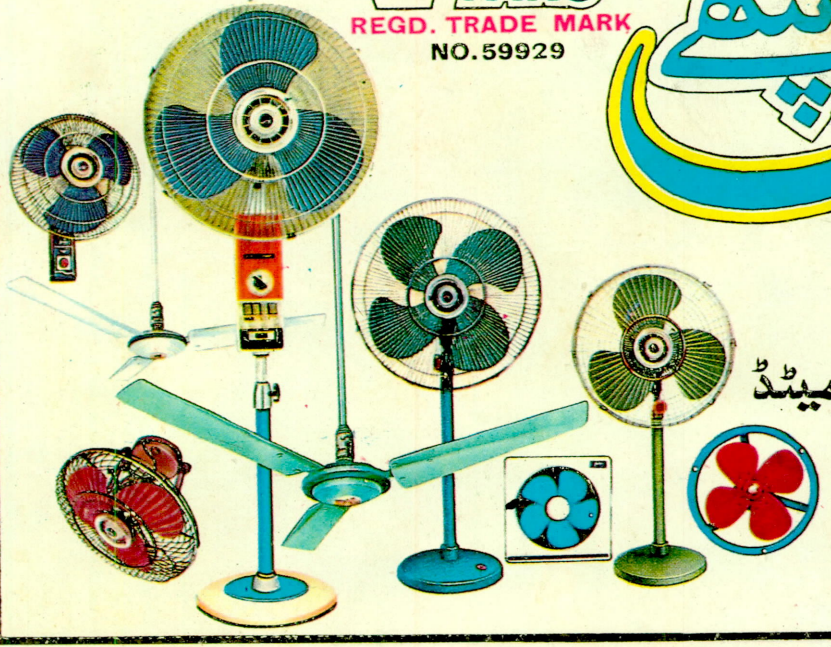


Yunas FANS

REGD. TRADE MARK
NO. 59929

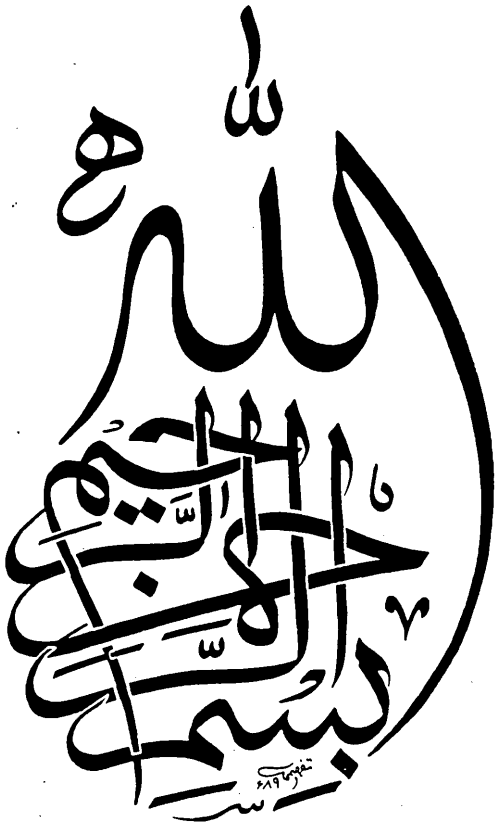
یونس پنکھے



یونس میٹل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

یونس کالونی جی۔ ٹی روڈ۔ گجرات

فون فیکٹری: 4643 - 4823
فون رہائش: 4824 - 4645



شروع اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

اللہ ولی التوفیق



کرسٹل ٹوٹھ پیسٹ بنانے والوں کی معیاری پیشکش

کفایت اور لذت کا نیا تصور

Crystal

فروٹ جوس کنسنٹریٹ



پھلوں کی خالص لذت، پاکستان میں پہلی بار حیرت انگیز کفایت کے ساتھ۔ کرسٹل فروٹ جوس کنسنٹریٹ کی شکل میں صرف ۸ روپے میں اورنج، پائن ایپل بلیک کرنٹ، آئس کریم سوڈا، ویسٹ اور فروٹ پنچ کے مزے دار ذائقوں میں سے گھر بیٹھے اپنی پسند کا شربت تیار کیجیے۔

جوس کنسنٹریٹ پانی میں ملا لیجیے۔ آپ کی پسند کے شربت کی ایک بوتل تیار۔ کرسٹل فروٹ جوس کنسنٹریٹ کا ایک پیک ۲۰ گلاس شربت بنانے کے لئے کافی ہے۔ پانی، چینی اور بوتل گھر کی۔ فروٹ جوس کنسنٹریٹ کرسٹل کا۔ گھر بیٹھے شربت تیار۔ کرسٹل فروٹ جوس کنسنٹریٹ۔ آج ہی خرید لیجیے۔



شربت کی تیاری بیحد آسان!

ایک جگ میں چلئے کے ۳ کپ پانی ڈالیے دو کپ چینی اور ایک پیکٹ فروٹ



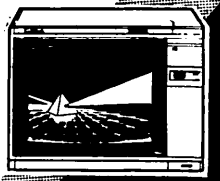
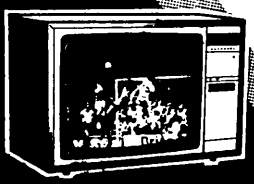
Crystal

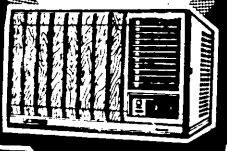
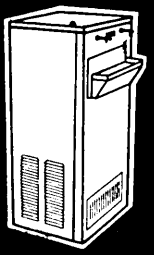
خالص لذت اور حیرت انگیز کفایت کا نچوڑ

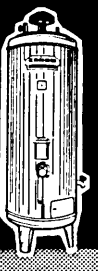
کرسٹل فروٹ جوس کنسنٹریٹ!

ٹیلی ویژن

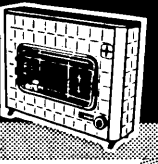
الیکٹرک و گیس
مصنوعات







ٹیلی ویژن، ریفریجریٹرز، ایئر کنڈیشنرز، واشنگ مشین، ڈیپ فریزرز، واٹر کولرز
واٹر ہیٹرز، روم ہیٹرز، کوکنگ رینج و سٹیبلائزرز وغیرہ۔

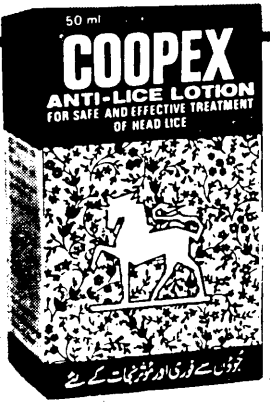
منظور شدہ ڈیلر

الیکٹرو گیس

عابد مارکیٹ شارع فاطمہ جناح
(کوئینز روڈ) لاہور ۳
فون: ۳۰۶۶۶۰

اپنے بچّوں کو جوؤں کے عذاب سے بچائیں





کوپیکس
اینٹی لائس لوشن
استعمال کریں

کوپیکس اینٹی لائس لوشن بچوں کی جلد اور بالوں کو نقصان نہیں پہنچاتی، کوپیکس ڈی ڈی ٹی، بی ایچ سی، پرو پوکسر، میلاتھیان اور اسی قسم کے دوسرے مضر صحت اجزاء سے پاک ہے۔

قیمت صرف
16.50

جوؤں اور لیکھوں سے مؤثر نجات کیلئے کوپیکس اینٹی لائس لوشن

TRANSWORLD

لذت اور خوشبو - دونوں کا مستقل ساتھ

SMC فلیورنگ ایسنس

کھانوں اور مشروبات میں
خوشبو کا اعلیٰ ترین معیار

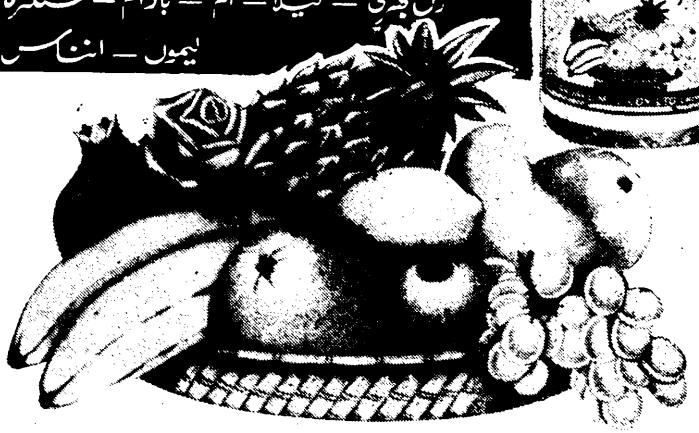


مشرق کا انداز ہو یا مغرب کا نمکین کھانے ہوں یا میٹھے، انواع واقسام کے فرحت بخش مشروبات ہوں یا خوش ذائقہ کنفکشنری - لذت اور خوشبو دونوں کا مستقل ساتھ ہے۔

SMC فلیورنگ ایسنس، آپکے کھانوں، مشروبات اور کنفکشنری کے لئے اعلیٰ ترین معیار کی خوشبو فراہم کرکے انکی لذت میں بیش بہا اضافہ کرتے ہیں۔

انتخاب کیجئے:

کیوڑہ - بریانی - ونیلا - صندل خس - گلاب
رس بھری - کیلا - آم - بادام - سنگترہ
لیموں - انناس



SMC فلیورنگ ایسنس - کھانوں میں خوشبو کا اعلیٰ معیار۔
بنانے والے: اسٹینڈرڈ مینوفکچرنگ کمپنی لمیٹڈ - لاہور

Repcom

صدیوں کے آزمودہ جوشاندے کی ترقی یافتہ شکل "جوشاندی" ہے

جوشاندی کی ترقی یافتہ شکل

"جوشاندی" ڈراپس

خوش ذائقہ، استعمال میں نہایت سہولت اور "جوشاندی" کے تمام تر فوائد موجود

"جوشاندی" ڈراپس بھی بلاشبہ نزلہ، زکام، کھانسی کی زود اثر دوا ہے

ترکیب: دن میں چار پانچ ڈراپس وقفوں کے ساتھ چوسیں

اسی طرح بچوں کو تین چار مرتبہ استعمال کرائیں۔



اجمل دواخانہ حکیم اجمل خان پرائیویٹ لمیٹڈ لاہور

کراچی راولپنڈی پشاور

UMEA

اولیائے کرام نمبر (جلد چہارم)

خصوصی شمارہ

اپریل ۱۹۸۹ء

خصوصی شعبۂ ادارت پینل برائے

ندیم اپیل ۔ نواز رومانی ۔ جی آر اعوان ۔ سید مقبول الدین گیلانی

کرم الٰہی نقشبندی ۔ مولانا محمد خاں ۔ علامہ ضیاء الحبیب صابری

ڈیزائنر : ارشد یعقوب

خطاطی : محمد اقبال طاہر ۔ علی احمد ۔ عبدالعزیز

پروسیس : فلک شیر

قیمت عام شمارہ

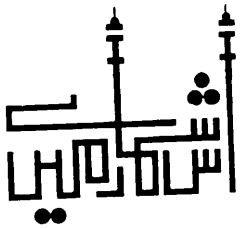
۱۵ روپے

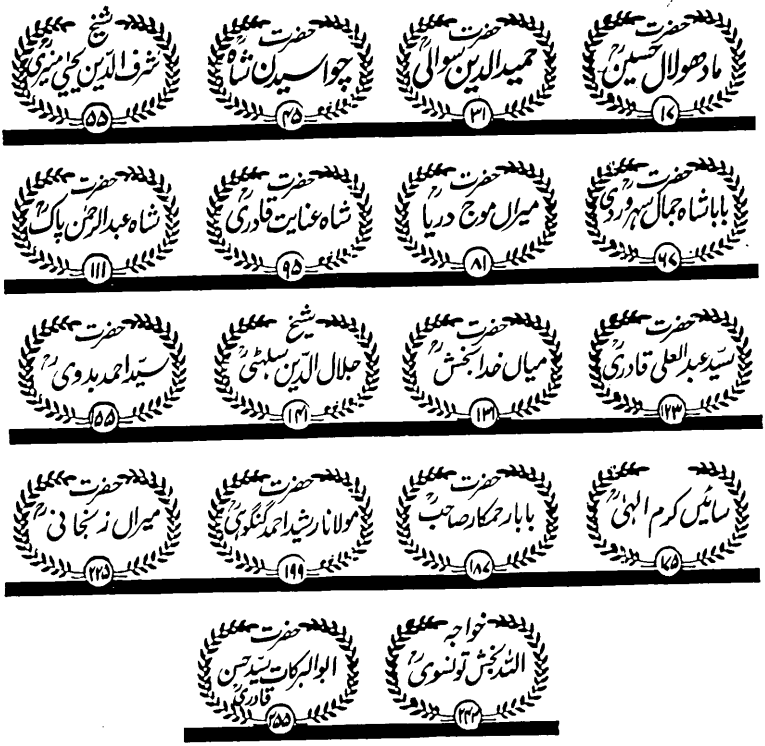
اولیائے کرام نمبر

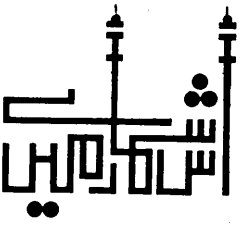
۴۲ روپے

ناشر

امجد رؤف خان




حضرت مادھولال حسینؒ ۱۷
حضرت حمید الدین سوالیؒ ۳۱
حضرت چواسیدن شاہؒ ۴۵
شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ ۵۵
حضرت باباشاہ جمال سہروردیؒ ۷۹
حضرت میراں موج دریاؒ ۸۱
حضرت شاہ عنایت قادریؒ ۹۵
حضرت شاہ عبدالرحمٰن پاکؒ ۱۱۱
حضرت سیّد عبدالعلی قادریؒ ۱۲۳
حضرت میاں خدا بخشؒ ۱۳۱
شیخ جلال الدین سلہٹیؒ ۱۴۱
حضرت سیّد احمد بدویؒ ۱۵۵
حضرت سائیں کرم الٰہیؒ ۱۷۵
حضرت بابا رحمکار صاحبؒ ۱۸۷
حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ۱۹۹
حضرت میراں زنجانیؒ ۲۲۵
خواجہ اللہ بخش تونسویؒ ۲۴۲
حضرت ابوالبرکات سیّد حسن قادریؒ ۲۵۵



حضرت ممشاد علو دینوریؒ ۲۶۲
حضرت شیخ سیف الدینؒ ۲۷۷
میاں اخوند سعید شوربانیؒ ۲۹۱
سید احمد سون افغانیؒ ۳۰۵
حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ ۳۱۵
حضرت خیر النساجؒ ۳۲۶
حضرت جلال الدین حسین شاہؒ ۳۵۵
خواجہ ضیاء الدین نخشبیؒ ۳۶۷
حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ ۳۹۸
حضرت ابو اسحاق ابراہیم شیبانیؒ ۴۰۲
حضرت سید نور الحسن شاہؒ ۴۲۴
حضرت ابراہیم بن شہریارؒ ۴۲۵
حضرت سید علی ترمذی المعروف بہ بابا پیرؒ ۴۴۱
حضرت جمال الدین ہانسویؒ ۴۵۱
خواجہ قمر الدین سیالویؒ ۴۵۶
حضرت صاحبزادہ فیض الحسنؒ ۴۶۵
حضرت محمد یونس آفریدیؒ ۴۷۲
حوالہ کتب ۴۸۰

خدمت و ترقی کے پچاس سال

1939 1989
50
GOLDEN JUBILEE

گیسٹول

سیرپ

تبخیر سینے کی جلن اور خرابی ہضم کیلئے



اشرف لیبارٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

فیصل آباد۔ پاکستان

اشرف

جام شیریں

خالص اجزاء۔ بہتر شربت

ایک بوتل ۳۰ گلاس شربت

نمک کا واحد شربت جس کی تیاری میں پانی کا ایک قطرہ بھی شامل نہیں۔
عام شربت میں پانی اور مصنوعی اجزاء استعمال ہوتے ہیں جبکہ قریشی کے جام شیریں میں خالص اجزاء کے عرقیات استعمال کیے جاتے ہیں۔
خالص اجزاء کے عرقیات کے استعمال کی وجہ سے اس کا ذائقہ منفرد ہے۔ پینے سے طبیعت بھی بھاری نہیں ہوتی اور دوسرے شربتوں کے مقابلے میں یہ پیاس بڑھاتا نہیں بلکہ پیاس بجھاتا ہے۔ جام شیریں گرمیوں میں لُو سے بچاتا ہے تسکین کنندہ ہے اور مفرح قلب ہے۔ جام شیریں کی ایک بوتل سے لیموں ملائے ۳۰ گلاس شربت بنایا جا سکتا ہے۔ قریشی کا جام شیریں خالص اجزاء۔ بہتر شربت



قریشی

تحقیق کی روایت۔ معیار کی ضمانت

نعت

یا نبیؐ اتنی مہربانی ہو !
تیری چاہت مری کہانی ہو
نعت لکھوں حضورؐ کی ایسے
میرے ہر لفظ میں جوانی ہو
میرے اشعار کے ستاروں میں
آپ کا حسن آسمانی ہو
میرے افکار کے نصیبوں میں
آپ کے در کی پاسبانی ہو
ہو بیاں مجھ سے آپ کی سیرت
میرے لہجے میں یوں روانی ہو
میرے اظہار کے سمندر میں
درد کی بارشوں کا پانی ہو
کاظمیؔ مدحتِ نبویؐ کے طفیل
زندگی میری جاودانی ہو

——— اکبر کاظمی

PRESTO
FREEZERS



PRESTO

Manufactured By
SALEEM SONS

SALES OFFICE
2, CLIFTON CO-OPERATIVE HOUSING SOCIETY, LAHORE 16 (PAKISTAN)
PHONES: 851 71, 854620
CABLE: PRESTO, TELEX: 44618 PRESTO PK

FACTORY:
G.T.E. GRAND TRUNK ROAD, LAHORE 11
AMAR SIDHU ROAD, LAHORE 11
PHONE: 30116 (5 POSITIVE LINES)

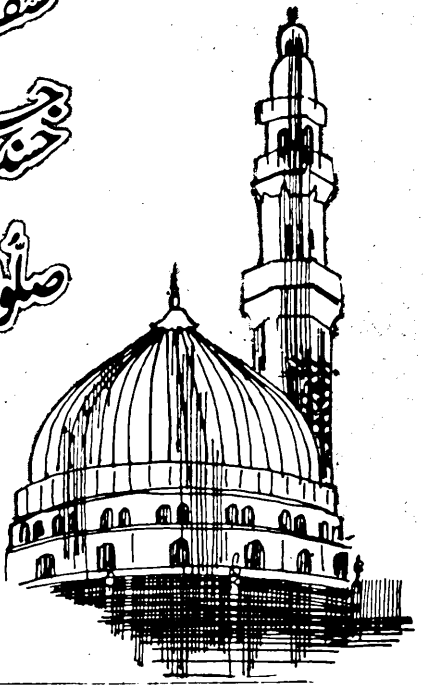
BRANCH OFFICE SALES:
Z-1/F, P.C.H.S., SHAHRAH-E-HUSSAIN ROAD
KARACHI-5, PAKISTAN, PHONE: 52727

بلغ العلیٰ بکمالہٖ

کشف الدجیٰ بجمالہٖ

حسنت جمیع خصالہٖ

صلوا علیہ وآلہٖ



یو بی ایل | یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ
ترقی ہمارا شعار

Orient

حضرت مادھو لال حسین رح

مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر ایک مرتبہ لاہور آئے۔ انہوں نے یہاں فقیر لال حسین کے قلندرانہ مشرب اور رامیش و رنگ کے عجیب و غریب قصے سُنے۔ فوراً وزیر اعظم کو حکم دیا کہ فقیر لال حسین کو پیش کیا جائے۔ حکم شہنشاہی کی اُسی وقت تعمیل کی گئی۔ مگر باوجود تلاشِ بسیار کے موصوف کا کہیں پتہ نہ چلا۔ وزیر اعظم ناکام بادشاہ کے حضور پہنچے اور عرض کی

"ظلِ الٰہی! لال حسین کا کہیں پتہ نہیں چل سکا۔"

ابھی یہ الفاظ وزیر کے مُنہ میں ہی تھے کہ فقیر لال حسین بادشاہ کے دربار میں تشریف لے آئے۔ آپ کا عجیب حُلیہ بنا ہوا تھا۔ مُونچھ ڈاڑھی غائب، ہاتھ میں ساغر و مینا اور مست و بے خود ہو کر بادشاہ کے روبرو کھڑے ہو کر پوچھا۔

"اے بادشاہ! تیرے بُلانے پر مَیں آگیا ہوں۔ کہو مجھ فقیر سے تمہیں کیا کام ہے؟"

بادشاہ نے کہا "اے درویش یہ تیرا حال کیا ہوا ہے۔ نہ شرعی شکل و صورت نہ جبہ و دستار اور پھر ہاتھوں میں سبو و جام۔ یہ سب کچھ ایک درویش کے لیے تو روا نہیں"

فقیر لال حسین نے جلال میں آکر بادشاہ کی طرف دیکھا اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "تیرا چہرہ غیر شرعی ہے اور کس کے ہاتھ میں شراب و پیمانہ ہے۔"

یہ کہتے ہی بادشاہ نے بھی دیکھا اور درباریوں نے بھی کہ فقیر لال حسین کے چہرے پر شرع کے مطابق ریش بھی ہے اور ہاتھ میں شراب کی بجائے دُودھ سے بھری ہوئی صراحی ہے۔"

بادشاہ کو خُدا نے ذہانت فطانت عطا کی تھی۔ فوراً پہچان گیا کہ یہ خُدا کے ولی نے اپنی کرامت دکھائی ہے۔ فوراً آداب بجالایا اور عرض کی۔

"اے صاحبِ ولایت! آپ واقعی خُدا رسیدہ ہیں۔"

فقیر نے جواب دیا "بے شک میں خُدا رسیدہ ہوں۔"

مگر آپ خُدا تک کس طرح پہنچے؟" بادشاہ نے سوال کیا۔

فرمایا "میں خُدا تک نہیں پہنچا بلکہ خُدا خود میرے پاس پہنچا ہے۔"

بادشاہ کے ایک مقرب نے جس کو اپنی دین و دانش اور عقل و آگہی پر بڑا ناز تھا جھٹ سے سوال کیا۔ اے درویش! اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ خُدا خود تم تک پہنچا۔"

فقیر لال حسین نے مصاحبِ شاہ کو نظر انداز کر کے بادشاہ سے کہا۔

"اے تاجدارِ ہندوستان! تو ہند کی سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک ہے، موٹی سی بات ہے اگر تو نہ چاہتا تو یہ گدا تجھ تک کیسے پہنچتا۔"

بادشاہ نے جب یہ جواب سُنا تو عش عش کر اُٹھا۔ آپ کی تعظیم کے لیے تخت سے اُٹھ کر آپ کے پاس آگیا اور دُعا کی درخواست کی۔

فقیر لال حسین نے بادشاہ کو اپنی دُعاؤں سے نوازا اور رخصت ہو گئے۔

یہی فقیر لال حسین دُنیائے عرفان میں حضرت مادھو لال حسین کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کا شمار اہلِ طریقت و معرفت میں ہوتا ہے۔ آپ کے آباء ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے دادا کا نام کلجس تھا اور وہ راجپوت قوم ڈھڈا سے تعلق رکھتے تھے۔ سُلطان فیروز شاہ کے زمانے میں آپ کے والد کلسن رائے نے اسلام قبول کیا اور اُن کا اسلامی نام شیخ عثمان رکھا گیا۔ آپ کے والد کپڑا بُننے کا کام کرتے تھے۔

فقیر لال حسین ۹۴۵ھ بمطابق ۱۵۳۸ء میں لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام شیخ حسین تھا۔ آپ عموماً سُرخ لباس پہنا کرتے تھے جس کی مناسبت سے آپ لال حسین کے نام سے پکارے جانے لگے۔

آپ کی عمر جب سات سال کی ہوئی تو آپ کو مکتب بھیجا گیا۔ آپ نے اس وقت کے مشہور عالم حافظ ابوبکر سے قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا۔ مگر ابھی صرف چھ سپارے ہی پڑھے تھے کہ یہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔ وہ اس طرح ہوا کہ ایک روز آپ اپنے مکتب میں درس لے رہے تھے کہ وہاں قطب زماں حضرت بہلولؒ تشریف لے آئے۔ حضرت بہلولؒ حضرت امام موسیٰ کاظمیؒ کے مزار پر حاضر تھے کہ آپ کو حکم ملا کہ آپ لاہور جائیں اور وہاں حافظ ابوبکر کے مکتب میں ایک کمسن طالب علم لال حسین ہے اُس کی تربیت کریں چنانچہ حضرت بہلولؒ لاہور پہنچ کر حافظ ابوبکر کے مکتب میں آئے اور اُن سے لال حسین کے بارے پوچھا۔ جب لال حسین حضرت بہلولؒ کے سامنے حاضر کیے گئے تو آپ نے اُن کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور فرمایا۔

"لال حسین! دریا پر جاؤ اور وہاں سے میرے وضو کے لیے پانی لے آؤ۔"

لال حسین نے حکم کی تعمیل کی۔ دریا سے پانی لائے جس سے حضرت بہلولؒ نے وضو کیا نماز پڑھی اور اس کے بعد دو رکعت نفل پڑھے اور خدا سے عرض کی "اے مولا کریم! اس معصوم لال حسین پر اپنا فضل و کرم کر اور اس کو عرفان کی دولت سے مالا مال کر کے اس کو اپنا سچا عاشق بنا۔"

حضرت بہلولؒ کی دعا رنگ لائی اور خدا نے لال حسین کے اندر جمالِ معرفت اور کمالِ حقیقت پیدا کر دیئے۔ انہی دنوں ماہِ رمضان المبارک کی آمد ہونے والی تھی۔ حضرت بہلولؒ نے فقیر لال حسین کو حکم دیا کہ اس سال نمازِ تراویح میں قرآن پاک تم سناؤ گے۔" یہ حکم سنتے ہی حافظ ابوبکر نے عرض کی "حضرت! یہ بچہ تو ابھی صرف چھ سپارے حفظ کر سکا ہے۔ یہ پورا قرآن پاک کس طرح سنائے گا۔"

حضرت بہلولؒ نے حافظ ابوبکر کی بات سُنی اَن سُنی کر کے فقیر لال حسین سے فرمایا "تم فکر نہ کرو اس سال تمہی نمازِ تراویح میں قرآن پاک سناؤ گے۔ بس تم اس طرح کرو دریا پر چلے جاؤ اور ہمارے لیے وہاں سے وضو کے لیے پانی لاؤ اور دریا پر تمہیں ایک بزرگ ملیں گے بس اُن کی باتیں غور سے سُن لینا اور اُن کی ہدایت پر عمل کرنا۔ تمہاری ساری مشکلات حل ہو جائیں گی۔"

فقیر لال حسین حسبِ حکم دریا پر پانی لانے کے لیے گئے۔ وہاں ایک نورانی شکل و صورت کے بزرگ آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ بزرگ نے آپ سے فرمایا "لال حسین! پانی کا لوٹا

بھر کر تھوڑا تھوڑا پانی میرے ہاتھ پر ڈالو۔" آپ نے ایسا ہی کیا۔ اُس بزرگ نے اُسی پانی سے آپ کے چہرے اور سر کو دھو ڈالا۔ اس کے بعد آپ کو حکم دیا کہ جا کر حضرت بہلولؒ کو سارا کلام پاک سُنا دو۔"

فقیر لال حسین واپس آتے ساری باتیں حضرت بہلولؒ کو بتائیں اور اُس کے بعد آپ نے حضرت کو پورا قرآن پاک سُنا دیا۔ حافظ ابوبکر یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لال حسین نے تو صرف چند سپارے پڑھے تھے ان کو پورا قرآن حکیم کس طرح حفظ ہو گیا۔

پھر حضرت بہلولؒ نے آپ کو نمازِ تراویح میں پیش امام بنایا اور آپ سے ماہِ رمضان میں پورا قرآن پاک سُنا۔ رمضان شریف کا مہینہ گزرا تو حضرت بہلولؒ نے فقیر لال حسین کو اپنا باقاعدہ مرید بنایا اور آپ کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد انہوں نے آپ کو ہدایت فرمائی مجھے جتنا حکم تھا اُس کی میں نے تعمیل کر دی ہے۔ اب میں تو رخصت ہونے لگا ہوں مگر تمہاری تربیت اور تعلیم ابھی ختم نہیں ہوئی۔ تمہاری مزید تربیت حضرت داتا گنج بخشؒ فرمائیں گے لہٰذا تم بلا ناغہ اُن کے مزار پُر انوار پر حاضر ہوا کرو۔

حضرت فقیر لال حسین عرصہ بارہ سال تک نہایت پابندی سے حضرت داتا صاحبؒ کے مزار پر حاضری دیتے رہے۔ پوری پوری رات عبادت و تلاوت میں گزار دینا آپ کا معمول ہو گیا۔ ایک روز آپ معمول کے مطابق حضرت داتا صاحب کے مزار پر حاضر تھے کہ اچانک آپ کے سامنے ایک نورانی شکل والے بزرگ آتے اور فرمایا۔

"لال حسین! جانتے ہو میں کون ہوں؟"

عرض کی "حضرت آپ خود ہی فرما دیجئے کہ آپ کون ہیں میں تو بہت کم علم ہوں۔ آپ علم والے ہیں آپ ہی میری رہنمائی فرمائیے۔"

فرمایا "میں علی ہجویریؒ ہوں۔ تم نے بارہ سال تک میری خدمت میں رہ کر جو ریاضت کی ہے اُس کا انعام دینے کے لیے مجھے پروردگارِ عالم نے بھیجا ہے۔" اس کے بعد حضرت داتا صاحبؒ نے آپ کو اپنے سامنے کھڑا کر کے فرمایا "لال حسین! آج سے تم باطنی نعمت سے مالا مال ہو۔" یوں فقیر لال حسین ولایت سے سرفراز اور شرابِ وحدت سے سرشار ہوئے۔

حضرت فقیر لال حسین نے چھبیس سال تک سخت عبادت و ریاضت کی۔ ہر روز ایک قرآن پاک ختم کرنا آپ کا معمول بن گیا تھا۔ مجاہدے اور چلہ کشی کر کے آپ نے ایسی نفس کشی کی کہ باکمال انسان بن گئے۔ آپ قائم الیل اور شب زندہ دار بزرگ تھے۔ ریاضت

راوی کے کنارے پر رات بھر کھڑے ہو کر آپ پورا قرآن پاک پڑھا کرتے تھے۔

طریقت کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے دوسری تعلیم کی طرف توجہ دی۔ آپ نے شیخ سعد اللہؒ سے تفسیر مدارک کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ایک روز آپ اپنا سبق پڑھ رہے تھے کہ قرآن پاک کی ایک آیت جس کا ترجمہ یہ تھا "اس جہاں کی زندگی لہو و لعب ہے"۔ پر پہنچے تو اس کی حقیقت آپ کو سمجھ نہ آئی۔ آپ نے شیخ سعد اللہؒ سے اس کی وضاحت اور تشریح پوچھی مگر موصوف نے فلسفانہ اور عالمانہ طور پر آپ کو سمجھایا اور اس بات پر زور دیا کہ یہ تمام دُنیا ہی لہو و لعب ہے۔ بس یہ سُننا تھا کہ آپ پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ آپ رقص کرتے ہوتے مکتب سے نکل پڑے۔ گلیوں بازاروں میں ناچتے جاتے اور کہتے جاتے "جب خُدا تعالیٰ نے ساری دُنیا کو بازی فرمایا ہے تو بس اسی میں مصروف رہنا چاہیئے"۔

آپ پر جذب نے ایسا رنگ چڑھایا کہ آپ نے اپنی اور اپنے ہم مکتبوں کی تمام کتابیں کنویں میں پھینک دیں۔ ڈاڑھی اور مونچھ کے بار سے سبکدوش ہو گئے۔ آپ کے ساتھی آپ سے اُلجھنے لگے کہ ہماری کتابیں کنویں سے نکال دو۔ یہ سُننا تھا کہ آپ اُن سب کو لے کر کنویں کے پاس آتے اور اپنا ہاتھ کنویں میں ڈالا' عام سا ہاتھ اتنا دراز ہوا کہ گہرے کنویں سے تیرتی ہوئی کتابیں باہر نکال کر لے آیا۔ آپ کے ہم مکتبوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ تمام کی تمام کتابیں بالکل خُشک تھیں۔ پانی نے کتابوں کو ذرا بھی متاثر نہیں کیا تھا۔ لڑکے اپنی اپنی کتابیں لے کر رخصت ہوتے تو آپ کی حالت پھر سے ویسی ہو گئی۔ آپ کا اب یہ معمول بن گیا کہ صراحی و جام ہاتھ میں تھامے گلی کوچوں میں پھرتے رہتے تھے۔ طوائفوں کے کوٹھوں پر جاتے اور ناچ گانے میں اپنے دن رات بسر کرتے تھے۔

آپ کے شب و روز محفل نشاط و مستی میں گزرنے لگے۔ آپ کی اس کیفیت کی خبر آپ کے مُرشد حضرت بہلولؒ کو پہنچی تو انہوں نے فرمایا "ہرگز نہیں میرا مرید کسی طرح بھی بھٹک نہیں سکتا"۔

لوگوں نے جب اُنہیں یقین دلایا اور عرض کیا "حضرت آپ خود چل کر دیکھ لیں اور اپنی آنکھوں سے اپنے مرید کی حالت ملاحظہ کریں"۔

حضرت بہلولؒ لاہور تشریف لاتے اور آخر فقیر لال حسینؒ کو دیکھا۔ آپ جذب و شکر میں مبتلا بے خود اور مست تھے۔ آپ کی حالت دیکھ کر حضرت بہلولؒ مسکراتے اور مطمئن ہو کر فرمایا "یہ دیکھنے والی نظروں کا قصور ہے ورنہ لال حسین تو اپنی منزل کی طرف نہایت کامیابی سے

رواں دواں ہے۔" یہ کہہ کر حضرت بہلولؒ واپس تشریف لے گئے اور کچھ ہی عرصے کے بعد آپ وصال فرما گئے۔ فقیر لال حسین نے مُرشد کے وصال کی خبر سُنی تو اور بھی زیادہ مستانہ و دیوانہ وار ناچنے لگے۔



ایک روز کی بات ہے کہ آپ ناچتے ہوتے شاہدرہ سے گزر رہے تھے کہ آپ کی نگاہ ایک خوب رُو نوجوان پر پڑی۔ بس ایک نگاہ اپنا کام کر گئی۔ اور آپ اُس لڑکے پر فریفتہ ہو گئے۔ موصوف ایک سولہ سال کا برہمن نوجوان تھا۔ جو شادی شدہ تھا اور اپنے والدین کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہا تھا۔ فقیر لال حسین جس لڑکے پر عاشق ہوتے اس کا نام مادھو تھا۔ عشق نے حضرت کی وہ حالت کر دی کہ آپ دن رات مادھو کے گھر کا طواف کرنے لگے۔ مگر عشق نے کبھی اتنی آسانی سے منزل حاصل نہیں کی۔ آبلہ پائی تو عشق کرنے والوں کا مقدر رہے۔ مادھو بھی ایک مدّت تک حضرت سے بے اعتنائی کا سلوک کرتا رہا مگر کب تک آخر اس کو التفات برتنا پڑا۔

پھر اس قدر قربت ہوئی کہ دونوں کے نام بھی ایک دُوسرے کی پہچان بن گئے۔ فقیر لال حسین نے اپنا نام ہی مادھو لال حسین رکھ لیا۔ مادھو آپ کے سچے عشق میں جب گرفتار ہوتے تو انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت آپ کے پاس گزارنا شروع کر دیا اور آپ کے متنوع سے شغل فرمانے لگے۔ مادھو کے گھر والوں کو آپ دونوں کی دوستی سخت ناگوار لگتی تھی۔ مگر اس بات کو حضرت نے اور مادھو دونوں نے خاطر میں لانے کی کوشش ہی نہ کی۔ اور پھر مادھو پر رفتہ رفتہ حضرت کی صحبت نے ایسا اثر کیا کہ انہوں نے کلمۂ طیبہ پڑھ کر وحدانیت کا اقرار کیا اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اُن کا اسلامی نام محبوب الحق رکھا گیا لیکن انہیں شہرتِ دوام مادھو نام سے ہی ملی۔ آپ شیخ حسین کے دستِ حق پرست پر بیعت ہو کر سلسلۂ قادریہ میں داخل ہوتے اور توجہ شیخ سے درجۂ کمال پر پہنچے۔

شیخ لال حسین کی مادھو کے ساتھ محبّت اور دوستی ہمیشہ اُس کے والدین کو کھٹکتی تھی چنانچہ وہ لوگ وقتاً فوقتاً اس کوشش میں رہتے کہ کسی طرح ان دونوں کو ایک دُوسرے سے جُدا کر دیا جائے مگر خُدا کو ایسا کرنا منظور نہ تھا۔

اسی سلسلہ میں ایک دفعہ مادھو کے والدین انہیں گنگا اشنان کے لیے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ مگر نہ مادھو کو جانا گوارہ تھا اور نہ شیخ حسین میں اتنی تاب تھی کہ وہ اپنے محبوب کو اپنی

نظروں سے دُور کریں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ مادھو اپنے گھر والوں کے ہمراہ گنگا اشنان کو نہیں جائیں گے۔ مادھو نے آپ کے فیصلے پر سر جُھکا دیا اور اپنے گھر والوں کو کہہ دیا "آپ سب جائیں میں نہیں جاؤں گا۔"

جب وہ سب لوگ چلے گئے تو شیخ حسین کو محسوس ہوا کہ مادھو نے میری خاطر کتنی قربانیاں دی ہیں۔ حتیٰ کہ اپنے والدین کی معمولی سی خواہش پوری کرنے سے انکار بھی کر دیا ہے چنانچہ ایک روز آپ نے مادھو سے پوچھا۔

"مادھو! اشنان کس دن ہو گا؟"

عرض کی "حضرت! کل ہو گا۔"

فرمایا "کل مجھے یاد دلا دینا کہ آج اشنان ہے۔"

حکم کی تعمیل کی گئی اور مادھو نے آپ کو اگلے روز یاد کروا دیا۔ آپ نے مادھو سے فرمایا کہ وہ آنکھیں بند کر کے آپ کے پاؤں پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہو جائیں۔ مادھو نے آپ کے ارشاد کے مطابق عمل کیا اور جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو گنگا کے کنارے کھڑا پایا۔ پھر انہوں نے حسب دستور اپنے والدین اور دیگر اعزہ کے ہمراہ اشنانِ گنگا کیا اور پھر حضرت کے حکم کے مطابق آنکھیں بند کیں اور اُن کے پاؤں پر پاؤں رکھے اور پلک جھپکتے ہی واپس لاہور پہنچ گئے۔

حضرت مادھو کے والدین بڑے حیران ہوتے کہ آپ اچانک آتے اور اشنان کر کے واپس بھی چلے گئے۔ اس طرح کا آنا اور واپس چلے جانا اُن کی سمجھ سے بالا تھا۔ مگر جب وہ لاہور آئے تو بیٹے کی زبانی اُس سفر کی روئداد سُن کر اُن کی آنکھیں کُھل گئیں۔ اب انہوں نے سوچا شیخ حسین تو خُدا کے ولی کامل ہیں اور یہ مادھو کے ساتھ اُن کا تلطف محض دُنیاوی نہیں بلکہ خُدا کی رضا منشا کی تکمیل ہے۔ اس کے بعد اُن لوگوں نے حضرت مادھو کی دوستی اور پیری مریدی کو کج نظری سے دیکھنا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد مادھو اور حضرت کی رفاقت اور گہری ہوتی گئی حتیٰ کہ آپ دونوں ایک دُوسرے کا جزو لاینفک ہو گئے۔

ایک مرتبہ بسنت کے موقعہ پر مادھو ایک گلال لاتے اور آپ پر ڈال دیا۔ آپ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی اور آپ اسی مستی میں اپنے حُجرے سے ناچتے ہوتے بازاروں کی طرف نکل گئے۔ ہوش میں آنے کے بعد آپ نے اس تہوار کو باقاعدگی سے منانا شروع کر دیا۔

یہ تہوار اگرچہ ہندوؤں کی رسم تھی مگر جب سے آپ نے اسے منانا شروع کیا تو وہاں مُسلمان بھی جمع ہونا شروع ہو گئے حتیٰ کہ آپ کے وصال کے بعد تب سے اب تک یہ تہوار عُرس کی شکل میں منایا جاتا ہے۔ آپ کے مزار پر بسنتی رنگ کا ایک غلاف چڑھایا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ لاہور کے قاضی مخدوم الملک نے آپ کو ڈھول پر رقص کرتے دیکھا تو انہیں یہ بات سخت ناگوار معلوم ہوئی۔ چنانچہ آپ کو عدالتِ قاضی میں طلب کیا گیا۔

آپ پیش ہوئے تو قاضی نے کہا۔

"اے شاہ حسین! یہ تم نے کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ تم شرعی کام چھوڑ کر ان لغویات میں مصروف ہو۔ آخر تم دُنیا کو کیا دکھانا چاہتے ہو؟"

آپ نے قاضی کی طرف غور سے دیکھا اور فرمایا۔

"قاضی صاحب! اسلام کے ارکان کتنے ہیں؟"

قاضی نے جواب دیا "پانچ ہیں"۔

فرمایا "کون کون سے ہیں بتائیں ذرا"۔

قاضی نے کہا "۱۔ کلمہ توحید اور رسالت کا اقرار

۲۔ نماز

۳۔ روزہ

۴۔ زکوٰۃ

۵۔ حج

آپ نے یہ باتیں سُنی تو فرمایا "دیکھیں قاضی صاحب! پہلے رکن میں توحید و رسالت میں آپ بھی شریک ہیں اور میں بھی۔ دُوسرے دو ارکان مَیں نے چھوڑ رکھے ہیں اور آخری دو آپ نے ترک کر دیئے ہیں۔ پھر کیا مَیں ہی سزا کا مستوجب ہوں۔ آپ کے لیے کوئی سزا نہیں ہے؟"

قاضی صاحب نے جب آپ کی گفتگو سُنی تو بہت شرمندہ ہوئے۔ کیونکہ وہ صاحبِ نصاب ہونے کے باوجود زکوٰۃ نہیں دیتے تھے اور باحیثیت ہونے پر بھی حج سے مشرف یاب نہیں ہوتے تھے۔ اس کے بعد آپ پر قاضیٔ وقت نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔

معروف بزرگ واسطی فرماتے ہیں۔

"جو شخص اپنے نفس کو ملامت کرتا ہے وہ خُدا کا قرب حاصل کرتا ہے۔ اس بات کی توضیح

شاہ ہند دارشکوہ نے یوں کی۔

از اصل حقیقت جو خبر دارشدی
در حضرتِ حق محرم اسرار شدی
چوں فائل خیر و شہ خُدا را دیدی
دیدی زگنہ خویش گنہ گار شدی

حضرت واسطیؒ پھر فرماتے ہیں "شیخ حسین پر خُدا کی رحمت ہو جو ملامتیوں کے طریقے پر کڑک کر اور ڈھول دھڑاکے سے چلتا تھا۔ گزشتہ زمانوں کے ملامتیوں میں بھی اُس جیسا ملامتی کوئی نہیں دیکھا گیا تھا اور وہ اپنے زمانے کے ملامتیوں کا بھی اُستاد ہے۔"

لوگوں نے یہ باتیں سُنی تو واسطیؒ سے پوچھا "آپ کون ہیں"۔

تو حضرت واسطیؒ نے جواب دیا

"میں نہ مقیم ہوں نہ مسافر، نہ مسلمان ہوں نہ کافر وہی کچھ ہوں جو میں تھا"۔

ایک مرتبہ ایک مجلس میں حضرت شاہ حسین کے سامنے حافظ شیرازی کا ایک شعر پڑھا گیا جو حسب ذیل تھا۔

چشمۂ چشم مرا اے بتِ خنداں دریاب
بر اُمید تو بخوشش آب روانے دارد

آپ نے شعر سُن کر غُصّے سے فرمایا "حافظ شیرازی کی تو ساری عُمر ہی بوڑھی عورتوں کی طرح روتے ہوئے گزر گئی"۔ پھر آپ نے اہلِ مجلس کو اپنا ایک شعر سناتے ہوئے فرمایا "اس حافظ کی غزل کا یہ شاندار مطلع سُنیئے۔

شاہد آں نیست کہ موئے دمیانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

آپ کا شعر سُن کر سب لوگ واہ واہ کر اُٹھے۔ حضرت نے اپنے شوق اور طرب و رنگ کے لبادے میں اپنی ولایت کو زندہ رکھا۔ آپ عرفانِ الٰہی کے اتنے قریب تھے کہ ہر بات آپ اذنِ الٰہی سے کیا کرتے تھے۔ اور خُدا کے حضور پہنچ کر آپ کے شوق کی منزل آپ کے قریب تر ہو جاتی تھی۔ مگر بندوں میں آکر آپ وہی فقیر بن جاتے تھے جس کی ظاہری حالت شرع سے بعید ہو جاتی تھی۔

مشہور شہنشاہ نورالدین جہانگیر نے عالم شہزادگی میں آپ کی خدمت میں ایک عرصہ گزارا۔ وہ آپ کا معتقد اور والا وشیدا تھا۔ اُس نے آپ کی زندگی پر ایک روزنامچہ لکھوایا اور اس کام پر اپنے مصاحب بہادر خان کو معمور کیا۔ مغل شہنشاہ اکبر اور اس کے حرم کی شہزادیاں اور بیگمات بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیوض و برکات حاصل کیا کرتی تھیں۔ آپ کے کشف و کرامات سے مغل سلطنت نے استحکام حاصل کیا۔ جہانگیر آپ کی فوق العادت طاقت اور تقدس کا اس قدر قائل تھا کہ اس نے بہادر خان کے مرتب کردہ روزنامچہ کو ایک کتاب کی شکل میں شائع کروایا اور وہ کتاب "بہاریہ" کے نام سے موسوم کی گئی۔

ایک مرتبہ موضع منڈیالہ میں کافی عرصہ سے بارش نہیں ہوتی تھی۔ فصلیں خشک سالی سے بالکل تباہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس دیہات کے نمبردار نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے دُعا کی درخواست کی۔ مگر آپ اُس پر مطلق متوجہ نہ ہوتے۔ نمبردار کو سخت افسوس ہوا۔ ایک روز آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ منڈیالہ کے قریب سے گزر رہے تھے کہ نمبردار کو پتہ چل گیا۔ اس نے اپنے آدمی بھیجے جو آپ کو ساتھیوں سمیت منڈیالہ لے آئے۔ نمبردار نے آپ کو اپنے گھر میں بٹھایا اور عرض کی۔

"حضرت! اب میں آپ کو اُس وقت تک جانے نہیں دوں گا جب تک آپ ہمارے لیے بارش کی دُعا نہیں کریں گے۔"

آپ نے مسکرا کر فرمایا "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے دُعا کروانے کے لیے ہمیں قید کر لیا ہے، چلو اچھا، مگر ہم ایک شرط پر دُعا کریں گے۔ تم پہلے مجھے اور میرے ساتھیوں کو مُرغ اور نان کھلاؤ پھر دیکھنا تمہاری خواہش کس طرح پوری ہوتی ہے۔"

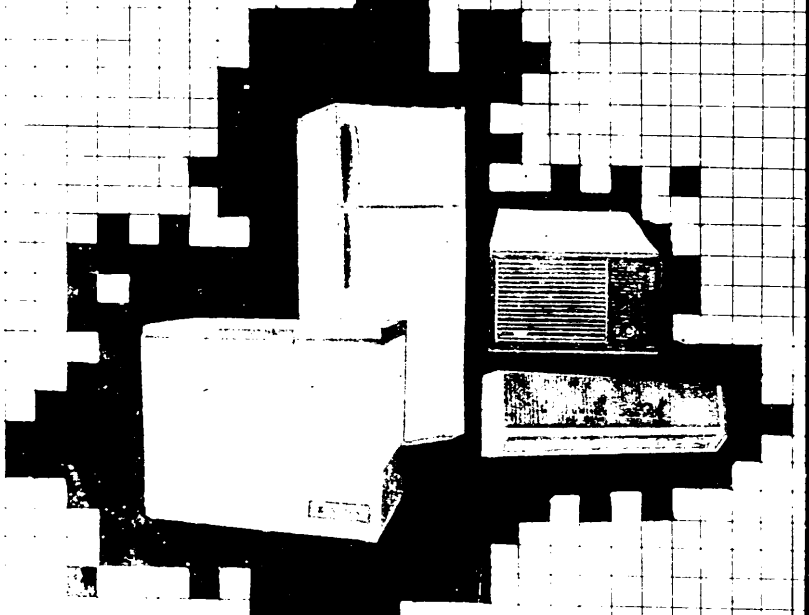
نمبردار نے آپ کے حکم کے مطابق مُرغ اور نان پکوا کر آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ آپ اور آپ کے ساتھیوں نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا "اب کیا دیر ہے۔"

آپ کا یہ کہنا تھا کہ ابر گھر کر آیا اور خوب بارش ہوئی اور اُس وقت تک نہ رُکی جب تک نمبردار نے آپ سے عرض نہ کی کہ حضرت بس اب میری دُعا پوری ہو گئی ہے۔

آپ کی خدمت میں بڑے بڑے علماء اور دانشور حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وقت کے

بڑھتی ہوئی آسائشوں کا گھر

PEL



جہاں معیار کا احساس

پاک الیکٹرون لمیٹڈ

کوٹ لکھپت، لاہور پاکستان فون

EVERNEW CONCEPTS

مشہور عالم مولانا عبدالحکیم نے آپ کی خدمت میں عرض کی۔

"حضرت! میں ایک مدت سے آپ کی خدمت میں حاضر رہتا ہوں۔ آپ کے عرفان سے میں نے ادراک حاصل کیا ہے۔ آپ مجھے اپنا مرید بنالیں تو یہ میرے لیے بہت بڑی سعادت ہوگی۔"

آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ چھوڑ یار تُو ملاں ہے۔ میں فقیر ہوں۔ میرا تیرا کیا جوڑ ہے۔ کیوں مجھے شہر میں ذلیل و خوار کرائے گا۔ تُو علم پڑھ۔ یہ فقیری تیرے لائق نہیں۔ تُو نکتے نکالنے والا مولوی ہے مگر ہم صرف اللہ اللہ کرنے والے ہیں۔"

شاہ حسینؒ پنجابی کے مشہور شاعر بھی تھے۔ اُن کی لاتعداد کافیاں آج بھی مقبولِ عام ہیں جن کو شوق سے گایا جاتا ہے۔ آپ کی زبان بڑی صاف، میٹھی اور رس سے لبریز تھی۔ زبان کے لحاظ سے پنجابی شعراء میں آپ کا رتبہ بہت بلند ہے۔ آپ کی زبان میں ادبی پوٹھوہاری کی بھی جھلک ہے جو روزمرہ ہے۔ آپ عروضی ضرورتوں سے بے پروا تھے۔ آپ کو لفظوں کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

کافی کو ہندی میں راگنی بھی کہتے ہیں اور اُس کو راگ کے طور پر بھی گایا جاتا ہے۔ مگر عرفِ عام میں کافی صوفیا کا وہ کلام معرفت ہے۔ جس کو ترنم سے ادا کیا جاتا ہے۔ شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں حضرت شاہ حسین کی نشست حضرت بلھے شاہ سے بھی بلند ہے۔

آپ فرماتے ہیں۔

من اٹکیا بے پرواہ نال
اُہ دین دُنی دے شاہ نال
دُنیا چھوڑ آخر مر جاناں
اوڑک کم اللہ نال

حضرت نے تصوف کی دُنیا میں دیگر اولیائے کرام اور زعماء دین کی طرح ایک بڑا نام حاصل کیا۔ آپ صوفی شاعر بھی تھے۔ آپ کو صاحبِ کرامت بزرگ بھی مانا گیا ہے۔ آپ کے متعلق سیرت کی کتابوں میں مختلف مخالف و موافق آراء بیان کی گئی ہیں مگر اجمالی طور پر اگر آپ کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو آپ واقعی ایک نیک نہاد اور کامل انسان تھے۔ اس لیے ارباب سیر کی منتقی آراء پر وحیان دیتے بغیر حضرت شاہ حسین کی اُس عزت و توقیر پر غور کرنا لازم ہے جو خُدا نے اُن کو بعد از وفات عطا فرمائی ہے۔

شیخ مادھو کو حضرت شاہ حسین کے ساتھ بہت محبت تھی۔ لمحہ بھر کی جُدائی بھی انہیں شاق گزرتی

تھی۔ ایک دفعہ حضرت نے مادھو کو امتحان و آزمائش میں ڈال دیا۔ آپ نے مادھو کو حکم دیا کہ وہ راجہ مان سنگھ جو اکبری عہد کا امیر تھا کی ملازمت کریں اور اُس کے ساتھ دکن کی مہم پر جائیں۔ شیخ مادھو کو اگرچہ اپنے مُرشد کی مفارقت گوارہ نہ تھی لیکن وہ ارشادِ مرشدی سے سرتابی بھی نہ کر سکتے تھے۔ ناچار دل پر پتھر رکھ کر وہ دکن روانہ ہوتے۔ مہم جوئی میں کامیابی کے بعد بھی راجہ کی ملازمت میں مادھو نے تقریباً تیرہ سال گزارے۔ اور ایک طویل عرصہ کے بعد لاہور واپس آئے۔

اللہ والے ہر آنے والے معاملات سے باخبر ہوتے ہیں۔ شیخ حسین جانتے تھے کہ وہ اور مادھو ایک دُوسرے سے محبّت کرتے ہیں۔ محبّت بھی ایسی جس میں جُدائی برداشت کرنے کا تصوّر بھی سوہانِ رُوح ہے۔ اس کے ساتھ ہی شیخ حسین کو خُدا نے یہ بھی بتا دیا کہ اب وہ جلد ہی وفات پانے والے ہیں۔ اس لیے انہوں نے سوچا میری وفات کے بعد دائمی جدائی مادھو کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگی۔ اِن رموز کو پیشِ نظر رکھ کر انہوں نے مادھو کو راجہ مان سنگھ کی ملازمت اختیار کرنے اور دکن کی مہم پر جانے کا حکم دیا۔ مادھو کی دکن روانگی کے بارہ سال بعد اور لاہور واپسی سے ایک سال قبل حضرت شاہ حسین وصال فرما گئے۔ یوں ایک لمبی جُدائی اور طویل فراق کے عادی ہونے کے باوجود جب مادھو لاہور واپس پہنچے تو اپنے مُرشد کی وفات کی خبر سُن کر اپنے حواس کھو بیٹھے۔

حضرت شاہ حسین نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے شاہدرہ کے قریب ایک کنواں کھُدوایا اور باغ لگوایا اور وصیّت کی "مجھے اسی باغ میں دفن کیا جائے۔ لیکن یہ میری عارضی تدفین ہوگی۔ کیونکہ میری وفات کے ایک سال بعد مادھو آئے گا اور وہ میرے جسدِ خاکی کو شاہدرہ سے نکال کر بابو پورے میں دفن کروائے۔ اور وہی میرا سجادہ نشین ہوگا۔

حضرت کی یہ پیشن گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ آپ کی تدفین کے کچھ عرصہ بعد شاہدرہ کا وہ علاقہ جہاں آپ مدفون تھے سیلاب کی وجہ سے زیرِ آب آگیا۔ اور اسی زمانے میں شیخ مادھو بھی دکن سے واپس لاہور آئے۔ تب حضرت کا مزار سیلاب کی وجہ سے بالکل گر چکا تھا۔ شیخ مادھو نے آپ کی قبر کھدوائی۔ آپ کا جسدِ خاکی بالکل محفوظ تھا۔ آپ نے میّت کو دوبارہ غسل دیا۔ کفن پہنایا اور نمازِ جنازہ پڑھوائی اور شیخ حسین کو محلہ بابو پورہ (باغبان پورہ) میں دفن کیا۔ وہیں آپ کا مقبرہ ہے۔ اس طرح حضرت کا فرمانا خُدا تعالیٰ نے برحق ثابت کیا۔

آپ کی وصیّت کے مطابق شیخ مادھو آپ کے سجادہ نشین بنے اور تقریباً پینتیس سال تک وہ مسند پر متمکن رہے۔ شیخ مادھو بھی اپنے مُرشد کی طرح بڑے بلند پایہ شاعر تھے۔

آپ کے دل پر مُرشد کی وفات نے ایسا اثر کیا کہ اکثر آپ حضرت شاہ حسین کی قبر سے لپٹ کر روتے رہتے اور یہ اشعار پڑھتے تھے۔

تو شدی با وصالِ حق ہمدم
مادھو را گزاشتی در غم
تو شدی از جہاں نباز و نعم
مادھو تو شدہ بدرد دو نیم

حضرت مادھو نے تہتر سال کی عُمر میں ۲۲ ذوالحج ۱۰۵۶ھ میں وفات پائی۔ اُن کے علاوہ شیخ حسین کے سولہ خلفاء ہو کر گزرے ہیں جن میں چار کو شاہ غریب، چار کو دیوان، چار کو خاکی اور چار کو بلاول کہا جاتا ہے۔

جس طرح زندگی میں حضرت شاہ حسین اور مادھو ایک دُوسرے کے جان و قالب تھے بعد وفات بھی قدرت نے انہیں اسی طرح پہلو بہ پہلو رکھا۔ حضرت کا مزار باغبان پورہ کے شمال میں واقع ہے۔ مزار کے اندر ایک چبوترے پر حضرت شاہ حسین اور شیخ مادھو کی قبریں ساتھ ساتھ ہیں۔ درمیان میں صرف زائرین کے چلنے کے لیے تھوڑی سی جگہ چھوڑی گئی ہے۔ بس اتنا سا ظاہری فاصلہ طالب و مطلوب میں ہے۔ مزار کے احاطے میں ایک مسجد اور ایک بُرج بھی ہے۔ اُس بُرج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نقشِ قدم یعنی "قدمِ رسُولؐ" نہایت تحریم کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ ایسا ہی ایک نقشِ قدم دہلی کی جامع مسجد میں بھی ہے۔

حضرت شاہ حسین ایک باکمال اور صاحبِ طریقت و حقیقت اولیاء اللہ تھے۔ آپ نے ۱۰۰۸ھ میں تریسٹھ سال کی عُمر میں وفات پائی۔ ہر سال بسنت کے موقع پر میلہ چراغاں کے نام سے ایک میلہ آپ کے مزار پر لگتا ہے۔ جو درحقیقت آپ کا عُرس ہوتا ہے۔ جس میں لوگ کثرت سے شرکت کرتے ہیں اور رات کو چراغاں بھی کیا جاتا ہے۔





حضرت سوالی حمید الدینؒ

حضرت بہاؤالدین زکریاؒ ملتانی کے صاحب زادے کو شیخ حمید الدینؒ سے سخت چڑ ہو گئی۔ ولی زادہ دراصل بزرگِ موصوف کے مقام و مراتب سے آگاہ و آشنا نہیں تھا۔ اُس نے اس مخالفت کو عمل کی شکل دینے کے لیے ایک منصوبہ بنایا اور ملتان سے ناگور جا پہنچا۔ حضرت ملتانیؒ کے فقر و استغنا اور علم و عرفان کی شہرت جہاں بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ اہلِ ناگور نے ولی زادے کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُن کی آؤ بھگت کی۔ ناگور کے علماء بھی حضرت ملتانی کے بیٹے سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ یہ وہ علماء تھے جو عناد کی حد تک حضرت شیخ حمید الدین سے بغض رکھتے تھے۔ حضرت ملتانی کے صاحبزادے نے اہلِ ناگور اور علمائے ناگور سے حضرت شیخ کا ذکر چھیڑا تو دبے دبے الفاظ میں علماء کے بیان کردہ اظہارِ خیال سے انہوں نے محسوس کیا یہ عالم لوگ درویش سے سخت نالاں ہیں۔ صاحب زادے کی منشا تو خود بھی حضرت کے خلاف محاذ آرائی کرنا تھی۔ اُس نے علماء کو اپنا ہم نوا پایا تو اُن کو بھی ہمراہ لے کر حضرت شیخؒ کے خلاف صف آراء ہونے کا پروگرام بنا لیا۔

علماء کو حضرت شیخؒ سے یہ کدورت تھی کہ وہ ان کی امامت میں نمازِ جمعہ نہیں پڑھتے اس کدورت کو جب حمایت ملی تو اسی مسئلہ یعنی نماز جمعہ علماء کی اقتدا میں نہ پڑھنے کے باعث

نزاع بنا لیا گیا اور طے کردہ پروگرام کے تحت حضرت ملتانیؒ کے صاحبزادے علماء کی ایک جماعت لے کر حضرت شیخ حمید الدینؒ کے کنج عافیت میں جا پہنچے۔ علماء کی یہ مجال کہاں تھی کہ درویش کا سامنا کر سکیں یہ تو ولی زادہ تھا جس کو اپنے جلیل القدر باپ کی ولایت پر ناز تھا جس کی آڑ میں وہ حضرت شیخ سے مقابلہ چاہتا تھا۔ حضرت کے پاس پہنچ کر علماء تو ایک طرف کھڑے ہو گئے اور ولی زادہ حضرت شیخؒ کے سامنے آیا اور بڑے زعم و تفاخر سے کہا۔ میں حضرت بہاؤ الدین زکریاؒ کا بیٹا ہوں اور آپ سے مل کر کچھ سوال و جواب کرنے کا خواہشمند ہوں۔

حضرت حمید الدینؒ نے دیکھا کہ ولی زادہ بزعم پدر میرے مقابل آیا ہے تو بڑے رسان سے فرمایا۔

"میاں صاحب زادے! افسوس کہ تو ایک کامل انسان کا فرزند ہو کر بھی علم و عرفان سے محروم ہے۔ کاش تو بھی اپنے باپ کی طرح ایک عارف انسان ہوتا۔"

ولی زادہ جو غصے کی آگ میں پہلے ہی جل رہا تھا بھڑک اٹھا اور بولا۔

"حضرت! آپ کو کیا معلوم ہے کہ کون علم و عرفان سے تہی ہے اور کون عالم و عارف ہے؟"

حضرت حمید الدین صاحب اوصاف لگا نہ تھے اُن کو ولی زادے کی باتیں گو اچھی نہ لگیں تاہم انہوں نے اُس کو صرف اتنا کہا۔ "اگر مجھے ملنا تھا تو اتنی فوج لانے کی کیا ضرورت تھی، اکیلے ہی آتے اور جو کچھ دریافت کرنا تھا کر لیتے۔"

ولی زادہ برہم ہوا اور بولا۔ "جناب! یہ وہ لوگ ہیں جو آپ کے علاقے کے اہل علم ہیں۔ جن کے علم سے آپ مستفیض نہیں ہوتے اور تو اور آپ تو ان کی اقتدا میں جمعہ کی نماز تک ادا نہیں کرتے۔ یہ لوگ مجھے اپنا راہنما بنا کر آپ سے سوال کرنے آئے ہیں کہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کیا خدا رسیدگی اسی کا نام ہے کہ اہل علم کی ناقدری کی جائے۔"

حضرت نے اعتراض سُنا تو فرمایا: "یہ درست بات ہے کہ میں اِن علماء کی امامت میں نماز جمعہ نہیں پڑھتا مگر ضروری نہیں کہ میں اس بات کا جواب تمہیں یا ان لوگوں کو دوں۔ یہ معاملہ میرے اور خدا کے درمیان ہے۔ اگر اس کا سوال خدا مجھ سے کرے گا تو اُسے میں اس کا جواب دوں گا اور خدا عالم غیب ہے جو دلوں کے بھید جانتا ہے وہ نہ تو مجھ سے اس بارے میں سوال کرے گا اور نہ ہی خفا ہو گا۔ اس لیے تم بھی اس چکر میں مت پڑو اور

اپنا راستہ ناپو۔"

ملتان سے محاذ آرائی کرنے کے لیے آنے والا ولی زادہ بھلا کس طرح خاموش رہ سکتا تھا ترکی بہ ترکی بولا۔

"دیکھئے بزرگ محترم! ہمارے سوال کا جواب دیجئے ورنہ آپ کو معلوم نہیں ہمارے عزائم آپ کی تمام ناموری اور عزت و جاہ کو خاک میں ملا دیں گے۔ آپ میدان سے بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔ ہمارے سوالوں کے جوابات دیے بغیر آپ کو چھٹکارا حاصل کرنا ممکن نہیں۔"

حضرت نے جواب دیا "اے نوجوان تو ملتان سے آیا ہے۔ ناگور کے حالات اور یہاں کے علماء کے بارے میں تو بے خبر ہے۔ امامت کی بھی کچھ شرائط ہوتی ہیں جو ان شرائط کو پورا نہیں کر سکتے اُن کے پیچھے نماز پڑھنا واجب نہیں۔ مجھے خدا نے علم عطا فرمایا ہے میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ امامت کے قابل ہیں یا نہیں تو اِن جھنجھٹوں میں نہ پڑ۔"

علماء کے جلوس کا میر ولی زادہ حضرت حمیدالدینؒ سے باقاعدہ اُلجھنے لگا اور اہلِ ناگور کو مخاطب کر کے بتانے لگا "عالموں سے متنفر و گریزاں رہنے والے یہ صاحب اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتے ہیں۔ یہ تو میرے والد سے جو دُنیا بھر میں اپنے زہد و رکوع اور معرفت و ریاضت کے باعث ایک بلند مقام رکھتے ہیں اُلجھتے رہتے ہیں۔" واقعہ دراصل یہ تھا کہ حضرت حمیدالدینؒ کو جب معلوم ہوا کہ حضرت ملتانیؒ صاحبِ کرامت و طریقت بھی ہیں اور دنیاوی مال و زر سے بھی مالا مال ہیں تو اس بات سے انہیں حیرت ہوئی کہ جس نے لباسِ تصوف پہن لیا ہو اس کے دل اور گھر میں مال و زر نے کیسے جگہ بنالی۔ انہی دنوں ناگور کا ایک سوداگر جو تلوں کی تجارت کرتا اور اکثر و بیشتر ملتان آتا جاتا رہتا تھا۔ اور ہر سفر کے آغاز سے پہلے حضرت حمیدالدینؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعائیں لیا کرتا ملتان روانہ ہونے والا تھا۔ حضرت حمیدالدینؒ نے اُس کو ایک خط حضرت ملتانیؒ کے نام لکھ کر دیا جس میں لکھا۔

"نصوص، احادیث اور مشائخ کا اس پر اجماع ہے کہ دنیا اور متاعِ دُنیا وصول الی اللہ میں آڑے آتی ہیں۔ مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ اس زمانے کے بعض مشائخ کے پاس دنیا کا کافی ساز و سامان موجود ہے اور اس کے باوجود اُس سے خوارق و کرامات کا ظہور بھی ہوتا ہے تو اس مکین کو اس پر بڑی حیرت ہوئی ہے۔ کیا اجماع ضدیں ممکن ہے؟ نور اور ظلمت یکجا نہیں رہ سکتے۔ حق اور باطل ایک ہی جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ آپ کے بارے میں تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ واصلانِ حق میں سے ہیں اور ساتھ ہی مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ

دنیا باری تعالیٰ کی مبغوض ہے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ جیسا بزرگ خدا کے اس دشمن کو دُور نہیں کرتا ؟"

خط بارگاہ ملتانیؒ میں پہنچا تو انہوں نے جواباً تحریر فرمایا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ دنیا کیا ہے ؟ اور اس کی کتنی مقدار میرے پاس ہو گی ؟ اور آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جس شخص کے پاس افسون ہو گا سانپ کے زہر سے اُس کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"

حضرت حمیدالدّینؒ کو اس جواب سے تشفیٔ کامل نہ ہوئی انہوں نے ایک مرتبہ پھر حضرت ملتانیؒ کی خدمت میں گزارش نامہ ارسال کیا اور عرض کی۔

"حضرت! اِس عاجز کو آپ کے جواب نے مطمئن نہیں کیا کیونکہ افسون کے باوجود سانپ کو پاس رکھنا اچھی بات نہیں ہے۔"

اس خط کا جواب یہ آیا۔" اے حمیدالدّین یاد رکھ! دُنیا ہاتھ میں ہو تو دوا ہے اور دل میں ہو تو درد ہے۔"

یہ نامہ و پیام کچھ عرصہ جاری رہے۔ اس سے نہ شیخ حمیدالدّینؒ کے دل میں حضرت ملتانیؒ کے مراتب کی کوئی کمی آئی اور نہ حضرت ملتانی کی پیشانی شکن آلود ہوئی۔ مگر حضرت ملتانیؒ کے صاحبزادے کے دل میں حضرت حمیدالدّین کے لیے نفرت پیدا ہو گئی اور درحقیقت اِسی نفرت کو بنیاد بنا کر وہ حضرت موصوف کے ساتھ مقابلہ آرا تھے۔ حضرت حمیدالدّینؒ کشف کے ذریعہ اصل معاملہ جانتے تھے اس لیے انہوں نے ولی زادے کی گستاخیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فرمایا۔

"بیٹے تم جانتے ہو کہ دو پہلوانوں کے درمیان تیسرے آنے والے کا کیا حال ہوتا ہے۔ اس لیے تم اپنے ارادوں سے باز رہو اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔"

مگر جوانی کا غصّہ اور خون کی گرمی ولی زادے کو چین نہ لینے دے رہی تھی وہ بڑھتا ہی چلا گیا اور علماء کی ایماء پر ناگور میں حضرت حمیدالدّینؒ کی شخصیت کو پست و بدنام کرنا شروع کر دیا۔ عزّت و ذلّت دینے والی خدا کی ذات ہے۔ بندہ اپنے طور پر یہ اعزاز نہ کسی کو دے سکتا ہے اور نہ ہی یہ طوق کسی کے گلے میں ڈالنے کی اسکی از خود ہمّت ہے، ولی زادہ بھی حضرت حمیدالدّین کو تو بدنام نہ کر سکا مگر اپنی عقبیٰ خراب کرنے کے درپے رہا۔

ایک روز حضرت نے اُس نوجوان ولی زادے کو بُلایا اور جلال کے انداز میں حکم دیا۔

"برخوردار! بہت ہوئی۔ اب تم ملتان واپس چلے جاؤ۔ تم نے جتنے دن مجھے پریشان رکھا ہے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ میں نے تمہیں درویشانہ قید میں ڈال رکھا ہے۔"

نوجوان ہنسا اور کہا۔ "یہ درویشانہ قید کیا ہوتی ہے؟ یہ جاہلوں کو ڈرانے والی باتیں بھلا مجھے مرعوب کر سکتی ہیں؟"

حضرت نے دکھ سے فرمایا۔ "کاش تم حضرت ملتانیؒ کے بیٹے نہ ہوتے۔ تو تمہیں گستاخی کی ایسی سزا دی جاتی کہ عمر بھر یاد رکھتے۔ مگر اب بھی یہ خاطر جمع رکھو کہ اس درویشانہ قید کے بارے میں تمہیں ایک نہ ایک روز ضرور پتہ چل جائے گا۔"

نوجوان کو خدا نے ہدایت دی اور کچھ عرصہ بعد ناگور سے واپس ملتان چلا گیا۔

حضرت حمید الدین کی وفات کے فوراً بعد ایک مرتبہ حضرت ملتانی کا یہی صاحب زادہ کسی کام کے سلسلے میں ملتان سے باہر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت ملتانیؒ وصال فرما چکے تھے اور جب یہ صاحب زادہ ملتان واپس آ رہا تھا تو اسکو ایک شری ڈاکو نے پکڑ لیا اور قید میں ڈال دیا۔ ڈاکو کو جب صاحبزادے نے بتایا کہ میں مشہورِ زمانہ اولیاء اللہ بہاؤالدین زکریاؒ کا فرزند دل بند ہوں۔ تو اُس نے متاثر ہونے کی بجائے ولی زادے کو کہا۔ "یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ تمہارے والد ایک ولی کامل ہونے کے علاوہ اہل ثروت بھی تھے۔ اُن کی جائیداد اور دولت سے تمہیں بھی ضرور حصہ ملا ہو گا۔ اس لیے تمہاری جان خلاصی کی ایک ہی صورت ہے کہ تم اپنی جائیداد اور دولت کا حصہ ملتان سے مجھے منگوا دو ورنہ تمہیں ساری عمر میری قید میں کاٹنا ہو گی۔"

ولی زادہ رضامند ہو گیا اور ایک پیامبر کے ہاتھ اپنے برادر کلاں حضرت صدر الدین عارف کو خط لکھا اور ڈاکو کا مدعا بیان کیا۔ حضرت صدر الدین عارف نے بھائی کا خط پڑھا اور اُسکے حصے کا مال اُس پیامبر کے حوالے کر دیا۔ ڈاکو نے مال زر وصول کر لیا مگر پھر بھی وعدے کے مطابق ولی زادے کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اور کہا۔

"میں تمہیں تب چھوڑوں گا جب تو اپنے بھائی کے حصے کی جائیداد سے بھی کچھ حصہ مجھے دلوا دے گا ورنہ تیری عمر میری قید میں ہی بسر ہو گی۔"

ولی زادہ پریشان ہوا کہ یہ تو خود غرضانہ بات ہے۔ میرے بھائی اپنے حصے کی جائیداد میں سے حصہ کیوں دینے لگے۔ مگر جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو اُس نے اپنی مجبوری بڑے بھائی کو لکھ بھیجی۔ بھائی نے بلا تامل اپنی جائیداد میں سے بھی کچھ حصہ روانہ کر دیا۔ ڈاکو کو مزید

دولت ملی تو اُس نے ولی زادے کو چھوڑ دیا۔ ابھی قید خانے سے صاحب زادہ نکلا ہی تھا کہ اُسے آواز آئی تُو نے جتنی مدت حضرت حمیدالدینؒ کو تنگ کیا تھا تجھے اتنے دن قید درویشانہ رکھا گیا ہے۔ اب لے اپنا اور اپنے بھائی کا مال واسباب اور یاد رکھ آئندہ کسی اہل اللہ سے مقابلہ نہ کرنا! صاحب زادے نے یہ غیبی آواز سُنی تو اُس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کو شدت سے احساس ہُوا کہ حضرت حمیدالدین کی گستاخی کرکے اُس نے کتنا ستم کیا ہے مگر اب حضرت کو کہاں تلاش کرتا وہ تو پردہ فرما گئے تھے۔

❀

یہ حمیدالدینؒ دراصل کوئی معمولی انسان نہ تھے بلکہ دنیائے طریقت میں حمیدالدینؒ سوالی کے نام سے مشہور و معروف رہے۔ آپ کا تعلق اجمیر کے قرب و جوار میں ایک مشہور قصبہ ناگور سے ہے۔ اِس علاقے میں اسلام کا نُور حضرت معین الدین چشتیؒ اجمیری کے توسط سے پہنچا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ یہاں عرب و عجم سے آئے ہوئے مسلمان بھی ـــــ آباد ہونے لگے ان ہجرت کرکے آنے والے مسلمانوں میں ایک نیک انسان کے ہاں حضرت حمیدالدین سوالیؒ پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب مختلف واسطوں سے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت سعید بن زید سے جا ملتا ہے۔ حضرت سعید بن زیدؓ کا شمار اُن دس صحابہ کبارؓ میں ہوتا ہے جنہیں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی زندگی میں ہی قطعی طور پر جنتی ہونے کی بشارت دے دی تھی۔ یہی سعید بن زیدؓ حضرت عمر بن خطابؓ کے بہنوئی تھے۔ انہی کے وسیلہ سے حضرت عمرؓ کو اسلام قبول کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ ربّ تعالیٰ کی شان ملاحظہ ہو کہ اسی خانوادے کا ایک فرد ناگور میں پیدا ہوا جس کی انسانی عظمت اور اسلام دوستی نے سارے ہندوستان میں اُسے ایسی شہرت ناموری اور عزت دی کہ جس کا تذکرہ رہتی دنیا تک قائم رہا۔

حضرت حمیدالدینؒ کی ابتدائی زندگی بھی عجیب وغریب تھی۔ آپ بڑے ہوتے ہی رنگ دنیا میں مست ہو گئے۔ دوستوں کا ایک لشکر ہر وقت آپ کے ساتھ ہوتا تھا۔ آپ خوشحال اور خوش فعال نوجوان تھے۔ نہ غم روزگار کی فکر نہ آخرت کا غم۔ شب و روز رنگیں اور خواہشاتِ نفسانی ہر دم ہر گھڑی آپ کی ہمراہ و ہم رکاب رہتی تھیں۔ جوانی میں مآل اندیشی کہاں ہوتی ہے۔ پُر لطف زندگی میں عقل و فہم کا کہاں گزر ہوتا ہے۔ آپ دن رات مزے مزے کی باتوں، دلچسپ حکایتوں اور حسینوں کے تذکروں میں گزار دیتے تھے۔ شاعری جس

میں جوانی کے ولولے اور امنگیں پنہاں ہوتی ہیں اس طرح پڑھی جاتی کہ پڑھنے سننے والوں پر کیف و مستی مینہ کی طرح برسنے لگتی۔

انہی شب و روز کی مستیوں میں سب دوستوں نے اپنے رسالدار حمیدالدین کو مشورہ دیا۔

"اے دوست یہ چند روزہ زندگی اگر بلا عیش کوشی اور حسرت زدہ رہ کر گزر گئی تو کیا فائدہ۔ اس کا صحیح لطف و مزہ اُٹھانے کے لیے دربارِ سرکار سے وابستگی ضروری ہے۔"

آپ نے اپنے دوست سے پوچھا۔ "اے عزیزِ من! ذرا یہ تو بتا! دربارِ سرکار سے وابستگی کے لیے تو دہلی جانا پڑے گا اور یہ مصائب آگیں سفر طے ہوگا۔"

دوسرے دوست نے عرض کی۔ "جناب! دربارِ سرکار اور دہلی جانے کی کیا ضرورت، فوج میں بھرتی ہو جائیے۔ علاقے فتح کیجئے۔ مالِ غنیمت میں آپ کو مال بھی ملے گا، زر بھی ملے گا اور شباب بھی ملے گا۔ یہ تینوں چیزیں ہوں گی تو زندگی شاداب و گلاب ہو جائے گی۔"

دو دوستوں کے مشورے سُن چکے تو حمیدالدین کو تیسرے دوست نے تصاویر کا دوسرا رُخ دکھایا کہ جنگ و جدل میں اگر مالِ غنیمت اور شباب ملتا ہے تو ان معرکوں میں جان بھی جاسکتی ہے! عیش کوشی کے حصول میں اگر جان چلی جائے تو پھر کیا فائدہ؟

ان رنگینیوں اور دوستوں کی پُرامید اور مایوسانہ باتوں نے حضرت کے دل میں عجیب سی کش مکش پیدا کر دی۔ یہی وہ وقت تھا جب آپ کی توجہ اسلام کی جانب مبذول ہوئی۔ آپ کو اسلام کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جن میں کہیں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی آواز تھی کہیں بابا فرید گنج شکرؒ کی آواز تھی۔ کہیں بہاؤالدین زکریاؒ کی آواز تھی اور ان سب آوازوں میں بلند آواز خواجگان کے سرتاج خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی آواز تھی۔ یہ اہلِ اللہ جو کچھ اپنی آواز میں بیان فرماتے تھے اِن سے متاثر نہ ہونا کسی کے بس میں نہ تھا۔ اسلام کی اور اولیاء اللہ کی اس آواز میں جو گہرائی تھی وہ لوگوں کے لیے باعث فکر تھی یہ آواز حضرت حمیدالدینؒ کے کان میں پڑی۔ آپ دل بھی رکھتے اور دماغ بھی۔ دیدۂ بینا نے آپ کو اجمیر جانے پر مجبور کیا۔ اجمیر جو ناگور کے قریب تھا۔ حمیدالدین حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کی خدمت میں پہنچے تو وہاں کے روح پرور منظر نے آپ کے دل میں ہلچل مچا دی۔ آپ کو دیکھتے ہی حضرت خواجہ نے پوچھا۔

"کہو! حمیدالدین آنے میں دیر لگا دی ہم کب سے آپ کے منتظر تھے۔"

حمیدالدین نے پوچھا۔ "حضرت! میں نے تو آج آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ ہماری تو آپس

میں کوئی جان پہچان بھی نہیں پھر میں نے آپ سے کوئی ایسا وعدہ بھی نہیں کیا تھا جس سے میری آمد کے انتظار کی آپ کو زحمت اٹھانا پڑی۔"

حضرت مسکرائے اور فرمایا "بھئی! تم سعید بن زیدؓ جیسی جلیل القدر ہستی کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہو اور تمہیں دنیا کی دلچسپیاں اور رنگینیاں مرغوب ہیں۔ ہم منتظر تھے کہ اس جلیل القدر خاندان کا فرد اس لہو و لعب سے کب متنفر ہوتا ہے اور کب ہماری طرف آتا ہے۔ تم آج یہاں آئے تو اس محفل کا رنگ دیکھنے ہو مگر ہم تمہیں یہاں سے اپنے رنگ میں رنگ کر بھیجیں گے۔ تم دربارِ سرکار میں اور فوج میں دنیاوی عیش و عشرت کے حصول کے لیے جانا چاہتے ہو، لیکن ہم تمہیں دربار سرکار کی بجائے اس دربار میں لے جانا چاہتے ہیں لیکن ہم تمہیں دربار سرکار کی بجائے اس دربار میں لے جانا چاہتے ہیں جو دنیا کے سب درباروں سے بڑا دربار ہے جس کی عطا کا کوئی جود و سخا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہم تمہارے اُن دوستوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حمید الدین کی منزل وہ نہیں جس کی طرف وہ لوگ تمہیں لے کر جانا چاہتے ہیں بلکہ تمہاری منزل تو وہ ہے جس کی طرف تمہاری انگلی تھام کر ہم چلیں گے۔"

حمید الدین نے حضرت معین الدین کی باتیں سنیں تو عرض کی "حضرت! میں حیران ہوں کہ آپ کو میرے اور میرے دوستوں کے اس ارادے کا علم کیسے ہو گیا۔ یہ باتیں تو ہم نے اپنی محافل میں طے کیں تھیں آپ تک کیونکر پہنچ گئیں۔"

حضرت خواجہ نے فرمایا "حمید الدینؒ! تمہیں تمہارے دوستوں کی محفل سے یہاں کون لایا ہے۔ ہم تمہیں لانے والے کا نام بتاتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے اور اسی نے ہمیں تمہارے سارے پروگرامات کی خبر گیری کی ہے۔ یاد رکھو جو تزکیۂ نفس اور مجاہدوں میں زندگی بسر کرتا ہے اور دنیا کی نفی کرتا ہے دنیا اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور جو دنیا کے پیچھے دوڑتا ہے دنیا اُس کے کبھی ہاتھ نہیں آتی۔ اور یہ نفس کا تزکیہ اور مجاہدے ہی انسان کو خدا رسیدگی کے مراتب عطا فرماتے ہیں تو بھی خدا رسیدگی کی طرف قدم بڑھا دنیا بھی تیری غلام بن جائے گی اور عقبیٰ پر بھی تیرا راج ہو گا۔

حمید الدینؒ حیران کھڑے ہیں شہنشاہِ چشتؒ اپنی گفتار کے موتی برسا رہے ہیں عرض کی حضرت! میں آپ کی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا میں دنیا دار ہوں۔ مجھے سمجھائیے میری تربیت کیجئے۔"

حضرت نے فرمایا: "حمیدالدین دنیا اور اس کے معاملات کو سمجھنے کے دو طریقے ہیں یا تو اُس کو عقل و آگہی سے سمجھا جا سکتا ہے یا پھر وجدان و عشق سے اس تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ عقل کی تعلیم جو کچھ بتاتی ہے اُس کی صداقت پر یقین کامل کرنا مشکل ہے اور عشق و وجدان سے جو حاصل ہوتا ہے وہ صداقت عین ہوتا ہے اور عشق و وجدان کے لیے تمہیں تربیت کی ضرورت ہے اور پھر یہ تربیت تمہارے اندر عشق و وجدان اور تزکیہ نفس کے اوصاف پیدا کرے گی اور پھر تمام راہیں ایسی روشن ہو جائیں گی کہ دنیا اور عقبیٰ کے تمام پردے تمہاری نگاہوں کے سامنے سے اُٹھ جائیں گے۔ تم بس ایک وعدہ کرو کہ یہاں پابندی سے آیا کرو گے۔"

حمیدالدین نے اُس روز سے یہ معمول بنا لیا کہ روزانہ بغیر کسی پس و پیش کے حضرت خواجہؒ کی درگاہ میں حاضر ہو جاتے۔ آپ کے دوستوں کو معلوم ہوا تو اُن کے سارے پروگراموں پر اوس پڑ گئی۔ انہوں نے آپ کو بہت سمجھایا اور دنیا کی دلکشی کی طرف راغب کرنا چاہا مگر آپ کی تو کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ جب دوست محبت سے معاملات حل نہ کر سکے پھر انہوں نے سختی سے کام لینا شروع کر دیا۔ یہ معاملہ جب آپ نے حضرت خواجہ کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے فرمایا۔

"حمیدالدین! اپنے دوستوں سے کہو کہ مدتیں گزریں میں نے کسی سے ایک عہد کیا تھا مگر میں اس عہد کو بھول گیا تھا۔ اب کسی کے یاد دلانے سے وہ عہد مجھے یاد آ چکا ہے اس لیے میں کوشش کر رہا ہوں کہ اپنے عہد کو پورا کروں۔"

حضرت کے حکم کے مطابق حمیدالدین نے اپنے دوستوں سے وہی کچھ کہا۔ دوست حیران ہوئے اور پوچھا۔

"اے دوست عزیز! بتاؤ کہ وہ کون سا ایسا عہد ہے اور یہ عہد کس سے کیا گیا تھا۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں ہمارے تمہارے تمام دوست مشترک ہیں تم کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو ذرا بتاؤ تو سہی اس سارے قصے کے پیچھے اصل حقیقت کیا ہے؟"

دوستوں کی باتیں سن کر آپ نے انہیں تسلی دی اور کہا۔ "دوستو! میری باتیں بالکل واضح ہیں۔ جہاں تک عہد اور عہد والے کا تعلق ہے تو وہ ہم سب کا مشترکہ دوست ہے۔"

دوستوں نے حمیدالدین کا تمسخر اُڑایا اور کہا: "اچھا دوست تمہارا خدا حافظ تم دراصل اُن لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے ہو جنہیں دنیا راس نہیں آئی۔ وہ خرقہ پوش جو دنیاوی حیثیت سے محروم ہیں اور جو عرف عام میں دنیا سے بیزار کہلاتے ہیں۔"

آپ کو دوستوں کی باتیں ناگوار گزریں مگر آپ نے اُن کو کچھ نہ کہا اور واپس حضرت خواجہ اجمیریؒ کی صحبت صالح میں آ گئے۔ وہ صحبت جہاں دل منوّر اور دماغ روشن ہو جاتے ہیں۔ جہاں خود شناسی اور عرفان و فقر کی باتیں ہوتی تھیں۔ جہاں زمین و آسمان اور دونوں جہاں کے اسرار و رموز کے تذکرے ہوتے تھے جہاں حضرت حمید الدّین کو بتایا گیا کہ انسان کو دنیاوی عہدے اور مناصب حاصل ہو جائیں تو یہ فخر کی نہیں فکر کی بات ہے۔ خدا رسیدہ لوگوں کو جو استغنا اور طمانیت حاصل ہے دنیا دار اُس سے بالکل محروم ہیں۔ یہ محفل پاک کا اعجاز و سرور تھا کہ جناب حمید الدّین روحانیت و معرفت کے رنگ میں رنگے گئے اور طریقت کی سرور و مستی نے اُن کو دنیا سے بیگانہ اور خدا کا دیوانہ کر دیا۔

ایک مرتبہ حضرت خواجہ اجمیریؒ نے فرمایا۔

"حمید الدّین! اپنی دُنیا میں لوٹ جاؤ اور کسی ایسے آدمی کو تلاش کرو جو سود و زیاں سے مبرّا۔ قانع اور بے فکرا ہو۔"

اپنے پیشوا کے حکم کی تعمیل کے لیے انسانوں کے ہجوم میں حمید الدینؒ مذکورہ اوصاف کے آدمی کو تلاش کرنے نکل گئے۔ بڑی تلاش کے بعد ایک آدمی آپ کو ملا جو مفلوک الحال تھا۔ جس نے دولت و ثروت کو کبھی اپنے پاس نہیں آنے دیا تھا۔ آپ نے اُس سے پوچھا۔ "اے شخص تمہاری گزر بسر کیسے ہو رہی ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "گزر تو ہو رہی ہے مگر میں یہ نہیں جانتا کہ کیسے ہو رہی ہے۔ خدا جب مجھے مہربانیوں سے نوازتا ہے تو میں اس کا شکریہ ادا کر لیتا ہوں اور جب اُس کی مہربانیوں سے محروم ہوتا ہوں تو اُس سے شکوہ نہیں کرتا۔"

حمید الدّینؒ اُس آدمی کے متعلق جملہ حقائق لے کر حضرت اجمیریؒ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کی۔ "حضرت! فلاں شخص ایسا ہے جو آپ کے معیار کے مطابق ہے۔"

آپ نے سُنا تو فرمایا۔ "حمید الدّین تم ابھی ایسا شخص تلاش نہیں کر سکے جس کے اوصاف میں نے تمہیں بتائے تھے جس شخص کا قصہ تم بیان کر رہے ہو یہ تو جاہل انسان ہے وہ کہتا ہے کہ اگر اس کو مل جائے تو وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور نہ ملے تو شکوہ نہیں کرتا۔ اس کو یہ پتہ ہی نہیں کہ اس کو کیا چیز نہیں ملی اُس نے اگر صرف اپنی صحت اور جسمانی اعضا کی تکمیل پر ہی غور کیا ہوتا تو وہ خدا کا شکر کرتا نہ تھکتا۔ ایسا شخص نہ بے فکرا ہو سکتا ہے نہ قانع ہو سکتا

——— ہے اور نہ ہی مودو زباں سے مبرّا ہو سکتا ہے۔ جاؤ پھر تلاش کرو۔"

حضرت حمید الدّین ایک مدّت تک اس تلاش میں مصروف رہے۔ مگر وہ کوئی ایسا شخص تلاش نہ کر سکے جو حضرت اجمیریؒ کے بیان کردہ اوصاف کا حامل ہو۔ آپ واپس آئے اور عرض کی "حضرت میں مایوس ہو چکا ہوں مجھے ایسا شخص کہیں نہیں ملتا۔"

حضرت خواجہ نے فرمایا۔ "حمید الدّین ایسی صفات والا شخص تمہیں صرف فقرا، صوفیا، اور درویشوں میں ملے گا۔ یہ لوگ وہ ہیں جو دُنیا میں رہتے ہیں مگر دنیا سے لاتعلق ہیں۔ یہ خدا کے صابر و شاکر قانع اور پُراسرار بندے خدائی اوصاف رکھنے والے ہوتے ہیں۔ یہ خدا سے اس کی رضا کے سوا کچھ طلب نہیں کرتے۔"

یہ سُننا تھا کہ حضرت حمید الدّینؒ کے دل سے دنیا کی محبّت بالکل محو ہو گئی اُن کی نس نس اور رگ و پے میں خدا کی محبّت گردش کرنے لگی۔ پھر آپ کی زندگی حضرت اجمیری کے دربار سے ایسی وابستہ ہوئی کہ آپ نے اپنا اوڑھنا بچھونا ہی اسی محفل کو بنا لیا۔

ایک مرتبہ حضرت اجمیریؒ نے اپنے مریدوں سے فرمایا "جس کو بھی کوئی حاجت ہے وہ کھڑا ہو کر بیان کرے اس کی خواہش فی الفور پوری ہو جائے گی کیونکہ خدا کا درِ اجابت اس وقت کھلا ہے۔ بہت سے لوگ کھڑے ہوئے۔ کسی کو دولت کی تمنّا تھی کسی کو کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا تھی۔ کسی کو دُشمن کی بربادی کرنا تھی۔ غرض ہر شخص نے اپنی اپنی خواہشات و حاجات بیان کیں اور ان کی اجابت و منظوری اللہ پاک نے اُسی وقت فرما دی۔ اُسی محفل میں حضرت قطب الدّین بختیار کاکیؒ بھی تشریف فرما تھے۔ اُن سے پوچھا گیا کہ انہیں بھی کوئی تمنّا ہو تو بیان کریں۔

انہوں نے عرض کی "حضرت! میں کیا مانگوں۔ بندے کو تو مانگنے تک کا اختیار نہیں دیا گیا۔ اگر آپ کچھ ارشاد کریں تو میں وہی مانگ لوں گا ورنہ میں نے اپنے معاملات خدا کے سپرد کر رکھے ہیں۔"

پھر حضرت اجمیریؒ نے حمید الدّین سے پوچھا۔ "حمید الدّین کہو تمہیں کوئی حاجت نہیں؟"

"عرض کی حضرت! میں کیا مانگوں؟ مجھے مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔ خدا نے پہلے ہی اپنے بندے کو اتنا کچھ دے رکھا ہے کہ اُس سے دوبارہ مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

یہ سُننا تھا کہ حضرت سلطان الخواجگان نے فرمایا "لوگو! تم نے سُنا حمید الدّین کیا کہہ

رہے ہیں۔ یہ حمید الدینؒ آج سے صوفی۔ تارک الدنیا اور مستغنیٔ آخرت اور سلطان العارفین ہیں۔" حضرت کی زبان سے حمید الدین کے مقام کی بلندی کا جب لوگوں نے سُنا تو سب لوگ حیران رہ گئے۔ رنگینیٔ دنیا اور لعو ولعب کے پیچھے بھاگنے والے حمید الدین کو خدا نے کتنا مقام عطا فرمایا ہے۔

❦

حضرت حمید الدین کی علمیت اور فقر کے چرچے زبان زدِ عام تھے۔ آپ کے وجدان اور کشف و کرامات کا زمانہ معترف تھا۔ آپ کی روشن ضمیری اور ذہن رسا کی وجہ سے لوگوں کا ہر وقت آپ کی خدمت میں میلہ لگا رہتا تھا۔ ایک روز آپ کی مجلس سجی ہوئی تھی لوگوں کا بڑا ہجوم آپ کے اِردگرد موجود تھا لوگ آپ سے مختلف سوال کر رہے اور آپ اُن کے کامل اور دلنشین جوابات دے رہے تھے۔

ایک شخص نے پوچھا "اللہ کی مدد کب اور کس طرح مل سکتی ہے!

فرمایا! "یہ مدد جس کے لیے مقرر کر دی گئی ہے۔ اسے مقررہ وقت اور غیر متوقع انداز میں حاصل ہو جاتی ہے اور اس کا تقرر اور تعین انہی لوگوں کے لیے ہوتا ہے جو جسم و قلب سے اس کے متمنّی اور خواہش مند ہوتے ہیں۔

اسی طرح ایک پیراں سال آدمی نے سوال کیا۔

ایک ارادت مند نے پوچھا "حضرت! یہ بہشت اور دوزخ کیا ہیں؟"

آپ نے جواباً فرمایا "تمہارے اعمال۔ اللہ نے قرآنِ پاک میں فرمایا ہے (جو شخص ذرّہ برابر نیکی کرے گا وہ اُس کو دیکھ لے گا اور اسی طرح جو شخص ذرّہ برابر بُرائی کرے گا اُس کو بھی وہ دیکھ لے گا۔) اگر کسی نے اس دنیا میں نیکی کی ہے قیامت کے دن اس کی نیکی کو جنّت کی شکل میں پیش کیا جائے اور اگر کسی نے دنیا میں بُرائی کی ہو گی تو اُس کو بھیانک صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہی دوزخ ہے۔"

آپ کا معمول تھا کہ آپ لوگوں کے سوالات کے جواب اُن کی منشا و استعداد کے مطابق دیا کرتے تھے۔ آپ کو ان سوالات کی نسبت سے ہی حمید الدین سوالیؒ کے نام سے پکارا جانے لگا۔

❦

آپ کے پاس نصف بیگھہ زمین تھی۔ عبادت و ریاضت کے علاوہ آپ اُس زمین کی

آج بھی اچھا ، کل بھی اچھا
ہر گھر کا فائدہ ، ہر دُکاندار کا فائدہ!

عمدہ مہک قیمت میں کم لیکن کام میں کہیں بہتر صابن

101



بہترین کوالٹی کا صابن

اپنے قریبی دکاندار سے طلب کریں۔

دربار سوپ ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ ایس آئی ٹی ای ۔ کراچی ۱۶

ان شہروں میں جہاں ہمارا صابن دستیاب نہیں ایجنسی کیلئے لکھیں

marksman

DSWL-12-85

کاشت سے رزق حلال اور کسب کمال حاصل کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حاکم ناگور نے آپ کی خدمت میں کچھ زرِ نقد پیش کیا۔ آپ نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ "اے نیک بخت! حاکم ناگور ہماری مالی امداد کرنا چاہتا ہے کیا قبول کر لی جائے۔ کیونکہ میرا لباس بھی بالکل بوسیدہ اور پرانا ہو چکا ہے اور تمہارے لیے بھی نئے لباس کی ضرورت ہے۔"

بیوی نے عرض کیا۔

"کیا آپ پسند کریں گے کہ ہم درویشی کو چند سکوں پر قربان کر دیں۔ آپ مطمئن رہیں خدا ہمارے لباس کا انتظام کر دے گا ہمیں حاکم کی امداد کی کوئی ضرورت نہیں۔"

آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ "اے نیک بخت میں تو تیرا امتحان لے رہا تھا ورنہ مجھے تو حاکم کی امداد کی کوئی حاجت نہیں۔" آپ نے حاکم کو شکریے کے ساتھ امداد لوٹا دی۔

ایک مرتبہ حضرت اپنے خدام کے ہمراہ بازار سے گزر رہے تھے کہ راستے میں ایک بوڑھا ہندو آپ کو ملا آپ اُس کا ضرورت سے زیادہ احترام بجا لائے۔ مریدوں نے عرض کی "حضرت! اس دین کے دشمن کا آپ نے ایسا احترام کیوں کیا ہے۔"

آپ نے فرمایا "تم نہیں جانتے میں جانتا ہوں۔ یہ شخص عنقریب بہت بڑا مرتبہ حاصل کرنے والا ہے۔" مرید خاموش ہو گئے۔ اس واقعہ سے چند روز کے بعد وہ بوڑھا ہندو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "حضرت مجھے مسلمان کر لیجئے کیونکہ میرا وقت آخر قریب آگیا ہے۔ میں عمر بھر اسلام کا داعی رہا ہوں مگر اپنی قوم اور قبیلے سے ڈرتا رہا اب میں دنیا سے جانے والا ہوں مجھے اب کسی کا ڈر اور پرواہ نہیں۔"

آپ نے اُسے غسل کروایا۔ لباس تبدیل کروایا اور کلمہ طیبہ پڑھایا۔ اسی حالت میں اُس شخص کا انتقال ہو گیا۔ یہ حضرت کی عظمت کا اعجاز تھا کہ وہ آمدہ حالات کے بارے میں بذریعہ کشف باخبر ہو جاتے تھے۔

حضرت حمید الدین سوالیؒ نے حضرت خواجگانِ چشت سے طریقت و حقیقت کی تعلیم حاصل کر کے دنیائے معرفت میں اپنا نام ایک ولیٔ کامل کے طور پر روشن کیا۔ آپ کی زندگی ہر پہلو سے درخشندہ اور قابلِ تقلید تھی۔ آپ کی سنِ پیدائش کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے کہیں ذکر نہیں تاہم آپ ۲۹ ربیع الثانی ۶۷۳ھ میں واصلِ حق ہوئے اور اُس جماعت میں شامل ہو گئے جس کو عاشقانِ رسولؐ اور محبوبانِ حق کی جماعت کہا جاتا ہے۔



حضرت سخی سیدن شاہ

المعروف چوا سیدن شاہ

چُوا (جنڈیال) ضلع چکوال کی سرزمین کے پیاسے ذرّے اور خشک لب ایک مدّت سے پانی جیسی نعمتِ عظمیٰ سے محروم تھے۔ لوگوں کو دُور دراز کے چشموں سے پانی لانا پڑتا تھا۔ یہ چشمے موضع امرکنڈ جس کا موجودہ نام کٹاس ہے، میں تھے جن پر متعصب ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ وہ مُسلمانوں کو پانی دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ ان ہندوؤں نے بالکل اُس یہودی جیسا رویّہ اختیار کر رکھا تھا جو مدینہ میں مسلمانوں کو پانی قیمتاً دیتا تھا اور اپنی مرضی سے دیتا تھا۔ چُوا کی بے آب و گیاہ وادی کے پیاسے مکیں اور باسی ایک وفد کی شکل میں حضرت سخی سیدن شاہ شیرازیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کی "حضرت! موضع امرکنڈ (کٹاس) میں پانی کے وافر ذخیرے اور چشمے موجود ہیں لیکن وہاں سے پانی کا حصول مشکل ہے وہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ کیونکہ اس بستی میں اُن کے مندر اور دیگر مقدّس مقامات و قلعہ ہیں۔ لہٰذا وہاں جا کر اُن سے پانی کا تقاضا کرنا مُشکل ہے۔" آپ ہماری رہبری اور دستگیری فرمائیں اور اُن متعصبانہ ذہنیت رکھنے والے ہندوؤں سے ہمیں پانی لے کر دیں۔"

حضرت سخی سیدن شاہؒ کی طبیعت موج میں تھی لوگوں کو ساتھ لیا اور کٹاس کی طرف چل پڑے۔ وہاں جا کر ہندوؤں کو بڑے رسان و محبّت سے فرمایا "پانی خُدا کی دی ہوئی نعمت ہے۔ اس پر اُس کی ساری مخلوق کا مساوی حق ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ربّ العالمین ہے۔ اُس کی نعمتیں عنایتیں

اور مہربانیاں ہر شخص کے لیے یکساں ہیں۔"

ہندوؤں نے حضرت کی باتوں پر کوئی توجہ اور غور کیے بغیر پانی دینے سے انکار کر دیا۔ آپ نے جلال میں آکر فرمایا "اچھا تو تم پانی دینے سے انکاری ہو تو میں پانی لیے جاتا ہوں روک سکتے ہو تو روک لو۔ ایک اور بات بھی کان کھول کر سُن لو وہ وقت آنے والا ہے جب یہ تمہارے معبد و مندر اور قلعے سب ویران ہو جائیں گے۔" یہ فرما کر حضرت نے چشمے میں اپنا عصا رکھا اور پانی کو لکیر کی شکل میں کھینچتے ہوئے سوتے چُوا روانہ ہوئے۔ راستے میں میدان بھی آئے۔ پہاڑ بھی آئے۔ وادیاں بھی آئیں مگر پانی موجوں کی شکل میں حضرت کے پیچھے کسی معمول کی طرح چلتا ہوا چُوا سیدن کی سرزمین کو سیراب کرنے کے لیے آگیا۔ وہ دن اور آج کا دن پانی اُسی روانی اور جولانی کے ساتھ چشمے کی شکل میں چُوا سیدن شاہ کی سرزمین کو سرسبز و شاداب اور گلاب بنا رہا ہے۔ زمانہ شاہد ہے جنڈیال (چُوا) کی بنجر اور لق دق زمین آج زرخیز اور رنگ پور کا خطّہ بن چکی ہے۔ چُوا پنجابی میں چشمہ کو کہتے ہیں یہی وجہ ہے تب جنڈیال کا نام چُوا رکھ دیا گیا۔

حضرت سیدن شاہؒ کا سن ولادت کسی کتاب و تذکرہ میں حتمی طور پر تحریر نہیں تاہم آپ کی ولادت کے سات صدیوں قبل ہونے پر کامل اتفاق رائے کیا گیا ہے۔ آپ کے سوانح و افکار کے لیے اگرچہ قلم و قرطاس استعمال میں نہیں لائے گئے۔ ذرائع ابلاغ اور حاوی کوششوں کے بغیر بھی خُدا کے کامل ولی نے صدیوں سے جو شہرت، ناموری اور نیک نامی حاصل کر رکھی ہے وہ آپ کی ولایت و عرفان کا ہی حصّہ ہے۔

شیراز (ایران) میں آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے نیک نہاد اور کامل صوفی والد کے زیر سایہ حاصل کی۔ والد نے آپ کو سن شعور میں آنے سے پہلے ہی علم قرآن و حدیث اور فقہ میں یکتا ناز کر دیا۔ آپ نے علوم ظاہری کے علاوہ مقامی زبانوں اور علاقائی زبانوں میں بھی دستگاہ حاصل کر لی۔ جب آپ جوان ہوئے تو خُدا نے آپ کو حکم دیا "سیدن شاہؒ! اپنے خاندان، والدین اور ساتھیوں کو لے کر سفر اختیار کر اور ہندوستان کے ایک گمنام پہاڑی علاقے میں اپنا ٹھکانہ بنا اور ایک بے آب و گیاہ، خشک و بنجر علاقے پر ابرِ رحمت کی گھٹا بن کر برس اور جنڈیال (چُوا) کو حیات جاوداں بخش۔" حضرت سخی سیدن شاہؒ جو مادر زاد ولی تھے جنھوں نے ظاہری تعلیم تو مدین سے حاصل کی تھی مگر باطنی تعلیم اور معرفت و عرفان کے ادراک براہِ راست خُدا سے حاصل کیے۔ خُدا کے حکم کے سامنے سرتابی کیسے کر سکتے تھے۔ والدین سے خُدا کے حکم کا تذکرہ کیا عظیم بیٹے کے عظیم والدین نے بلا تامل رختِ سفر باصفا۔ یوں ایک مختصر سا قافلہ اپنی

ف کرے گا۔
کے مسلمان تھے۔ ایسے لوگوں کی زند
ا ہے۔ اپنی شخصیت کی چمک دمک اور اعجاز
ں ہے۔

حضرت سیدن شاہؒ نے ابتداء میں حضورؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ
ں کی بکریاں اور مال و مویشی اُجرت پر چرانے کا کسب کمال کرنے
ے رزقِ حلال کما کر اپنا اور اپنے لواحقین کا پیٹ پالتے دوسرے اس
آپ کی اجنبیت بھی رفتہ رفتہ تمام ہوتی گئی۔

آپ کا معمول تھا آپ گاؤں سے لوگوں کے مال و مویشی ہانکتے جنگل میں
کو کھلے میدانوں میں آزاد چھوڑ کر فرماتے "اے مویشیو! میں خُدا کے حوالے
ں، تم اپنا رزق تلاش کر کے اپنا پیٹ بھر لو جب تک میں خدا کی راہ میں سجد
بندگی ادا کرتا ہوں۔" مویشی اپنے رکھوالے اور چرواہے کی بات سُن لیتے اور ز
کہتے "اے ہمارے راعی تو کوئی عام راعی نہیں، تیری رعایا تیرا مقام ولایت جا
س کے حضور حق بندگی ادا کر رہا ہے وہ ہمارا بھی رب ہے ہم بھی اُس کی عبادت ف
۔ وہ روزی رساں ہیں وہ خود بخود ہمارے رزق کا انتظام کر دے گا لہذا جس طر
بادت کرے گا اسی طرح ہم بھی اس خالق مالک کے سامنے سربسجود ہوں گے۔"
حضرت سیدن شاہؒ تو مویشیوں سے غافل و بیگانہ ہو کر خدا کی عبادت میں مشغول ہو

ان جانوروں اور اِن کے چرواہے
ور وَں والوں سے کہا۔
سارے جانور بمعہ چرواہے کے جنگل میں مُردہ حالت میں پڑے
وں لاٹھیاں اٹھائے جنگل کی طرف دوڑ پڑا۔ حضرت سیدن شاہؒ
سارے معاملے کی خبر کر دی۔ آپ نے سجدے سے سر اٹھایا
خُدا کی عبادت میں اسی طرح مشغول ہیں جس طرح اُن کا راعی ورکھوا
نتا نے جانوروں کو بالکل نہ چھیڑا اور خود بھی دوبارہ عبادت بھی مصروف
تمام لوگ جنگل میں پہنچ گئے اور بلند آواز سے حضرت کو پکارا۔ آپ نے
ک کی اور لوگوں کی طرف دیکھا اور پوچھا "کہو! کیا بات ہے یہ ڈانگ سوٹے
لیے اُٹھالاتے ہو۔"
بولے "یہ ہمارے جانوروں کو کس نے مارا ہے۔" آپ نے فرمایا "انھیں کون مار سکتا
بخیریت ہیں۔ انھیں صرف اور صرف وہی مار سکتا ہے جو ان کا خالق ہے۔"
ں نے پھر کہا "پھر یہ اس طرح مُردہ حالت میں کیوں پڑے ہیں۔"
ت سیدن شاہؒ نے فرمایا "بے وقوفو! یہ زندہ ہیں لو دیکھو۔"
ب نے جانوروں کو پکارا اور فرمایا "خُدا کا نام لے کر اُٹھو۔" سب کے سب جانور ایک
ے ہو گئے۔

ناآشنا اور نادیدہ منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ مدتوں آپ لوگوں نے سفر کیا۔ راستوں کے پیچ وخم، صعوبت راہ پر پریشانیاں اور غریب الوطنی کے مارے رنج وغم اور مصائب جھیلے۔ کابل اور درہ خیبر کے راستے ضلع چکوال کے ایک دُور افتادہ گاؤں جنڈیال (چُوا) میں وارد ہوتے۔ سفر تمام ہوا مگر منزل پر پہنچنے سے پہلے آپ اپنے پدری سے محروم ہو چکے تھے۔ آپ کے والد ماجد پیراں سالی اور ضعیفی کی بدولت دورانِ سفر موگلہ کے مقام پر داعی اجل کو لبیک کہہ کر آپ کو داغِ مفارقت دے گئے۔ آپ چند ساتھیوں نحیف وضعیف ماں کو لے کر جنڈیال (چُوا) پہنچے۔

حضرت سیدن شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا بحرِ بیکراں تھے۔ آپ کو علومِ قرآن اور علوم
رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کے یگانہ اور بے پناہ عشق تھا۔ اسی لیے آپ نے اپنی
جملہ ذہنی و روحانی اور [redacted] اُمّتِ محمدیؐ کی خدمت اور دینِ اسلام کی
اور نتھے لوگ جن میں اکثر غیر مسلم تھے اور جو مسلم
کو انقلاب آفرین بنانا کوئی آسان کا
[redacted]
نتِ شا

جبکہ دوسری طرف تمام مویشی بھی اُن کی تقلید میں زمین پر سجدہ کی حالت میں گر کر عبادت شروع کر دیتے تھے۔ حضرت سیدن شاہؒ مویشیوں کے اس طرزِ عمل سے قطعاً لاعلم اور بے خبر تھے۔ وہ تو شام تک عبادت میں غرق رہتے اور شام کو مویشیوں کو ہانکتے ہوئے اُن کے مالکان کے گھروں میں لاکر چھوڑ دیتے۔ اس دوران ایک قابلِ ذکر تبدیلی یہ ہوئی کہ تمام کے تمام مویشی فربہ صحت مند ہو گئے۔ اور دُودھ دینے والے جانوروں کی دُودھ دینے کی شرح بہت زیادہ ہو گئی۔

اسی طرح زندگی گزر رہی تھی لوگ حضرت سیدن شاہؒ کے ہدایت سے ناآشنا اُن سے راعی کا کام لے رہے تھے۔ ایک دن حسبِ معمول جنگل میں ایک طرف حضرت خُدا کے ذکر عبادت میں مشغول تھے اور دوسری طرف مویشی بھی اپنے مالک کی یاد و عبادت میں محو و ریز تھے کہ جنڈیال کے ایک آدمی کا اُدھر سے گزر ہوا۔ نافہم شخص نے جانور کو سجدے کی حالت میں گرے ہوتے دیکھا تو حضرت سیدن شاہؒ کو جانور چرانے پر ڈھیری بنے خُدا کو یاد کر رہے تھے۔ اُس نے [redacted] چلا گیا ہے۔ وہ بھاگا بھاگا گاؤں آیا

اہلِ جنڈیال جو غُصّے سے بھرے ہوتے جنگل میں آتے تھے حیران اور انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے۔ پوچھا "حضرت! یہ کیا ماجرا ہے؟"

حضرت سیدن شاہؒ نے فرمایا "کوئی خاص بات نہیں ہر مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے خالق و معبود کی بندگی و عبادت کرے۔ میں ان کے سامنے اپنے رازق و خالق کی بندگی کرتا ہوں۔ یہ جانور بھی میری تقلید کرتے ہیں۔ میری طرح سارا دن عبادت میں غرق رہتے ہیں عبادت کے دوران اِن کی حالت مردوں جیسی ہو جاتی ہے۔ مگر خُدا اپنی قدرتِ کاملہ سے ان کے اجسام کے اندر رزق پہنچاتا رہتا ہے۔"

لوگوں نے حضرت سیدن شاہؒ کی باتیں سُنیں تو دنگ رہ گئے۔ وہ تو حضرت کو محض ایک چرواہا اور راعی سمجھتے تھے لیکن اُن کے سامنے تو ایک چرواہے کے رُوپ میں ایک ماہرِ روحانیت اور ولایت کا ہلالِ کامل کھڑا تھا۔ سارے لوگ حضرت کے قدموں میں بیٹھ گئے اور معافیاں مانگنے لگے "حضرت! ہم تو آپ کے مقام سے نابلد رہے۔ ہمارے قلب و اذہان پر مہر لگی ہوئی تھی۔ ہماری کور چشمی تھی کہ ہم آپ کی پہچان و شناخت نہ کر سکے۔ آپ ہمیں معاف فرمادیں۔"

حضرت نے سب لوگوں کو مخاطب ہو کر فرمایا "لوگو! تم سب کو خُدا نے پیدا کیا ہے تمہیں اپنی بے شمار نعمتوں سے مالا مال کیا ہے۔ تمہارے دلوں کے اندر محبّت جیسا جذبہ پیدا کیا ہے۔ اس لیے تم پر فرض ہے تم خُدا کی عبادت کرو۔ اُس کے ساتھ اور اس کی مخلوق کے ساتھ محبّت کرو۔"

حضرت سخی سیدن شاہؒ ایک عظیم، جلیل، رُوحانی اور علمی شخصیت تھے۔ اپنے زہد و تقویٰ اور پرہیز گاری، دینی و مذہبی خدمات و معاملات میں یدِ الٰہی رکھنے کی بدولت آپ ہر دلعزیز تھے۔ آپ جو پہلے صرف ایک راعی تھے اب ایک رعایا کے بے تاج شہنشاہ تھے۔ آپ کی خدمت میں سارا سارا دن لوگوں کے ٹھٹھ لگے رہتے تھے۔ ہر کوئی آتا اور روحانیت و طریقت کے جامِ شیریں نوشِ جان کرتا۔

حُسن عموماً دو اقسام کا ہوتا ہے یعنی جسمانی اور روحانی۔ حضرت سخی سیدن شاہؒ کی شخصیت دونوں قسم کے حُسن سے مزّین تھی۔ آپ کی آنکھوں میں روحانیت کی ایک خاص چمک تھی جو دیدنی تھی۔ آپ ایک ستودہ صفات اور جامع خصوصیات ہستی تھے۔ آپ جب اپنی مجلس میں درس و تدریس دیتے تھے تو آپ کا اندازِ خطیبانہ آتشِ دلنشیں ہوتا کہ آپ کے کلام پر ہر دل یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ آپ کو بھاری بھر کم بات بھی ہلکے پھلکے انداز میں بیان کرنے

کرنے کا ملکہ حاصل تھا۔

آپ کے فیضانِ علم و معرفت سے لاکھوں افرادِ ملت سیراب ہوتے۔ علم روحانیت و طریقت میں آپ سے تلمذ رکھنے والوں کی تعداد بے شمار ہے۔ آپ کی پوری زندگی عشقِ رسولؐ و محبتِ الٰہی اور اطاعت و اتباع کا عملی پیکر بنی رہی۔ آپ کی طبیعت سادہ مگر باوقار تھی۔ آپ اپنی باتوں اور محبتوں سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتے تھے۔ آپ ایک سچے اور کھرے باعمل مومن کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ آپ کی پاکیزہ زندگی سے بلا مبالغہ ہزاروں طالبانِ حق کے سینے نورِ ایمان سے منور ہوتے۔ آپ گفتار و کردار کے غازی تھے۔ آپ کی گفتار و کردار اور نشست و برخاست۔ منکسر المزاجی۔ تواضع اور غفور حلم میں قرونِ اولیٰ کے درخشاں چہروں کا عکسِ جمیل ضوفشاں تھا۔

جب چُوا میں حضرت سیدن شاہؒ کا نورِ روحانیت پھیلا تو اس کی روشنی صرف اسی علاقہ تک محدود نہ رہی۔ یہ مبداء فیض دُور دراز کے لوگوں کے لیے بھی نجات کا باعث بن گیا۔ آپ کے دربار میں شاہ گدا، رُدسا اور امرا بھی حاضریاں دینے لگے۔ ایک روز حضرت سیدن شاہؒ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کی محفل میں بیٹھے شرابِ شریعت کے خُم لُنڈھا رہے تھے کہ کشمیری حاکم جو لشکری سُلطان کے نام سے مشہور تھا۔ اپنے سالاروں، جرنیلوں اور کثیر سپاہ کے ہمراہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ سے دُعا اور نصیحت کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا "اے بادشاہ! تجھ سے بڑا بھی ایک بادشاہ ہے جو درحقیقت سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ اُس نے تمہیں اپنی زمین پر اپنی مخلوق کے لیے ایک امین بنایا ہے تیرا فرض ہے تو پہلے حقِ بندگی ادا کرے۔ پھر حقِ مخلوق ادا کرے۔ لوگوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے معاملے میں خُدا سے ڈرتا رہے کیونکہ یہ حکومت، یہ جاہ و جلال اور تزک و احتشام تیرا امتحان ہے اس میں کامیابی، کامرانی اور سرخروئی تمہیں تب نصیب ہوگی جب تو خُدا کے احکام کی پابندی، دینِ مصطفویؐ کی پیروی اور قوانینِ اسلام کی پاسداری کرے گا۔ یہ دُنیا عارضی ہے۔ یہ حکومت ثانوی ہے۔ یہ اقتدار و اختیار چند روزہ ہے۔ اس لیے اپنا وقت استغفار میں گزارو اور اگر تم خُدا سے ڈرتے رہو گے، خشیتِ الٰہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لو گے تو تمہارے لیے یہ دُنیا بھی راحت و آرام کا مسکن بن جائے گی اور آنے والی زندگی میں بھی تمہیں خُدا تعالیٰ اپنی نوازشات و عنایات سے ہمکنار کر دے گا۔"

لشکری سلطان پر آپ کی رُوح پرور باتوں کا ایسا اثر ہوا کہ اُس نے اپنے تخت و تاج کو اپنے مصاحبین کے حوالے کیا اور خود مردِ فقر و فاقہ بن کر حضرت سیدن شاہؒ کی خدمت میں بقیہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا ــــ اُس کے شب و روز عبادت و ریاضت میں گزرنے لگے۔ اب خُدا کی قدرت ملاحظہ ہو کہ نازک اندام بادشاہ جس کے دن رات راحت و سکون، اعلیٰ ایوانوں میں گزرتے تھے جس کی خوراک مختلف انواع کے کھانوں پر مشتمل ہوتی تھی اُس کو سوکھی روٹی کھا کر اور پانی پی کر جب دن رات عبادت کرنی پڑی تو وہ چند روز کے اندر ہی بیمار ہو کر بستر پر لگ گیا۔ چُوا کا پانی اُس کو راس نہ آیا اور وہ دردِ شکم سے ایسی بچھاڑیں کھا کر گر پڑتا تھا کہ دیکھنے والے بھی تڑپ کر رہ جاتے تھے مگر وہ اپنی اس حالتِ زار اور بیماری کو حضرت سیدن شاہؒ سے مخفی رکھنا چاہتا تھا مگر نگاہِ ولایت سے کون سی چیز مخفی رہ سکتی ہے۔ ایکدن حضرت نے سلطان کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔

"بادشاہ فقیری اختیار کر کے پچھتا رہے ہو"

عرض کی "حضرت! ہرگز نہیں۔ اس فقیری میں تو وہ سکون ہے امیری جس سے یکسر تہی دست ہے"

پھر تمہاری صحت کیوں گرتی جا رہی ہے" حضرت نے استفسار فرمایا۔

عرض کی "حضرت شاید یہاں کا پانی اس عاجز کو راس نہیں آیا" حضرت سیدن شاہ کو خُدا نے بصیرت والی آنکھ اور دیدۂ بینا عطا فرماتے تھے۔ آپ کو خُدا نے کشف کے ذریعہ بتا دیا کہ سلطان کشمیر کے ٹھنڈے اور میٹھے چشموں کا پانی پینے کا عادی ہے۔ اسی لیے یہاں کا پانی اس کے لیے مضرِ صحت ثابت ہوا ہے۔ آپ نے اپنی خانقاہ کے احاطے میں زمین پر اپنا عصا مارا۔ خُدا نے اپنی رحمت اور فضل کیا اور اسی وقت زمین سے ایک چشمہ اُبل پڑا جس کا پانی میٹھا شیریں اور ٹھنڈا تھا۔ وہ پانی جب بادشاہ نے پیا تو اس کے سارے عوارض جاتے رہے۔ یہ چشمہ جس کا پانی شیریں اور ٹھنڈا ہے آج بھی حضرت کے مزار کے احاطے میں موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان لشکری چونکہ کشمیر کا پانی پینے کا عادی تھا چنانچہ اللہ پاک نے ایک مردِ کامل کی التجا و دُعا پر زیرِ زمین یہ پانی کشمیر سے چُوا بھیجا جو حضرت کی خانقاہ کے اندر ایک چشمے کی شکل میں نکلا۔ سلطان لشکری نے جب میٹھے چشمے کا پانی پیا تو اس کی پیٹ درد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ پھر اس نے ساری زندگی حضرت کی خدمت میں عبادات و ریاضت میں مشغول رہ کر گزار دی۔ حتیٰ کہ اُس کی موت بھی حضرت کے قدموں میں ہوئی اور اس کا

مزار حضرت سیدن شاہؒ کے مزار کے پہلو میں آج بھی لائقِ دید ہے۔

حضرت سیدن شاہؒ نے بے شمار غیر مسلموں کو مسلمان کیا اور نام کے بے شمار مسلمانوں کو اسلام کی سچی راہ اور حقانیت سے روشناس کیا۔ آپ کے عقیدت مندوں اور مریدوں کا شمار کرنا مشکل ہے۔ آپ کی ذات پشت پہلو ہیرے کی مانند تھی جس کی روشنی نے ظلمت کدوں کو جگمگا کے رکھ دیا۔

آپ کے سینے میں علوم و معارف کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر تھا۔ آپ کے دل میں محبتِ الٰہی اور عشقِ مصطفوی کی فروزاں قندیل روشن تھی۔ آپ کی سب سے بڑی بات آپ کا بے مثال تقویٰ تھا۔ ہر شخص کے لیے آپ کی نظر باعثِ شفقت اطمینان تھی۔ آپ بلاشبہ ان برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جن سے شرفِ انسانیت اور اعتبارِ دنیا قائم اور دائم ہے۔

حضرت سیدن شاہؒ کریم النفس شخصیت تھے۔ آپ کو ہمیشہ گمنامی پسند تھی آپ خدا سے دعا کرتے تھے "اے مولا کریم! میں شہرت و تشہیر کا خواہاں نہیں میں اپنے ذکر کو لوگوں کی زبان پر پھیلتا دیکھنے کی بجائے تیری خوشنودی چاہتا ہوں۔ تو مجھے اپنا بنالے اور یہ دوری کا تصور معدوم ہو جائے۔"

اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمالی۔ اور باوجود لاتعداد خلفاء جانشین اور گدی نشین ہونے کے حضرت کی سوانح حیات اور تواریخ ولادت و وفات حتمی اور حقیقی شکل میں کہیں نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ جن کو اپنا بنالیتا ہے تو اُن کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ اُن کو دنیا میں وہ عزت دیتا ہے کہ اُن کی شخصیت رہتی دنیا تک لائقِ تقلید ہو جاتی ہے۔

حضرت سیدن شاہؒ ہمالہ روحانیت تھے۔ آپ کے وصال کے بعد بھی آپ کی شخصیت کے اعجاز و کرامت رونما ہوتے رہے۔ جن دنوں سکھوں کی حکومت تھی ان دنوں کا ایک واقعہ ہے "سکھ اپنی برتری کے زعم پر مسلمانوں پر بڑے بڑے ظلم ڈھایا کرتے تھے اور ان کی عبادت اور مذہبی مقامات کی بے حرمتی کرنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ سکھوں میں ایک رواج ہے کہ وہ بکرا مسلمانوں کی طرح ذبح کرنے کی بجائے جھٹکا دیتے ہیں اور تلوار سے بکرے کی گردن اتار کے رکھ دیتے ہیں۔ کسی مسلمان عالم نے ایک دفعہ رسم جھٹکا کے خلاف بات کی تو سکھوں کا ایک سرکردہ حاکم اپنے غرور و تفاخر کے نشے میں چور ہو کر ایک بکرا لے کر حضرت سخی سیدن شاہؒ کی درگاہ پر آگیا اور کہنے لگا۔ مسلمانوں کے اس ولی جس کو صاحبِ کرامت کہا جاتا ہے میں اس کے مزار پر بکرے کا جھٹکا کرتا ہوں۔ اور دیکھتا ہوں یہ ولیِ کامل مجھے کیسے روکتا ہے۔ تماشا لگ

گیا۔ سکھ تماشائیوں کی شکل میں کھڑے مسلمانوں کی بے بسی کا مذاق اڑا رہے تھے۔ مسلمان بے بس کھڑے کسی کرامت و معجزے کے منتظر تھے۔ غیرتِ خُدا جوش میں آئی اس نے مسلمانوں کو کہا "مسلمانو! یاد کرو جب میرے گھر کعبہ کو تباہ کرنے والا مغرور بادشاہ ابرا ہہ یمن سے مکّے آیا تھا تو میں نے اپنی ایک مخلوق ابابیل سے اس کو نیست و نابود کر دیا تھا آج تم بے بس ہو تو کیا ہوا میں اس سکھ کو اس کے ہاتھ سے ہی فی النار کرتا ہوں۔" چنانچہ سکھ حاکم نے تلوار فضا میں تین مرتبہ لہرائی اور مسلمانوں پر طنز کے تیر برساتے اور کہا "بلاؤ اپنے اولیاء کو وہ مجھے روکے۔" مسلمان خاموش کھڑے رہے۔ تین مرتبہ تلوار لہرانے کے بعد چوتھی مرتبہ سکھ حاکم نے زور سے تلوار کا وار بکرے پر کیا۔ تلوار بکرے کی گردن پر لگی مگر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بکرے کی گردن اُترنے کی بجائے سکھ حاکم کا سر تن سے جُدا ہو کر دُور جا گرا۔ سکھ کا وجودِ کاملہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے ایک نمرود نما اور فرعون صفت سکھ کو اس کے انجام تک پہنچا کر اپنے نیک، صالح اور صاحبِ ولایت و عرفان پیارے بندے کے مزار کی حرمت کی حفاظت فرمائی اور یہ ثابت کر دیا جو خُدا کے ہو جاتے ہیں خُدا ان کا ہو جاتا ہے اور جب کسی کا خُدا ہو جاتا ہے تو پھر وہ اپنے پیاروں کے عزّت و ناموس پر انگشت نمائی کرنے والوں کو ہمیشہ کے لیے بے نشان کر دیتا ہے۔

حضرت سخی سیدن شاہؒ کے مزار پر خُدا کی رحمت کی برسات کا نزول آج بھی اُسی طرح ہے جس طرح زمانۂ رفتہ میں تھا۔ اکثر اولیاء یکتا فن ہوتے ہیں۔ یعنی کسی کو علمِ قرآن و حدیث میں عبور حاصل ہوتا ہے اور وہ دیگر علوم میں واجبی سا علم رکھتے ہیں اسی طرح کوئی فقہ میں عبور رکھتا ہے تو کوئی روحانیت میں صاحبِ مقام ہوتا ہے۔ لیکن حضرت سخی سیدن شاہؒ کی ذات والا صفات بیک وقت ہمہ پہلو تھی۔ ہر میدان میں آپ یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ اور آپ وسیع القلب، بالغ نظر اور دُور اندیش بزرگ تھے۔

انگریزوں کے زمانے کا ایک واقعہ ہے جو آپ کے وصال کے بعد پیش آیا تھا۔ چند ملزموں کو سزائے موت سنوانے کے لیے عدالت میں لے جایا جا رہا تھا۔ ملزموں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ عدالت میں پیش کرنے سے پہلے وہ حضرت سخی سیدنؒ کے مزار پر حاضری دینا چاہتے ہیں چنانچہ ان کی اس خواہش کی تکمیل کی اجازت دے دی گئی۔ ملزمان چونکہ بے گناہ تھے چنانچہ

جب وہ مزار میں داخل ہوتے تو انھوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اچانک خُدا کی قدرت سے اُن کی ہتھ کڑیاں ٹوٹ کر زمین پر جا گریں۔ بعد میں سپاہیوں کی باوجود کوشش سے بھی اُن ملزموں کو ہتھ کڑیاں نہ لگ سکیں۔ ناچار انھیں بغیر ہتھ کڑیوں کے ہی عدالت میں پیش کیا گیا۔ جب عدالت میں سپاہیوں نے مزار پر پیش آنے والا واقعہ بیان کیا تو انگریز جج نے چشمِ حیرت سے ملزموں کی طرف دیکھا۔ دوبارہ مقدمے کی ساری تحقیقات و کارروائی کی گئی اور ملزموں کو بے گناہ ہونے کی وجہ سے بَری کر دیا۔

حضرت سخی سیدن شاہؒ کے وصال کے بعد اس مزار کی انتظامیہ میں ایک گدّی نشین شخص جو کہ ناچ و گانے کے دلدادہ تھے، انھوں نے حضرت کی تعلیمات کو غلط رنگ دے کر لوگوں میں یہ بات مشہور کر دی کہ حضرت سیدن شاہؒ طوائفوں کے ناچ گانوں کے شوقین تھے اور یوں ایک عرصہ تک آپ کے عرس پر رنگ و بو اور رقص و سرود کی محافل جمنے لگیں لیکن جہالت کی یہ روش زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مردِ کامل کو اس بے حیائی اور بے راہ روی کی بیخ کنی کے لیے روانہ کیا۔ اور یوں حاجی غلام احمد المعروف باوا جی نے ایک عظیم تحریک کے نتیجے میں حضرت سخی سیدنؒ کے عرس کو طوائفی رنگ سے پاک کیا۔ اس نیکی کی جنگ میں لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور سرکاری اور حکومتی سطح پر ان محافل نشاط و طرب پر ہمیشہ کے لیے پابندی لگا دی گئی۔ جو حضرت سیدن شاہؒ کے مزار پر عُرس کے موقع پر زیرِ عمل آتی تھیں۔

حضرت سیدن شاہؒ ایک کامل بزرگ تھے۔ آپ اپنی زندگی میں فرمایا کرتے تھے "چُوا سیدن شاہؒ کے چہار اطراف بزرگوں کے ایسے گوشۂ عافیت ہوں گے کہ وہ حضرات میرے مزار کے چاروں طرف پہرہ داروں کی حیثیت اختیار کر لیں گے۔" آپ کا فرمانا برحق ہے کیونکہ ولی کی زبان خُدا کا فرمان ہوتا ہے۔ آپ کے مزار کے مشرق میں نور شاہ غازیؒ کا مزار ہے۔ اور مغرب میں شاہ مشرف بخاری استراحت فرما رہے ہیں۔ شمال کی جانب گھٹالی والی سرکارؒ کا مزارِ رحمت موجود ہے جبکہ جنوب میں چنبے والی سرکار حق اور حق پرست کے پہریداروں کے طور پر آج بھی مرجع خاص و عام ہیں۔

حضرت سیدن شاہؒ کی تاریخِ وصال کے بارے میں کوئی تحریری معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ تاہم چیت کی پہلی جمعرات کو آپ کا عُرس بڑے ہی تزک و احتشام سے منایا جاتا ہے۔ لوگ آپ کے دربار پر حاضر ہو کر سائل مراد سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

شیخ منیر کا شرف الدین رح

ساتویں صدی ہجری میں ایک مسلمان خاندان بھارت میں منیر نامی قصبے میں آباد تھا۔ اس خاندان نے تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں شاندار کارنامے سرانجام دیے۔ اس خاندان کا نسب نامہ عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف تک جا پہنچتا ہے جس وجہ سے یہ خاندان روحانی اور علمی اعتبار سے بہت اعلیٰ منصب پر فائز تھا۔ قصبہ منیر کی وجہ سے یہ لوگ منیری کہلاتے تھے اور انہی لوگوں کی وجہ سے اس قصبے میں اسلام کا نور پھیلا۔

۲۶ شعبان ۶۶۱ھ کو اس خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام شرف الدین رکھا گیا۔ اس کے والد کا نام شیخ یحییٰ تھا۔ شیخ یحییٰ کے ایک اور بیٹے بھی تھے جن کا نام جلال الدین احمد تھا۔ یہ مشہور خاندان عرب کے سادات کی ایک شاخ سے متعلق تھا اور زہد و تقویٰ میں مثالی تھا۔

شیخ یحییٰ کے چھوٹے بیٹے شرف الدین احمد ابھی سن شعور میں داخل بھی نہ ہونے پائے تھے کہ اپنے والدین کی خاص توجہ کے مستحق قرار پائے۔ باپ کو نامعلوم اُن میں کیا نظر آیا کہ اُن کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دینے لگے۔ ان دنوں منیر قصبہ میں کوئی ایسا لائق اور مہتم عالم موجود نہ تھا جو شرف الدین احمد کو علم سے بہرہ مند کر سکتا۔ اس لیے شرف الدین کے والد نے سُنار نامی گاؤں میں موجود عالمِ دین ابو توامہ کو شرف الدین کی تعلیم دینی کے لیے

منتخب کیا۔

یہی شرف الدین احمد آگے چل کر علم کے سمندر بنے۔ آپ دینی مسائل کے اندھیرے میں ایک روشن چراغ تھے۔ زہد و تقویٰ میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اتنا علم حاصل کرنے کے باوجود آپ کو ہمیشہ تشنگی ہی محسوس ہوتی رہی۔ آپ ایک پیرِ کامل اور مردِ خدا ثابت ہوئے۔

بہرکیف شیخ یحییٰ، شرف الدین کو ابوتوامہ کے پاس لے گئے اور وہاں پہنچ کر ابوتوامہ سے نہایت ادب سے عرض کی۔" حضرت یہ میرا فرزندِ ارجمند ہے، آپ اس کی علمی تشنگی دور فرمائیں گے؛ گویا یہ آج سے میرا نہیں آپ کا فرزند ہو گا۔" ابوتوامہ کہنے لگے، شیخ! آپ نے تو میرا دل خوش کر دیا، کیا گوہرِ نایاب لائے ہیں آپ۔ مجھے تو اس کے وجود سے مسرور کن اور پُر لطف خوشبو سی محسوس ہو رہی ہے۔"

شیخ یحییٰ نے اپنے بیٹے کی تعریفیں سُنیں تو بے حد خوش ہوئے اور اپنے بیٹے کو نصیحتیں کرنے لگے۔" دیکھ میرے بیٹے ابھی تُو بچہ ہے اور یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ایک باپ اور ایک استاد میں کیا فرق ہوتا ہے۔ جب تُو بڑا ہو جائے گا تو خود بخود تیری سمجھ میں باپ اور استاد کا فرق آجائے گا۔ باپ پیدا کرتا ہے مگر استاد اس کو نکھارتا، سنوارتا اور آراستہ کرتا ہے۔"

معصوم بچہ اپنے باپ کی یہ پُر معانی باتیں سمجھ سکا یا نہیں یہ کسی کو معلوم نہ ہوا مگر بعد کے حالات نے یہ بتا دیا کہ یہ بچہ اپنے ذہن میں غیر معمولی سمجھ لے کر آیا تھا۔

استاد نے شرف الدین میں جذب و سوز پہلے ہی محسوس کر لیا تھا اور اسی جذب و سوز کی وجہ سے شرف الدین ریاضت اور مجاہدے میں زیادہ مشغول رہنے لگے۔ حالانکہ نوجوانی میں زہد و تقویٰ اختیار کرنا تقریباً بہت ہی مشکل اور کٹھن کام ہے مگر شرف الدین نے نہ صرف زہد و تقویٰ کو اختیار کئے رکھا بلکہ ہمیشہ اس سے لطف اندوز بھی ہوئے۔ آپ نے اپنے اُستاد کے گھر میں اُن سے قرآن پاک کی تفسیر، حدیث، فقہ، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی اور ایک گھر کے فرد کی طرح اپنے استاد کے یہاں رہے۔

آپ کے اُستادِ گرامی نہایت متقی اور پرہیز گار تھے جس کی وجہ سے یہ خصوصیات آپ میں بھی در آئی تھیں۔ ابوتوامہ کی ایک صاحبزادی بھی تھیں جو اپنے والد کی طرح پرہیز گار تھیں۔ ابوتوامہ کو شرف الدین سے بہتر اُن کے لیے کوئی بَر نہیں مل سکتا تھا اس لیے انھوں

نے ایک دن اشارے کنائے سے شرف الدین سے کہا " اگر تم چاہو تو زندگی بھر اسی گھر میں رہ سکتے ہو۔"

شیخ شرف الدین نے پوچھا " وہ کس طرح جناب ؟"

ابوتوامہ نے جواب دیا " آج میں سُنتِ رسولؐ اللہ پوری کرتے ہوئے تم سے اپنی بیٹی کے رشتے کی بات کر رہا ہوں۔"

شرف الدّین نے عُذر پیش کیا کہ میں والدین کی غیر موجودگی میں یہ کام کس طرح سرانجام دے سکتا ہوں اور وہ بھی اُن کی اجازت کے بغیر ؟

ابوتوامہ کہنے لگے " ارے میں کب یہ تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم یہ کام اُن کی غیر موجودگی میں کرو بلکہ میں تو اُن کو مطلع کروں گا۔"

شرف الدین کہنے لگے " ٹھیک ہے مگر اُن کی اجازت لینے کے لیے میں خود آپ کے ساتھ چلوں گا اور آپکے سامنے اس کام کے لیے اجازت طلب کروں گا۔"

ابوتوامہ اور شرف الدین ابھی منیر جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ شیخ یحییٰ خود ہی تشریف لے آئے اور جب اُن کو اس بات کا علم ہوا کہ اُن کا بیٹا اپنے استاد کی صاحبزادی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو انھوں نے بے دھڑک اس کے لیے اجازت دے دی۔ چنانچہ والد کی موجودگی اور رضامندی کے ساتھ شرف الدین کی شادی اُن کے استاد کی بیٹی سے ہو گئی۔

اس طرح آپ عرصۂ دراز تک اپنے اُستاد اور سُسر کے ہاں رہے۔

ایک دفعہ ایک گھڑسوار سُنار گاؤں میں آیا اور لوگوں سے پُوچھا " یہاں کے مشہور عالمِ دین ابوتوامہ کا گھر کدھر ہے ؟"

لوگوں نے جب ابوتوامہ کے گھر کا پتہ بتایا تو وہ گھڑسوار فوراً وہاں پہنچا اور شرف الدین سے ملاقات کی۔ اُس نے کہا " حضرت ! میں آپ کے لیے ایک بہت بُری خبر لایا ہوں۔" آپ نے فرمایا " اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ ہاں اب بتا، تُو میرے لیے کون سی منحوس خبر لایا ہے۔"

سوار نے عرض کی " حضرت ! کل رات آپ کے والد واصلِ بحق ہو گئے۔" یہ کہہ کر سوار خاموش ہو گیا اور واپس روانہ ہو گیا۔

یہ خبر سُن کر آپ بہت پریشان اور غمزدہ ہوئے۔ اس سے پہلے آپ نے زندگی میں کبھی اتنا بڑا غم نہیں دیکھا تھا۔ آپ اپنی بیوی کے پاس آئے اور اُس کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بیوی نے جواب دیا " میں نے کب انکار کیا ہے میں چلوں گی اور آپ سے یہ نہیں

پوچھوں گی کہ آپ یہاں سے کیوں جا رہے ہیں ؟"

چنانچہ آپ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر پٹنہ کے قصبے منیر پہنچے۔ وہاں پر آپ کی والدہ اور بڑے بھائی بہت سوگوار تھے۔ مرحوم باپ کی آخری رسوم ادا کی جا چکی تھیں۔ ماں نے بیٹے سے کہا۔" شرف الدین! تیرے باپ نے آخری وقت میں تجھے بہت یاد کیا تھا۔"

شرف الدین کہنے لگے۔" ہاں ماں، خدا انھیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے مجھے بھی اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ مَیں آخری وقت میں اُن کے سامنے موجود نہ تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب میں کیا کروں ؟"

بڑے بھائی جلال الدین نے کہا،" شرف الدین! اگر تم یہاں موجود بھی ہوتے تو کیا کر لیتے یہ سفر تو ہر ایک کے لیے لازماً آنا ہے اس لیے اس کا ملال ہی کیوں ؟"

شرف الدین نے جواب دیا۔" ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے مگر ہمیں جو اس جگہ بھیجا گیا ہے اس کا بھی تو کوئی مقصد یا جواز ہو گا۔"

ماں نے کہا۔" اس کا مقصد اور جواز یہ ہے کہ ہم کسی حال میں بھی خدا کو نہ بھولیں اور ہر حال میں اُس کا شکر ادا کرتے رہیں اور اُس کے احسان کو ہر حال میں یاد رکھیں۔ شرف الدین نے ماں کی یہ بات سُنی تو اُن کی حالت عجیب سی ہو گئی۔ کہنے لگے" کیا فرمایا آپ نے ؟ کسی حال میں بھی خدا کو نہیں بھولنا چاہیئے۔ آپ نے یہ فرما کر مجھے اُس معاہدے کی یاد دلا دی ہے۔ جو روزِ اوّل ہم نے اپنے ربّ سے کیا تھا۔" پھر اُن کی زبان پر اس طرح الفاظ آئے جیسے وہ کسی حاضر و موجود سے کہہ رہے ہوں۔" مَیں تجھ کو کسی حال میں بھی نہیں بھول سکتا۔ مَیں تجھے یاد رکھوں گا کبھی نہیں بھولوں گا۔ یا ربّ مَیں شرمسار ہوں کہ مَیں اب تک کن خیالوں میں گم تھا جو تیری طرف رجوع نہ کیا۔"

آپ کی بیوی جو اُس وقت وہیں موجود تھیں آپ کی یہ حالت دیکھ کر حیران ہوئیں۔ شرف الدین پھر فرمانے لگے" بہر حال جو دن بے خبری اور غفلت میں گزر گئے سو گزر گئے مگر اب مَیں باقی دنوں اور لمحوں کو کار آمد بنانا چاہتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے آپ ایک طرف کو چلنے لگے مگر بیوی نے آپ کا راستہ روک دیا اور کہا۔" آپ کہیں نہیں جائیں گے مَیں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی آپ اسی گھر میں رہیں گے۔" شرف الدین خاموش کھڑے رہے مگر بیوی سے نہ رہا گیا کہنے لگی۔" آپ مجھ سے بھی تو کہئے، کچھ مجھے بھی تو بتایئے، آپ کیا چاہتے ہیں ؟"

آپ نے جواب دیا: "اے شریف خاتون! میں تجھ کو وہ عہد یاد دلاتا ہوں جو ہم نے روزِ اوّل اپنے خدا سے کیا تھا۔ اس دن اللہ نے ہم سے پوچھا تھا۔ کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ پھر ہم نے جواب دیا تھا۔ بیشک تُو ہمارا ربّ ہے۔ جب ہم نے اُس کی ربوبیّت اور الٰہیّت کا روزِ اوّل ہی اقرار کر لیا تھا تو اب ہمیں اُس کا عملی ثبوت فراہم کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے اعمال اور افعال سے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ہم اپنے ربّ کو پورے خشوع و خضوع سے مانتے ہیں۔ ہم اس کی نافرمانی نہیں کریں گے اور اسی کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں گے۔

بیوی نے پوچھا: "تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ چاہو تو اسی گھر میں میری ماں کے ساتھ رہو اور اللہ کو یاد کرتی رہو لیکن اگر یہاں رہنے میں کوئی عذر ہو تو اپنے باپ کے گھر جا سکتی ہو اور وہاں اپنے ربّ کی یاد میں زندگی گزارو۔"

بیوی نے سوگوار لہجے میں کہا "جنابِ والا! آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں یہاں آپ کی والدہ کے پاس بھی رہوں اور سُنار گاؤں اپنے باپ کے پاس بھی رہوں۔"

آپ نے جواب دیا "ٹھیک ہے، میری طرف سے اجازت ہے۔"

شرف الدین کی والدہ، جو یہ سب گفتگو سُن رہی تھیں، نے اپنی بہو کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اور کہنے لگیں۔ "بہو! مجھے اپنے بیٹے کے اِس فیصلے کا بہت پہلے ہی علم ہو چکا تھا کہ شرف الدین بڑا ہو کر صُوفی بنے گا اس کے بہت سے ارادت مند ہوں گے اور اس کے علم اور روحانیت کا ایک عالم معترف ہوگا۔"

شرف الدین کی بیوی نے یہ سُنا تو اُس نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے شوہر کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائے گی اس لیے وہ شرف الدین کی والدہ کے پاس ہی ٹھہر گئی اور اپنے شوہر سے کوئی مزید سوال نہ کیا۔

راج گڑھ کا پہاڑی علاقہ نزدیک ہی تھا جہاں کے غاروں اور چٹانوں کے مشقت سلسلوں میں خدا کے متلاشی اور اس راہ میں عبادت و ریاضت کرنے والے اپنی زندگیاں گزار دیتے تھے۔ چنانچہ شرف الدین کو بھی عبادت و ریاضت کے لیے یہی جگہ پسند آئی۔

گھر کا ایک ملازم بھی تھا جس کا نام فتوحا تھا۔ جب شرف الدین اس پہاڑی علاقے کی طرف کسی ایک غار میں قیام کرنے کے لیے روانہ ہوگئے تو آپ کی والدہ نے فتوحا کو

حکم دیا کہ شرف الدین کے پیچھے جا اور یہ دیکھ کر آ کہ وہ کس غار میں قیام کرتے ہیں۔

فتوحا نے حکم کی تعمیل کی اور شرف الدین کے پیچھے پیچھے چل دیا حتیٰ کہ اُس نے وہ غار دیکھ لی جس کو آپ نے عبادت کی غرض سے چُنا تھا۔

اگلے دن ماں نے اپنے بیٹے کے لیے کھانا تیار کیا اور فتوحا سے کہا "تُو نے شرف الدین کا ٹھکانہ دیکھ لیا ہے، یہ کھانا لے جا کر اُسے دے آ۔"

فتوحا نے کھانا لیا اور غار کی طرف چل دیا۔ جب یہ وہاں پہنچا تو اُس وقت شرف الدین آنکھیں بند کئے یادِ الٰہی میں مشغول تھے۔ فتوحا آپ کے پاس کھڑا ہو گیا اور انتظار کرنے لگا کہ کب آپ آنکھیں کھولیں اور کب وہ آپ کو کھانا دے۔ کافی انتظار کے بعد بھی شرف الدین نے آنکھیں نہ کھولیں تو خادم نے پکارا "میاں جی!"

شرف الدین نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور فتوحا کو اپنے پاس دیکھ کر حیران رہ گئے۔ خفگی سے پوچھا۔ "تجھ کو میرا پتا کیسے معلوم ہوا؟"

فتوحا نے جواب دیا۔ جب آپ یہاں آ رہے تھے تو مَیں آپ کی والدہ کے حکم سے آپ کا پیچھا کر رہا تھا جس سے مجھے آپ کا پتا معلوم ہو گیا۔"

آپ نے اپنی والدہ کے حکم کی بات سُنی تو خفگی دُور ہو گئی فرمایا "کیا کرنے آیا ہے اب یہاں؟"

فتوحا نے کھانے کی پوٹلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ماں نے آپ کے لیے کھانا بنایا تھا وہی لے کر آیا ہوں۔"

شرف الدین نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "کھانا وہاں رکھ دے اور فوراً چلا جا۔ ماں سے کہنا کہ جس نے رزق کا وعدہ کیا ہے وہی یہاں بھی پہنچا دے گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

فتوحا جب گھر پہنچا تو شرف الدین کی والدہ نے پوچھا "کیا شرف الدین نے کھانا تیرے سامنے ہی کھا لیا تھا؟" فتوحا نے نفی میں جواب دیا اور شرف الدین کی بتائی ہوئی ساری بات بیان کر دی۔

آپ کی والدہ کی آنکھیں بھر آئیں کہا "فتوحا! اب جب مَیں تجھے کھانا دے کر بھیجوں گی تو میرے بیٹے سے کہنا کہ جس رزّاق نے تجھ سے رزق کا وعدہ کیا ہوا ہے مَیں اُسی کے حکم سے یہ کھانا تجھے بھیج رہی ہوں۔"

فتوحا دوسرے دن کھانا لے گیا تو پھر وہی اشارے سے کہا گیا کہ کھانا وہاں رکھ دے۔ جب کھانا رکھ دیا گیا تو شرف الدین نے پوچھا: "کیا تُو نے میری بات والدہ محترمہ کے گوش گزار کر دی تھی؟"

فتوحا نے جواب دیا: "جی ہاں مَیں نے ساری بات بیان کر دی تھی۔ انھوں نے کہا ہے کہ جس نے رزق کا وعدہ کیا ہے، مَیں اُسی کے حکم کی تعمیل میں رزق بھیجتی ہوں۔"

فتوحا کی یہ بات سُن کر آپ خاموش ہو گئے اور پھر یہ سلسلہ مدتوں چلتا رہا۔ یہ سُنتے کہ کھانا ایک طرف رکھوا دیا جاتا ہے اور فتوحا نے انھیں ایک بار بھی کھانا کھاتے نہیں دیکھا، ماں کو تشویش ہوئی اور فتوحا سے پوچھا "کیوں فتوحا! تیرا کیا خیال ہے تیرے آنے کے بعد شرف الدین کھانا کھا تو لیتا ہو گا؟" فتوحا نے جواب دیا۔ "ضرور کھا لیتے ہوں گے۔ کیونکہ جب مَیں دوسرے دن جاتا ہوں تو پہلے دن کا کھانا ختم ہو چکا ہوتا ہے۔"

ماں نے کہا۔ "ٹھیک ہے آج مَیں شرف الدین کے لیے کھجور تیار کروں گی تو اِن کو لے جائے گا اور اپنے سامنے شرف الدین کو کھلا کر آئے گا۔ یہ میرا حکم ہے۔" اس کے بعد ماں نے میدہ نکالا اس میں شکر اور خمیر کی آمیزش کی اور کھجوریں تیار کر دیں۔ پھر اُن کھجوروں کو ایک بڑے پیالے میں ڈال کر پوٹلی سی بنا دی۔

شرف الدین کی والدہ نے فتوحا کو یہ پوٹلی دی اور کہا کہ شرف الدین کو میرا حکم سُنا دینا کہ وہ یہ کھجوریں تیرے سامنے کھائے ورنہ مَیں ناراض ہو جاؤں گی۔"

فتوحا نے کہا۔ "اگر وہ پھر بھی نہ کھائیں تو مَیں کیا کروں؟"

والدہ نے جواب دیا۔ "پھر میری طرف سے یہ کہہ دینا کہ اگر اس نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو مَیں اُسے دودھ نہیں بخشوں گی اور روزِ قیامت اُس کو رُسوا کروں گی۔"

فتوحا نے شرف الدین کی والدہ کے حکم کی تعمیل کی اور کھجوریں آپ تک پہنچا دیں اور ماں کا حکم بھی سُنا دیا۔

ماں کا حکم سُن کر شرف الدین مجبور ہو گئے اس لیے خاموشی سے ایک کھجور لے کر منہ میں ڈال لی۔ ابھی آپ نے اُسے دانتوں تلے دبایا ہی تھا کہ آپ پر غشی طاری ہو گئی اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ بے ہوشی کی حالت میں آپ کا مُنہ کھُلا تھا۔ یہ سب دیکھ کر فتوحا کے ہوش و حواس اُڑ گئے۔ پھر اچانک اُس نے یہ منظر دیکھا تو وہ سکتے میں مبتلا ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ چیونٹیوں کی ایک بڑی فوج شرف الدین کے منہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ اُسے

روکنا بھی چاہتا تو روک نہ سکتا تھا۔ پھر یہ ساری چیونٹیاں شرف الدین کے منہ میں داخل ہوگئیں اور اُن کے منہ میں موجود کھجور کا ایک ایک ذرّہ باہر نکال دیا اور پھر نہ جانے کہاں غائب ہوگئیں۔

فتوحا یہ سارا ماجرہ دیکھ کر فوراً واپس پہنچا اور سارا واقعہ شرف الدین کی ماں کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔ "اب آپ انھیں کسی بات پر مجبور نہ کریں۔

شرف الدین کو جب ہوش آیا تو اُنھیں حکم ملا کہ فوراً اس غار سے نکل کر دہلی چلے جاؤ۔ وہاں شیخ نظام الدین بدایونی تیری رہنمائی فرمائیں گے۔

شرف الدین فوراً غار سے نکلے اور اپنے گھر پہنچے اور ماں سے کہا۔ "میں اب دہلی جارہا ہوں کیونکہ مجھے اس کے لیے ہاتفِ غیبی نے حکم دیا ہے کہ میں غار سے نکل جاؤں اور شیخ نظام الدین بدایونی سے راہنمائی حاصل کروں۔

ماں نے کہا۔ "تو اکیلا وہاں نہیں جائے گا اپنے ساتھ جلال الدین کو بھی لیتا جا اُسے بھی شیخ نظام الدین سے ملاقات کا بہت شوق ہے۔" چنانچہ شرف الدین اپنے بڑے بھائی جلال الدین کو ساتھ لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوگئے۔

دہلی میں داخل ہوتے ہی شرف الدین سیدھے نظام الدین اولیا کے پاس پہنچے اور نہایت ادب اور حددرجہ عقیدت کا مظاہرہ کیا۔

شیخ نظام الدین اولیاء نے بطورِ خاص شرف الدین سے پوچھا۔ "خواجہ شرف الدین! کیسے آنا ہوا؟"

شرف الدین نے آنکھیں اُٹھائیں اور نہایت ادب سے کہا "حضرت! عمریوں ہی گزرتی چلی جارہی ہے اور جب میں اپنے ماضی اور حال کی طرف دیکھتا ہوں تو خسارہ ہی خسارہ نظر آتا ہے۔"

یہ سُن کر نظام الدین اولیاءؒ سب کچھ سمجھ گئے اور فرمایا۔ "مسئلہ کچھ یوں ہے کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں آپ دونوں کو مُرید کروں اور تربیت دوں۔ لہذا میں نے تمہارے لیے خاندانِ فردوسیہ کو مقرر کیا ہے، تم دونوں اُن کے پاس چلے جاؤ، تمہارا کام ہو جائیگا۔"

فردوسی خاندان کا تعلق سہروردیہ خاندان سے ہے۔ اُن دنوں فردوسیہ خاندان کے نجیب الدین فردوسی کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ اس خاندان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ اس

خاندان کے شیخ نجم الدین کبریٰ فردوسی اور شیخ علاؤ الدین فردوسی یک جا ہوئے۔ یہ دونوں بزرگ مجاہدات اور ریاضات میں ہم پلّہ تھے اور اس کے باوجود وہ مطمئن نہ تھے۔ اس لیے یہ دونوں بزرگ ایک تیسرے بزرگ شیخ ضیاء الدین ابونجیب کے پاس گئے اور عرض کی "حضرت! اپنی عمریں ختم ہو رہی ہیں اور ابھی تک کوئی کام نہیں ہو پایا۔ ریاضت و مجاہدے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی مگر ابھی تک مقصود حاصل نہیں ہوا۔ ہمیں بتایئے کہ اب ہم کیا کریں؟"

شیخ ضیاؔ الدین نے فرمایا: "بھائیو! مَیں خود بھی اسی مرض میں مبتلا ہوں اور مَیں نے اس کا علاج یہ دریافت کیا ہے کہ ہم تینوں کسی کے ہاتھ بیعت ہو جائیں۔"

چنانچہ تینوں بزرگ شیخ وجیہہ الدین ابوحفص بن عمر عمویہ کے پاس پہنچے۔ شیخ وجیہہ الدین نے ضیاء الدین اور علاؤ الدین کو تو بیعت میں کر لیا مگر انھوں نے شیخ نجم الدین کبریٰ کو شیخ نجیب الدین فردوسی کے حوالے کر دیا۔ شیخ نجم الدین اُن کے پاس سات ماہ تک رہے پھر انھیں بھی خلافت مل گئی۔ پھر شیخ نجم الدین کو رخصت کرتے ہوئے کہا: "اب تم جاؤ کیوں کہ اب تم فردوسی مشائخ میں سے ہو۔" اس طرح یہ فردوسی خاندان معرضِ وجود میں آ گیا۔ انہی شیخ نجیب الدین فردوسی کی خدمت میں شرف الدین نے حاضری دی۔

شیخ نجیب الدین نے جب دونوں بھائیوں کو دیکھا تو بڑی گرمجوشی سے ملے اور شرف الدین سے فرمایا۔ "اے شرف الدین! آؤ ہم تمہارا بہت عرصہ سے انتظار کر رہے تھے اور تم سے ملنے کے مشتاق تھے۔" بہرکیف دونوں بھائیوں کو اسی وقت بیعت کر لیا گیا۔ پھر انھیں خرقۂ خلافت عطا ہوا اور پیرانِ عظام کے تبرکات اُن کے حوالے کر دیئے گئے۔ یہ تبرکات اُن کے پاس بطورِ امانت رکھے ہوئے تھے۔

آپ پیر و مرشد کے پاس ہی رہنے لگے۔ ایک دفعہ شرف الدین کے پیر و مرشد نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر شرف الدین سے کہا۔ "اس کو پڑھ لو۔"

کاغذ پر چند سطریں لکھیں تھیں شرف الدین نے جب یہ سطور پڑھیں تو اُن کی حالت عجیب سی ہو گئی اور زمین کی تہوں میں موجود اشیاء بھی انھیں صاف دکھائی دینے لگیں۔ شرف الدین نے اس کاغذ کو اپنی آنکھوں سے لگایا، بوسہ دیا اور اس کو پیر و مرشد کے سامنے دوبارہ رکھ دیا۔

پیر و مرشد نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں شرف الدین! تم اس کاغذ کو واپس کیوں کر رہے ہو؟"

انھوں نے جواب دیا۔" پیرو مرشد! یہ آپ اس شخص کو مرحمت فرمائیں جسے اس کی حاجت ہو، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

شیخ نجیب الدین اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور کہا۔" صاحبزادے! مَیں تمہارے اس جواب سے بہت خوش ہوا ہوں، خدا تمہیں تمہارے مقاصد میں کامیاب کرے۔ آمین۔" پھر قدرے توقف کے بعد فرمانے لگے" شرف الدین! کیا تمہیں معلوم ہے کہ میری زندگی تمہاری ارادت پر موقوف تھی۔"

شرف الدین خاموش رہے، پیرِ مُرشد کہتے رہے" شرف الدین! اب تم واپس جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ مَیں ایسا محسوس کر رہا ہوں، گویا مَیں سارے فرائض انجام دے کر فارغ ہو گیا ہوں۔"

شرف الدین نے فرمایا۔" پیرِ مُرشد! میرے لیے کوئی حُکم؟"

پیرِ مرشد نے فرمایا:" جب تمہیں میری موت کی خبر پہنچے تو تم اُسی وقت جہاں کہیں بھی ہو میرے پاس چلے آنا۔ یہ میری آخری خواہش بھی ہے اور وصیّت بھی۔"

آپ نے جب یہ سُنا تو اپنے پیرِ مُرشد کی وصیّت و نصیحت گرہ میں باندھ کر وطن کے لیے روانہ ہو گئے۔ ابھی آپ زیادہ دُور نہیں گئے ہوں گے کہ آپ کے پاس ایک گھڑ سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا پہنچا اور کہنے لگا۔" شرف الدین کہاں جا رہے ہو؟ دہلی فوراً واپس چلے چلو کیونکہ تمہارے پیرِ مرشد وصال فرما چکے ہیں۔"

آپ کو یہ سُن کر بہت رنج ہوا اور پھر اپنے پیرِ مُرشد کی وصیّت پر عمل کرتے ہوئے فوراً اس گھڑ سوار کے ساتھ واپس دہلی پہنچے اور اپنے پیرِ مرشد کی آخری رسومات میں شریک ہوئے۔

یہاں سے دوبارہ آپ سفر کرتے ہوئے واپس وطن کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ کیساتھ آپ کے بھائی جلال الدین بھی تھے مگر اُن میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ابھی آپ دونوں بھائی پٹنہ بھی نہیں پہنچے تھے اور آگرہ کے جنگل سے گزر رہے تھے کہ اچانک کسی طرف سے مور کی آواز سنائی دی۔ اس آواز کے سُنتے ہی دونوں کے اندر آگ سی لگ گئی پھر دونوں بھائیوں کا ساتھ چھوٹ گیا۔ شرف الدین اسی جنگل میں کہیں گم ہو گئے۔ جلال الدین نے انھیں بہت تلاش کیا مگر انھیں نہ ملنا تھا نہ ملے۔ بہرکیف جلال الدین واپس گھر پہنچ گئے۔ صابر ماں نے صبر کر لیا اور شرف الدین کی بیوی بھی دل شکستہ ہو کر اپنے باپ کے گھر واپس چلی گئی۔

شرف الدین نے آگرہ کے جنگلات میں ہی مجاہدے اور نفس کشی شروع کر دی۔ حالانکہ جنگل

میں بہت سے درندے اور عجیب وغریب حشرات الارض بھی تھے مگر انھوں نے آپ کو بالکل کوئی گزند نہ پہنچائی۔ ان جنگلات میں آپ کو ہندو جوگی بھی گیان دھیان اور تپسیا میں مشغول ملے۔ آپ نے اُن کے ساتھ علمی مباحثے بھی کئے اور انھیں قائل بھی کرتے رہے۔ ان جنگلات میں آپ نے پورے بارہ سال گزارے پھر آپ راج گڑھ کے جنگلات میں چلے گئے۔ ان جنگلات میں آپ نے تیس سال تک مجاہدے کئے اور نفس کشی میں لگے رہے۔ اس کے بعد آپ گھر پہنچے مگر وہاں کوئی بھی نہ ملا آپ کی ماں واصلِ حق ہو چکی تھیں۔ آپ نے صبر سے کام لیا اور دوبارہ عبادت و ریاضت میں لگ گئے۔

ایک دفعہ آپ بہار شریف کی ایک جامع مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھنے تشریف لے گئے۔ وہاں پر آپ نے نمازِ جمعہ کے بعد پند و وعظ کے لیے اپنی زبان کھولی تو تمام ہجوم کے جذبات بے قابو ہو گئے۔ اُن پر آپ کے وعظ کا بہت اثر ہوا۔ اس کے بعد آپ کا شہرہ دُور دُور تک پھیلتا گیا۔ آپ کے علم و فضل سے بہت سے لوگ مستفیض و مستفیر ہوئے۔

ایک جگہ آپ ہمّت و حوصلہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس دنیا کے تمام تر کاروبار ہمّت پر موقوف ہیں جس کی جتنی بلند ہمّت ہو گی اس کی تشنگی بھی اتنی ہی زیادہ ہو گی۔ کوشش ایّام میں صبر کے کڑوے گھونٹ پینے کے علاوہ چارۂ کار نہیں۔ سختیوں میں جینا سیکھو، ورنہ کچے اور خام رہ جاؤ گے۔

آپ سے سماع کے بارے میں یہ پوچھا گیا کہ یہ جائز ہے یا ناجائز؟ آپ نے جواب دیا "سماع اہلِ حق کے لیے مستحب، اہلِ زہد کے لیے مباح اور اہلِ نفس کے لیے مکروہ ہے۔"

اس پر کسی نے ذرا گھما پھرا کر پوچھا: "سماع مذموم ہے یا محمود؟"

آپ نے جواب دیا "سماع اگر طلبِ منفعت کے لیے ہو تو مذموم ہے اور اگر طلبِ حقیقت کے لیے ہو تو محمود ہے۔" اس کے بعد آپ نے اس کی اس طرح وضاحت فرمائی: "لوگو! اگر سماع سے اللہ کی محبّت کی تحریک ہو اور احوال شریف یعنی مکاشفات ظہور پذیر ہوں تو یہ حلال ہے اور اگر اس سے طبیعت فجور کی طرف مائل ہو تو یہ حرام ہے۔ اس طرح یہ ثابت ہوا کہ سماع حرام بھی ہے اور حلال بھی، مکروہ بھی ہے اور مباح بھی۔ یوں سمجھ لو کہ اگر سماع سے دل حق کی طرف مائل ہو تو حلال ہے، اور اگر مجاز کی طرف مائل ہو تو حرام ہے اور اگر کچھ غیر حق کی طرف اور کچھ حق کی طرف مائل ہو تو یہ مکروہ ہے اور اگر یہ حق اور مجاز دونوں کی طرف مائل ہو مگر حق کی طرف زیادہ مائل ہو تو یہ مباح ہے۔"

کسی موقع پر راہِ توحید کی آپ نے یوں وضاحت فرمائی۔ "راہِ توحید جو مردوں کا دین ایک دریائے محیط ہے یہاں علم اور عقل غرق ہیں۔ لکھنا اور بات کرنا تو ایک طرف، جو شخص اس میں گر جاتا ہے، گویا وہ عالمِ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔"

ایک شخص آپ کے پاس آیا اور عرض کی۔ "حضرت میری حاجتیں پوری نہیں ہوتیں، محرومیاں میرا مقدر بن گئی ہیں بتائیے اس سلسلے میں میں کیا کروں؟"

آپ نے فرمایا۔ "میرے پاس اس مسئلہ کا علاج ہے مگر پہلے تو یہ بتا کہ نماز بھی ادا کرتا ہے یا نہیں؟"

اُس شخص نے جواب دیا۔ "نماز تو میں بڑی پابندی سے ادا کرتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "فجر کی نماز میں سنتوں اور فرضوں کے درمیان وقت نکال کر اکتالیس مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کر لیا کر، خدا نے چاہا تو تیرے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔"

چنانچہ وہ شخص چلا گیا اور آپ کے کہنے کے مطابق عمل کرتا رہا۔ چند ماہ کے بعد وہ دوبارہ آپ کے پاس آیا اور کہا "حضرت آپ کا بہت بہت شکریہ، اب مجھے کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی اب میں محرومیوں کا شکار ہوں۔"

دوسرے مریدوں نے جب یہ سُنا تو وہ بھی آپ سے اپنے دکھوں اور مصیبتوں کو دُور کرنے کے لیے عمل اور وظیفے معلوم کرنے لگے۔

۷۸۲ھ کے رمضان گزر چکے تھے اور عید کے دن سے لوگوں کا تانتا جو لگا تو ٹوٹنے کو نہ آیا۔ دُور دُور سے لوگ آپ سے ملنے چلے آرہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اُن کو حاضری کا حکم دیا گیا ہے۔ چھ شوال کو اس ہجوم میں بہت زیادتی ہو گئی۔ آپ ہر ایک کو وقت دے رہے تھے۔ آپ اُن میں سے ہر آدمی کو باری باری بُلاتے تھے۔

آپ بعض لوگوں کو گلے لگا لیتے تھے بعض سے صرف مصافحہ کرتے تھے اور بعض کو صرف نصیحتیں کر کے رخصت کر دیتے۔ پھر اچانک آپ نے یہ سلسلہ بند کر دیا اور قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ پھر آپ کچھ دعائیں پڑھنے لگ گئے۔ چند ساعتوں کے بعد آپ کے قریبی مریدوں نے دیکھا کہ آپ دراز ہو کر کلمہ پڑھنے لگے ہیں۔

آپ کے مُریدوں نے آپ کی یہ حالت دیکھی تو پریشان ہو کر آپ پر جھک گئے۔ دیکھا تو پتا چلا کہ آپ واصلِ حق ہو چکے ہیں۔ آپ پٹنہ کے منیر نامی قصبے میں پیدا ہوئے اور اسی قصبے میں وفات پائی۔

حضرت بابا شاہ جمالؒ

مغل حکمرانوں نے اپنے عہد میں بے شمار عمارات تعمیر کروائیں۔ جو آج بھی اپنی تاریخی یادگاروں کے اعتبار سے لائقِ دید ہیں۔ ان دنوں بھی شہزادی سلطان بیگم بنت جلال الدین اکبر ایک خوبصورت، شان عالی اور وسیع و عریض محل تعمیر کروا رہی تھی۔ جس میں بڑے بڑے باغات تالاب اور بارہ دریاں بنوائی جا رہی تھیں۔ شاہی محل پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ ماہرین تعمیرات اس محل کو بنانے میں مشغول تھے۔ حضرت شاہ جمالؒ جو روحانیت و ولایت کے یگانۂ روزگار بادشاہ تھے انھوں نے بھی ایک بلند و بالا اور فلک بوس دمدمہ بنوانے کا ارادہ فرمایا۔ دمدمہ کا مطلب لغات میں عارضی تعمیر ہے۔ بادشاہ جس عمارت کو محل کا نام دیتے ہیں اس بزرگ ہستی نے محل کو دمدمہ سے موسوم کر کے تعمیر کروانے کا پروگرام بنوایا۔ یہ دمدمہ ایک ٹیلے پر بنوانے کے انتظامات ہونے لگے۔ اب جب ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو معماروں، راجوں اور مزدوروں کی دستیابی ایک مسئلہ بن گئی۔ جتنے ماہر کاریگر تھے وہ تو سب کے سب شاہی محل کی تعمیر پر مامور تھے۔

حضرت نے انہی معماروں کو اپنے پاس بلوایا اور فرمایا: بھئی! تم بے شک شاہی معمار ہو مگر کاریگر تو کاریگر ہوتا ہے اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اگر بادشاہوں کے کام کرتا ہے تو فقیروں کے بھی کام کرے۔ اس لیے تم لوگ شاہی محل کے ساتھ میرے دمدمہ کو

بھی تعمیر کرو۔"

معماروں نے کہا" حضرت! ہم شاہی معمار ہیں۔ جتنی اُجرت و معاوضہ ہمیں شاہوں سے ملتا ہے وہ آپ نہ دے سکیں گے۔ دوسرے ہمارے پاس آپ کا کام کرنے کا وقت بھی نہیں ہے۔ ہم سارا دن تو شاہی محل کی تعمیر میں گزار دیتے ہیں۔ آپ کا کام کیوں کر کر سکیں گے۔"

حضرت شاہ جمالؒ نے مسکرا کر فرمایا" دیکھو معمارو! جہاں تک اُجرت کا تعلق ہے آپ لوگ خاطر جمع رکھیں آپ کو جتنی اُجرت شاہی خاندان سے ملتی ہے ہم بھی اتنا ہی معاوضہ دیں گے۔ بلکہ اگر کوئی مزدور یا راج ایک پہر بھی کام کرے گا تو اُس کو مزدوری پورے دن کی ملے گی۔ اور رہی بات وقت کی، آپ لوگ سارا دن شاہی محل تعمیر کرتے ہیں تو رات کے وقت ہمارا دمدمہ تعمیر کریں۔ اس طرح آپ دوکام کرنے دوہری کمائی حاصل کر سکیں گے۔"

راج، مزدور رضامند ہوگئے۔ حضرت کے دمدمہ کا کام شروع ہوگیا۔ مزدور و معمار دن کو شہزادی کا محل تعمیر کرتے، رات کو دمدمہ تعمیر کرتے۔ انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک رات کو حسبِ معمول حضرت کے دمدمہ کا کام ہو رہا تھا کہ اچانک چراغوں میں تیل ختم ہوگیا۔ رات کے وقت نہ کوئی دکان کھلی تھی نہ کوئی بازار جہاں سے تیل حاصل کیا جا سکتا۔ مزدوروں اور راجوں نے کام روک دیا اور ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے۔ اس بات کی اطلاع جب حضرت شاہ جمالؒ کو ملی تو انھوں نے حکم دیا کہ اگر تیل نہیں ملتا تو کوئی حرج و فکر والی بات نہیں چراغوں میں میرے کنویں کا پانی ڈال دیا جائے پانی مثلِ تیل جلے گا۔" آپ کے حکم پر عمل کیا گیا اور آپ کے کنویں کا پانی چراغوں میں ڈال دیا گیا۔ خدا تعالیٰ نے اپنے کامل بندے کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو سچائی بخش دی اور بجھے ہوئے چراغوں میں ڈالا گیا پانی مثلِ تیل جلنے لگا اور یوں راجوں اور مزدوروں نے معمول کے مطابق رات بھر کام کیا۔

حضرت کی یہ کرامت اتنی مشہور ہوئی کہ آپ کی خدمت میں عقیدت مندوں کا تانتا بندھ گیا۔ وہی راج و معمار جو مزدوری پر رضامند نہ ہو رہے تھے اب آپ کام بلا معاوضہ کرنے پر تیار ہوگئے مگر خدا کے ولی نے ایسا منظور نہ کیا اور مزدوری برابر اُن کو دیتے رہے۔ آپ کا معمول تھا کہ جب صبح ہونے کو آتی اور مزدور اپنا کام بند کرتے تو آپ سب کو اپنے پاس بلاتے اور اپنے مصلّے کے نیچے ہاتھ لے جاتے اور وہاں سے رقم نکالتے اور مزدوروں کو دے دیتے۔ مزدور اور راج حیران تھے کہ حضرت کے مصلّی کے نیچے نہ جانے کونسا خزانہ دفن ہے جہاں سے آپ رقم حاصل کرتے ہیں اور انھیں دیتے ہیں مگر اس بارے

میں سوال و استفسار کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ جب دمدمہ کی سات منزلہ عمارت تیار ہوگئی تو اس کے مقابلہ میں شاہی محل پست دکھائی دینے لگا۔ اہل محل کو آپ کے دمدمہ کی اونچائی ناگوار گزری۔ سب درباریوں اور مصاحبوں نے یہ بات شہزادی سلطان بیگم تک پہنچائی کہ حضرت شاہ جمالؒ کے تعمیر کردہ دمدمہ کی بلندی سے محل کی بے ستری ہونے کا احتمال ہے۔ اس لیے موصوف کو حکم دیا جائے کہ اپنا دمدمہ گروا کر محل سے نیچا کریں۔

شہزادی نے اپنے مصاحبوں کے مشورے پر حضرت شاہ جمالؒ کو بلوایا اور کہا" اے درویش آپ نے اپنی تعمیر کردہ عمارت کو ہمارے محل سے بلند کر لیا ہے۔ اس کی بلندی سے ہمارے محل میں بے پردگی ہوتی ہے۔ اگر ایسی اونچی عمارت ہمارا کوئی امیر بنواتا تو ہم اُس کو سزا دیتے مگر آپ ایک فقیر اور درویش آدمی ہیں اس لیے آپ سے اُلجھنا ہم مناسب نہیں سمجھتے۔ لہٰذا آپ کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ اس عمارت کو گروا دیں اور شاہی خاندان سے مقابلہ بازی سے باز رہیں۔"

حضرت شاہ جمالؒ نے شہزادی کا پیغام سُنا تو جواباً فرمایا" اے شہزادی تمہیں اپنے شاہی جاہ و جلال اور اختیارات پر بڑا ناز ہے مگر ہم ایسی چیزوں سے قطعاً مرعوب ہونے والے نہیں ہیں۔ جہاں تک پردہ کے تحفظ کا معاملہ ہے، یہ خدا کے احکام سے متعلق ہے ہم اس پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ہم اپنا دمدمہ نیچا کیے لیتے ہیں لیکن یاد رکھو جس حویلی اور محل پر تم نازاں ہو وہ عنقریب ختم ہو جائے گی اور اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔"

یہ فرما کر آپ نے اُس شب وجدِ عارفانہ میں آکر عمارت کی سب سے اوپر والی چھت پر اس جذب و سُکر میں آکر ناچے کہ دمدمہ کی پانچ منزلیں زمین بوس ہوگئیں۔ صرف دو منازل رہ گئیں۔ یہ دو منازل اب بھی موجود ہیں۔ بعد میں جب سکھوں کی حکومت آئی شہزادی کا محل اور باغ اجاڑ دیئے اور وہاں ایک توپ خانہ تعمیر کروا دیا۔ مگر آپ کے دمدمہ کی طرف سکھوں نے رُخ کرنے کی کبھی ہمت نہ کی۔ گو سکھوں کا زمانہ آنے تک حضرت وصال فرما چکے تھے مگر سکھوں نے آپ کے مقبرہ کی بہت تعظیم و تکریم کی۔ اس طرح حضرت شاہ جمالؒ کی پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی کہ انھوں نے اپنے دمدمہ کی پانچ منزلیں تو زمین بوس کردیں مگر شہزادی کے محل کا بھی نام و نشان مٹ گیا۔ اس کے علاوہ بھی حضرت کے دمدمہ کے قرب و جوار میں بہت سی سرائیں، مملّات، باغات اور مندر وغیرہ تعمیر تھے جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ سب کے سب ختم ہو گئے لیکن حضرت کا دمدمہ آج بھی آپ کے مقبرے کی شکل میں موجود و محفوظ ہے۔ مقبرے

کی موجودہ عمارت اب بھی دو منزلہ ہے اور زمین سے بہت اونچی ہے۔

حضرت شاہ جمالؒ عہد مغلیہ دور کے اکابر مشائخ میں سے تھے۔ آپ ایک صاحب کمال ولیٔ کامل تھے جو جمال و جلال میں یکساں تھے۔ آپ سادات نسب تھے اور آپ کا خاندانی شجرہ وسلسلہ مختلف واسطوں سے ہوتا ہوا حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ کے والد صاحب سیّد عبداللہ ایک نیک نہاد اور صالح بزرگ تھے۔ بعض روایات کے مطابق آپ کے والدِ گرامی کا نام عبدالواحد تھا۔ مؤخرالذکر نام کے بارے میں روایات خاصی ہیں اور معتبر ہیں۔ لہٰذا اسی نام یعنی عبدالواحد کو ہی صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ حضرت عبدالواحد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ ان کو اپنے علاقے میں زہد و ورع کی وجہ سے بہت عظمت و بزرگی حاصل تھی۔ جس کی وجہ سے حاکم کشمیر آپ سے حسد و بغض رکھتا تھا لیکن وہ اپنی کوششوں کے باوجود آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکا مگر اُس کی ریشہ دوانیوں اور چیرہ دستیوں سے بچنے کے لیے حضرت عبدالواحد نے کشمیر سے نقل مکانی کا ارادہ کیا اور سیالکوٹ میں آکر آباد ہو گئے۔ یہاں آکر آپ خدا کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔ یوں آپ کو حاکمِ کشمیر کی تنگ نظریوں اور کینہ توزیوں سے بھی نجات مل گئی اور یکسوئی سے عبادت کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ حضرت عبدالواحدؒ ایک باوقار کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ایک مشہور بزرگ حضرت قاضی جمال الدین بڈشاہی کی اولادِ صالحہ میں سے تھے۔ حضرت عبدالواحد علم و عرفان اور عبادت و ریاضت میں یکتا تاز تو تھے ہی اسی وجہ سے آپ کی نیکی اور خدا رسیدگی رنگ لائی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو معرفت و ولایت آگیں اولاد عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو بیٹے عطا فرمائے۔ جن کے اسمائے گرامی حضرت شاہ جمالؒ اور حضرت شاہ کمالؒ تھے۔ ان دونوں بھائیوں میں سے اوّل الذکر حضرت شاہ جمالؒ کا ذکر ہی ان سطور میں بیان ہو رہا ہے۔

حضرت شاہ جمال کی تاریخِ ولادت کے بارے میں اوراقِ تاریخ خاموش ہیں تاہم روایتوں اور تذکروں نے آپ کا اندازاً سنِ ولادت ۹۴۴ ہجری بتایا ہے۔ حضرت شاہ جمالؒ اپنے والد صاحب کے عکاس تھے۔ وہ اُن کی تقلید ہر رنگ میں فرمایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا شمار اُن صوفیاء و اولیاء میں ہوتا ہے جن کی آمد سے قبل برصغیر میں یہاں کے باسی ایک عذاب میں مبتلا تھے۔ برہمنی تعلیم نے انسانی دلوں میں نفرت، کینہ اور نسلی امتیازات پیدا کر دیئے تھے۔ معاشرے میں شودروں کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھا جاتا تھا ایسے میں حضرت شاہ جمالؒ جیسی ہستیاں ہی خدا اور اس کے رسولِ کریمؐ

نے حدیث و فقہ اور زبان دانی میں کمالات حاصل کیے۔ اور یوں وہ تشنگی جو ابتدائی ایام میں آپ کے اندر رہ گئی تھی اُس سے آپ نے ایک محدود عرصہ کے اندر اپنے وجود کو سیراب کر لیا۔ آپ کی اس لیاقت و فطانت کے بارے میں خزینۃ الاصفیاء میں مرقوم ہے۔

جب دنیاوی تعلیم اور علمی قابلیت سے بہرہ ور ہو چکے تو پھر آپ کو باطنی تعلیم کے حصول کا شوق پیدا ہوا۔ آپ نے سلوک اور معرفت کی تعلیم کے لیے کسی مردِ جلیل کا دامن تھامنا چاہا مگر آپ کو اس سلسلہ میں بھی کافی ریاضت کرنی پڑی۔ آخر آپ کی سعی بلیغ رنگ لائی اور آپ کو ایک جریدۂ روزگار بزرگ حضرت پیر گکرا بیگؒ کے نیاز حاصل ہو گئے۔ حضرت پیر گکرا بیگؒ ایک نہایت ہی صالح اور نیک نہاد و عہد ساز بزرگ تھے۔ انھوں نے حضرت بابا شاہ جمال کو سلسلہ عالیہ سہروردیہ میں بیعت کر لیا اور یوں آپ کو راہِ طریقت اور حقیقت پر چلنے کے لیے ایک راہبر میسر آگیا۔ آپ کے مُرشد نے آپ کو سلوک و عرفان کی تمام منازل سر کروائیں۔ آپ کے دل کو اسباق و ادراک کی روشنی سے منوّر کیا۔ آپ نے اپنے مُرشد کی زیرِ تربیت رہ کر بہت سے مجاہدے کئے، چلہ کشی کی اور سخت عبادات کیں۔ جنہوں نے آپ کی شخصیت کو پارس بنا دیا۔ مسلسل مجاہدوں سے آپ کی شخصیت میں بے حد جلال پیدا ہو گیا تھا۔ ایک طویل عرصہ حضرت پیر گکرا بیگؒ کی صحبت میں رہ کر آپ نے اُن کی نگاہِ فیض سے روحانیت کے تمام مدارج طے کئے۔ آپ کی تعلیم کے ابواب جب تمام ہوئے تو آپ کو حضرت پیر گکرا بیگؒ نے خلافت سے نوازا اور خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔

اس کے بعد آپ کو مُرشد نے حکم دیا کہ لاہور چلے جاؤ۔ لاہور کی سرزمین کو اولیاء کی قدم بوسی کا اعزاز حاصل ہے۔ وہاں اچھرہ کی نواحی بستی میں جا کر آباد ہو جاؤ اور رشد و ہدایت کا دریائے فیض رساں جاری کر دو۔ آپ نے حکمِ مرشد کی تعمیل کی اور لاہور تشریف لا کر اچھرہ کے نواحی علاقے میں آباد ہو گئے۔ جس جگہ آج آپ کا مزار واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں آپ تشریف لائے۔ شرابِ رشد و ہدایت کے خم بہ خم لنڈھائے اور اسی جگہ ایک ٹیلے پر دمدمہ تعمیر کروایا جو اپنی پانچ منازل زمین بوس ہو جانے کے بعد بھی آج دو منازل کے ساتھ ایستادہ و موجود ہے۔

لاہور میں پہنچنے کے بعد آپ نے اپنی سادگی، درویشی اور متقانہ زندگی سے لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ حضرت شاہ جمال کو لاہور بہت پسند آیا۔ آپ کو معلوم تھا کہ یہ سرزمین اہلِ اللہ، حفاظِ کرام اور علماء و زعماء کی آماجگاہ ہے۔ آپ ۱۵۸۷ء میں لاہور تشریف لائے

کی تعلیمات کے اسباق لے کر اس خطے میں تشریف آور ہوئیں اور احترامِ انسانیت، محبت اتحاد، اخوت و ایثار اور مساوات کا ایسا درس دیا اور عملی نمونہ پیش کیا کہ ظلم وستم کی ستائی ہوئی اقلیتوں نے اُن کی آوازِ حق پر لبّیک کہتے ہوئے اسلام قبول کر لیا اور پھر خدا نے ایسا کرم کیا کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد برصغیر کی ایک کثیر آبادی مشرف با اسلام ہوگئی۔

حضرت شاہ جمال اُن نفوسِ قدسیہ کی جماعت میں سے تھے جنہوں نے اس خطے میں اسلام کے بیج بوئے اور پھر اُس سے اُگنے والی فصل کی پرورش و آبیاری کی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ آپ کی ہستی ـــــ ایک جوئے رواں تھی جس سے ہر ایک نے اپنے دامن کو تر اور قلب و ذہن کو سیراب کیا۔ تمام اولیاء عظام میں آپ کا وجود مشخص تھا۔

حضرت بابا شاہ جمالؒ کی ابتدائی زندگی بالکل عامیانہ سی ہے۔ آپ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ آپ بچپن میں تعلیم و علم سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے تھے۔ آپ نے دیگر اولیاء کی طرح اپنا بچپن غیر معمولی ذہانت و فطانت کے کارنامے دکھانے میں نہیں گزارا۔ بلکہ آپ تو عام بچّوں کی طرح دن بھر کھیل کود میں مشغول رہتے تھے اور رات کو پڑ کر سو جاتے تھے۔

ایک دفعہ آپ معمول کے مطابق کھیل رہے تھے کہ اچانک آپ کی ملاقات ایک درویش سے ہوگئی۔ اس درویش نے دیدۂ بینا سے آپ کو دیکھا اور آپ کے اندر روحانیت کا گوہر یک دانہ دیکھ لیا۔ آپ کی پوشیدہ مگر کامل شخصیت اُن پر عیاں ہوگئی۔ انھوں نے آپ کے اوصاف و کمالات پہچان کر آپ کا بازو پکڑ لیا اور نہایت محبّت سے فرمایا۔

"بیٹا! کھیل کود میں وقت ضائع کر دینے والے اپنی منزل سے دُور ہو جاتے ہیں اور جب وقت گزر جاتا ہے تو وہ منزل کو ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہوتے ہیں۔ تم خدا کے وہ کامل و یگانہ بندے ہو جس پر آئندہ نسل کے سنوارنے کی ذمّہ داری عائد ہو گی۔ خدا تم سے بڑے بڑے کام لینے والا ہے۔ نسل کو سنوارنے اور بڑے بڑے کام کرنے کے لیے علم حاصل کرنے، اس پر عمل کرنے اور محنت کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے اپنے آپ کو پہچانو اور اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنے راستے کی تلاش کرو۔"

راہگیر درویش تو اپنی بات کہہ کر چلا گیا مگر اس کی نصیحت حضرت شاہ جمالؒ کے قلب و ذہن پر نقش ہوگئی۔ آپ نے گھر جانے کی بجائے گلی سے ہی مدرسے کی راہ لی۔ پھر مدرسہ سے اُس وقت فارغ ہوئے جب تحصیلِ علم کی تکمیل ہوگئی۔ قرآن پاک کی تعلیم کے بعد آپ

تھے۔ یہ زمانہ اکبر اعظم کا عہد تھا۔ آپ نے دیگر اہلِ روحانیت و ولایت کی طرح اسلام کی بے پناہ خدمت کی۔ آپ کے ہاتھوں بے شمار اور لاتعداد ہندو مسلمان ہوئے۔ آپ کی خدمت میں ہر وقت لوگوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ حاجت مند اور ضرورت مند آپ کی خدمت میں دکھوں کے انبار لے کر آتے اور سکون و سکھ سے اپنا دامن بھر کر واپس جاتے تھے۔

حضرت شاہ جمالؒ کی شخصیت تاریخی اعتبار سے بھی بڑی اہم تھی۔ آپ نے اکبری عہد جہانگیری زمانہ اور شاہ جہانی دورِ حکومت کو مشاہداتی نظروں سے دیکھا تھا۔ آپ کا شمار انہی علمار حق میں ہوتا ہے جنہوں نے اکبرِ اعظم کے خودساختہ اور باطلہ دینِ الٰہی کی مخالفت کی تھی۔ اس اکبری روشِ غلط کی مذمّت کے علاوہ حضرت شاہ جمالؒ نے دیگر علمار و صوفیار کے ساتھ مل کر جہانگیر کو اس شرط پر تخت نشینی میں مدد دی کہ وہ اکبر کے جاری کردہ لامذہبی قوانین کو منسوخ کر دے گا۔ اکبر کے باطلانہ خیالات کی مخالفت شاہ جہاں نے بھی کی تھی۔

حضرت شاہ جمالؒ نے ان تینوں حکمرانوں کے ادوار کو بنظرِ غائر دیکھا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اکبری فتنہ کی سرکوبی میں لاہور کے صوفیائے کرام کا ایک خاص مقام ہے اور ان کے درمیان حضرت شاہ جمالؒ کو ایک اہم اور خاص امتیازیت حاصل ہے۔

حضرت شاہ جمالؒ صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ اولیائے کرام کی کرامات برحق ہوتی ہیں۔ حضرت داتا گنج بخش اپنی کتاب کشف المحجوب میں رقم طراز ہیں کہ اولیائے کرام کی کرامات درحقیقت حضرت نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے معجزات ہیں جو بعد از وفات آپ کی روحانیت سے صادر ہو رہے ہیں۔ جس کی دلیل آپ یہ دیتے ہیں کہ "ولایت نبوّت کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔" تاہم جس طرح نبی کی صداقت اور حقانیت اُن سے معجزات کا طالب نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اُس کی صداقت اور حقانیت کو اس کی سیرت و کردار میں تلاش کرنا چاہیے: مثلاً ایک شخص آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کا چہرہ دیکھتے ہی ایمان لے آیا اور کہنے لگا "یہ چہرہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔" اسی طرح اولیائے کرام سے ان کی صداقت کی معرفت کے لیے کرامت کا طالب نہیں ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ اُن کی سیرت و کردار کی تابانی ہی اُن کی صداقت کی اعلیٰ نشانی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اسوۂ نبویؐ پر استقامت سے عمل پیرا ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے عظیم معجزے کی حیثیت ہی سے پیدا کیا ہے اور کہا ہے۔

"اور تمہارے لیے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی

ذاتِ اقدس کا اسوۂ حسنہ ایک اعلیٰ معجزہ ہے۔"

اسی لیے اکابر صوفیائے کرام نے کرامت سے پہلو تہی کرتے ہوئے استقامت پر انحصار کیا ہے۔ اسی بات کو حضرت شاہ جمالؒ کے جدِ خانوادہ طریقت حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے جو سرِ سلسلہ سہروردیہ ہیں اپنی کتاب عوارف المعارف میں ابوعلی الجوزجانی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

" استقامت کا طالب بن نہ کہ کرامت کا "

حضرت شیخ سہروردی کا ہی یہ ارشاد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے یہ حکم دیا تھا " اے نبیٔ محترم صلی اللہ علیہ وسلم آپ استقامت اختیار فرمائیے "

اسی حکمِ ربانی کے تحت صوفیائے کرام کا عمل بھی اسی ارشاد پر ہے۔ البتہ چونکہ کرامت آیت ربانی ہے جو ولی کے ہاتھ پر تائیدِ دین کے لیے ایک قوتِ الٰہی کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا ذکر ایمان افزا ہے۔

حضرت شاہ جمالؒ کی بھی ایمان افزا کرامات کافی تعداد میں قابلِ ذکر ہیں۔ جو تواترِ زمان سے لازوال شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ آپ کی خدمت میں ایک ہندو کھتری دودھل اکثر و بیشتر حاضر ہوا کرتا تھا۔ وہ آپ کا بہت عقیدت مند تھا مگر بدقسمتی سے اس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ وہ اکثر اولاد کے لیے آپ سے دُعا کروایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ چند تازہ خربوزے لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے خربوزے قبول فرمائے اور ان میں سے دو خربوزے آپ نے مذکورہ کھتری کو دے دیئے اور خود عصر کی نماز ادا کرنے لگے۔

اُس کھتری نے سوچا کہ شاید آپ نے اُسے یہ خربوزے چھلکا اُتارنے کے لیے دیئے ہیں۔ چنانچہ اُس نے ایک کو تراشا ہی تھا کہ آپ نماز سے فارغ ہو گئے تو آپ نے تراشا ہوا خربوزہ دیکھ کر اُس کھتری سے فرمایا۔

" یہ تم نے کیا کر دیا مَیں نے تو تمہیں دو خربوزے اس لیے دیئے تھے کہ تم اور تمہاری بیوی یہ دونوں خربوزے مل کر کھاؤ گے تو خداوند تعالیٰ تمہیں دو بیٹے دے گا۔ اب تم نے ایک تراش لیا ہے تو یہ بھی خوب ہوا۔ اب ایسے ہی یہ خربوزے لے جاؤ اور دونوں میاں بیوی مل کر کھاؤ۔ تمہارے ہاں دو لڑکے پیدا ہوں گے۔ ایک لڑکا مسلمان پیدا ہو گا اور دوسرا ہندو ہو گا "

اُس کھتری نے گھر جاکر اپنی بیوی کو تمام واقعہ سنایا اور ساتھ خربوزے بھی دیئے۔ اُس کی بیوی جو اولاد کی شدید تمنائی تھی بہت خوش ہوئی۔ چنانچہ اُن دونوں نے مل کر خربوزے کھائے۔ اُسی رات کھتری کی بیوی حمل سے ہوگئی اور ٹھیک نو ماہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں دو بیٹے عطا فرمائے۔ اُن دونوں میں سے ایک بچہ مختون تھا یعنی اُس کے ختنے قدرتی طور پر ہو چکے تھے اور دوسرا نامختون تھا۔ وہ کھتری مختون بیٹے کو حضرت شاہ جمالؒ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا۔ آپ نے اُس کو بیٹوں کی بہت مبارکباد دی اور فرمایا۔

"دودمل! یہ تیرا مختون بیٹا خدا کے حکم سے ہمارے پاس رہے گا۔ اس کی ہم تربیت کریں گے۔ اس کو سلوک و معرفت کی راہ دکھائیں گے اور یہ بڑا ہو کر خدا کا رضاجو اور عابد و عاجز بندہ بنے گا۔"

دودمل نے یہ بات سُنی تو عرض کی: "حضرت! یہ بچے آپ کی دُعا سے خدا نے مجھے دیئے ہیں۔ آپ کا ان پر پورا حق ہے۔ آپ چاہیں تو دونوں بچے اپنے پاس رکھ لیں۔"

حضرت نے مسکرا کر فرمایا "نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے جو خدا نے حکم دیا ہے میں اُس کی تعمیل کروں گا اور تمہارے مختون بچے کو اپنی زیرِ سرپرستی رکھوں گا۔" چنانچہ اُس مختون نومولود کو حضرت نے اپنی جاودانی شفقت میں لے لیا اور اُس کی پرورش ہونے لگی۔ اُس بچے کو شیخ فخرالدین کے نام سے موسوم کیا۔

اس بچے کی آپ نے روحانیت و طریقت کے اصولوں کے مطابق پرورش کی اور اس کو ظاہری و باطنی دولت سے مالا مال کیا اور جب وہ بچہ بڑا ہوگیا تو اُس کے آپ نے اپنی اولاد کی طرح فرائض پورے کیے۔ اُس کی شادی کروائی اور موری دروازے کے اندر محلہ جوڑے میں ایک مکان بھی خرید کر دیا۔

حضرت شیخ فخرالدین نے بھی آپ کی تعظیم حقیقی والد کی طرح کی۔ وہ عمر بھر آپ کے جاں نثار اور خادم رہے۔ صاحبِ عیال و اطفال ہونے کے باوجود وہ حضرت شاہ جمالؒ کی خدمات سے غافل نہیں ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت شاہ جمالؒ، حضرت شیخ فخرالدین کے گھر تشریف لے گئے اور گھر میں داخل ہونے کی بجائے باہر سے اُنھیں آواز دی اور فرمایا۔

"فخرالدین! اپنے بیوی بچوں کو اور ضروری اسباب لے کر فوراً مکان سے باہر آجاؤ۔" تابع فرمان فخرالدین نے فوراً آپ کے حکم پر عمل کیا اور اپنے اہل و عیال اور اسباب سمیت گھر سے

باہر آگئے۔ ابھی اُن لوگوں کو گھر سے باہر آئے چند ثانیے بھی نہیں گزرے تھے کہ پورا کا پورا مکان زمین پر آگرا۔

شیخ فخر الدین اور دیگر دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ قدرت نے حضرت شاہ جمالؒ کے توسط سے کس طرح ایک خاندان کو موت کے بے رحم ہاتھ سے بچا لیا۔ حضرت شاہ جمالؒ نے اس پر فرمایا۔

"مجھے انکشافِ قلبی کی بنا پر اس جان لیوا حادثے کی خبر پہلے ہی کر دی گئی تھی۔ چنانچہ میں گھر سے اسی مقصد کے لیے چل پڑا۔ اور خدا نے میری دعا اور خواہش کی تکمیل کی اور میرے متوسلین اس بدعواقب سے بال بال بچ گئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو ایسی نوازشات سے نوازتا رہتا ہے کہ وہ اپنی کرامات کے ذریعے اس کی مخلوق کو فائدہ پہنچاتے رہیں اور کرامت بھی چونکہ آیت ربّانی ہوتی ہے لہذا اس میں خدا تعالیٰ نے اپنی آیت و کلام جتنا اثر رکھا ہوتا ہے اور یہ صرف اُن حضرات سے ہی صادر و سرزد ہوتی ہیں جو اپنی زندگیوں آسائشوں اور آراموں کو خدا کے نام پر تیاگ دیتے ہیں اور اپنے آپ کو خدا کا بنا لیتے ہیں۔ اور جب وہ خدا کے بن جاتے ہیں تو خدا اُن کا بن جاتا ہے۔ اور جن کا خدا بن جاتا ہے اُن کے درجے ایسے ہی بلند و بالا ہو جاتے ہیں جیسے حضرت شاہ جمالؒ کا مقام بلند ہے۔

جتنا مُرشد عالی شان اور صاحبِ عظمت و بصیرت ہو اتنے ہی اُس کے مُرید بھی یکتا و نابغہ ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ جمالؒ کے مُرید خاص حضرت پیر حسن شاہ جو شیخ حسّو تیلیؒ کے نام سے معروف و مشہور ہیں۔ موصوف اناج اور تیل کی تجارت کیا کرتے تھے۔ اُن کا کسب ہی اُن کے نام کی عرفیت بن گیا۔ شیخ حسّوؒ چوک جھنڈا میں غلّہ فروشی کی دکان کیا کرتے تھے اور اکثر و بیشتر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ حضرت شاہ جمالؒ ہر نشست میں اُن کو نصیحت کرتے تھے کہ کاروبار میں دیانت داری پہلی شرط ہے اس لیے ایمانداری کا دامن کسی طور پر بھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔

حضرت شیخ حسّوؒ نے حضرت بابا شاہ جمالؒ کی اس نصیحت کو پلے باندھ لیا اور ناپ تول کے معاملات میں اس قدر محتاط ہو گئے کہ ہر گاہک کو جنس فروخت کرتے وقت فرماتے۔

"تم اپنے ہاتھ سے غلّہ تول لو۔" اس طرح آپ کم وزنی کے احتمال سے بچ جاتے۔ اب جو شخص آپ کے ساتھ ایمانداری کرتا تھا یا آپ کے حساب سے بھی کم جنس لیتا تھا اُس کی

جنس گھر جاکر اصل سے کافی ہوتی۔ اور جو آپ کے ساتھ بے ایمانی اور آپ کے حساب سے زیادہ تول لیتا تو گھر جاکر اُس کی جنس کم پڑ جاتی تھی مگر آپ اس سے بری الذمہ ہوتے تھے کیونکہ گاہک تو خود ناپ تول کرتا تھا۔ اس طریقِ کار نے حضرت شیخ حسّو کے کاروبار میں اتنی برکت ڈالی کہ آپ نہایت مال دار ہوگئے اور صاحبِ ثروت بھی ایسے ہوئے کہ آپ نے تولنے والے باٹ بھی سونے کے بنوالیے۔

ایک روز شیخ حسّو اپنے سونے کے باٹ لے کر حضرت بابا شاہ جمالؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی۔

"حضرت! آپ کی توجہ سے اس قدر کشائش اور برکت ہوگئی ہے کہ سنگھائے ترازو بھی میں نے سونے کے بنوالیے ہیں۔"

حضرت شاہ جمالؒ نے مسکرا کر فرمایا: "تو اس کا مطلب ہے تم نے ایمان داری کو اپنا لیا ہے۔"

شیخ حسّو نے جواب دیا: "حضرت آپ کے حکم کی میں نے ہر ممکن تعمیل کی ہے۔"

"تو پھر اس ایمانداری کا امتحان کروں۔" حضرت بابا شاہ جمالؒ نے پوچھا۔

"حضرت! ضرور کریں۔" شیخ حسّو نے جواب دیا۔

اس پر بابا شاہ جمالؒ نے فرمایا: "تو ایسا کرو ان سونے کے باٹوں کو لے جاکر دریا میں ڈال آؤ۔"

شیخ حسو نے بلا تامّل باٹ اُٹھائے، دریا کا رُخ کیا اور اُن کو ماتھے پر شکن لائے بغیر دریا میں پھینک دیا۔

ٹھیک دو روز بعد لاہور کے مضافات کے دیہاتوں سے دیہاتی حسبِ معمول غلّہ فروش کرنے شہر آئے تو انھوں نے دریا کے باہر سونے کے چمکتے ہوئے باٹ دیکھے۔ اب ہر شخص یہ جانتا تھا کہ سونے کے باٹوں کے ساتھ ناپ تول صرف شیخ حسو ہی کرتے ہیں اور ان دیہاتیوں کو بھی یہ بات معلوم تھی چنانچہ انھوں نے یہ باٹ اٹھائے اور حضرت شیخ حسو کی دکان پر لے کر آگئے اور کہا یہ آپ کے باٹ دریا کے کنارے پڑے تھے ہم اُٹھا لائے ہیں۔

حضرت شیخ حسو اُن باٹوں کو لے کر دوبارہ حضرت شاہ جمالؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: "حضرت میں تو ان سونے کے باٹوں کو دریا کے حوالے کر آیا تھا لیکن یہ پھر میرے پاس آگئے ہیں۔"

حضرت شاہ جمالؒ نے فرمایا: "میاں حسو! تمہاری ایمانداری سرخرو ہوگئی ہے۔ یہ راستی کا معمول تھا۔ تم نے ایمانداری شروع کردی۔ کم تولنا چھوڑ دیا تو کمائی حلال ہوگئی اور یہ رزقِ حلال کی برکت ہے کہ تم نے اپنی حلال کی کمائی کو دریا میں ڈالا تو اُس نے بھی اُس کو ضائع نہیں ہونے دیا اور تمہارا مال با حفاظت تم تک پہنچ گیا۔

بس اُس روز سے حضرت شیخ حسُو حضرت شاہ جمالؒ کے مُریدوں میں شامل ہوگئے۔ اپنی دکان اپنا کاروبار سب خدا کی راہ میں دے دیا۔ دن رات زہد و ریاضت میں بسر کرنے لگے اور چند ہی سالوں میں ولایت کا مرتبہ حاصل کرلیا۔ حضرت شاہ جمالؒ نے جب انھیں کمال کے درجے پر فائز ہوتے دیکھا تو فرمایا۔

"شیخ حسُو! اب تم اپنا کاروبار کرو کیونکہ کسبِ کمال کرنا بھی عبادت ہے۔ چنانچہ شیخ حسُو نے دوبارہ غلّہ فروشی شروع کردی۔ ایک روز آپ گندم تلوا رہے تھے اور ساتھ ساتھ دھارنیں گنتے جارہے تھے۔ جب تیرھویں دھارن گن رہے تھے تو آپ کے مُنہ سے نکلا تیراں، تیراں، تیراں کی تکرار نے آپ کی معرفت کو بیدار کردیا۔ آپ نے اس کا مطلب یہ لیا "یا الٰہی میں تیرا ہوں۔" بس پھر آپ نے دوبارہ کاروبار چھوڑ چھاڑ کر ایک مدّت شخصیت ولایت میں بسر کردی۔ جب عمر کا ایک حصّہ خدا رسیدگی میں بسر کرچکے تو پھر آپ کو حضرت شاہ جمالؒ نے دوبارہ ہدایت کی کہ خدا کی یاد کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی کرو۔

چنانچہ آپ دوبارہ سلوک میں آگئے اور پھر تیل بیچنے کا کام شروع کیا اور اسی کاروبار کی بدولت آپ کے نام کے ساتھ تیلی کے لفظ کی اضافت پیدا ہوگئی اور پھر عمر بھر ریاضت و عبادت اور کسبِ کمال میں مصروف رہے اور پھر جب وصال کرگئے تو آپ کو ایبٹ روڈ پر جانکی دیوی جیت سنگھ خیراتی ہسپتال کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

یہ حالات تو حضرت بابا شاہ جمال کے ایک مُرید خاص کے تھے جن کے اندر آپ نے اپنے اوصاف کی روشنی ڈالی اور اُس کو ہمیشہ کے لیے تاباں کردیا تھا۔ حضرت بابا جی خود بھی نہایت خوش اندام و خوش اخلاق انسان تھے۔ آپ خانوادۂ سادات سے متعلق ہونے کی بنا پر سخاوت، زہد، شرافت اور نجابت کے داعی تھے۔ علم و دانش اور عبادات آپ کے طبعی اخلاقیات میں شامل تھے۔ کامل ولایت ہونے کے باعث آپ کو بلند مقام حاصل تھا۔ اسباب معیشت ناپید ہونے کے باوجود آپ نہایت متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے اور کبھی کسی کے دستِ نگر نہ ہوتے تھے۔

آپ کے ارادت مندوں میں جہانگیر، شاہ جہاں جیسے عالی مرتبت شہنشاہ بھی تھے مگر آپ اُن سے کچھ نہ لیتے تھے۔ بلکہ آپ کے خزانے ہر ایک کے لیے کھلے تھے۔ جو سوالی آپ کے دَر پر آتا آپ اس کو روحانی دولت اور مادی دولت سے سرفراز فرمایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی سخاوت، فیاضی اور دریا دلی کی داستانیں آج بھی مشہور ہیں۔

حضرت بابا شاہ جمالؒ کی متوکلانہ زندگی کا ایک اہم حصّہ آپ کے مجاہدات ہیں۔ آپ طویل چلّہ کشی فرمایا کرتے تھے۔ ایک چلّہ ختم ہوتا تو دوسرا شروع کر دیتے تھے بلکہ زندگی کے آخری سال تو آپ نے گزارے ہی چلّہ کشی میں تھے۔ آپ کے چلّہ کشی کے مقامات کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ شیخوپورہ میں ایک قبرستان جو قلعہ کے نزدیک ہے اور شاہ جمال روڈ پر واقع ہے وہاں بھی آپ نے ایک طویل عرصہ تک مجاہدات کیئے۔ اسی طرح شاہدرہ اور شاہ رحمٰن (بھڑی شریف) میں بھی آپ چلّہ کشی فرماتے رہے۔ ریاست چمبہ (بھارت ضلع گورداسپور) میں بھی آپ کی نشست گاہ ہے۔ جس پر باقاعدہ عُرس بھی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ پے در پے چلّہ کشی اور مجاہدات آپ نے اپنے موجودہ مزار والی جگہ (اپنے مدرسہ) میں انجام دیئے اور چلّہ کشی میں آپ کی مشغولیت کا یہ عالم تھا کہ آپ کا وصال بھی چلّہ کشی کے دوران ہی ہوا۔ جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

حضرت شاہ جمالؒ کے معاصر مختلف اور مشہور، غیر مشہور سلاسل کے بہت سے اولیاء کرام تھے۔ اپنی شمعیں روشن کر کے جنہوں نے لاہور کو منوّر و تاباں کر رکھا تھا۔ دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں برصغیر میں اولیائے کرام کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا اور اس سیلاب کا زیادہ مرکز و منبع لاہور شہر تھا۔ اسی بنا پر حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جو اسی زمانے کے قطبِ ربانی ہیں۔ برصغیر کے شہروں کے لیے لاہور شہر کو قطبِ الارشاد کا لقب دیا تھا۔

حضرت بابا شاہ جمالؒ کی ذاتی زندگی کے متعلق جہاں اور کافی واقعات تذکراجات میں بیان کیئے گئے ہیں وہاں آپ کی شادی اور اولاد کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ تذکرہ نگاروں کے خیالات اور آپ کی مسلسل چلّہ کشی کے حالات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ نے حالتِ تجرد میں زندگی بسر کی۔ آپ نے اس عمل میں حضرت صابر کلیری کی تقلید کی کہ ایک دل میں دو محبوب جگہ نہیں پا سکتے۔ اسی لیے آپ کے وارثوں میں آپ کے لے پالک بیٹے حضرت شیخ فخر الدین کو ہی شمار کیا جا سکتا ہے جن کے متعلق گزشتہ صفحات میں تفصیلاً بیان کیا جا چکا ہے۔

حضرت شاہ جمالؒ کے وصال کے تیس سال بعد کا ایک واقعہ جو کہ حضرت کی کرامات کا حصّہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس کو بھی ان سطور کی زینت بنانا ضروری ہے۔ جو یوں ہے۔ آپ کے عرس کے موقعہ پر ایک منہ پھٹ فقیر آیا۔ اس کے دل میں یہ خواہش تھی کہ وہ حضرت کے مزار کے قرب وجوار میں مدفون ہو۔ چنانچہ جب اُس کو لنگر سے دو روٹیاں دی گئیں تو اُس نے سجادہ نشین کو نہایت سخت لہجے میں کہا۔

"تم عجیب آدمی ہو۔ بے کفن روٹیاں مجھے دے رہے ہو" (مطلب یہ کہ سالن کے بغیر) سجادہ نشین بھی صاحبِ اوصاف انسان تھے۔ انھوں نے فوراً کہا۔

"فکر نہ کرو تمہیں کفن بھی مل جاتا ہے۔" یہ الفاظ سجادہ نشین کے منہ سے نکلنے کی دیر تھی۔ اس فقیر پر اُسی وقت کپکپی طاری ہوگئی اور وہ زمین پر گر کر فوت ہوگیا۔ اُس کی قبر بھی حضرت شاہ جمالؒ کی خانقاہ کے احاطے میں بنائی گئی ہے یوں اُس فقیر نے اپنے مقصد کو حاصل کر لیا۔ اس واقعہ کے بارے میں بعض تذکرہ نویسوں کا خیال مختلف ہے۔ وہ اس طرح کہ اُس فقیر کو ایک اولیاء اللہ کے مزار پر بدزبانی اور منہ پھٹ اور گستاخ ہونے کی یہ سزا ملی تھی۔ جو عبرت آموزِ خلق ہے۔ حضرت کی خانقاہ کے قریب ہی وہ فقیر مدفون ہے۔

حضرت بابا شاہ جمالؒ کے وصال کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ جس جگہ آپ کے مزار کا تعویز ہے اس کے نیچے حجرے میں آپ حسبِ معمول چلہ کشی میں مصروف تھے اور حجرے کے دروازے مکمّل طور پر بند تھے۔ آپ لگاتار تیس دن تک حجرے میں بند رہ کر یادِ الٰہی میں مشغول رہے۔ تیسویں دن بارش اس شدّت سے ہوئی کہ آپ کے حجرے کی ایک دیوار گر پڑی۔ خادموں نے چاہا کہ حجرے کا دروازہ کھول کر آپ کو باہر نکالیں۔ تو ناگاہ اندر سے آواز آئی جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اس حجرے کو میرا مدفن تصوّر کرو اور اس کے اوپر میری قبر کا تعویز بنا دو۔ چنانچہ آپ کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ آپ کے لے پالک بیٹے شیخ فخرالدین نے حجرے کو مقبرہ کی شکل دے دی۔

آپ کے خلفاء میں حضرت شیخ فخرالدین سرِفہرست ہیں۔ دوسرے نمبر پر پیر حسّو تیلی ہیں حضرت شیخ فخرالدین اور ان کی اہلیہ بھی حضرت بابا جیؒ کے مزار کے احاطے میں ہی مدفون ہیں۔

حضرت بابا شاہ جمالؒ کی تاریخ وفات ۱۴ ربیع الثانی ۱۰۴۹ھ کو ہوئی۔ یہ شاہ جہانی عہد تھا۔ اسی تاریخ کو آپ کا سالانہ عرس بڑی آن وبان اور شان سے منایا جاتا ہے۔ آپ کا مزار فیروز پور روڈ اچھرہ موڑ کے قریب شاہ جمال کالونی میں واقع ہے۔

حضرت میراں موج دریا رحؒ

امیروں نے بادشاہ سے کہا کہ آپ نے یہ اس قدر جاگیر کثیر ایک فقیر کو دے دی ہے۔ اگر یہی جائیداد بہت سے لوگوں میں تقسیم کر دی جاتی تو اس سے بہت ساری مخلوقِ خدا خوشحال ہو سکتی تھی۔ ایک ہی شخص کو اتنی جائیداد و جاگیر دے دینے سے مستحقین کی ایک بڑی جماعت شاہی الطاف و عنایت سے محروم رہ گئی ہے۔ بادشاہ نے امراء سے کہا "اوروں اور اس فقیر میں کوئی نسبت نہیں۔ یہ فقیر تو ایک درویش ہے، صاحبِ کرامت ہے اور صاحبِ علم و حلیم ہے۔" امراء نے حاسدانہ ریشہ دوانیوں کے زیرِ اثر بادشاہ کو ایک اور آزمائشی سوال کیا۔ "جہاں پناہ اگر یہ فقیر جو آپ کی نظر میں درویش اور صاحبِ کرامت ہے تو اُس کو کہا جائے کہ کوئی کرامت دکھائیں جسے ہم بچشمِ خود دیکھیں تو پھر آپ کے اعتقاد سے اتفاق کریں۔

یہ صاحبِ یقین بادشاہ اکبرِ اعظم تھا جو جس درویش کو امراء زیرِ بحث لا رہے تھے وہ حضرت میراں موج دریا بخاریؒ سہروردی صاحبِ عرفان ہستی تھی۔ اکبر بادشاہ نے اپنے ناعاقبت اندیش اور نافہم امراء سے کہا کہ حضرت موج دریاؒ ایک صاحبِ کرامت و عرفان شخصیت ہیں وہ کوئی بھی کرامت دکھا سکتے ہیں۔ تم جس طرح چاہو اُن کا امتحان کر لو تاکہ تمہیں اندازہ ہو کہ میں نے اتنی بڑی جاگیر کسی عام آدمی کو نہیں دی بلکہ ایک تاجدارِ روحانیت و ولایت

کی خدمت میں ایک حقیر نذرانہ پیش کیا ہے۔

امراء نے بادشاہ سے کہا "جہاں پناہ! حضرت موج دریاؒ سادات خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ کہاوت مشہور ہے کہ سادات کو آگ نہیں جلاتی۔ حضرت کوئی کرامت صادر فرمانا چاہیں تو ہمیں جلتی ہوئی آگ میں کُود کر دکھاتیں۔ وہ صاحبِ کرامت ہوتے تو آگ میں جانے سے تعرّض نہیں کریں گے اور دُوسرے اگر وہ واقعی سیّد ہوتے تو آگ اُن کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گی۔

اکبرِ اعظم نے امراء کی باتیں حضرت موج دریاؒ کی خدمت میں عرض کیں۔ دریائے ولایت جوش میں آیا۔ درویشِ خدا نے مسکرا کر فرمایا "بادشاہ تو اور تیرے امراء دو زراء جتنی بڑی آگ اپنی مرضی سے جلالیں سیّد آگ سے نہیں گھبراتے گا۔"

شاہی قلعہ کے اندر ایک بہت بڑا لوہے کا تندور گرم کیا گیا۔ بادشاہ اور اس کے امراء کے روبرو حضرت موج دریاؒ کو اس تندور میں ڈالنے کا فیصلہ کیا گیا۔ حضرت ایک شان اور تزک و احتشام کے ساتھ قلعہ میں پہنچے۔ ادھر حضرت کے صاحبزادے سیّد شہاب الدین کو پتہ چلا کہ قلعے کے اندر ایک لوہے کے گرم تندور میں اُن کے والدِ گرامی کو محض ایک کرامت دکھانے اور سیّد نسب ہونے کی تحقیق کرنے کی بناء پر ڈالا جا رہا ہے تو ولیٔ کامل کا کامل بیٹا فوراً سُوئے قلعہ روانہ ہوا۔ قلعہ کا دروازہ بند تھا۔ محافظوں نے انھیں قلعہ میں جانے سے روک دیا۔ آپ نے محافظوں سے فرمایا "باپ تو کرامت بعد میں دکھائے گا بیٹے کی کرامت پہلے دیکھو۔" بس پھر کیا تھا حضرت شہاب الدینؒ نے خُدا کے حُکم سے فوراً شیر کی شکل اختیار کر لی اور قلعہ کے مضبوط دروازے کو ایسی زوردار ٹکّر ماری کہ دروازے کے پُرزے اُڑ گئے۔ قلعے میں شیر داخل ہوا تو بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ پناہ گاہیں ڈھونڈنے لگے۔ شیر نے بادشاہ کی طرف دیکھا اور طمانچہ مارنے کے لیے اپنا پنجہ اٹھایا۔ اکبر بادشاہ خوفزدہ ہو کر حضرت موج دریاؒ کے پیچھے چُھپ گیا۔ حضرت تو جانتے تھے کہ شیر درحقیقت اُن کا ہی لختِ جگر ہے جو بادشاہ اور امراء کو یہ بتانے آیا کہ ایک ولی زادہ اگر صاحبِ کرامت ہو سکتا ہے تو اُس کا باپ کونسے مقامِ کرامت پر متمکن ہو گا۔ بادشاہ کو خوفزدہ دیکھ کر حضرت موج دریاؒ نے شیر کو مخاطب کیا۔

"اے شہاب الدین کیا تو نہرا ہو گیا ہے (ہندی میں نہرا شیر کو کہتے ہیں) فقیروں کو ایسی گرمی نہیں چاہیئے۔" یہ سُننا تھا کہ آپ شیر سے اصلی شکل میں آ گئے اور عرض کی "اے امیرانِ اکبر! اکبر آپ سے کرامت چاہتا ہے کہ آپ اس تندور میں جائیں۔ فرزند کے ہوتے ہوتے باپ کیوں

آگ میں جاتے۔ میں آپ کا لختِ جگر ہوں اوّل میں آگ میں جاؤں گا۔ اگر مجھ کو آگ نقصان پہنچائے گی تو پھر آپ بے شک آگ میں چلے جائیں۔" باپ بیٹے کی باتیں سُن کر حضرت موج دریاؒ کا ایک خدمت گار جو آپ کا باورچی اور وضو کروانے والا تھا آگے بڑھا اور عرض کی آگ سادات کو تو کیا اُن کے خدام پر بھی اثر نہیں کر سکتی آپ مجھے حکم دیں میں بادشاہ اور اُس کے مقربین کو حضرت کی شان و عرفان کی تصویر و تفسیر دکھاؤں اور بتاؤں۔"

حضرت موج دریاؒ نے اپنے خادم جن کا نام فرید تھا حکم دیا "فرید خدا کا نام لے کر تندور میں داخل ہو جاؤ۔" یہ ارشاد سُنتے ہی فرید نے اللہ اکبر کہا اور خُدا کا ذکر کرتے ہوئے آگ میں کُود گیا۔ اکبر اور اُس کے امراء نے فرید کو آگ میں کُودتے دیکھا تو سخت شرمندہ ہوئے اور فوراً فرید کو آواز دی "فرید واپس آجاؤ بس ہم نے دیکھ لیا ہے کہ حضرت موج دریاؒ واقعی صاحبِ کرامت بزرگ ہیں جن کے خدام بھی اعلیٰ و ارفع مقام رکھتے ہیں۔"

مگر فرید بادشاہ اور امراء کی بات کیا سُنتے تھے وہ آگ کے اندر اس طرح بیٹھ گئے جیسے کسی سرسبز و شاداب باغ میں بیٹھے ہوں اور بادشاہ و امراء کی التجاؤں کی کوئی پروانہ کی اور بلاجنبش آگ میں بیٹھے رہے۔ آخر بادشاہ نے حضرت موج دریاؒ سے درخواست کی حضرت اپنے مرید کو حکم دیجئے کہ وہ باہر آجائے۔ اب ہم مان گئے ہیں کہ آپ سادات نسب بھی ہیں اور صاحبِ کرامت و عرفان بھی ہیں۔"

حضرت موج دریاؒ نے اپنے خادم کو حکم دیا "فرید! آگ سے باہر آجاؤ۔" فرید نے مرشد کا ارشاد سُنا تو فوراً آگ سے باہر آگئے اور اپنے پیر کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ بادشاہ نے امراء سے پوچھا "اب بتاؤ حضرت کو میں نے اتنی بڑی جاگیر دے کر کوئی غلط فیصلہ کیا تھا؟"

امراء یک زبان ہو کر بولے "جہاں پناہ! آپ بلاشبہ سچے ہیں۔ آپ کا فیصلہ دانش مندانہ ہے حضرت موج دریاؒ نہ صرف ایک کامل ہستی ہیں بلکہ وہ تو ایک فیض رساں ہستی ہیں جن کے دریائے فیض سے سارا جہاں آبیار ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔

❀

حضرت میراں موج دریاؒ ۱۳۳۵ء بمطابق ۹۴۰ھ میں اوچ شریف میں پیدا ہوئے۔ اوچ شریف اہل اللہ کی آماجگاہ ہے۔ آپ مختلف واسطوں سے حضرت جہانیاں جہاں گشت کے قرابت دار تھے۔ یہ زمانہ مغل بادشاہ نصیر الدین ہمایوں کا تھا۔ جب یہ آفتابِ ولایت طلوع ہوا آپ کا نام میراں محمد شاہ رکھا گیا۔ آپ کے والدِ گرامی کا نام نامی سیّد

عفی الدین تھا جو خود بھی روحانیت و معرفت میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ اس طرح حضرت میراں موج دریاؒ کے خاندان میں ولایت و شرافت اور کرامت موروثی تھی۔ آپ سادات نسب تھے۔ آپ کے خاندان نے سلسلہ سہروردیہ کو لاہور اور پنجاب میں پھیلانے میں قابلِ ستائش خدمات انجام دیں۔ حضرت موج دریا نے ابتدائی تعلیم اپنے والدِ گرامی سے ہی حاصل کی۔ آپ کے والد کیونکہ ایک عالمِ دین اور بزرگ انسان تھے اس لیے انھوں نے اپنے فرزند کی تربیت خود کرنے کا فیصلہ کیا۔

حضرت موج دریاؒ نے عمر کے ابتدائی چند سالوں میں قرآن حکیم پہلے ناظرہ پھر حفظ پڑھ لیا۔ یوں والد کی رفاقت میں رہ کر آپ کی طبیعت میں اتباعِ شریعت اور حصولِ معرفت کا بھرپور شوق پیدا ہو گیا۔ بعد میں آپ نے مختلف اساتذہ سے اکتسابِ علم کر کے اپنے ظاہری علوم کی تکمیل کی۔ تحصیلِ علم کے بعد حضرت موج دریاؒ نے اپنے والدِ محترم کے دستِ مبارک پر سلسلہ سہروردیہ میں بیعت کی۔ بیعت کے بعد آپ کے والد جو آپ کے مرشد بھی تھے کی توجہ سے آپ کی شخصیت دوچند ہو گئی۔ اس طرح آپ نے ریاضت و عبادت کے بڑے بڑے مقام ایک محدود عرصہ میں سر کر لیے۔ آپ کا یہ معمول تھا کہ آپ دن بھر عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ ذکر و فکر تو آپ کی رُوح کی غذا تھی۔ حصولِ معرفت کے لیے آپ نے سخت سے سخت مجاہدات کیے اور یوں آپ منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ جب آپ معرفت و حقیقت میں یکتا زاور کامل ہو گئے تو آپ کے والدِ محترم نے آپ کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور مخلوقِ خُدا کو فیض رسانی کی تلقین کی۔

آپ نے اپنے مرشد والد گرامی کے حکم کے مطابق خلافت حاصل کرتے ہی اپنا زیادہ وقت خلقِ خُدا کی رہنمائی اور اصلاح میں گزارنا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی بزرگی، دانائی، پارسائی، نیک نامی اور عرفان کا پرچار چہار اطراف ہونے لگا۔ آپ کی شخصیت کے کمال سے فیض یاب ہونے کے لیے لوگ دُور دُور سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر انوار و اکرام سے جھولیاں بھرنے لگے۔ آپ کی عظمت و فضیلت کے قصّے مشہور بادشاہ جلال الدین اکبر نے بھی سُنے۔ جو اُن دنوں سخت متفکر و مضطرب تھا۔

اکبر کے لیے چتوڑ کے قلعہ کی فتح ایک جہنم بن گئی تھی۔ مغلیہ فوج، اس کے بڑے بڑے جرنیل اور سپہ سالار بے بس ہو چکے تھے۔ تمام تدابیر اکارت ہو چکی تھیں۔ اگرچہ بادشاہ خود بھی ایک باصلاحیت اور فنونِ حرب کا ماہر سمجھا جاتا تھا مگر اُس کی بھی کوئی پیش نہ چلی۔ ہر شخص بے چین تھا۔

بادشاہ کا تو یہ عالم تھا کہ اُس کے دن کا چین اور رات کا آرام موقوف ہو گیا تھا۔ اس کے قلب و ذہن پر ایک ہی بات نقش تھی کہ چتوڑ کا قلعہ کیونکر فتح ہو۔

ناچار ماہر نجومیوں اور جوتشیوں کی خدمات لی گئیں کہ وہی بتائیں یہ ناقابلِ تسخیر قلعہ کس طرح، کب اور کس کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ ماہرین نجوم اکبر اعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی۔

"اے ظلِ سبحانی، تاجدارِ ہندوستان! یہ قلعہ فتح کرنا ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں ہے۔ اوچ شریف میں ایک صاحبِ اوصاف، یگانۂ وقت اور نابغۂ عصر ہستی تشریف فرما ہے دُنیا جس کو حضرت میراں محمد شاہ عرف موج دریا کے نام سے جانتی ہے۔ اگر وہ یہاں تشریف لائیں تو اُن کی دُعا اور عطا کی بدولت یہ مہم سر ہوگی ورنہ چتوڑ کے قلعے کی سرکوبی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔"

اکبر نے نجومیوں کی باتیں سُنیں تو فوراً اپنے مشیروں کا ایک وفد تیار کیا جس کو ایک سانڈنی دے کر حضرت موج دریا کی خدمت میں اوچ شریف روانہ کیا گیا۔ اور اُن سے کہا کہ حضرت سے بادشاہ کی طرف سے عرض کریں کہ وہ چتوڑ کے قلعہ کی فتح کے لیے مدد فرمائیں۔"

وفد اوچ شریف پہنچا اور حضرت موج دریاؒ کی خدمت میں بادشاہ کی درخواست پہنچائی۔ آپ نے فرمایا "آپ سب لوگ واپس جائیں اور یہ جو سانڈنی بادشاہ نے میرے لیے بھیجی ہے وہ بھی واپس لے جائیں ہم از خود چتوڑ گڑھ پہنچ جائیں گے۔" وفد نے عرض کی "حضرت وہاں پہنچ کر ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ آپ تشریف لے آئے ہیں۔

آپ نے فرمایا "جس دن ہماری آمد وہاں ہوگی اس روز سخت طوفانی آندھی آئے گی۔ تمام خیمہ جات اور قناتیں گر جائیں گی۔ چراغ گُل ہو جائیں گے۔ صرف ایک چراغ روشن رہے گا اور وہ چراغ ہمارے خیمہ کا چراغ ہوگا۔"

وفد نے واپس پہنچ کر اکبر بادشاہ کو حضرت میراں موج دریاؒ سے ملاقات کا احوال سنایا اور اُن کے حکم کی تفصیل بیان کی۔ بادشاہ اور امراء اب حضرت کی آمد کا انتظار کرنے لگے انتظار کی شدّت بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ بادشاہ جو ایک طرف تو چتوڑ کے قلعے کی فتح سے مایوس ہو رہا تھا حضرت کے انتظار نے اس کو مزید پریشان کر دیا۔ آخر اس کے انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں۔ حضرت موج دریاؒ کے فرمان کے عین مطابق ایک روز رات کے وقت سخت آندھی آئی۔ شاہی فوج چتوڑ کی سرکوبی کے لیے صف آرا تھی، بادشاہ اپنے خیمے میں اپنے مصاحبین کے ہمراہ فروکش تھا کہ ایسی زور کی آندھی آئی جس نے فوج کی صفیں، خیموں کی طنابیں اور چراغوں

کی روشنی تہہ و بالا کر دیں۔ ہر شخص خوف و ہراس میں ڈوب گیا۔

جب طوفان تھما تو بادشاہ نے حضرت موج دریاؒ کی پیش گوئی کے مطابق مصاحبین کو حکم دیا کہ وہ پورے لشکر اور دیگر خیمہ جات میں جا کر دیکھیں کہ کون سی جگہ ایسی ہے جہاں چراغ روشن ہے تاکہ حضرت موصوف تک پہنچا جائے اور ان کی قدم بوسی کی جائے۔

مصاحبین نے حضرت کو تلاش کرنا شروع کیا تو اُن کی نگاہ ایک ایسے خیمے پر پڑی جس کے اندر چراغ روشن تھا۔ وہ فوراً بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عرض کی۔

"جہاں پناہ ایک خیمہ ایسا ہے جہاں اس طوفان میں بھی چراغ روشن رہا ہے۔ یقیناً وہ خیمہ حضرت موج دریاؒ کی قیام گاہ ہے۔"

اکبر بادشاہ نے اپنے مصاحبین کو ساتھ لیا اور برہنہ پا حضرت موج دریا کی خدمت میں چل پڑا۔ جب وہ اس خیمے کے نزدیک پہنچا جس میں چراغ جل رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ خیمہ بقعۂ نور بنا ہوا ہے مگر اندر کوئی چراغ نہیں جل رہا اور اس چُندھیا دینے والی روشنی میں ایک نورانی صورت والا شخص محوِ عبادت ہے۔ جب حضرت عبادت سے فارغ ہوتے تو اکبر نے آپ سے اندر آنے کی اجازت چاہی۔

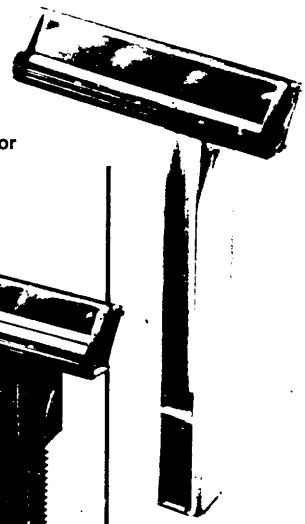
حضرت موج دریا نے دیکھا کہ شہنشاہ ننگے پاؤں اُن کی خدمت میں حاضر ہے۔ فرمایا "اے بادشاہ اندر آجاؤ۔ کہو اس فقیر سے کیا چاہتے ہو۔" اکبر نے عرض کی۔ اے درویش اور ولیٔ کامل! جس مالکِ کون و مکان نے تیرے خیمے کو بلا چراغ روشن کر رکھا ہے تیرے وسیلے سے مجھے اُس کی مدد درکار ہے۔ مَیں چتوڑ کے قلعے کی تسخیر کے لیے ایک مدّت سے کوشاں ہوں مگر سخت تدبیر، محنت اور سینہ کاری کے باوجود کوئی ثمر آور نتیجہ نہیں نکل رہا۔ یہ کام ہم جیسے ناتوانوں کے بس سے باہر ہے۔ اب تو کسی فیض رساں نظر کی ضرورت ہے جو آپ کے پاس ہے۔ آپ کی توجہ سے خدا کا کرم اس عاجز و ناتواں پر ہو سکتا ہے۔"

حضرت موج دریاؒ نے فرمایا "بادشاہ تو پورے ہندوستان کی قسمت کا مالک ہے۔ یہ معمولی سا قلعہ نہیں فتح ہوا تو گھبرا گیا ہے۔ جاؤ۔ کل انشاءاللہ قلعہ فتح ہو جائے گا۔"

دُوسرے روز حضرت موج دریا علی الصباح قلعہ کے پاس تشریف لے گئے اور تین بار باآوازِ بلند سے اسم ذات "اللہ" اپنی زبان مبارک سے پکارا۔ خُدا نے کرم کیا اکبر فوج نے نہایت برق رفتاری، پامردی اور جاں فشانی سے دشمن پر حملہ کیا کہ ناقابلِ تسخیر قلعہ چند گھنٹوں کے اندر فتح ہو گیا۔

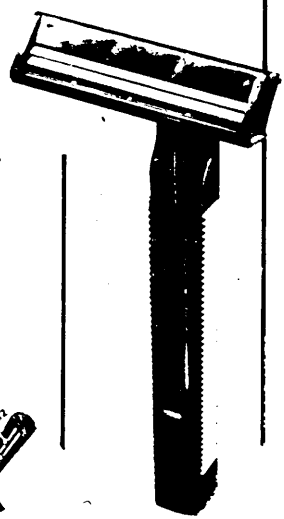
Treet I
PLATINUM
Single Fixed Head Disposable Razor

Ideal for soft, delicate skin.
Many more smooth, safer shaves
than any ordinary double-edge blade.



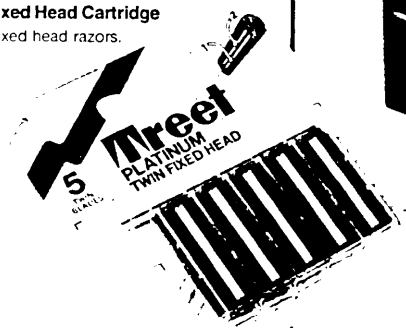
Treet II
PLATINUM
Twin Fixed Head Disposable Razor

Twin-blade set at prefixed angle for
closer, smoother, safer shaves.



Treet II
PLATINUM
Twin Fixed Head Cartridge

Fits all fixed head razors.



The price yet another plus



PRESTIG

حضرت موج دریاؒ کی خدمت میں اکبر بادشاہ حاضر ہوا اور شکریہ ادا کیا۔ آپ نے بادشاہ کو قلعہ فتح ہونے کی مبارک باد دی اور فرمایا "بس بادشاہ اتنی سی بات تھی جس کے لیے تُو بے چین تھا۔ اچھا اب تیرا قلعہ تو فتح ہو گیا ہم چلتے ہیں۔"

بادشاہ نے عرض کی "حضرت! میں آپ کا خادم ہوں۔ آپ میرے پاس رہیں تو یہ میری خوش نصیبی ہو گی۔" آپ نے انکار کرتے ہوتے فرمایا "شاہوں اور گداؤں کا کیا میل۔ ہم جاتے ہیں۔"

بادشاہ پھر دست بستہ ہوا اور عرض کی حضرت! پھر آپ میری سلطنت کے کسی حصّے میں قیام فرمائیں تاکہ میں اپنے دل کو مطمئن کر سکوں کہ حضرت نے اس عاجز سے کچھ قبول فرمالیا۔ یہ سُن کر حضرت موج دریاؒ نے لاہور میں رہنا قبول فرمالیا۔ اسی دوران اکبر نے حضرت کو بٹالہ میں دو لاکھ روپے کی جاگیر عطا فرمائی۔ وہ جاگیر آپ نے قبول فرمالی جو اکبری فرمان کی رُو سے نسلوں آپ کی اولاد کی ملکیت میں رہی۔ یہی وہ جائیداد ہے جس کے بارے میں ابتداً سطور میں تفصیلات بیان کی گئی۔ جب اکبر کے عاقبت نااندیش گورنر اور امراء حضرات سے کرامت بچشمِ خود دیکھنے کے طالب ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ امیر و وزیر حضرت میراں موج دریاؒ کے مقامِ ولایت و کرامت سے ناواقف تھے اور چتوڑ کے قلعہ کی تسخیر والے واقعہ سے نابلد و ناآشنا تھے۔

لاہور پہنچ کر حضرت میراں موج دریاؒ نے اہالیان لاہور کی علوم ظاہری و باطنی سے تزویج کی۔ اس علاقے میں بے شمار ہندوؤں کو اسلام کی روشنی سے منوّر کیا۔ لوگوں کو قرآنی تعلیمات اور سنتِ رسولؐ کا پابند بنایا اور اپنے حلقے میں آنے والوں کے عقائد و اخلاق کی اصلاح کی۔ آپ دن بھر درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ آپ نے درس کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کروایا جہاں علوم و معرفت کے تشنگان دُور دراز سے آتے تھے جن کی رہائش و خوراک اور بود و باش کے لیے حضرت نے ـــــــ دارالاقامہ تعمیر کروا رکھا تھا۔ آپ کا لنگر خانہ بٹالہ اور لاہور میں باقاعدہ چلتا تھا۔ علوم کی تلاش میں آنے والوں اور دیگر لوگوں پر آپ تمام نقد و صرف خود اپنی جیب سے کرتے تھے۔ اپنی جاگیر کی تمام آمدنی آپ نے مخلوقِ خدا کے لیے وقف کر رکھی تھی۔

آپ کی سیرت و کردار کی روشنی اس طرح پھیلی کہ آپ کے ارادت مندوں اور عقیدت والوں کا شمار کرنا مشکل ہو گیا۔ لوگ آتے آپ کی مجلس میں بیٹھتے اور سیراب ہوتے تھے۔ آپ

کی تعلیم زہد و تقویٰ، شریعت قرآنی اور اسوۂ محمدیؐ پر مبنی ہوتی تھی۔ آپ اخلاقِ صالحہ اور اسوۂ حسنہ کے مالک تھے۔ آپ کی خدمت میں بیٹھنے والے آپ کے پاکی عادات و اطوار سے ہی اتنے متاثر ہوتے کہ آپ کے گرویدہ ہو جاتے اور آپ سے دائمی تعلق استوار کر لیتے تھے۔ آپ کی ولایت و ریاضت اور طریقت و حقیقت کی سربلندی کا یہ عالم تھا کہ آپ کی اولاد اور آپ کے مریدوں میں بھی بڑے بڑے صاحبِ اوصاف، بہقی العصر اور لاثانی بزرگانِ دین پیدا ہوئے۔ آپ کی شانِ ولایت نے رموزِ حقیقت سے ہر اُس شخص کو روشناس کیا جو آپکی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپ کی نگاہ فیض رساں سے بہرہ ور ہوا۔ حضرت موج دریاؒ نے اپنی عنایت و ولایت کے دم قدم سے اہلِ ہندوستان کی بالعموم اور اہلِ لاہور کی بالخصوص بہت خدمت کی اور خدا کے ہاں عالی و بلند مرتبہ پایا۔ حضرت موج دریاؒ علومِ حکمت و آگہی، دین دانش، معرفت و عرفان کے ایک دریا تھے ناپید کنار تھے۔

حضرت میراں موج دریاؒ طبیعت میں جلال ہونے کی وجہ سے جب کبھی جلال میں آکر کسی پر خوش ہوتے تو اس پر نوازشات و عنایات کی میگھا برسا دیتے۔ اتنا کچھ عطا فرما دیتے کہ سائل کے لیے رحمتِ خداوندی اور فضل باری کے دریا بہنا شروع ہو جاتے۔ حضرت کی اسی موج دریا کی صفت کے پیشِ نظر آپ کے عقیدت مندوں اور مریدوں نے آپ کو موج دریا کا خطاب دے ڈالا اور پھر رفتہ رفتہ آپ اس عرفیت کے طفیل میراں موج دریا ہو گئے۔

حضرت موج دریا نے سنتِ محمدیؐ کے تحت شادیاں بھی کیں۔ تاریخ کی کتابوں میں آپ کی دو شادیوں کا ذکر مذکور ہے۔ آپ کی پہلی زوجہ محترمہ کا نام بی بی کلاں تھا جبکہ دوسری اہلیہ عفیفہ نورنگ بی بی تھا۔ یہ دونوں خواتین نہایت عابدہ، زاہدہ اور صالحہ تھیں۔ تہجد گزار اور شب زندہ دار تھیں۔ آپ کی پہلی بیوی جو وڈی بی بی کہلاتی تھیں گیلانی سادات خاندان سے تھی اور ایک جید و کامل بزرگ حضرت سید عبدالقادر ثالث کی دخترِ نیک اختر تھیں۔ موصوف عبدالقادر ثالث کا مزار حضرت چراغ شاہ کے مقبرے کے اندر واقع ہے۔ وڈی بی بی کے بطنِ عفت سے حضرت موج دریاؒ کے دو بیٹے پیدا ہوئے جن کا نام حضرت سید صفی الدین اؤ سید بہاؤ الدین تھے۔

حضرت موج دریاؒ نے دوسری شادی ایک مسلمان راجے کی بیٹی نورنگ بی بی سے کی تھی

جن سے ایک بیٹا تولد ہوا تھا۔ آپ کی پہلی زوجہ محترمہ کو آپ کا دوسرا نکاح ناگوار گزرا۔ اسی لیے مصلحت کی بنا پر اور حضرت بی بی کلاں کی مرضی و منشا پر انھیں بٹالہ بھیج دیا اور اسی مقام پر اُن کے لیے حویلیاں تعمیر کروائی گئیں۔ دوسری بی بی نورنگ لاہور میں قیام پذیر ہوئیں۔ دوسری بیوی بی بی نورنگ سے پیدا ہونے والے فرزند شہاب الدین نہرا تھے جو کامل ولی اور مکمل شیخ تھے۔ یہ وہی فرزند ہیں جو آگ میں کودنے والی آزمائش کے وقت شیر بن کر مغل شہنشاہ کے قلعے میں داخل ہوتے تھے۔ خُدا کے حُکم سے ان کے شیر بن جانے کی وجہ سے ہی حضرت موج دریاؒ نے انھیں نہرا کا خطاب دیا تھا۔

حضرت میراں موج دریا کے حقیقی بھائی سیّد جلال الدین سہروردی تھے۔ آپ بھی بزرگان اُچ شریف کے نقشِ قدم پر چلنے والے بزرگ تھے۔ آپ اپنے بھائی موج دریا کے ساتھ ہی لاہور تشریف لاتے تھے۔ انھوں نے اپنی تعلیم و تربیت کا ابتدائی زمانہ اچ شریف میں بسر کیا اور اپنے والد ماجد کے مرید بنے اور انھیں سے ظاہر و باطنی تعلیم حاصل کر کے بے شمار روحانی مشاہدات و مجاہدات کیے۔ ذکرِ الٰہی، کثرتِ عبادت آپ کے محبوب مشاغل تھے۔ آپ اللہ کی محبّت کے سامنے دنیا کو بالکل حقیر سمجھتے تھے۔ عشقِ رسُول، یادِ الٰہی اور ترک و تجرید میں لاثانی تھے۔ دُنیا داروں سے بالکل کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے بڑے بھائی میراں موج دریاؒ کے پاس بھی کم ہی ٹھہرا کرتے تھے۔ بلکہ اپنا زیادہ تر وقت باغوں اور ویران جگہوں پر گزارتے تھے۔ آپ نے ۱۶۰۷ء مطابق ۱۰۱۶ھ میں شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد وصال فرمایا اور واقع محمد نگر قبرستان بیبیاں پاک دامناں کے اندر مدفون ہوئے۔

حضرت موج دریاؒ کے صاحبزادے سیّد صفی الدین صاحبِ کمال اور ولیِ کامل بزرگ تھے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا آپ حضرت موج دریا کی پہلی زوجہ محترمہ بی بی کلاں کے بطن سے تھے۔ آپ نے اپنی تعلیم و تربیت، معرفت اور سلوک کی منازل اپنے والدِ گرامی سے حاصل کی۔ حضرت موج دریاؒ نے آپ کو اپنی روحانی ضوفشانی سے ایسا چمکایا اور عرفان سے ایسا تراشا اور سلسلہ سہروردیہ سے وابستہ کیا کہ آپ ہشت پہلو بن گئے بلکہ حضرت موج دریا کے صحیح معنوں میں جانشینی کے فرائض بھی آپ نے ہی انجام دیئے۔ کیونکہ حضرت موج دریا کا جاری کردہ سلسلہ درس و تدریس ان کے وصال کے بعد بھی آپ نے ہی برقرار رکھا۔ آپ والد کی وفات کے بعد اُن کے ارادت مندوں کی کھلے دل

اور دابازوں سے خدمت کرتے تھے۔

حضرت موج دریاؒ کی لاہور میں قائم کردہ خانقاہ جن میں فقرا اور طالبانِ طریقت کی تربیت کے انتظام ہوتے تھے۔ دُور دراز سے آنے والے طلباء کے قیام وطعام کے بندوبست ہوتے تھے۔ سید صفی الدین نے ان سب کو جوں کا توں رکھا۔ اور اُن کے انتظام، ان کے پروگرام اور اُن کی آن بان اور شان میں رائی برابر فرق نہ آنے دیا۔ جس طرح خانقاہ کا ماحول حضرت موج دریا کی حیات میں تقویٰ و پرہیزگاری اور خلوص و توکل پر مبنی تھا۔ اور اسی ماحول سے بڑے بڑے گنہگاروں کا ذہن بدل جاتا اور وہ طالبِ مولا ہو جاتے تھے۔ حضرت کی وفات کے بعد بھی اُن کے اس جلیل القدر فرزند نے آپ کے پروگرام اور خواہشات کو جاری اور ساری رکھا۔

حضرت سید بہاؤ الدین سہروردیؒ حضرت میراں موج دریاؒ کے فرزندِ ثانی تھے۔ آپ پر والد کی کامل توجہ کا نتیجہ یہ تھا کہ اللہ نے آپ پر بہت کرم کیا۔ آپ چونکہ کامل ولی کے فرزند اور خانوادۂ سادات کے چشم وچراغ تھے۔ اس لیے نسبتِ پدری اور شفقت وتربیت سے آپ صاحبِ روحانیت بنے۔ آپ کو ریاضت وعبادت سے بے حد شغف تھا۔ آپ سلسلہ سہروردیہ میں حضرت میراں موج دریاؒ سے بیعت ہوتے اور انہی کی زیرِ ہدایت ذکر وفکر اور عبادتِ الٰہی سے روحانیت کی تکمیل پائی۔ شرافت اور ولایت آپ کے خاندان میں نسل در نسل کافی عرصہ تک قائم رہی۔ آپ بہت متقی اور پرہیزگار تھے۔ آپ نے اپنے والد صاحب کے زیرِ سایہ بہت عرصہ لاہور میں گزارا مگر جب حضرت موج دریاؒ بٹالہ تشریف لے جاتے تو بعد میں آپ بھی اُن کے پیچھے بٹالہ چلے جاتے اور والد صاحب کے ہمراہ وہاں قیام فرماتے۔

حضرت بہاؤ الدین سہروردی نے تمام عمر والدین اور مخلوقِ خدا کی خدمت میں گزاری۔ آپ نے والد صاحب حضرت موج دریاؒ کے حکم پر سنتِ نبویؐ کے اتباع پر شادی کی۔ آپ کو خدا نے تین پسران سے نوازا۔ جن کے اسماء کی ترتیب سید نظام، سید میر مومن اور سید صادق علی تھی لیکن یہ تینوں صاحبزادے لاولد ہوئے۔

حضرت بہاؤ الدین سہروردی کو آپ کے والد گرامی میراں موج دریاؒ کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔ آپ کی قبر ایڈورڈ روڈ لاہور میں گنبد موج دریا بخاری میں ہے جہاں ایک مسجد بھی ہے۔

حضرت میراں موج دریاؒ کے تیسرے صاحبزادے سید شہاب الدین نہر اسہروردی ہیں

یہ آپ کی دوسری بیوی نورنگ بی بی کے بطن سے ۹۶۵ھ بمطابق ۱۵۵۷ء میں نصیرالدین ہمایوں کے عہد میں پیدا ہوئے۔ آپ بھی اپنے والد حضرت موج دریاؒ کے ہمراہ کبھی لاہور اور کبھی بٹالہ میں تشریف فرما رہتے تھے۔ آپ کو نہرا کا خطاب شیر کی شکل اختیار کرنے پر ملا تھا جس کی تفصیل ابتدائی صفحات میں آچکی ہے۔

شہاب الدین نہرا چار سال کے ہوئے تو حسب دستور شرع محمدی ان کے والد حضرت موج دریاؒ نے انھیں معلم فضل رسول کے پاس تعلیم ظاہری حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ استاد نے پڑھانے کے لیے انھیں کہا "کہو بچے الف" آپ نے فرمادیا الف۔ پھر کہا کہو "ب" آپ چُپ رہے کچھ نہ بولے۔ استاد نے پھر تاکید کی پڑھو۔ پھر مقرر کہا کہ پڑھو۔ مگر نہرا صاحب نے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ استاد نے سرزنش کی اور ایک طمانچہ لگا دیا۔ اور کہا بے وقوف الف سے آگے کیوں نہیں پڑھتا۔ یہ سُننا تھا کہ شہاب الدین نہرا نے استاد سے کہا "اے استاد بے وقوف تو تم ہو ہمارے لیے صرف اللہ ہی کافی ہے۔ ب کا علم ہم جان چکے ہیں"۔ استاد کو بہت غصہ آیا وہ انھیں پکڑ کر حضرت موج دریاؒ کی خدمت میں لے گئے اور سارا ماجرا سنایا۔

حضرت موج دریاؒ نے بیٹے کو ڈانٹا کہ استاد کی گستاخی کرتے ہو۔ الف پڑھنے کے بعد آگے پڑھنے سے کیوں انکار کر دیا ہے۔

صاحب بصیرت بیٹے نے جواب دیا "محترم پدر گاہی! الف اللہ ہمارے لیے کافی ہے ماسوائے اس کے ہمیں تمام علوم حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ شکم مادر میں پڑھا گئے ہیں۔ یہ کہہ کر حضرت شہاب الدین نہرا نے سارا قرآن پاک کھڑے پاؤں اپنے والد محترم میاں موج دریا کو سُنا دیا۔

حضرت موج دریاؒ بہت خوش ہوئے دوگانہ ادا کیا۔ استاد حیران کھڑے تھے۔ اُن کی حیرانی دیکھ کر حضرت موج دریاؒ نے فرمایا "اے معلم! یہ معرفت و عرفان کا راستہ تھا جو یہ بچہ محض خدا کی ذاتی تربیت سے ہی دیکھ چکا ہے۔ اب اس کی تعلیم تیرے بس سے باہر ہے۔ حضرت نہرا نے ساری عمر ریاضت و عبادت میں گزاری۔ آپ پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ ساری زندگی ہدایت خلق میں مصروف رہے۔ حضرت موج دریاؒ کی خصوصی توجہ سے آپ اُن مقامات پر پہنچے کہ کم عمری میں ہی آپ کے ارادت میں بے شمار لوگ حاضر ہونے لگے تھے۔

بٹالے والی زمین کا انتظام و انصرام آپ چلاتے۔ جس سے بے تحاشا آمدنی ـــــ ہوتی۔ اپنے صرف وخرچ اور لنگر کے اخراجات رکھ کر باقی ساری آمدنی غرباء، مستحقین اور ناداروں

میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ آپ نے ۱۱ ذوالحجہ ۱۰۴۱ھ کو بٹالہ میں اپنے صاحبزادے شاہ مصطفیٰ کو حکم دیا کہ آج ہم وصال کر جائیں گے تم ہمارا جنازہ بٹالہ سے لاہور لے جانا۔ بس جہاں ہمارا جنازہ رک جائے وہیں دفن کرنا۔ چنانچہ جس جگہ اب آپ کا مزار ہے وہاں آپ کا جنازہ پہنچ کر رُک گیا لہٰذا آپ کو بھوگیوال نزد باغبانپورہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

حضرت سیّد زندہ علی سہروردی حضرت میاں موج دریاؒ کے سجادہ نشین تھے۔ آپ بھی ترک و تجرید اور اوصافِ حمیدہ کے حامل تھے۔ سہروردیہ سلسلہ کے بیعت تھے۔ آپ حضرت میراں موج دریاؒ کے عقیدت مندوں اور مریدوں کی بے پناہ خدمت کیا کرتے تھے۔ حضرت موج دریا کے وصال کے بعد آپ نے حضرت کے مزار کے قریب ایک کنواں کھدوایا جس کا پانی کھاری تھا۔ رات کو خواب میں حضرت زندہ علیؒ نے دیکھا کہ حضرت میراں موج دریاؒ فرما رہے ہیں اسی کنویں کے بالکل قریب ایک دُوسرا کنواں کھود دیا جائے تو اس میں سے انشاءاللہ میٹھا پانی آئے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے حضرت میراں موج دریاؒ کی زبان مبارک کی لاج رکھ دی اور ان کا کہا پورا ہو گیا۔ اس بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بزرگوں کا یہ قول فیصل ہے کہ اولیاء قبل از وصال ایسی تلوار ہوتے ہیں جو زیرِ نیام ہوتی ہے اور بعد از وصال اُن کا معاملہ ننگی تلوار جیسا ہوتا ہے یعنی زندگی میں جو کہتے ہیں اس کے پورے ہونے میں قدرے تاخیر ہو جاتی ہے لیکن وصال کے بعد اُن کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات اٹل حقیقت بن جاتی ہے۔

حضرت میراں موج دریاؒ کے چہیتے مرید اور خلیفہ حضرت عبدالرزاق مکیؒ سہروردی تھے۔ آپ سبزوار کے رہنے والے سادات تھے۔ ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ جوانی میں سیاحت فرمانے روانہ ہوتے غزنی آئے، یہاں سے پشاور اور پھر لاہور اور دہلی پہنچے۔ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے دور میں فوج میں ملازم ہو گئے۔ پھر ملازمت چھوڑ کر مستقل لاہور آ گئے۔ لاہور میں قیام کے دوران آپ نے حضرت میراں موج دریاؒ کی بیعت کی اور انہی سے تربیت لیتے رہے اور اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ آپ نے حضرت موج دریاؒ کی خدمت میں گزار دیا۔ اپنے پیر روشن ضمیر کا ہر حکم دل و جان سے مانتے تھے۔ حضرت موج دریاؒ کی توجہ نے انھیں خرقۂ خلافت بھی عطا کیا اور اس کے ساتھ قطبِ زمانہ بھی بنا دیا۔

حضرت عبدالرزاق مکیؒ حضرت موج دریاؒ کے وصال کے بعد اپنی زندگی کی راتیں اور دن اپنے مُرشد کے مزار پر گزارتے تھے۔ آپ دُنیا داروں سے لاتعلق ہو گئے۔ آپ اغنیا اور امراء سے سخت متنفر تھے۔ آپ نہایت متقی اور پابند شرع بزرگ تھے۔ حضرت میراں موج دریاؒ بھی آپ کی علمیت و کمال اور زہد و رکوع کو تسلیم کرتے تھے۔

آپ نے ۱۶۷۳ء بمطابق ۱۰۸۴ھ میں وفات پائی اور آپ کو آپ کے حجرے میں ہی دفن کیا گیا۔ یہ آبادی کسی زمیندار کی آباد کردہ تھی۔ جس جگہ آپ کا مزار ہے اس کے گنبد کی وجہ سے بعد میں یہ علاقہ نیلا گنبد سے مشہور ہو گیا۔ آپ کی قبر ایک مدت تک خام رہی۔ اس زمانے میں مشہور تھا کہ ہر جمعرات کو وہاں شیر حاضری دینے آتا تھا اور اپنی دم سے جاروب کشی کرتا تھا پھر ایک رات حضرت میراں موج دریاؒ کی خانقاہ کے متولی نے خواب میں دیکھا وہ فرما رہے ہیں "حضرت غوث الاعظمؒ کے ارشاد کے مطابق عبدالرزاق مکیؒ کا مزار پکا بنا دیا جائے"۔ چنانچہ عبدالغفور نامی معمار نے بہ اہتمام یہ مقبرہ تعمیر کروایا۔

حضرت میراں موج دریاؒ جیسی جید، کامل نجیب الطرفین، یگانۂ عصر، بہقی الریز، جریدہ روزگار ہستی صدیوں بعد پیدا ہوتی ہے۔ حضرت کے ذکر کے ساتھ ساتھ اُن کے پسران اور مریدان کا ذکر ناگزیر تھا۔ جس کے تحریر کر دینے سے مضمون کی تشنگی تمام ہو گئی ہے۔

حضرت موج دریاؒ اکبر بادشاہ کے دور میں ۷۳ سال کی عُمر میں وصال فرما گئے۔ آپ کا سن وفات ۱۷ ربیع الاوّل ۱۰۱۳ھ بمطابق ۱۶۰۴ء تھا۔ آپ کی وفات بمقام خان فتاکہ بٹالہ میں ہوئی مگر آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت سید صفی الدین جنھیں آپ سے بے پناہ اور لازوال محبت تھی وہ آپ کو خان فتاکہ کے مقام سے لے کر لاہور پہنچے اور حضرت کی خواہش کے مطابق انھیں سپردِ خاک کیا۔

حضرت میاں موج دریاؒ کا مزار کسٹم ہاؤس ایڈورڈ روڈ پر سبز گنبد میں واقع ہے۔ یہ مزار شہنشاہ اکبر نے آپ کی وفات سے قبل ہی تعمیر کروا دیا تھا۔ مزار کے ساتھ کشادہ مسجد بھی ہے۔ مسجد کے صحن میں حضرت کے اعزّہ کی بھی قبریں ہیں۔ آپ کا مقبرہ بڑی شان و شوکت والا ہے جس پر مغلیہ طرز کا نہایت مضبوط اور شاندار گنبد ہے۔ آپ کا عرس ہر سال ۱۶، ۱۷، ۱۸ ربیع الثانی کو منایا جاتا ہے۔ آپ کے مزار پر لوگ آتے ہیں اور فیوض و برکات سے جھولیاں بھرتے ہیں۔

حضرت میراں محمد شاہ خُلد موج دریا سخا عین الیقین
سہروردی پیر شیخ باصفا بود بحرِ فیض بر روئے زمین

حضرت شاہ عنایت قادریؒ

حضرت ابوالمعارف شاہ عنایت قادری قدس سرہ کی شہرت و عظمت کی داستانیں پورے برصغیر میں زبانِ عام تھیں۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے جانشین محمد شاہ کو حضرت کی یہ شان اور بزرگی ایک نظر نہ بھاتی تھی۔ وہ اثنا عشری ملک کا داعی تھا اور اس کی ترویج کرنا چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو طریقت و تصوف سے سخت بُغض تھا۔ اس کی تنگ دلی اور کج نظری سے حضرت شاہ عنایتؒ باخبر تھے۔ مگر ایسی باتوں کو زیرِ خاطر لانا ایک درویش کے شایانِ شان کہاں۔ محمد شاہ اپنے دلی تعصّب سے مجبور ہو کر ایک روز اپنے ساتھ خوشامدیوں اور درباریوں کی ایک جماعت لے کر حضرت شاہ عنایت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس کا منشا تھا کہ وہ ایک جمِ غفیر کے سامنے حضرت کا امتحان کرے۔ حضرت شاہ عنایت نے شاہِ وقت کو اپنے خانۂ رحمت میں دیکھا تو اُس کی آمد کی عنایت بھی کشفی ذرائع سے جان گئے۔ مگر انھوں نے محمد شاہ پر کوئی توجّہ نہ دی۔

محمد شاہ نے خود ہی سلسلۂ کلام کا آغاز کیا اور کہا "حضرت! آپ کی اولیائی کی تعریفیں ایک مدّت سے سُن رہا ہوں۔ لیکن میں نے کسی پر بھی یقین نہیں کیا۔ میں ایک حقیقت پسند انسان ہوں۔ ہر چیز کو آزما کر دیکھنا میرا معمول اور اصول ہے۔ مَیں آپ کو ایک ولی اللہ اور باکمال شخص صرف اسی صورت میں مان سکتا ہوں کہ آپ کوئی کرامت مجھے اسی وقت دکھائیں"

حضرت شاہ عنایت مسکراتے اور فرمایا "اے دُنیا کے بادشاہ تو شاید یہ بھُول رہا ہے کہ تم سے بڑا بھی ایک بادشاہ ہے جو اس کائنات کا خالق و مالک ہے اور میں اُسی مالک کا ایک ادنیٰ سا بندہ ہوں۔ خُدا نے مجھے یقین کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ مجھے پکّا اعتماد ہے کہ خدا تعالیٰ مجھے تمھارے ہر امتحان میں کامیاب فرمائے گا۔ تو بتا کیا چاہتا ہے"۔

یہ شدید سردیوں کا موسم تھا۔ بادشاہ نے اپنے طور پر ایک سخت اور کڑی آزمائش میں درویش کو ڈالنے والی بات کی اور کہا "حضرت! میں تو آپ کو تب ولی مانوں گا کہ یہ سامنے جو آم کا پیڑ ہے اس سے مجھے اسی وقت تازہ اور پکّے، میٹھے آم کھلائیں"۔ سردیوں کے موسم میں آم کہاں ہو سکتے ہیں۔ بادشاہ نے حضرت کی بات کو چیلنج سوچ سمجھ کر کیا۔ مگر دوسری طرف بھی کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ حضرت شاہ عنایت نے آنکھیں بند کر کے خُدا سے سرخروئی کی دُعا کی۔ پھر شانِ ولایت جوش میں آئی۔ نگاہِ درویش اُوپر اٹھی۔ خُدا نے کرم کیا اِدھر حضرت کی نظر درخت پر پڑی اُدھر دھڑا دھڑ پکے ہوتے رس بھرے آم گرنے لگے۔

شہنشاہ محمد شاہ نے یہ کرامت دیکھی تو دم بخود ہو کر رہ گیا۔ حواس باختہ ہو کر کبھی حضرت کو کبھی حاضرینِ مجلس کو دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھیں اشکوں سے لبریز ہو گئیں اور وہ بے اختیار حضرت شاہ عنایت کے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔ صدقِ دل سے آپ سے معافی مانگی اور بیعت ہونے کی درخواست کی۔ حضرت نے بادشاہ کو معاف کر کے اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کر لیا۔

بادشاہ نے حضرت کو بھاٹی دروازے کے اندر واقع "اونچی مسجد" کی امامت قبول فرمانے کی درخواست کی۔ اونچی مسجد اندرون بھاٹی دروازہ بازار لکڑ ہارا میں موجود ہے۔ اُس مسجد کے در و دیوار پر قرآنی آیات کے علاوہ کندہ تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد اکبری عہد کی یادگار ہے۔ مگر بعض روایات کے مطابق یہ مسجد کسی سقہ نے بنوائی تھی۔ اس مسجد کی کُرسی اونچی ہے اس لیے اونچی مسجد سے موسوم و معنون ہے۔

حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے شاہِ وقت محمد شاہ کی درخواست قبول فرمائی اور مذکورہ مسجد کی امامت اختیار کرنا منظور فرما لیا۔

حضرت شاہ عنایتؒ دنیائے تصوّف کی ایک عظیم المرتبہ اور صاحبِ بصیرت ہستی تھے۔ اولیائے کرام اور صوفیاء میں آپ کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ آپ مشہور صوفی شاعر حضرت بابا بلھے شاہ قصوری کے مُرشدِ کامل تھے۔

حضرت شاہ عنایت ایک نہایت صالح اور نیک بزرگ مولوی پیر محمد صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ ولادت کے بارے میں ابواب تاریخ خاموش ہیں۔ مگر حضرت کے دستِ مبارک سے تحریر کردہ بعض مسودات جو انھوں نے اپنے ادوار کے علماء کے بارے میں تحریر کیے تھے اور اپنے صاحبزادے کو عطا فرماتے تھے اُن پر ۱۰۵۶ھ کا اندراج ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ عنایت معروف درویش مغل حکمران اورنگ زیب عالمگیر کے ہمعصر تھے۔ بلکہ عہدِ شاہ جہانی کو بھی آپ نے اپنی زندگی میں دیکھا تھا۔ ان خطوط پر ہی غالباً محقق اور ماہرِ تعلیم محمد علم الدین سالک نے اپنے تحقیقی مقالہ میں حضرت کا سنِ ولادت ۱۰۵۶ھ درج کیا ہے۔

حضرت کے والد مولوی پیر محمد صاحب گزشتہ کئی نسلوں سے لاہور کے نواحی گاؤں مزنگ میں آباد تھے۔ (مزنگ لاہور کا پُر رونق علاقہ اُس دور میں محض ایک دیہات تھا) مولوی پیر محمد صاحب اراعین خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے پاس کچھ زرعی اراضی بھی تھی۔ مگر انھوں نے بعض وجوہ کی بناء پر عہدِ نوجوانی میں لاہور سے نقل مکانی کر کے قصور میں اپنے سسرال کے ہاں رہائش اختیار کر لی تھی۔ آپ وہاں ایک مسجد کے پیش امام بن گئے اور ساتھ ہی کاشتکاری بھی شروع کر دی۔ مولوی صاحب موصوف کے سُسر بھی قصور میں خطیب تھے اور درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ حضرت شاہ عنایت کے والد بزرگوار نے اپنے سُسر کی وفات کے بعد قصور میں امامت و خطابت اور درس و تدریس شروع کر دی۔ مولوی صاحب بڑے شریف النفس، عالم فاضل اور درویش منش بزرگ تھے۔ دن کو درس و تدریس اور رات کو شب بیداری اور یادِ الٰہی میں مصروف رہنے لگے۔ کھیتی باڑی بالکل موقوف ہو کر رہ گئی۔

حضرت شاہ عنایتؒ کی ولادت سے قبل مولوی پیر محمد صاحب کو ایک مست و مجذوب انسان ہر روز صبح کی نماز کے وقت ملتا اور آپ کے ہاتھ چوم کر کہتا "پیر محمدؐ تمھارے خاندان کو چمکانے والا آ رہا ہے۔" پھر اُس مجذوب کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی اور آپ کے گھر ایک چاند سے بیٹے نے جنم لیا۔ یہی بچہ حضرت شاہ عنایت تھے جنھوں نے تاریخ ولایت میں اپنا نام پیدا کیا۔ حضرت کی ولادت کے بعد — آپ کی ولادت کا پیش گو اور پیامبر مجذوب ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔

مولوی پیر محمد صاحب بیٹے کی ولادت پر بہت مسرور ہوئے اور انھوں نے یہ جان لیا

کہ جس بچے کی پیدائش کی پیشگی اطلاع اللہ تعالیٰ نے ایک مجذوب کے ذریعے دی ہے وہ یقیناً علم و عرفان میں گوہر یک دانہ اور گلشنِ طریقت کا سدا بہار پھول ہوگا۔ آپ نے اپنے بیٹے جس نے مستقبل میں مسندِ ولایت سنبھالنی تھی اُس کا نام محمد عنایت رکھا۔ مولوی صاحب چونکہ خود صاحبِ علم اور صاحبِ بصیرت انسان تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے فرزندِ دل بند کو اُس دور کی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرنے کا اہتمام کیا اور بیٹا بھی عالی مرتبت باپ کی امیدِ پر پورا اترا۔ اور اپنے زمانے کے بہترین اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

حضرت شاہ عنایت نے پانچ سال کی کم عمری میں قرآن پاک حفظ کر لیا اور نو سال کی عمر میں عربی، فارسی زبانوں اور علوم کے علاوہ تمام دیگر علوم دینی و دنیوی پر دسترس حاصل کر لی۔ اور یوں بارہ سال کی مختصر سی عمر میں دستارِ فضیلت حاصل کی۔ شاہ صاحب ایک صوفی منش اور دینی گھرانے کے پروردہ تھے۔ لہٰذا ابتداء ہی سے فقر و تصوف کی طرف طبعی رجحان رکھتے تھے۔ دوسری طرف آپ کے والد بزرگوار کی بھی یہ منشا تھی کہ ان کا لختِ جگر روحانی اور عرفانی علوم میں کمال حاصل کرے۔ مگر مولوی پیر محمد صاحب اپنے بیٹے کے سر پر علوم باطنی کا سہرا دیکھنے سے پہلے ہی اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ کمسن حضرت شاہ عنایت والدِ بزرگوار کی اچانک اور بے وقت موت سے بڑے رنجور اور آزردہ خاطر ہوتے۔ سایہ پدری سے محروم ہونے کے بعد آپ کے دل میں اپنے پدرِ گاہی کی خواہش پوری کرنے کا جذبہ تڑپ اور مچل اٹھا۔ چنانچہ آپ تحصیلِ علم کے لیے گھر سے نکلے اور ایک طویل سیاحت کے بعد لاہور پہنچے۔

شہر لاہور علم و دانش کا سرچشمہ اور اولیائے اللہ کی ہمیشہ سے آماجگاہ بنا رہا ہے۔ اُن دنوں لاہور میں حضرت محمد رضا شاہ قادری شطاری کا روحانی چشمہ جاری و ساری تھا۔ دُور دُور سے تشنہ لب آتے اور فیضانِ نظر اور صحبتِ کرم سے شاد کام ہو کر جاتے تھے۔ حضرت محمد رضا شاہ کا پیران سالی کا زمانہ شروع ہو چکا تھا۔ زندگی کی شام کسی وقت بھی متوقع تھی۔ وہ فکر مند تھے کہ اپنی وفات کے بعد درسِ روحانیت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے کس کو اپنا خلیفہ بنائیں۔ انھیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ اگر کوئی ایسا شخص انھیں نہ ملا جو بارِ معرفت و ولایت اٹھا سکے۔ تو پھر تصوف و معرفت کے سوتے سُوکھ جائیں گے۔ اسی تذبذب میں حضرت محمد رضا شاہ مبتلا تھے کہ اُسی وقت روحانیت کی تعلیم کے متلاشی، عبادت کے خوگر اور علم کے طالب حضرت شاہ عنایت قادری حضرت محمد رضا شاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ کمسن شاہ عنایت کو دیکھتے ہی حضرت رضا شاہ کی تمام فکریں دُور ہو گئیں۔ انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

حضرت شاہ عنایتؒ بھی مذکورہ رضا شاہ صاحبؒ کی مقدس شخصیت سے بے حد متاثر ہوتے اور انھوں نے آپ کی خدمت میں رہ کر اپنی شخصیت تعمیر کرنے کا ارادہ کر لیا۔

حضرت شاہ عنایتؒ نے حضرت محمد رضا صاحبؒ سے درخواست کی کہ انھیں حلقہ مریدان میں داخل کر کے اُن کی باطنی تربیت کی جائے اور اُن کے وجود کو چشمۂ صافی سے سیراب کیا جائے۔ حضرت رضا شاہ تو پہلے ہی تیار تھے۔ وہ دیدۂ بینا سے شاہ عنایت کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں سے آگاہ ہو چکے تھے۔ انھوں نے بلا تامل انھیں سلسلہ قادریہ شطاریہ میں بیعت کر کے اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کر لیا۔ حضرت شاہ عنایت اپنے استاد اور مرشد سے اس قدر متاثر ہوتے کہ انہی کے ہو کر رہ گئے۔

حضرت شاہ عنایتؒ نے ایک طویل عرصہ اپنے مرشد و پیر روشن ضمیر کی خدمت صالح میں رہ کر روحانی اسباق کی تکمیل کی اور سلوک کی منازل طے کیں۔ مرشدِ عالی نے بھی آپ کو شب و روز اپنی صحبت میں رکھ کر اپنے ہی رنگ میں رنگ دیا۔ یوں فیضِ مرشد سے آپ بہت جلد ہی کمال تک پہنچ گئے۔ جب حضرت محمد رضا شاہ صاحب آپ کی تعلیم و تربیت کی تکمیل سے کاملاً مطمئن ہو گئے تو آپ کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔ اور حکم دیا کہ آپ قصور چلے جائیں اور اپنے والد اور نانا کی طرح علم و عرفان کے دریا سے مخلوقِ خدا کی روحانی آبیاری کریں۔ اکثر تذکروں میں یہ بات بھی مرقوم ہے کہ حضرت شاہ عنایت نے حضرت محمد رضا شاہؒ صاحب کے علاوہ بھی سات دیگر سلسلہ ہائے قادریہ سے بھی خلافت حاصل کی۔ مگر آپ کی شخصیت کو جو چمک اور جلا حضرت محمد رضا شاہ صاحب نے بخشی وہی قابلِ ذکر ہے۔ اسی وجہ سے آپ نے دُنیائے تصوّف میں ایک نام پیدا کیا۔ مسلک وحدت الوجود کے حامل ہونے کے باعث پورے ہندوستان کے صوفیاء و اولیاء کرام میں آپ نے شہرۂ تمام حاصل کیا۔

❀

مرشد کے حکمِ ہدایت پر حضرت شاہ عنایت لاہور سے قصور پہنچ گئے۔ لاہور میں آپ کے والد کی اراضی ہنوز موجود تھی مگر آپ نے اُس کی کوئی پروا نہ کی۔ اور صرف ارشادِ شیخ کی تکمیل پر توجہ دی۔ آپ نے قصور پہنچتے ہی مُرشدِ لاثانی کے فرمان کے مطابق ہدایتِ خلق میں مصروف ہو گئے۔ آپ نے عشقِ خداوندی سے سرشار باطن کی بدولت بہت جلد اہلِ قصور میں اپنے آپکو مقبول کرا لیا۔ آپ کی ولایت اور کرامات کا چرچا چہار سو ہونے لگا۔ خلقِ خدا کا ایک تانتا بندھ گیا۔ ایک قلیل عرصہ میں ہزاروں افراد آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر طریقیت

کی صراحیٔ مئے ناب سے فیض یاب ہونے لگے۔

ہنگامہ شخصیت اس قدر گرم ہوا کہ آپ قصور اور اس کے گرد و نواح کے جملہ دیہات و مضافات کے رہنے والوں کی عقیدت کا مرکز بن گئے۔ آپ ہر روز قرآن حکیم کی تفسیر — احادیث و فقہ پر مبنی ایک جامع درس دیا کرتے تھے۔ خلقِ کثیر نے آپ کے علومِ روحانی اور فیوضِ برکات سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور لوگ جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

جب عوام و خلائق کی بھاری تعداد ایک درویش اور ملوکیت و شہنشاہیت سے لاتعلق انسان کی دل و جان سے عقیدت مند ہو جاتے اور اُس کے اشارہ ابرو پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے پر آمادہ ہو تو عموماً بادشاہ اور حاکم حضرات خواہ مخواہ اُس بندۂ خدا سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ عہد بھی افراتفری سے دوچار تھا۔ پورا ہندوستان بالعموم اور پنجاب بالخصوص طوائف الملوکی کا شکار تھا۔ تمام سرکاری ادارے اور سیاسی و معاشی اور انتظامی ڈھانچے انحطاط کی آخری منزل بن چکے تھے۔ اقتدار کی کشمکش میں مُلک کے مرکزی حکمران بھی سال میں دو مرتبہ تبدیل ہوتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر خود درویش منش حکمران تھے۔ وہ حکومت کے زور پر سُنّی مسلک اور طریقت و تصوّف کو عام کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ طریقت کے مسلک کو عوام اور عوامی فکر اور سوچ رکھنے والے صوفیوں، شاعروں اور دانشوروں میں عام کر دیا۔

حضرت شاہ عنایت طریقت کے مسلک کے علمبردار تھے۔ وہ مذہبی فکر کو رواج دینے والوں کے سرخیل تھے۔ آپ نے حکمرانوں کے جبر و تشدد اور متصادم حالات کے پیشِ نظر ہندوستان کو "دارالحرب" قرار دے دیا۔ جہاں انسان معاشی، مذہبی، سیاسی اور فکری تصادم کا شکار ہو وہاں حکمرانوں سے عوام کی نفرت یقینی ہو جاتی ہے۔ پھر ایسے حالات میں جہاں درماندہ اور پسے ہوتے انسان ہوں وہ حضرت شاہ عنایت جیسا بندۂ خدا اور یگانۂ اوصاف کا حامل بزرگ موجود ہو تو وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز اور تکالیفِ قلبی کا محرک لازمی بنتا ہے۔ ایسے مقبولِ عوام اور اُمّت کے بہی خواہ بزرگ حکمرانوں کی نگاہوں میں اٹکنے لگ جاتے ہیں۔ حکومت میں تو آدمی اپنے سائے سے بھی ڈرتا ہے۔

حاکمِ قصور نواب حسین خان افغان بڑا ہی مغرور، خودسر، ظالم حکمران تھا۔ وہ اپنی بدنیتی، بداعمالیوں اور ستم رسانیوں کے ساتھ عیّاش و بدکار بھی تھا۔ لوگ اُس سے سخت نالاں اور متنفر تھے۔ اُس نے جب اہلِ قصور کو حضرت شاہ عنایت کے گرد والہانہ اور عاشقانہ رُوپ میں دیکھا تو تلملا اٹھا۔

حسین خان کی حکومت کی بنیاد جبر و تشدد اور خوف و ہراس پر منحصر تھی۔ ایسے حاکم کو عموماً اپنی رعایا پر مطلق اعتماد نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ جب کہیں عوام کا اجتماع دیکھتا ہے تو گھبرا جاتا ہے کہ مبادا اُس کے خلاف بغاوت کے جال نہ بچھائے جا رہے ہوں۔ حسین خان اپنے ظلم و جبر کے حوالوں سے یہ جانتا تھا کہ اہلِ قصور اُس سے نفرت کرتے ہیں اور پھر حضرت شاہ عنایت سے لوگوں کی محبت نے تو اُسے چراغ پا کر دیا۔

حاکمِ قصور حسین خان شاہ عنایت کو اپنا دشمن سمجھنے لگا۔ اور اُن سے اس قدر متنفر ہوا کہ ہر وقت ان کو آزار و تکلیف پہنچانے کے بہانے سوچتا رہتا۔ مگر اُس کی ہر مکارانہ چال ناکام ہو جاتی تھی۔ اسی دوران ایک ایسا واقعہ وقوع پذیر ہوا جو حاکمِ قصور کے لیے سنہری تھا اور وہ اس بہانے کی آڑ میں حضرت شاہ عنایت سے انتقام لے سکتا تھا۔ ہوا یوں کہ نواب حسین خان کے دربار میں ایک خوبصورت مطربہ (طوائف) تھی۔ کہنے کو وہ طوائف تھی مگر اُس کے اندر ایمان و اسلام کے سچے جذبے موجزن تھے۔ وہ اپنے ماحول اور پیشہ سے نفرت کرتی تھی۔ اُس طوائف کی ایک بیٹی بھی تھی۔ جو بڑی ہی خوبصورت تھی۔ طوائف کے دل میں یہ خواہش شدت سے انگڑائیاں لے رہی تھی کہ اُس کی بیٹی ناچ گانے کے روایتی اور خاندانی پیشے کو اپنانے کی بجائے اسلام کی تعلیم سے روشناس ہو کر اسلامی اور شریفانہ زندگی بسر کرے۔ اس کے لیے اس نے عملی کوششیں بھی کیں۔ اور اپنی بچی کو قرآن پاک حفظ کروایا اور دینی علوم سے بہرہ ور کیا۔ لڑکی خوبصورت تو تھی ہی مذہبی اور دینی تعلیم نے اُس کے حُسنِ ظاہری کے ساتھ حُسنِ باطنی کو بھی جلا بخشی اور وہ لڑکی گوہرِ نایاب بن گئی۔

ایک روز وہی طوائف اپنی خوبصورت اور جوان عالمہ فاضلہ بیٹی کو لے کر حضرت شاہ عنایت کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی "حضرت! میں ایک گناہ گار اور سیاہ کار عورت ہوں۔ اپنی زندگی تو میں نے اخلاقی طاعون اور تعفن میں بسر کر لی مگر اپنی بیٹی کو میں اس ماحول سے دُور رکھنا چاہتی ہوں تاکہ یہ کلنک کا ٹیکہ جو میرے ماتھے پر لگا ہوا ہے اس سے یہ بچ جائے۔ اپنی ناقص کوشش سے میں نے اس لڑکی کو ظاہری تعلیم سے تو آراستہ کر دیا ہے اب میری خواہش ہے کہ اگر آپ اس کے ساتھ نکاح کر لیں تو اس کی تعلیم و تربیت میں نکھار و وقار آ جائے گا۔" حضرت شاہ عنایت نے طوائف ماں کی بات غور سے سُنی۔ اس کی فاضلہ بیٹی کو دیکھا تو خُدا سے رجوع کیا۔ کیونکہ درویش کا کوئی فیصلہ اپنا نہیں ہوتا۔ خُدا کے فیصلے اس کی زندگی کا محور و مدار ہوتے ہیں۔ خُدا نے آپ کو اُس نیک سیرت اور صالحہ طوائف زادی سے شادی کا حکم دے دیا۔ چنانچہ آپ نے بلا تاخیر اُس کے ساتھ شادی کر لی۔

دُوسری طرف نواب حسین خان ایک مدّت سے اپنی درباری مطربہ کی بیٹی پر نظر رکھے ہوتے تھا۔ اس کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو اس کی نفرت کی آگ مزید بھڑک اٹھی۔ اس نے مذکورہ بالا طوائف کے لواحقین کو حضرت کے خلاف ہنگامہ کھڑا کرنے کے لیے اکسایا۔ اور انھیں سبق دیا کہ وہ لوگ اس معاملے کا فیصلہ کروانے کے لیے میرے پاس آئیں۔ چنانچہ نواب خان کے ایماء پر ہنگامہ کھڑا کرنے کے لیے مطربہ کے رشتہ داروں نے حضرت کے خلاف نواب حسین کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ نواب حسین جانتا تھا کہ حضرت قصور میں ایک مقبول شخصیت ہیں۔ لہٰذا قصور کو چھوڑنا اُن کے لیے ناممکن ہے۔ اُس نے اسی بات کو فیصلہ کی بنیاد بنایا اور طوائف کے رشتہ داروں کے حق میں اور حضرت کے خلاف فیصلہ صادر کیا کہ یا آپ طوائف زادی کو طلاق دے کر اُس سے کنارہ کش ہو جائیں یا پھر قصور کو چھوڑ کر فی الفور کہیں اور چلے جائیں۔ حضرت نے شادی کا فیصلہ خُدا کے حُکم سے کیا تھا۔ چنانچہ اُس سے روگردانی اور کنارہ کشی کسی طور پر ممکن و مناسب نہ تھی۔ آپ نے قصور کو چھوڑنا منظور کر لیا۔

آپ قصور سے روانہ ہوتے تو اہلِ قصور اور دیگر اردگرد کے علاقوں کے لوگ تڑپ اٹھے خلقت آپ کے فراق و جدائی کے تصوّر میں زاروزار رو رہی تھی۔ آپ نے لوگوں کو یوں تڑپتے اور روتے دیکھا تو اُن کو دلاسا دیا اور فرمایا۔

"لوگو! تم تشفی رکھو۔ حاکم قصور حسین خان نے ہمیں صرف قصور سے نکالا ہے خُدا تعالیٰ اس کو بہت جلد اس دُنیا سے نکال دے گا اور اس حاکم کی درویشِ خُدا کے ساتھ یہ ٹکر عبرت ناک بن جائے گی۔" یہ کہہ کر آپ قصور سے لاہور روانہ ہو گئے۔

نواب حسین خان اور امرتسر کے سکھوں کے رہنما گلاب خان کی آپس میں متعدد لڑائیاں ہو چکی تھیں۔ مگر ہر میدان میں گلاب سنگھ ہار جاتا تھا۔ گلاب سنگھ ہر وقت حسین خان کی دشمنی میں جلتا رہتا تھا۔ آخر کار گلاب سنگھ نے ماہی گیروں کو ایک خطیر رقم دے کر حسین خان کی موت پر معمور کیا۔ حسین خان اپنے لاؤ لشکر سمیت کسی جنگ سے واپس قصور جا رہا تھا۔ راستے میں وہ فوج سے جُدا ہو گیا اور راہ گم کر بیٹھا۔ کرشمہ خداوندی یہ ہوا کہ وہ بھٹکتا ہوا اپنے ماہی گیروں کی قیام گاہوں کی طرف جا نکلا جو اس کی موت کا سودا طے کر چکے تھے۔ ماہی گیروں نے اس کو مارنا چاہا مگر وہ مسلح اور بہادر تو تھا ہی۔ اس لیے روبرو ہو کر مارنے سے زیادہ انھوں نے کسی تدبیر سے اُسے موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کیا۔ رات کو جب وہ کھانا کھا رہا تھا موقع پاتے ہی ایک ماہی گیر نے اُسے بندوق سے مار دیا۔ گولی اُس کے ماتھے پر لگی وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ قدرت نے چند

دنوں کے اندر ہی شاہ عنایت کی بد دُعا سے حسین خان کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔

حضرت شاہ عنایت کو لاہور سے بڑی محبت تھی۔ یہ اُن کا آباتی شہر تھا۔ یہاں اُن کے باپ دادا کی طرف سے وراثت کی اراضی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہاں اُن کے مُرشدِ عالی مقام کی یادیں تھیں۔ چنانچہ لاہور پہنچ کر انھوں نے اپنے آباتی گاؤں مزنگ میں ہی قیام کیا اور یہاں بھی خدمت الناس اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر دیا۔ لاہور کی خاکِ خوش نصیب کی قسمت میں آپ کے قدم چُومنا لکھا تھا۔ اسی لیے آپ نے لاہور میں قیام کرنا پسند کیا۔

موجودہ شارع فاطمہ جناح (کوئینز روڈ) پر جہاں اب آپ کا مزار واقع ہے وہاں آپ کی خاصی زمین تھی۔ جس پر دو کنویں تھے۔ ایک خوبصورت مسجد بھی تھی۔ اسی مسجد سے آپ نے مکتب کا کام لیا اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ مکتب میں فلسفہ اور روحانی علوم درس دیتے تھے۔ علم کے متلاشی دیگر بڑے اکابرین علماء کو چھوڑ چھاڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عالم و صوفی بن کر نکلتے تھے۔ آپ قرآن پاک، تفسیر، حدیث و فقہ، علوم و فنون، فصوص الحکم اور تصوف کے علاوہ مثنوی مولانا روم کا ایسا درس دیتے کہ بڑے بڑے عالم و فاضل آپ کی قابلیت و لیاقت کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے۔ جس طرح ہر مرید مرشد کے نام اور شان و شوکت کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کے برعکس حضرت شاہ عنایتؒ کی شہرت اور نام میں بابا بلھےؒ شاہ کا بھی حصّہ ہے۔ بلھےؒ شاہ آپ کے چہیتے اور مشہور مرید تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے حضرت شاہ عنایت اراعین تھے جبکہ بلھےؒ شاہ سیّد تھے۔ تاریخ اراعیاں میں سیّد مرید اور اراعین مرشد کا قصّہ بہت مشہور ہے۔ حضرت بلھےؒ شاہ کا ذکر حضرت عنایت قادر کے ساتھ کرنا لازم و ملزوم ہے۔ حضرت کی کرامات اور غیر معمولی واقعات کی تکمیل حضرت بلھےؒ شاہ کے تذکرہ کے بغیر ممکن نہیں۔

بابا بلھےؒ شاہ قصور کے ایک سیّد خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ نے تصوف کی دُنیا میں باغی صوفی شاعر کی حیثیت سے شہرتِ دوام پائی۔ شاہ صاحب نے مولوی غلام مرتضیٰ قصوری سے علوم ظاہری حاصل کیے۔ جب سن بلوغت کو پہنچے تو جذب کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ اسی حالت میں ایک مرتبہ پھرتے پھراتے بٹالے جا نکلے اور وہاں مُنہ سے منصور والا کلمہ نکل گیا۔ لوگ انھیں پکڑ کر دربار فاضلیہ کے مرد عارف شیخ فاضل الدین کی خدمت اقدس میں لے گئے حضرت فاضل الدین بلھےؒ شاہ کا مرض پہچان گئے۔ حضرت شاہ عنایت قادری کے علم و عرفان اور زہد و رکوع کا اُن دنوں بڑا شہرہ تھا۔ چنانچہ شیخ فاضل الدین نے لوگوں کو ہدایت کی کہ اس نوجوان بلھےؒ شاہ کو شاہ عنایت قادری کے ہاں لے جاؤ اُن کی صحبت میں رہ کر کامل ہو جائے گا۔

ایک روایت میں درج ہے کہ جب حضرت بلھےؒ شاہ شاہ عنایت سے ملاقات کے لیے لاہور پہنچے تو اُن دِنوں "حضرت شاہ عنایت" شالیمار باغ کے صدر مالی تھے۔ جب حضرت بلھےؒ شاہ لاہور آئے تو گرمی کے دن تھے۔ اُس وقت انھیں غضب کی بھوک لگ رہی تھی۔ جب وہ آم کے پیڑوں کے نیچے پہنچے تو انھوں نے پھلوں سے لدے ہوئے درخت دیکھے جن سے اُن کی بھوک دوچند ہوگئی۔ اُن کا دل شدّت سے آم کھانے کو چاہا۔ مگر وہاں چوکیدار موجود نہ تھا جس سے پوچھ کر یا خرید کر آم کھاتے۔ پھر خود ہی آم توڑ لینے کا ارادہ کیا۔ چوری کے گناہ سے بچنے کے لیے انھوں نے آم کے درخت کی طرف دیکھا اور "اللہ وغنی" کہا۔ ان الفاظ کے کہتے ہی ایک آم حضرت بلھےؒ شاہ کی جھولی میں آن گرا۔ انھوں نے کئی بار یہ الفاظ دہرائے اور یوں بہت سے آم گرے جنھیں آپ نے اپنے پٹکے میں باندھ لیا اور انھیں بیٹھ کر کھانے کے لیے کسی جگہ کی تلاش کرنے لگے۔ اتنے میں اُدھر سے شاہ عنایت صدر مالی کے رُوپ میں ـــــ آنکلے۔ انھوں نے آم چُرانے پر بلھےؒ شاہ کی سرزنش کی۔ بلھےؒ شاہ نے شاہ عنایت کو محض مالی سمجھا اور کہا "میں نے آم نہیں چرائے" پھر انھوں نے اپنی کرامت سے مرعوب کرنے کے لیے شاہ عنایت کے سامنے "اللہ غنی کہا" ایک آم بلھےؒ شاہ کی جھولی میں آن گرا۔ حضرت شاہ عنایت قادری نے اس کرامت پر کوئی توجہ نہ دی۔ بلھےؒ شاہ کو بڑی سبکی محسوس ہوئی۔ اُن کی شرمندگی اور خجالت دیکھ کر حضرت شاہ عنایت نے کہا (جو اَب تک بلھےؒ شاہ کی نظر میں صرف صدر مالی تھے) "اے نوجوان! تمھیں یہ الفاظ ادا ہی کرنے نہیں آتے۔ تو نے تو ان کی کرامات ہی گھٹا دی" یہ کہہ کر انھوں نے اپنے انداز میں "اللہ غنی" پڑھا اور تمام درختوں کے تمام آم فرش پر آن گرے۔ اِس کے بعد حضرت نے ایک بار پھر یہی الفاظ دہرائے تو پھل فرش سے واپس درختوں پر جا لگے۔ حضرت بلھےؒ شاہ اب تک جس کو ایک معمولی مالی سمجھ رہے تھے اُسی کے ہاتھوں شکست کھا کر اُن کے خیالات میں انقلاب آگیا۔ حضرت شاہ عنایت کی خدمت میں دست بستہ ہو کر انھوں نے مرید بننے کی گزارش کی جو منظور کر لی گئی۔

حضرت شاہ عنایت کی عظمت سے بلھےؒ شاہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اُن کے شاگرد بن گئے۔ حضرت بلھےؒ شاہ اپنے اکثر اشعار میں اپنے مرشد کا ذکر کرتے ہیں اور اپنی خوش بختی پر نازاں ہوتے ہیں کہ انھیں شاہ عنایت قادری ایسے مرشدِ کامل کا دامن نصیب ہوگیا۔

حضرت شاہ عنایت قادری اور حضرت بلھےؒ شاہ کی بیعت کے مختلف قصّے مشہور ہیں۔ بیعت کے متعلق ایک اور حکایت یہ بھی ہے کہ حضرت بلھےؒ شاہ مرشدِ کامل کی تلاش میں سرگرداں

تھے۔ اسی تلاش بسیار میں لاہور پہنچ گئے۔ ایک روز تھک ہار کے ایک درخت کے نیچے سو رہے تھے کہ اچانک خواب میں آپ کو آپ کی پانچویں پشت کے بزرگ حضرت سید عبدالکریم کی زیارت ہوئی۔ اُن کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ انھوں نے بلھے شاہ سے پانی طلب کیا۔ آپ نے انھیں پانی کی جگہ دودھ پیش کیا۔ جس میں تھوڑا سا انھوں نے پی لیا اور باقی آپ کو پلا دیا۔ جس سے آپ کا سینہ نور سے منور ہو گیا۔ پھر انھوں نے آپ کے حق میں دُعا فرماتے ہوئے فرمایا "تمھارے لیے دس روپے روزینہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ تمھیں مُرشدِ کامل عنقریب مل جائے گا۔ تم اس کی ہر طرح سے اطاعت کرنا۔" یہ کہہ کر بزرگ رخصت ہو گئے اور بلھے شاہ بیدار ہو گئے۔

بیداری کے بعد سارا خواب آپ نے اپنے والد ماجد کو سنایا۔ آپ کے والد ماجد بھی ولیِ کامل تھے۔ انھوں نے کشف کے ذریعے حضرت بلھے شاہ کو اُن کے مرشد کی نشاندہی کر دی چنانچہ حضرت بلھے شاہ قصور سے ننگے پاؤں مُرشد کی تلاش میں چل پڑے۔ ان دنوں حضرت شاہ عنایت اندرون بھاٹی گیٹ اونچی مسجد کے امام تھے۔ حضرت بلھے شاہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے اور بیعت کی درخواست کی۔ جس کو حضرت شاہ عنایت نے رَد کر دیا اور بیعت لینے سے انکار کر دیا۔ حضرت بلھے شاہ منت و اصرار کرتے رہے۔ آخر کار حضرت شاہ عنایت نے ٹالنے کے لیے اُن سے کہا:

"میں آپ کو بیعت کر لوں گا مگر ایک شرط پر۔ پہلے آپ پانچ صد روپے نقد، پانچ صد روپے کا گھوڑا، پانچ صد روپے کے طلائی کنگن، پانچ صد روپے کی پوشاکِ فاخرہ لائیں۔ اور یہ چیزیں شام سے پہلے پہلے لانا ہوں گی تب آپ کو بیعت کیا جائے گا۔"

بلھے شاہ کے پاس بھلا کہاں اتنی پونجی تھی کہ وہ مطلوبہ اشیاء بازار سے خرید کر پیش کر سکتے قصور اتنا دُور تھا کہ اتنے قلیل وقت میں وہاں جانا اور واپس آنا ناممکن تھا۔ اسی مایوسی اور پریشانی میں آپ دریائے راوی کی طرف چلے گئے۔ خیالات میں گم دریا کے کنارے کنارے کافی دُور تک نکل گئے۔ اچانک آپ کے دل میں ایک خیال آیا کہ مرشد کا تو اب ملنا مشکل ہے کیوں نہ زندگی کا ہی خاتمہ کر لیا جائے۔ یہ سوچ کر آپ نے دریا میں چھلانگ لگانے کا ارادہ کیا۔ ابھی چھلانگ لگانے ہی والے تھے کہ ایک نقاب پوش شہسوار اچانک ایک طرف سے آ گیا جس نے آپ کو چھلانگ لگانے سے روک دیا اور فرمایا "اے نوجوان میں اس دریا میں غسل کرنے لگا ہوں۔ تم میری چیزوں کی رکھوالی کرو۔ اس نے اپنا قیمتی گھوڑا، سونے کے کنگن، پانچ سو روپے نقد اور پوشاک آپ کے حوالے کی اور خود دریا میں اُتر گیا۔ بلھے شاہ نے اس کا

بہت انتظار کیا مگر وہ دریا سے واپس نہ نکلا۔ آپ عصر کی نماز تک اس کا انتظار کرتے رہے۔ آخر مایوس ہو کر حضرت شاہ عنایت کی خدمت میں چل پڑے۔ اور اُن کی خدمت میں گھوڑا، نقدی اور دیگر سامان پیش کر کے نقاب پوش کا قصہ سنایا۔"

شاہ عنایت نے ساری بات سُنی تو مسکرا کر بولے "میاں سیّد زادے! بس اتنا ہی حوصلہ تھا کہ ڈُوب مرنے پر تیار ہو گئے۔ سُنو وہ شہسوار ہم تھے ہم نے خُدا کے حکم سے جا کر تمھاری مشکل کا سامان پیدا کیا۔" بلھےؒ شاہ خادم ہو گئے اور اپنے آپ کو حضرت کے سپرد کر دیا اور پاؤں میں گر پڑے۔ حضرت شاہ عنایت نے آپ کو سینے سے لگا لیا۔ بیعت لی اور ولایت سے مشرف یاب کر دیا۔ تزکیہ نفس کی راہ دکھائی جس سے حضرت بلھےؒ شاہ عرفان کی چوٹیوں پر پہنچ گئے۔

کشف و کرامات کے یہ تینوں قصے اگرچہ مختلف ہیں مگر حضرت شاہ عنایت سے حضرت بلھےؒ شاہ کی مریدی بھی ان سے عیاں ہے اور یہ کہ حضرت شاہ عنایت قادری صاحبِ حال ولی تھے۔ ان واقعات سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت شاہ عنایت کا مرتبہ و مقام دنیائے حق پرستی میں بڑا بلند تھا اور متلاشیانِ حق آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر راہ پاتے تھے۔

حضرت شاہ عنایت قادری کی اجازت سے جب بلھےؒ شاہ اپنے گھر قصور گئے تو اُن کے رشتہ داروں جن کو اپنے سادات ہونے پر ناز تھا۔ انھوں نے بلھےؒ شاہ کو ایک ارائیں کی بیعت کرنے پر سخت ملامت کیا۔ آپ کی رشتہ دار خواتین نے آپ کو طعنے دیئے کہ آپ نے اولادِ علی ہو کر ایک ارائیں سے بیعت کی۔ اس سے آلِ علی کا سر نیچا ہو گیا۔ حضرت بلھےؒ شاہ اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

بلھے نوں سمجھاون آئیاں بھیناں تے بھرجائیاں
آل نبی، اولاد علی بلھیا توں کیہہ لیکاں لائیاں
من لے بلھیا ساڈا کہنا چھڈ دے پلا ارائیاں

لیکن حضرت بلھےؒ شاہ تو اپنے مرشد کے رنگ میں رنگے جا چکے تھے۔ ہادی نے سینے سے لگا کر قلب روشن کر دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے خواتین کے طعنوں کا جواب یوں دیا۔

جیہڑا سانوں سیّد آکھے، اونوں ملن سزائیاں
جیہڑا سانوں اراعین آکھے، بہشتیں پینگاں پائیاں
جے تو توڑیں باغ بہاراں، بلھیا طالب ہو جا اراعیاں

حضرت بلھے شاہ اپنے رشتہ داروں کے لگاتار طعنوں سے تنگ آگئے۔ لاابالی انسان تو تھے ہی ایک دن اُن کی مست الست طبیعت کے باعث اُن کے مُنہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔
"اِیہناں (شاہ عنایت) دی تے اِیہہ ولایت اک سیّد کولوں ای لئی اے کیہڑی اپنے گھروں دتی اے" (یعنی انھوں نے (شاہ عنایت) بھی تو ولایت ایک سیّد یعنی حضرت سیّد محمد رضا شاہ قادری شطاری سے ہی حاصل کی ہے۔ کون سا اپنے گھر سے دی ہے)
اکثر تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ حضرت بلھےؒ شاہ شاید ابھی مرشد پر کامل یقین نہیں لاتے ہوں گے جو اُن کے مُنہ سے یہ بے معنی الفاظ نکل گئے یا ان کے قلندرانہ مزاج سے یہ بات ان کے لبوں پر آگئی۔
حضرت شاہ عنایت کو اللہ تعالیٰ نے دو صاحبزادے بھی عطا کیے جو آپ ہی کی طرح صاحبِ کردار، صاحبِ علم، صاحبِ علم یگانہ اوصاف اور جریدۂ روزگار تھے۔ اُن دونوں کے نام سیّد زاہد اللہ اور سیّد محمد زمان تھا۔ وہ دونوں عبادت و ریاضت کے علاوہ آپ کی طرح رزقِ حلال اور کسبِ کمال بھی کماتے تھے۔ اپنے آبائی پیشہ کاشت کاری کو انھوں نے بھی اپنا رکھا تھا۔ مزنگ میں اپنی زمین پر ہی آپ تینوں حضرات جن میں جلیل القدر والد اور صاحبِ نیک سیرت اولاد شامل تھی، کھیتی باڑی کرتے تھے۔ اُس روز بھی تینوں باپ بیٹے اپنے کھیتوں میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں گوشت اور میتھی کا ساگ پکا ہوا تھا۔ یہ وہی وقت تھا کہ ادھر حضرت شاہ عنایت اپنے صاحبزادوں کے ساتھ کھانا تناول فرما رہے تھے کہ اُدھر قصور میں حضرت بلھے شاہ نے قلندرانہ ترنگ میں مذکورہ بالا الفاظ اپنے مرشدِ محترم کے بارے میں کہے جن سے گستاخی اور بے ادبی کا پہلو نکلتا تھا۔ ابھی الفاظ حضرت بلھےؒ شاہ کے مُنہ سے نکلے ہی تھے کہ ادھر لاہور میں کھانا کھاتے کھاتے اچانک حضرت شاہ عنایت کے صاحبزادے محمد زمان نے اپنے والدِ محترم سے کہا "آباجی! دیکھیا جے، بلھا کیہہ کہہ رہیا اے" (آباجی آپ نے دیکھا بلھا کیا کہہ رہا ہے) حضرت شاہ عنایت نے بیٹے کی بات سُنی تو آپ نے مُنہ سے بوٹی کی ہڈی نکال کر دُور پھینکتے ہوئے کہا "لے بُلھیا چُلھیہ ہو گیا ای" (یعنی اے

بلھے تُو نے جو حاصل کیا تھا تجھ سے چھین لیا گیا ہے) اور واقعہ ہوا بھی یہی حضرت بلھےؒ شاہ نے جو کچھ روحانیت کی دولت حاصل کی وہ اُن سے جاتی رہی۔ مُرشد کا ہاتھ پشت سے اُٹھ گیا۔ تو آپ در بدر ٹھوکریں کھانے لگے۔ آخر دھکے کھاتے ایک روز ایسے گھر میں پہنچ گئے جہاں رہنے والی عورت ایک طوائف تھی۔ آپ نے اُس عورت سے کہا مَیں تمھاری چلم تمباکو بھر دیا کروں گا۔ کوئی تنخواہ نہیں لوں گا۔ اللہ نے چاہا تو میرا معاوضہ ایک دن مجھے خود بخود مل جائے گا۔ وہ عورت اور گھر والے بہت خوش ہوئے کہ ایک خوبصورت نوجوان مُفت میں ملازم مل گیا ہے۔ حتیٰ کہ آپ نے بارہ سال طوائف کے گھر میں گزارے اور بیگار کاٹتے رہے۔ بارہ سال کے بعد حضرت شاہ عنایت ایک دن قصور کے ایک بازار میں سے گزر رہے تھے حسبِ معمول آپ نے اپنا چہرہ کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ راستے میں آپ نے دیکھا کہ ایک جگہ مُجرا ہو رہا ہے اور وہاں بلھے شاہ بھی کھڑے ہیں۔ بلھے شاہ نے بھی مرشد کو آتے ہوئے دیکھ لیا اور طوائف کو ناچنے سے روک دیا اور فرمایا "ہُن تو ہٹ جا میرے معاوضہ لین دا ویلا آ گیا ہے، ہُن مینوں نچ کے یار منالین دے"۔ (یعنی تم پرے ہٹ جاؤ۔ اب میرا معاوضہ لینے کا وقت آ گیا ہے مجھے ناچ کر اپنے دوست کو راضی کر لینے دو) پھر شاہ عنایت کو دیکھ کر حضرت بلھے شاہ اتنا ناچے کہ ناچتے ناچتے اُن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ پھر بے ہوش ہو کر گرنے لگے تو شاہ عنایت آگے بڑھے اور آپ کو تھام لیا اور فرمایا "اوتے توں بلھا ایں؟" (اوتے کیا تم بلھے ہو؟) عرض کی "نہیں سرکار میں بلھا نہیں، بُھلا آں" (حضرت! میں بلھا نہیں ہوں بھولا ہوا ہوں) یہ سُن کر شاہ عنایت کو آپ پر رحم آ گیا۔ انھوں نے آپ کو معاف فرما دیا۔ آپ کی ولایت بحال کر کے سب کچھ عطا فرما دیا۔ بعد میں بلھے شاہ دنیائے تصوّف و ولایت کے بہت بڑے بُزرگ ثابت ہوئے۔

اس کے بعد حضرت بلھےؒ شاہ کے رشتہ دار اُن کو شاہ عنایت کی بیعت توڑنے پر مجبور کرتے رہے مگر بلھےؒ شاہ نے کسی کی بات پر کان نہیں دھرا۔ انھیں خاندان والوں کی مخالفت بھی مول لینی پڑی اور دُوسرے کئی نقصان بھی برداشت کرنے پڑے۔ خاندان والے آپ کا ساتھ چھوڑ گئے۔ سوائے آپ کی ایک بہن کے جو خود بھی عفیفہ اور صالحہ خاتون تھیں وہ حضرت بلھےؒ شاہ کے احوال سے واقف تھیں انھوں نے بھائی کا حوصلہ بڑھایا اور عُمر بھر ساتھ دیا۔ بہن نے اتنی قربانی دی کہ جو مثال بن گئی۔ انھوں نے ساری عُمر کنواری رہ کر گزار دی۔

آخر کار بلھےؒ شاہ گھر بار، عزیز و اقارب سب کو چھوڑ چھاڑ کے لاہور اپنے مرشد کی خدمت

ہیں آگئے۔ اور اُن کے ساتھ ہی رہنے لگ گئے۔ مُرشد سے علومِ باطنی میں دسترس حاصل کی۔ آپ اپنے مُرشد کے خیالات، نظریات اور مسلک کی عملی تصویر تھے۔ آپ کو اپنے مرشد اور استاد سے بے پناہ عشق و محبّت تھی۔ مرشد کی محبّت میں آپ نے شعر کہنا شروع کیے۔ بلھےؒ شاہ کی شاعری اُن کے مُرشد کی محبّت اور عشق سے لبریز ہے۔ اُن کی ہر کافی کے مقطع میں حضرت شاہ عنایت کا نام آتا ہے۔

حضرت شاہ عنایت اعلیٰ پائے کے صُوفی بزرگ متبحّر عالمِ دین تھے۔ دنیائے علم میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ فلسفانہ مطالعہ کے سبب بڑی شہرت رکھتے تھے۔ نیک طبیعت، نیک فطرت، تہجد گزار اور شب بیدار تھے۔ وحدت الوجود کے حامی اور داعی تھے طریقت و حقیقت کے رموزِ عشق سے بہرہ ور تھے۔ اس مسلک میں آپ کا مقام دیگر صوفیاء کرام سے بالکل منفرد اور بلند ہے۔ آپ شہرتِ دوام کے مالک تھے۔ آپ بڑے عالم و فاضل اور صاحبِ قلم تھے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنّف و مترجم بھی تھے۔ صوفیانہ مسلک پر آپ نے خود کئی ایک کتابیں لکھیں۔ پُرانی کتب کی تفاسیر لکھیں۔ آپ کی اپنی کتاب "دستورالعمل" آپ کے صوفیانہ مسلک پر ایک سیر حاصل تصنیف اور انمول بحث ہے جس میں سلوک کی منازل طے کرنے اور رب سے تعلق قائم کرنے کے طریقے درج ہیں۔

حضرت شاہ عنایت قادری اللہ پاک کے سچّے عاشق و طالب تھے۔ آپ کی تعلیمات یہ تھیں کہ سب انسان خدا کے بزرگ و برتر کی نظر میں برابر ہیں۔ انسانوں کی اپنی کوئی ذات نہیں ہوتی۔ ذات صرف اُسی قادرِ مطلق کی ہے جو ازل سے ابد تک زندہ و تابندہ ہے اور رہے گی۔ آپ مذہبی تنگ نظری پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے پیشِ نظر وہ انسانی اعمال تھے جو انسان کی نیکی اور بدی کا پتہ دیتے ہیں۔ آپ کے نزدیک تمام مخلوقِ انسانی ایک اکائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان اور دیگر مخلوقات کا وجود آپ کے خیال میں اللہ تعالیٰ کے مختلف رُوپ ہیں اور انسان بحیثیت انسان بُرا نہیں۔

آپ کی ان تعلیمات کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ آپ کے مریدوں میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کی بھی ایک کثیر تعداد تھی جو اپنے انداز میں عبادت کیا کرتے تھے۔ مگر انسانی بھلائی، نیک اعمالی، خوفِ خُدا اور حقوق العباد کے معاملے میں سب کے نظریات ایک تھے۔ آپ اپنا وعظ و درس پنجابی زبان میں دیا کرتے تھے۔ درس کے دوران اپنے شعر اور دیگر تمثیلات اور لطائف و حقائق

سے اپنے درس میں مزید چاشنی پیدا فرما دیتے تھے۔ حضرت بلھےؒ شاہ کا یہ کمال و احسان ہے کہ انھوں نے حضرت شاہ عنایت کے ہر درس اور وعظ کو اپنے اشعار کی زبان دے کر رہتی دُنیا تک روحانیت کا سرمایہ گراں بہا بنا دیا۔

آپ زبان پر قابو رکھنے پر بہت زور دیا کرتے تھے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے "جو اپنی زبان کو قابو میں رکھے گا اور اپنی زبان کو اُن گناہوں سے بچائے گا جو زبان سے متعلق ہیں۔ ان کے جنتی ہونے کا میں ضامن ہوں۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جب صبح ہوتی ہے سب اعضاء زبان کی تعظیم اور خوشامد کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ خُدا سے ڈرتی رہو ہمارے معاملے میں۔ ہم تیرے ساتھ ہیں اگر تو سیدھی رہے گی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے" اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ زبان کو قابو رکھنے سے سب اعمال درست ہو جاتے ہیں اور زبان بند نہ کرنے سے خرابیاں لازم آتی ہیں۔

حضرت شاہ عنایت قصور سے آنے کے بعد لاہور میں تقریباً تیس سال تک قیام پذیر رہے اور یہ تیس سالہ دور خلائق کی تربیت، بھلائی اور درس و تدریس میں بسر ہوا۔

لاہور میں آپ کا سلسلہ فیوض و برکات جب تک جاری رہا شاگردوں میں روز بروز ترقی ہوتی رہی۔ آپ کے یہاں بڑے بڑے عالم دُور دراز سے آتے اور فیض یاب ہو کر واپس لوٹتے۔ آپ نے ۱۷۲۸ء بمطابق ۲۷ جمادی الثانی ۱۱۴۱ھ میں وصال فرمایا۔ آپ کے جانشین و خلیفہ بابا بلھےؒ شاہ تھے۔

آپ کا مزار پُر نور شاہراہ فاطمہ جناح کوئینز روڈ پر واقع ہے۔ آپ کے ساتھ آپ کے دونوں صاحبزادوں کے بھی مزار ہیں۔ مزار کے ساتھ ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔ مسجد تو حضرت کے زمانے میں تھی مگر ۱۹۷۳ء میں اس کو شہید کر کے نئی مسجد کی بنیاد رکھی جس کی تعمیر میں بے شمار بندگانِ خُدا نے عملی حصّہ لیا۔

حضرت شاہ عنایت کی ولایت و قطبیت کو آج بھی ایک بلند مقام حاصل ہے۔ حضرت کا نام آج بھی عقیدت سے لیا جاتا ہے۔ آپ کا عُرس نہایت شان و شوکت سے منایا جاتا ہے اور آپ کے مزار پر ارادت مندوں کا ہر وقت میلہ لگا رہتا ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن پاکؒ

دریائے چناب

کی لہروں پر کشتی آہستہ آہستہ ہلکورے کھا رہی تھی۔ کشتی میں قطب الاولیاء شیخ الاسلام حضرت سید حاجی محمد نوشہ گنج بخش ساہن پالوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے چند ایک مریدین کے ہمراہ سوار تھے۔ اس ہنگام قوال نہایت شیریں آواز میں عارفانہ کلام پڑھ رہے تھے۔ رقت و سوز و گداز نے حاضرین محفل میں عجیب کیفیات پیدا کر دی تھیں۔ سب مست و بے خود بیٹھے تھے۔ ہر ایک اپنے اپنے حال و مقام کے مطابق مئے معرفتِ الٰہیہ سے بہرہ ور ہو رہا تھا۔ ماحول نے گرد و پیش پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر شے مستی و سرخوشی سے جھوم رہی ہو اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مصروف ہو۔ نور و تجلیات کی بارش ہو رہی تھی۔ حضرت قطب الدین اولیاءؒ بھی اللہ سے لو لگائے آنکھیں بند کیے اور سر مبارک جھکائے بیٹھے تھے۔ معاً حضرت شاہ عبدالرحمٰن پاک رحمۃ اللہ علیہ اپنی جگہ سے اٹھے۔ نعرۂ مستانہ بلند کیا اور عالم بے خودی میں دریا میں گر پڑے۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی کہ حضرت شاہ عبدالرحمٰن پاک کے ساتھ کیا بیتی ہے۔

اس واقعہ کو سات دن گزر گئے۔ جب حضرت شاہ عبدالرحمٰن پاکؒ نظر نہ آئے تو دوسرے پیر بھائیوں کو فکر لاحق ہوا۔ چنانچہ حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آپ کی

عدم موجودگی کے بارے میں عرض کیا گیا۔ مرشد کامل کو بذریعہ کشف ان کے حالات سے آگاہی ہوئی تو قوالوں کو طلب کیا جب قوال آگئے تو مُریدین کے ہمراہ سوئے دریا چل پڑے۔ کنارِ دریا پہنچ کر قوالوں سے عارفانہ کلام پڑھنے کو فرمایا۔ قوالوں نے نہایت درد کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ اس اثنا میں اور بھی بہت سے لوگ وہاں اکٹھے ہوگئے۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ حضرت شاہ عبدالرحمٰن پاک عالم وجد میں نعرہ مار کر دریا سے باہر آگئے۔ سب لوگ حیران رہ گئے۔ مولانا پیر کمال لاہوری پر اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ زبان پر مچل گیا ؎

چناں شد بحرِ عشق آں صاحبِ جاہ
بہ دریا ہفت روز اندر شداں ماہ

آپ کی ولادت سے بہت قبل کی بات ہے کہ حافظہ آباد گوجرانوالہ سڑک پر ایک گاؤں اورنگ شاہ پورہ تھا جس کا بعد میں نام رنگن پور ڈلہ پڑ گیا۔ مرورِ زمانہ کے ہاتھوں جب یہ گاؤں ویران ہوگیا تو ایک ٹیلے کی شکل اختیار کر گیا۔ ٹیلے کو پنجابی زبان میں بھڑ کہتے ہیں۔ چونکہ یہ ٹیلا چھوٹا تھا اس مناسبت سے اسے بھڑی کہنے لگے۔

وقت گزرتا رہا۔ ایک دن قوم "ہرا" نے یہاں آکر ڈیرے جما لیے تو اس نوآبادی کا نام بھڑی سراواں مشہور ہوگیا۔ لیکن اس قوم کو یہاں زیادہ دیر قیام کا موقعہ نہ ملا۔ قوم دھوتھڑ اس پر زبردستی قابض ہوگئی تو یہ علاقہ بھڑی دھوتھڑاں کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اسی گاؤں میں شیخ صالح محمد رہتا تھا جو اصلی نام کی بجائے میاں سہالی کے نام سے معروف تھے۔ بڑا نیک و پارسا اور متقی و پرہیزگار تھا۔ اس کی بیوی بھی بڑی عابدہ و زاہدہ تھی۔ گاؤں میں سب لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان کے ہاں ۹۹۵ ہجری مطابق ۱۵۸۳ عیسوی میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام عبدالرحمٰن رکھا۔

عبدالرحمٰن بچپن سے ہی مجذوبانہ خصائل و اوصاف کے حامل تھے۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو ہم عمر بچوں میں بالکل منفرد و یگانہ نظر آتے تھے۔ ان کے درمیان ہونے کے باوجود علیحدہ دکھائی دیتے تھے۔ جب چار سال کے ہوئے تو ایک دن بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ ایک نورانی چہرہ بزرگ آتے دکھائی دیے۔ سب بچے بھاگ کر ان کے گرد جمع ہوگئے اور معصومانہ سلام عرض کیا۔ یہ بزرگ امام العاشقین رئیس المودرین حضرت نوشہ گنج بخش قادری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپ بچوں کے ساتھ نہایت شفقت و محبت سے پیش آئے۔ دعائے خیر و برکت دی۔ انہی بچوں میں حضرت عبدالرحمٰن پاکؒ بھی تھے۔ سید العارفینؒ نے آپ کی طرف دیکھا۔ چشم

معرفت سے دیکھ لیا کہ یہ بچّہ ولیٔ کامل ہوگا۔ ایسی نگاہ ڈالی کہ عشقِ حقیقی کے دروازے کھُل گئے۔ جذب و مستی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ سر پر دستِ محبّت پھیرا اور تشریف لے گئے۔ بچّے کھیل کُود میں مصروف ہو گئے، لیکن عبدالرحمٰن پاکؒ کی کیفیت مختلف ہوگئی۔ یہ اس نظر کی تاثیر تھی جو حضرت نوشہ گنج بخشؒ نے آپ پر ڈالی تھی۔ والدین کو کوئی خبر نہ تھی کہ ان کا بیٹا کس نعمتِ لازوال سے مالا مال ہو گیا ہے۔

جب آپ کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو والدِ بزرگوار نے درس میں داخل کرا دیا، لیکن پڑھائی کی طرف بہت کم توجّہ تھی۔ ہر لحظہ مستی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ آپ کے باطن میں جو چراغ عشق و مستی روشن ہو چکا تھا وہ دنیاوی تعلیم میں حارج تھا۔ چھ سال کے عرصہ میں بمشکل کتب خوانی کا کچھ ملکہ حاصل ہوا مگر آپ کا سینہ پیرِ روشن ضمیر کی توجہ سے ظاہری و باطنی علوم کا معدن بن گیا تھا۔ لبسا اوقات آپ کی زبان مبارک سے ایسے علم و معرفت اور اسرار و حکمت کے بیش بہا موتی نکلتے کہ سُننے والے حیران رہ جاتے۔ یقین نہ آتا تھا کہ آپ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔

وقت کے ہم آہنگ آپ کے جذب و مستی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بے ہوش ہو جایا کرتے تھے۔ والدین نے دیکھا تو بہت پریشان ہوئے۔ دوا دارو کیا مگر افاقہ نہ ہُوا۔ بہت کچھ پڑھ کر پھونکا مگر کوئی فرق نہ پڑا۔ پھر اس خیال نے گھیر لیا کہ آپ پر آسیب کا اثر ہے۔ پاؤں میں زنجیریں ڈال دی گئیں اور عاملوں کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے اپنے اپنے علم و عمل کے مطابق کئی تدابیر اختیار کیں مگر کوئی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ وہ سب عاجز آ گئے اور واپس لوٹ گئے۔ اِدھر یہ حالت تھی کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ بساط بھر کوشش کے باوجود جب عبدالرحمٰن کی حالت روبہ صحت نہ ہوئی تو والدین بہت متفکّر اور پریشان رہنے لگے۔ اولاد کا دُکھ معمولی نہ تھا۔ ایک دن میاں سہالیؒ بیٹھے تھے۔ چہرے سے غم و پریشانی کے آثار ہویدا تھے کہ اسی اثنا میں ایک شخص آیا اور باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں میاں صاحب نے اپنا دُکھ بیان کرتے ہوئے بیٹے کی بیماری کا ذکر کیا۔ اس شخص نے سُنا تو چند منٹ غور کرنے کے بعد بولا۔

"میاں سہالی! نورِ چشم عبدالرحمٰن کو سیّد العارفین حضرت سید حاجی محمّد نوشہ گنج بخش مدظلّہ العالی کی خدمتِ عالیہ میں ساہن پال گجرات لے جاؤ۔ سنا ہے جو آپ کی زیارت سے مشرف ہوتا ہے اس کا آسیب دُور ہو جاتا ہے۔"

میاں سہالی نے سنا تو دل کو بات لگی۔ امید کے چراغ روشن ہو گئے۔ اولیاء اللہ اور خاصانِ بارگاہِ حمدیت کے پاس کس مرض کی دوا نہیں ہے۔ فوراً اپنے بڑے بھائی شیخ الہ داد کے پاس گئے۔ سارا ماجرا بتایا اور کہا کہ وہ عبدالرحمٰن کو اپنے ہمراہ حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی خدمتِ عالیہ میں لے جائے۔

ان دنوں ساہن پال کی خانقاہ کا دور و نزدیک شہرہ تھا۔ بے شمار لوگ وہاں حاضر ہو کر مرادوں سے جھولیاں بھرتے تھے۔ کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ تہی دامن لوٹا ہے۔ جب عبدالرحمٰن اپنے تایا شیخ الہ داد کے ہمراہ منزلِ مقصود پر پہنچے تو اس وقت حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ میں موجود تھے۔ بہت سے مریدین و معتقدین حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ علم و عرفان کے موتی لٹائے جا رہے تھے۔ حاجت مند فیض یاب ہو رہے تھے۔ فیوض و برکات کے دروازے کشادہ تھے۔ شیخ الہ داد بھتیجے کو لے کر حاضرِ خدمت ہوئے اور کیفیت بیان کی اور دعا کے لیے عرض کیا۔ آپ نے سنا تو خنداں بر لب فرمایا۔

"عبدالرحمٰن کو کچھ نہیں ہوا۔"

میاں الہ داد حیرت سے تکنے لگا، لیکن لب کشائی کی جرأت نہ تھی۔ سوچ رہا تھا کہ دوبارہ مدعا کس طرح عرض کرے کہ آپ نے اپنی زبان ترجمانِ حق بیان کو جنبش دی۔ اور فرمایا۔

"یہ ہمارا منظورِ نظر ہے اور جذب و مستی کے مقام سے گزر رہا ہے۔"

شیخ صاحب نے سنا تو اطمینان نصیب ہوا۔ اسی ہنگام حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے عبدالرحمٰن کو حلقۂ ارادت میں شامل فرما لیا۔ اور اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ شیخ الہ داد واپس لوٹ گیا اور جا کر اپنے چھوٹے بھائی میاں سہالی کو بتایا تو وہ اللہ کا شکر بجا لایا اور بولا۔

"مجھے کیا علم تھا کہ یہ سب ایک ولیٔ کامل کی نظر کا اعجاز ہے۔"

سلسلہ قادریہ عالیہ میں بیعت ہونے کے بعد آپ مرشد کی خدمت میں رہنے لگے۔ ابتداءً آپ کو مزارعین اور درویشوں کو کھانا پہنچانے کی خدمت تفویض کی گئی۔ آپ گھر سے کھانا لے کر درویشوں اور مزارعوں کو پہنچا دیتے۔ گھر والے خیال کرتے کہ آپ درویشوں کے ہمراہ کھانا کھا لیتے ہوں گے اور مزارعین سوچتے کہ گھر سے کھانا کھا کر آتے ہوں گے لہٰذا آپ کو کھانے کے لیے نہ کہا جاتا۔ اس طرح چالیس دن گزر گئے۔ ان میں ایک لقمہ تک آپ کے

حلق سے نیچے نہ اُترا۔ اور نہ ہی آپ نے اس بات کا کسی سے ذکر کیا۔ مرشد نے جو کام سپرد کیا تھا بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہے۔

وہ مرشد ہی کیا جس کو اپنے مُرید کے احوال کا علم نہ ہو۔ حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کو سب پتہ تھا لیکن مرید کے تزکیہ نفس کا یہ حصہ تھا۔ چنانچہ جب سلوک کی منزل کا یہ حصہ طے ہو گیا تو ایک دن عبدالرحمٰن کو بلایا۔ محبت سے دیکھا اور اپنے مبارک ہاتھوں سے کوئلوں پر روٹی پکا کر مرید باصفا کو کھلائی۔ عبدالرحمٰن روٹی کھاتے جاتے تھے اور نظروں کے سامنے سے حجابات اُٹھتے جاتے تھے۔ معرفتِ الٰہیہ کے رنگ نمایاں ہوتے جاتے تھے۔ عشق رگ و ریشہ میں سرایت کرتا جاتا تھا۔ اور وہ منازل جو کئی سالوں کی ریاضت و مجاہد کے بعد نصیب ہوتی ہیں تھوڑی دیر میں طے کرا دیں۔

فنافی اللہ کے مقام پر پہنچنے سے قبل عارفین کو دو مقامات پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ اولاً فنافی الشیخ اور ثانیاً فنافی الرّسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ اب مرشد نے آپ کو کنواں چلانے پر مامور فرما دیا۔ بڑی محبت سے یہ کام سرانجام دینے لگے۔ ایک دن خیال آیا۔

"اے عبدالرحمٰن! گاہدی پر بیٹھنا اور بیلوں پر اپنا بوجھ ڈالنا خلافِ ادب ہے۔"

بس پھر کیا تھا آپ گاہدی سے اُترے اور پیچھے چلنے لگے۔ اس طرح چند دن گزر گئے ایک دن گاہدی کے پیچھے چل رہے تھے کہ خیال آیا۔

"بیل گاہدی کو کھینچتے ہیں اور میں فارغ آزاد پیچھے چلتا ہوں۔ یہ بھی ادب کے منافی ہے۔"

یہ سوچنا تھا کہ بیلوں کو کھول دیا اور ان کی جگہ خود کنواں چلانے لگے۔ مُرشد کی صحبت اس قدر سرایت کر چکی تھی کہ جب ایک چکر لگا کر اپنے پیر روشن ضمیر کے بالمقابل آتے تو ادب سے سر کو جھکا دیتے۔ یہ حرکتیں دیکھ کر لوگ آپ کو دیوانہ کہنے لگے، لیکن مرشد کو علم تھا کہ عبدالرحمٰن کس قدر فرزانہ ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کو پاک کا لقب مرشد نے ہی عطا کیا تھا۔ ایک دن آپ اپنے مرشد کے ہمراہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں دریا پڑتا تھا۔ کشتی روانہ ہونے کے لیے تیار تھی۔ حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ سوار ہو گئے۔ جب آپ سوار ہونے لگے تو اچانک پاؤں پھسل گیا اور دریا میں گر پڑے اسی اثنا میں مٹی کی بہت بڑی سِل کنارے سے لوٹ کر گری اور آپ اس کے نیچے دب گئے۔ اس واقعہ کو بیتے چالیس دن گزر گئے۔ ایک دن حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما تھے کہ ایک خادم نے عرض کیا۔

"حضور! چالیس روز ہوئے عبدالرحمٰن کہیں نظر نہیں آئے۔"

آپ نے کوئی جواب نہ دیا اپنی جگہ سے اُٹھکر کھڑے ہو گئے اور ایک طرف چل پڑے۔ اس وقت جو لوگ حاضرِ خدمت تھے وہ بھی کھڑے ہو گئے اور آپ کے پیچھے چل پڑے۔ حضرت نوشہ گنج رحمۃ اللہ علیہ لبِ دریا جا کر رُکے۔ دیکھا کہ اس جگہ سے پانی ہٹ گیا ہے جہاں مٹی کی سِل گری تھی۔ آپ نے مریدین سے فرمایا کہ وہ مٹی ہٹائیں۔ جب مٹی ہٹائی گئی تو نیچے سے حضرت عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ زندہ نکل آئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔

"اے عبدالرحمٰن! تو زمانے کی تکلیفوں سے پاک ہے۔" چنانچہ اس دن سے آپ کا نام رحمٰن پاک مشہور ہو گیا۔

دورانِ تربیتِ روحانی آپ کبھی کبھی والدین سے ملنے گھر بھی چلے جایا کرتے تھے۔ ابتدائے احوال میں بلند آواز سے ذکر کیا کرتے تھے اور ساری رات نعرے لگاتے رہتے تھے۔ لوگ آپ کو پاگل اور دیوانہ کہتے تھے۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ بھڑی کا ایک ہندو سوداگر فروش ساہن پال میں پہنچا اور حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ جب پتہ چلا کہ بھڑی کا رہنے والا ہے تو پوچھا۔

"تمہارے گاؤں میں ہمارا ایک درویش رحمٰن ہے۔ اس کا کیا حال ہے؟"

ہندو نے سُنا تو بڑی نفرت سے بولا۔

"ہاں وہ ایک دیوانہ سا ہے۔ ساری رات گاؤں کے گرد چکر لگاتا اور گیدڑ کی طرح چلّاتا رہتا ہے۔ لوگوں کو آرام نہیں لینے دیتا۔"

آپ نے سُنا تو چہرہ مبارک پہ جلال کے آثار نمودار ہوئے پُرجوش انداز میں گویا ہوئے۔

"یہ تم نہیں تمہاری ہندوانہ عصبیت و نفرت بول رہی ہے۔ اے گدھے تم کیا جانو وہ تو اللہ کا شیر ہے۔ وقت آئے گا کہ وہ شیر کی طرح غرّائے گا اور اس کی حالت از خود ظاہر ہو جائے گی۔"

اس واقعہ کو مولانا اشرف مینجری نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

رحمے شاہ عشق وچ رَجّے
بگے شیر وانگوں نت گجے
دوہیں جہانیں نوبت وجے
بل بل پیا پکاری دا

چنانچہ جیسا مرشد نے فرمایا تھا ویسا ہی ظہور میں آیا۔
جب سلوک کی منازل طے ہو گئیں تو مرشد نے آپ کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ لوگوں کو بیعت کرنے کی اجازت سے نوازا۔ اور حکم دیا کہ آپ اپنے گاؤں بھڑی میں ہی جا کر مخلوق اللہ کی رہنمائی و ہدایت کا فریضہ انجام دیں۔ مرشد کے حکم کے مطابق آپ اپنے گاؤں میں پہنچے اور گاؤں سے باہر بطرف شمال اپنا ڈیرہ لگایا۔ لوگ جوق در جوق آپ کی خدمتِ عالیہ میں جوق در جوق آ کر فیض یاب ہونے لگے۔ آپ کے ڈیرے کے قریب ہی ایک ہندو فقیر دندو رام کی کٹیا تھی۔ وہ صاحب استدراج تھا لوگوں کو خوب لوٹ رہا تھا۔ اُس نے آپ کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ چاہتا تھا کہ آپ کہیں اور چلے جائیں۔ آپ نے اُسے کہا۔

"سنو دندو رام! میں یہاں اپنے مُرشد کے حکم سے آیا ہوں اور اس کے علاقے کی باطنی خدمت میرے سپرد ہے۔"

مگر اُسے اپنے علم پر بڑا گھمنڈ تھا۔ سانپوں کا بڑا عامل تھا۔ اپنے تصرف سے آپ کو وہاں سے بھگانا چاہا۔ اُس نے سانپوں کو آپ پر مسلط کرنا چاہا تو آپ نے ان پر ایسی نگاہ ڈالی کہ سب کا زہر کھینچ لیا۔ ہندو فقیر بے بس اور لاچار ہو گیا اور وہاں سے اُٹھ کر دو میل دُور جا کر ڈیرہ لگا لیا۔ آج بھی اُس کے نام کا گاؤں حافظ آباد گوجرانوالہ سڑک پر موجود ہے۔

آپ ریاضت و مجاہدہ میں بڑے شدید تھے۔ شریعتِ دین متین کے بڑے سختی سے پابند تھے۔ نمازِ تہجد بڑی پابندی سے ادا فرماتے تھے۔ ہر وقت یادِ الٰہی میں مصروف رہتے۔ کوئی دم غفلت سے نہ گزرتا۔ اکثر رات کو گاؤں سے باہر جنگل کی طرف نکل جاتے تھے۔ کبھی ذکر نفی و اثبات بلند آواز سے کرتے اور عشقِ الٰہی میں نعرے لگاتے۔ نفس کشی کے لیے آپ مختلف طریقے اختیار کرتے تھے۔ فرماتے تھے نفس کے فتنے بڑے خراب ہیں؛ اسے قابو میں رکھنا چاہیئے۔ لہٰذا اسے خود سری اور بے قابو ہونے سے بچانے کے لیے کبھی پاؤں میں رسّہ باندھ کر بیلوں کے پیچھے باندھ دیتے اور زمین پر گھسیٹتے جاتے۔ کبھی موسم گرما میں تپتی ریت پر بیٹھ کر آگ سینکتے۔ کبھی حبسِ دم سے تمام رات ذکر خفی کرتے۔ کبھی دریا میں کھڑے ہو کر یادِ الٰہی کرتے۔ جَو اور پوہلی کی روٹی کھاتے۔ الغرض آپ اپنے تمام اوقات عبادت و ریاضت اور اشغال و اذکار سے معمور رکھتے تھے۔ لوگ آپ کو دیکھتے

نوالله یاد آتا تھا۔

شجرادب کو جس قدر شیریں اور کثرت سے پھل لگتا ہے اور کسی درخت کو نہیں لگتا۔ محبت وعشق کی اصل بھی ادب ہی ہے۔ مرشد کا ادب اس لیے لازمی ہے کہ اس کے توسط سے دین اور معرفت الہیٰ نصیب ہوتی ہے لہٰذا آپ جب بھی ساہن پال گجرات تشریف لے جاتے تو جوتا صحرائے گاجر گولہ (گوجرانوالہ) میں ایک ٹیلہ کے بیچ رکھ جاتے تھے اور ننگے پاؤں سفر کرتے تھے۔ پیر خانہ کی سرحد میں بھی بول وبزار نہ کرتے تھے۔ جب لوٹتے تو بھڑی تک اُلٹے پاؤں آتے۔ اور ادھر پشت نہ کرتے۔ اگر کبھی پیر خانہ کا خاکروب بھڑی آتا تو اُسے چارپائی پر بٹھاتے اور خود زمین پر۔ اور جب آپ کے مُرشد کا وصال ہو گیا تو اُن کی اولاد کو بھی سر آنکھوں پر بٹھاتے اور بے حد خدمت کرتے تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن پاک رحمۃ اللہ علیہ اخلاق حمیدہ کے مالک تھے۔ سیرت وصفات میں اولیائے سلف کا نمونہ تھے۔ چہرہ مبارک بڑا بارُعب تھا۔ ہر کسی کو آپ سے کلام کرنے کی جرأت نہ پڑتی تھی۔ نگاہ کیمیا میں اتنی تاثیر تھی کہ جس پر شفقت ومحبت سے نظر ڈالتے ولی اللہ ہو جاتا تھا۔ بھوک سے خلاصی پا لیتا۔ ایک دن آپ تشریف فرما تھے۔ سامنے مریدین مؤدب بیٹھے تھے۔ پوچھا۔

"تم نے کھانا ارادتاً چھوڑا ہے۔"

مریدین نے عرض کیا۔

"حضور! ہمیں کھانے کی رغبت ہی نہیں ہوتی۔ اگر ہم منہ میں ایک بھی لقمہ ڈالتے ہیں تو حلق سے نیچے نہیں اُترتا۔ ہمیں کھانا نہ کھانے سے قطعاً کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔"

کبھی کبھی اپنی مملوکہ زمین میں خود ہل چلاتے اور کاشتکاری کرتے تھے۔ جب فصل ہوتی تو اسے درویشوں مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ لباس میں تکلف نہیں برتتے تھے۔ ہمیشہ کمبل اوڑھ کر رکھتے اور جوتا پھٹا پرانا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ لاہور تشریف لے گئے تو آپ کے مرید نے نذرانہ کے طور پر عمدہ کپڑے اور جوتا پیش کیا تو آپ نے اُس کی خاطر داری کے لیے ان کو پہن لیا۔ لاہور میں آپ کچھ عرصہ اندرون بھاٹی گیٹ بازار حکیماں میں بھی ایک کمرہ میں معتکف رہے تھے جو آج بھی موجود ہے۔

آپ سماع سُنا کرتے تھے۔ آپ کی مجلس میں سوز وگداز۔ رقت وقلب ووجد بہت ہوا کرتا تھا۔ میاں علی قوال جب سرود سناتا تو وجد کی حالت میں بے حس وحرکت ہو جایا کرتے

واحد الماری والے

پاکستان میں پہلی بار اسٹیل کی الماریاں تول کر پیش کرنیکے بانی

ہم اپنے رب کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمارے ماہانہ ایڈوانس اقساط کے پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ہم اپنے عوام کے بھی تہہ دل سے مشکور ہیں کہ انہوں نے ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ عوام کے اعتماد اور تعاون کی بدولت ہم نے اپنی ایکسپیاں قائم کرنیکے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا اور ہمیں سعادت حاصل ہوئی کہ ہم عوام کی ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں آسان اقساط پر ان کے گھروں تک پہنچا دیں۔

آپ کی خدمت ہمارا نصب العین ہے

ہمیں دلی مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے ماہانہ ایڈوانس اقساط کے پروگراموں کی ممبرشپ جاری ہے آپ بھی ہمارے ماہانہ ایڈوانس اقساط کے پروگراموں میں ممبر بن کر اپنی پسند کی مندرجہ ذیل اشیاء حاصل کر سکتے ہیں۔

تفصیل اشیاء

سیونگ مشین۔ الیکٹرک فین چھوٹی الماری، بڑی الماری
واشنگ مشین، مختلف فرنیچر کے سیٹ، موٹر سائیکل، فریج۔ اور
ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں:

اس کے علاوہ ہمارے دیگر پروگرام

موٹر سائیکل ہنڈا ۷۰ CD. ۷۰ : ۴۰۰ روپے ماہانہ:
پاک سوزوکی کار ۸۰۰ CC : ۱۵۰۰ روپے ماہانہ

نقد یا نقد کے برابر اقساط کی ادائیگی پر ہماری کمپنی آپ کی پسند کی اشیاء کراچی میں آپکے گھر تک پہنچا کر دیتی ہے۔ آئیے آپ بھی ہمارے ماہانہ ایڈوانس اقساط کے پروگراموں کی ممبرشپ حاصل کر کے ہمارے پروگراموں میں اپنی شرکت کو یقینی بنائیے۔

نوٹ ۱۔ ہمارے ۸۰۰ CC پاک سوزوکی کار یا سی ڈی ۷۰ ہنڈا موٹر سائیکل کے اگلے ماہانہ ایڈوانس اقساط کے پروگرام میں حصہ لے کر آپ بھی اپنی شرکت کو یقینی بنائیے۔

ایجنسیاں:۔ لیاقت آباد: آئیڈیل ٹریڈرز ۱۴/۱۲ بلاک ۱۲ اکرم اسکوائر فون نمبر ۶۸۶۷۳۹

ناگن چورنگی: عزیز ٹریڈرز دوکان نمبر ۷۷ اقبال پلازہ نارتھ کراچی۔ **محمود آباد:** اصغر بھٹی ایجنسی ہولڈر سلیمان سینٹر محمود آباد نمبر ۱۲
ملیر: سہیل حیدر ایجنسی ہولڈر ایچ ۱۔ ۱ نزد لیاقت مارکیٹ۔ تاج کمپلیکس: ایم۔ اے جناح روڈ غفوری چان اینڈ سنز دوکان نمبر ۶۔ ۷ بلاک سی ۔ ۲۔ **کورنگی:** شیراز اینڈ برادرز ۲۵۔ اے زمان ٹاؤن کورنگی نمبر ۲
جماعت خانہ البیلا اسٹاپ: پرنس انٹرپرائزز گارڈن کارنر پارٹمنٹ نشتر روڈ دوکان نمبر ۱۱ البیلا اسٹاپ کراچی

واحد رحمٰن انڈسٹریز (پرائیویٹ) **لمیٹڈ**: ہیڈ آفس۔ ۳۰۶ پرفی شاپنگ سینٹر قیصری منزل کارنر آف بالمقابل محبوب کلاتھ مارکیٹ مدر کراچی۔ فون نمبر ۵۲۶۷۰۵ ۔ ۵۲۷۵۲۷ ۔ شوروم: دکان نمبر بی ۱/۲۱ ۔ گراؤنڈ فلور بلاک نمبر ۲ اکرم اسکوائر لیاقت آباد کراچی۔ شوروم: دکان نمبر ۵۔ ۴ بلاک ۲۔ سی۔ تاج کمپلیکس ایم۔ اے جناح روڈ کراچی

تھے یہاں تک کہ لوگ سمجھتے شاید آخری لمحات آگئے ہیں۔ مولانا حافظ برخوردار مفتی پرگند بچھ چھٹہ کو آپ کا یہ انداز ناگوار گزرتا تھا۔ اُس نے ناظم لاہور اور قاضی القضاۃ قاضی عبدالرحمٰن مفتی اعظم لاہور کو شکایت لکھ بھیجی۔ اُس نے برائے احتساب آپ کو لاہور طلب کیا۔

آپ گئے تو ہمراہ یارانِ طریقت اور علی قوال بھی تھا۔ داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دربارِ عالیہ پر حاضری دینے کے بعد اپنے مرید خاص مرزا احمد بیگ لاہور کے ہاں قیام فرمایا جو ایک معزز عہدے دار تھا۔ دوسرے دن علماء کا اجتماع ہُوا۔ سماع کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے دلائل پیش کیے اور ثابت کیا کہ سماع ناجائز نہیں۔ علمائے ربّانی نے جب دلائل سُنے تو انہیں بہ دل وجان آپ کے علم لدنی کا اعتراف کرنا پڑا۔ جب آپ نے دیکھا کہ اِن لوگوں کے پاس کہنے کے لیے اور کچھ نہیں تو علی قوال سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"کوئی کلام پڑھو"

اُس نے حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف ومنقبت میں ایک کافی پڑھنا شروع کی۔ سب خاموشی سے سُن رہے تھے معاً آپ نے نعرہ لگایا۔ بس پھر کیا تھا، حاضرینِ محفل پر وجد طاری ہو گیا اور سب ہو حق کے نعرے بلند کرنے لگے۔ کیفیت یہ ہوئی کہ تمام علماء اور مفتی اعظم ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ جب ہوش میں آئے تو آپ سے معذرت چاہی اور سب کے سب حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ان میں مفتی اعظم تو خلعتِ خلافت سے مشرف ہوئے اور کئی ولی اللہ ہوئے۔

کرامات کا ظہور اولیائی کی علامت نہیں لیکن اللہ والوں سے بعض اوقات خوارق عادات ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ حضرت شاہ عبدالرحمٰن پاک سے بھی بے شمار کرامات کا صدور ہُوا۔ ایک مرتبہ وزیر آباد تشریف لے گئے۔ سماع کے دوران کسی کام سے اُٹھ کر باہر جانا پڑا۔ اسی اثنا میں قاضی شہر چند علماء کے ہمراہ آیا اور گانے والوں کو گرفتار کر کے لے گیا۔ آپ واپس تشریف لائے تو حقیقت حال سے آگاہ ہوئے۔ قاضی کے پاس تشریف لے گئے اور ایسا تصرف فرمایا کہ وہ مطیع ہو گیا۔ معافی طلب کی۔ اور بھی بہت سے لوگ جو وہاں موجود تھے ـــــ حلقہ بگوش ہوئے۔

آپ کے معاصرین میں سے ایک درویش شیخ دریائے راوی کے کنارے میانی میں رہائش

پذیر تھا۔ وہ اپنے حلقہ میں کہا کرتا تھا۔

"اس وقت اولیاء میں صرف میں ہی مرد ہوں باقی سب عورتیں ہیں۔"

کسی نے اس امر کا ذکر حضرت عبدالرحمٰن پاک رحمۃ اللہ علیہ سے کر دیا۔ آپ نے باطنی طور پر اُسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس وقت محفل میں جو لوگ چشم باطن رکھتے تھے انہوں نے دیکھا کہ اس شیخ درویش کے ہاتھ بجانب پشت بندھے ہوئے ہیں اور آپ کے دروازے پر گرفتار بیٹھا ہے۔

کہتے ہیں جب آپ کے مرشد حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا وقت وصال قریب آیا تو اس وقت جو یارانِ طریقت موجود تھے اُن کو بلایا اور فرمایا۔

"اب میں سفرِ آخرت پر روانہ ہونے والا ہوں۔ کسی کو کوئی حاجت ہو تو بتاؤ۔"

حضرت سچیارؒ نے عرض کی۔

"یا مرشدنا! دین و دنیا عطا کر دیں۔"

آپ نے ارشاد فرمایا۔

"تمہارے سلسلہ میں قیامت تک دولت و دینداری رہے گی۔"

پھر مرشد نے حضرت عبدالرحمٰن پاک کو مستانہ کہہ کر بلایا اور فرمایا۔

"تم بھی کچھ مانگ لو۔"

آپ نے دونوں ہاتھ باندھ کر عرض کی۔

"حضور! نہ مجھے دنیا کی ضرورت ہے نہ دین کی۔ مجھے عشق مطلوب ہے۔"

مرشد نے سُنا تو مسکرا کر فرمایا۔

"عشق کا ظہور تمہارے سلسلہ میں رہے گا۔"

چنانچہ آج تک عشق و جذب و مستی آپ کے سلسلہ میں چلا آ رہا ہے۔ آپ کے مرید حضرت شیخ برخوردار ہرلؒ نوشاہی فرمایا کرتے تھے۔

"زمانہ کے مُرشد میاں عبدالرحمٰن پاک رحمۃ اللہ علیہ عشق و جذب کے سمندر میں جو ٹھاٹھیں مار رہے ہیں اور آپ کے انوار کے دریا کی موج درختوں کے اوپر سے بہہ رہی ہے۔"

آپ نے شادی کب کی اس کے بارے میں کہیں مذکور نہیں۔ تذکرہ نوشاہی میں صرف اتنا لکھا ہے کہ آپ کی اہلیہ محترمہ کا نام بی بی زہرہ خاتون تھا لیکن وہ بی بی ظہری کے نام سے مشہور تھیں۔ آپ کے ہاں بی بی جواہر خاتون، بی بی فتح خاتون اور بی بی حسین خاتون، تین

بیٹیوں نے جنم لیا۔ موخرالذکر دونوں بیٹیوں کی اولاد حضرت شاہ عبدالرحمٰن پاک رحمۃ اللہ علیہ کی متولی چلی آرہی ہے۔

آپ کی ولادت عہدِ کبریٰ میں ہوئی تھی اور وصال ۴ محرم الحرام ۱۱۱۵ ہجری مطابق ۱۷۰۳ء بعمر ۱۲۰ سال؛ حضرت اورنگ زیب عالمگیر غازی کے عہد میں ہوا اور بھڑی عبدالرحمٰن ہی میں مدفون ہوئے۔ یہ وہی جگہ ہے جسے آپ کے قیام سے قبل بھڑی دھوتھڑاں کہتے تھے، لیکن قیام کے بعد سے آج تک آپ کا نام نامی اسمِ گرامی سے زبان زدِ عام و خاص ہے۔ جب آپ کے وصال کی خبر حضرت شیخ پیر محمد سیمیارؒ جو آپ کے پیر بھائی تھے نے سُنی تو بولے "ہم اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہیں۔"

پھر دو نفل شکرانہ ادا کیے اور سوئے دریا چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولے۔

مرن نہ بھائی بھج جان نہ باہاں
کول وسندیاں دیاں مینوں لکھ پناہاں

اور دردناک نعرہ مارا۔ ساتھیوں پر رقت طاری ہو گئی ایک صاحب نے بصد ادب نماز شکرانہ ادا کرنے کی حکمت دریافت کی تو فرمایا۔

"بھائی نے ایک نازک کام میں ہاتھ ڈالا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس طریق میں اُس نے ہاتھ ڈالا تھا۔ اللہ عزوجل نے اس کو انجام تک پہنچایا۔"

آپ کا عرس ہر سال ۹ جیٹھ کو ہوتا ہے جس میں ہزاروں لوگ جمع ہوتے ہیں اور فیض حاصل کرتے ہیں۔

یونان کا مشہور مفکر اور فلکیات کا ماہر بطلیموس اپنے ایک دوست کا غم ہلکا کرنے گیا جو چند دنوں پہلے تک دولتمندوں میں شمار ہوتا تھا لیکن کسی طرح اس کی دولت دوسروں کے پاس چلی گئی تھی۔ دوست بطلیموس کو اپنے سامنے دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ بولا! میرے دوست! مجھے لوگوں نے تباہ کر دیا، میری دولت اِن کے قبضے میں جا چکی ہے۔"

بطلیموس نے جواب دیا "دوست! تم غلط فہمی کے شکار ہو۔ وہ تمہاری دولت کب تھی اگر وہ واقعی تمہاری ہوتی تو دوسروں سے تم تک نہ آتی اور اگر تمہارے قبضے سے دوسروں کے پاس نہ چلی جاتی۔"

وہ جو بیچتے تھے نورِ ایماں

صاحبِ کرامات | باعمل | روشن ضمیر | بلند کردار | فخرِ روزگار

عظیم ہستیوں کی روح پرور داستانیں

حضرت سید عبدالکمال قادری رح

حضرت غوث الثقلین غوث الاعظم شاہِ بغداد رح کی نسل مبارک میں حضرت شاہ کمال قادری کیتھلی رح بہت بڑے پائے کے بزرگ گزرے ہیں۔ آپ نویں صدی ہجری کے آخری ایام میں بمقام بغداد شریف پیدا ہوئے۔ دینی علوم سے فراغت کے بعد حضرت شاہ فضل قادری رح کے دستِ حق پرست پر بیعت فرمائی اور منازلِ سلوک طے فرمائیں۔

دسویں صدی ہجری کے وسط میں مختلف ممالک کی سیر و سیاحت فرماتے ہوئے ہندوستان آئے۔ اس زمانے میں ملتان، دلی، لاہور اور احمد آباد علومِ شریعت کے بڑے مراکز تھے۔ حضرت شاہ کمال قادری ان شہروں کے اربابِ فضل و کمال سے ملاقات و استفادہ کے بعد کیتھل تشریف لائے اور اس تاریخی قصبہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی یہ شیر شاہ سوری کا عہدِ سلطنت تھا۔

کیتھل کسی زمانے میں بُت پرستی اور اسلام دشمنی کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس کا اصل نام "کپس تھل" تھا۔ یعنی بندروں کا استھان؛ یہاں بندر بہت کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ان کے دیوتا ہنومان کی پرستش کی جاتی تھی۔

حضرت شاہ کمال قادری رح نے حق پرستی کے جُرم میں بڑی بڑی تکلیفیں جھیل کر تبلیغِ

اسلام کا مقدس فریضہ ادا کیا اور وہی قصبہ کیس تھل جو ہنومان کی پرستش کا بہت بڑا مرکز تھا "کیتھل" کے نام رشد و ہدایت کا سرچشمہ بن گیا۔ یہیں سے علم و عرفان کے ایسے چشمے جاری ہوئے جن سے بے شمار بندگانِ خدا فیضیاب ہوئے۔ سلسلۂ قادریہ کے جتنے بڑے بڑے روحانی مراکز ہیں وہ سب کیتھل کے مرکزِ روحانیت سے بہرہ ور اور فیضیاب ہوئے ہیں۔

سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے بہت مشہور بزرگ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے والد ماجد حضرت شیخ عبدالاحدؒ نے حضرت شاہ کمال قادریؒ سے سلسلۂ عالیہ قادریہ میں بیعت ہو کر خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ مشہور ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ ایک مرتبہ بچپن میں سخت بیمار ہوئے۔ بے حد علاج معالجہ کے باوجود جب کوئی افاقہ نہ ہوا تو اُن کے والد ماجد حضرت شیخ عبدالاحد سرہندیؒ بیمار بچے کو لے کر حضرت شاہ کمال کیتھلیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ کمال قادریؒ نے بچے کو گود میں لے کر دعائے صحت فرمائی اور شیخ عبدالاحدؒ کو بشارت دی کہ اس بچے کو بڑی عظمت و شہرت حاصل ہوگی اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے بے شمار لوگوں کو درجۂ کمال پر پہنچائے گا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ منصبِ مجددیت پر فائز ہونے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ

"جب ہم کو خاندانِ قادریہ کا کشف ہوتا ہے تو حضرت غوث الثقلینؒ کے بعد حضرت شاہ کمال قادریؒ جیسا بزرگ نظر نہیں آتا۔ جس طرح آسمان کے ستاروں کا شمار کرنا محال ہے اسی طرح حضرت شاہ کمال قادریؒ کی کرامات کا شمار کرنا محال ہے۔"

حضرت شاہ کمال قادریؒ کی ایک مشہور کرامت یہ تھی کہ آپ ہمیشہ سرخ لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے اور اگر کبھی کوئی سفید لباس خدمتِ اقدس میں پیش کرتا تو آپ اُسے قبول فرما لیتے لیکن جیسے ہی پہنتے تو اُس کا رنگ بھی سرخ ہو جاتا تھا۔ اس بنا پر لوگ آپ کو لال دیال کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

امامِ ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے حضرت شاہ کمال قادریؒ کے وارث و جانشین قطب الاقطاب حضرت شاہ سکندر قادری محبوبِ الٰہی سے سلسلۂ عالیہ قادریہ میں بیعت کی اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ اس طرح حضرت مجددؒ صاحبؒ سے جو سلسلہ جاری ہوا وہ قادریہ مجددیہ کہلاتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے حضرت شاہ سکندر رؤسؒ کی عظمتِ روحانی کا یہ کہہ کر

اظہار فرمایا ہے کہ "میں گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے وقت آفتاب کو بلا خیرگی چشم متواتر دیکھ سکتا ہوں۔ مگر جب میں حضرتِ اقدس کے قلبِ انور پر نظر ڈالتا ہوں تو غلبۂ اشعاعِ انوار کی وجہ سے نظر نہیں ٹھہرتی۔"

حضرت شاہ سکندر رؤس" اور ان کے سجادگانِ عظام" شاہ محبُ اللہ الیاس زہدی" حضرت محمدؐ شاہ علی، حضرت شاہ بالائے ماہ، حضرت شاہ حسن الدین"، حضرت شاہ کبیر الدین عابد، حضرت سیّد محمد شاہ علی"، قبلۂ عالم حضرت سید علی" اور حضرت سید عبدالعلی" نے ہزاروں تشنگانِ راہِ سلوک کو صراطِ مستقیم پر گامزن کیا۔ مکتوباتِ معصومیہ دفتر اوّل میں دو مکتوبات نمبر ۲، ۴، حضرت شاہ محبُ اللہ الیاس زہدی" کے نام ملتے ہیں۔ جن میں خواجہ محمدؐ معصوم سرہندی نے آنجناب" کی بڑی تعریف کی ہے۔ حضرت سید عبدالعلی" قادری اپنے جدِّ امجد حضرت شاہ سکندر رؤس الاولیاء کے سلسلۂ خاندانی میں آٹھویں بزرگ ہیں۔ ان کے والد ماجد حضرت شاہ سید علی سید بہت بڑے صاحبِ کرامت بزرگ تھے اور انھوں نے اپنے والد ماجد سلطان العارفین حضرت شاہ سید محمدؐ علی قادری" سے فیض حاصل کیا تھا جو ایک بلند پایہ صاحبِ نسبت بزرگ ہونے کے علاوہ ایک زبردست عالمِ دین بھی تھے اور ان کی خدمت میں صوفیائے کرام کے علاوہ بڑے بڑے علماء بھی بغرض استفادہ حاضر ہوتے تھے۔

حضرت کے جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ کبھی کوئی سائل در سے خالی ہاتھ نہ گیا۔ قرآن مجید کی تلاوت سے عشق تھا اور جب تلاوت فرماتے تو آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑتا تھا۔ تلاوت کے بعد اکثر استغراق کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جو بہت دیر تک قائم رہتی تھی۔

قبلۂ عالم حضرت سید عبدالعلی قادری" نے ابتدائی عمر میں علمِ ظاہری کی تکمیل فرمائی۔ ذہانت کا یہ عالم تھا کہ اساتذہ حیران رہ جاتے تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت اور حدیث کے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ عشقِ رسولؐ کے نور سے قلبِ مبارک ہمیشہ پُر نور رہتا تھا۔ تبلیغِ اسلام کی دُھن تھی۔ آپ کے دستِ حق پرست پر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد اپنے والدِ ماجد" ہی سے شرفِ ارادت حاصل کیا اور اس قدر زبردست مجاہدے کئے کہ موجودہ دور میں مثال ملنا محال ہے۔ ہمیشہ روزے رکھتے تھے اور کوئی لمحہ یادِ الٰہی سے خالی نہ جاتا تھا۔

قبلۂ عالم حضرت سیّد عبدالعلیؐ قادری صاحبِ جلال بزرگ تھے۔ کوئی شخص آنکھ ملا کر

بات نہ کرسکتا تھا۔ جس طرف نظر اُٹھ جاتی سکوت طاری ہو جاتا تھا لیکن اس شان وجلال کے ساتھ آپؒ بے انتہا بُردبار اور منکسر المزاج تھے۔ کبھی کسی شخص پر ناراض نہ ہوتے تھے۔ اور اگر کوئی بات خلافِ مزاج ہو بھی جاتی تو خاموشی اختیار فرما لیتے تھے۔

آستانۂ عالیہ پر بڑے بڑے امراء اور والیانِ ریاست حاضری کا شرف حاصل کرتے تھے لیکن آپ دینوی دولت وشہرت سے متنفر تھے۔ ایک مرتبہ مہاراجہ جے پور نے ایک گاؤں آپکی خدمتِ اقدس میں نذر کیا لیکن جب فرمان کے ذریعے اس کی سند بارگاہِ عالی میں پیش ہوئی تو حضرت شاہ عبد العلیؒ نے مہاراجہ کا فرمان چاک کرکے پھینک دیا اور فرمایا کہ ہم دنیا کی جاگیر کے طالب نہیں۔

ایک مرتبہ کسی ہندو کی بارات رخصتی کے بعد کیتھل سے گزر رہی تھی۔ سفر کے دوران سیون دروازہ کے باہر سلطانہ رضیہ کے مقبرے کے قریب رات کو پڑاؤ کیا۔ رات گئے دفعتاً شور بلند ہوا کہ دُلہن پالکی میں نہیں ہے۔ اب ہر شخص عجیب اُلجھن میں گرفتار تھا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ دُلہن کا یوں اچانک گم ہو جانا بہت سے شکوک پیدا کر رہا تھا۔ اِرد گرد کا علاقہ چھان مارا لیکن کہیں کوئی سُراغ نہ ملا۔ ایک برہمن نے دُلہا کے والد سے کہا۔ شہر میں ایک بہت بڑے بزرگ رہتے ہیں۔ بڑے اللہ والے ہیں۔ آؤ ہم سب اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کریں۔ اُن کی دُعا سے ہی یہ معاملہ ٹھیک ہوگا۔

چنانچہ وہ سب پریشانی کے عالم میں آپ کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوئے اور تمام واقعہ بیان کرکے طالبِ استمداد ہوئے۔

آپ نے دریافت فرمایا کہ "جہاں تم نے پڑاؤ کیا تھا کیا وہاں کوئی آندھی بھی آئی تھی؟"

انھوں نے اس کا اثبات میں جواب دیا۔

آپ نے فرمایا "یہ جنات کی شرارت ہے۔" آپ نے ایک رقعہ جنّات کے نام تحریر کیا اور کہا۔ "اس رقعہ کو اُسی جگہ لے جا کر ہوا میں پھونک مار کر اُڑا دو۔" چنانچہ انھوں نے ہدایت پر عمل کیا۔ اس کے بعد یکایک آندھی آئی اور جب آندھی ختم ہوئی تو دلہن کو پالکی سمیت وہاں موجود پایا۔ دُلہن نے تمام ماجرا بیان کیا کہ مجھے جنّات اُٹھا کر لے گئے تھے اور وہ کسی قیمت پر بھی مجھے واپس کرنے پر تیار نہ تھے۔ دفعتاً ایک سفید ریش بزرگ آئے

(پاکستان میں سب سے پرانا بینک)

قائم شدہ ۱۹۴۱

اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں جن میں سے ایک ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے، جو شخص اس (مبارک) گھر میں داخل ہوا اُس نے امن پالیا۔ اور لوگوں پر خدا کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے۔

سورۃ آلِ عمران - ۹۷



حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

manhattan International

اور انھوں نے مجھے اُن کی قید سے رہائی دلوائی۔

کرنل آسکر ایسٹ انڈیا کمپنی کے انتظامی دورے پر کیتھل آیا۔ اُن کے اولاد نہ ہوئی تھی۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ حضرت دُعا فرمایئے کہ اولاد ہو جائے۔ آپ نے دُعا فرمائی اور کرنل سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں لڑکا دے گا اُس کا نام یوسف رکھنا۔ چنانچہ اُن کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے اپنے بیٹے کا نام جوزف آسکر رکھا۔

کرنل آسکر نے بوقتِ رخصت حضرت سے نصیحت چاہی۔ آپ نے فرمایا۔

"کسی پر ظلم مت کرنا۔"

عوام کو آپؒ سے اتنی زبردست عقیدت تھی کہ بڑے بڑے مقدموں کے فیصلے دربارِ اقدس میں طے ہو جاتے تھے۔ فریقین سے کہہ دیا جاتا تھا کہ حضرت کی جائے نماز پر ہاتھ رکھ کر اپنے سچّا ہونے کی قسمیں کھائیں اور جس فریق کو اپنی سچائی کا پورا بھروسہ ہوتا تو وہ آپ کی جائے نماز پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا لیتا۔ مشہور تھا کہ کوئی شخص آپ کی جائے نماز پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا تھا اور اگر جھوٹی قسم کھانے کی کوشش کرتا تو اُس کی زبان گنگ ہو جاتی تھی۔

پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم قائدِ ملّت لیاقت علی خاں شہید اور اُن کے مورث نوابانِ کرنال کو سلسلۂ عالیہ قادریہ کے اس سرچشمۂ فیض سے بڑی عقیدت رہی اور ہر دور میں دربارِ قادریہ میں حاضر ہونا اس کے لیے باعثِ فخر رہا۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ نواب ابوالفتح علی خاں کو براہِ راست حضرت شاہ کمال کیتھلیؒ سے شرفِ ارادت حاصل تھا۔ کیتھل سے کئی میل دور وہ سواری سے اُتر جاتے اور کافی طویل فاصلہ پا پیادہ طے کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ حضرت شاہ کمال قادریؒ نے نواب ابوالفتح علی خاں کی عبادت و ریاضت سے خوش ہو کر انھیں خرقۂ خلافت بھی عطا فرمایا تھا۔ اس خاندان کی ثروت، عزّت اور شہرت حضرت شاہ کمال قادریؒ اور اُن کے جانشینوں کے روحانی تصرفات کا نتیجہ یقین کی جاتی ہے۔

قائدِ ملّت لیاقت علیخاں شہید کے دادا نواب احمد علیخاں کو سلطان العارفین حضرت شاہ سید علی قادریؒ سے شرفِ ارادت حاصل تھا۔ انھیں اپنے پیر و مُرشد سے اتنی زبردست عقیدت تھی کہ کبھی کیتھل کی طرف پاؤں کر کے نہیں سوئے۔ انھیں مُرشد کے دربار کا پانی اس قدر عزیز تھا کہ نواب صاحب کی ایک لاری روزانہ مظفر نگر یا کرنال سے کیتھل آتی

تھی اور نواب صاحب کے لیے پانی بھر کر لے جاتی تھی۔ نواب صاحب کو کیتھل کے سوا کسی دوسرے شہر کا پانی پسند نہ تھا۔ مُرشد کی وفات کے بعد ان کی نذر و نیاز پر فراخ دلی سے خرچ کرتے تھے۔ مرضِ موت میں انھوں نے اپنے فرزند نواب رستم علیخاں (نواب زاہد علی خاں، قائدِ ملت نواب لیاقت علی خاں کے والد ماجد) کو تاکید کے ساتھ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد انھیں خاندانی قبرستان کی بجائے ان کے پیر و مُرشد حضرت شاہ سید علی قادریؒ کے جوار میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ اس وصیت پر عمل کیا گیا اور جب نواب احمد علی خان اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے تو بعض با اثر رشتہ داروں کی مخالفت کے باوجود ان کی لاش کیتھل شریف لائی گئی اور حضرت شاہ سید علی قادریؒ کے جوار میں دفن کی گئی۔

قائدِ ملت لیاقت علی خاں کے والد ماجد نواب رستم علی خاں کو حضرت شاہ سید عبدالعلی قادریؒ سے شرفِ بیعت حاصل تھا۔ قدیم خاندانی روایات کے مطابق نواب رستم علی خاں کو بھی کیتھل شریف کے آستانۂ قادریہ سے بے حد عقیدت تھی۔ جب آپ اپنے پیر و مُرشد کی زیارت کے لیے کیتھل شریف لاتے تو قصبہ سے دو تین فرلانگ دُور رہ جانے پر سواری سے اُتر پڑتے اور بھاری بھرکم، لحیم شحیم ہونے کے باوجود پیدل چلتے۔ جب کیتھل شریف ایک ڈیڑھ فرلانگ رہ جاتا تو جوتیاں اُتار کر پابرہنہ ہو جاتے اور پُشتینی رئیس و پروردۂ نازو نعمت ہونے کے باوجود ناہموار راستے اور گلیوں کے صبر آزما نشیب و فراز، کانٹوں اور سنگریزوں کی زحمت بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔

نواب رستم علی خاں مرحوم نے کبھی اپنے پیر و مُرشد سے آنکھ ملا کر بات نہیں کی اور نہ ہی کوئی کام ان کی اجازت کے بغیر کرتے تھے۔

جب قائدِ ملت لیاقت علی خاں پیدا ہوئے تو نواب رستم علی خاں نے پیدائش کے چھٹے روز انھیں کیتھل لے جا کر حضرت شاہ عبدالعلی قادریؒ کے قدموں پر ڈال دیا۔ حضرت شاہ صاحب نے بچے کو بڑی محبت سے گود میں لیا۔ پیار کیا۔ سینے سے لگایا اور نواب رستم علی خان سے فرمایا کہ تمہارا بچہ حکمرانی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم تو محض نواب ہو انشاء اللہ تعالیٰ کسی ملک کا بادشاہ بنے گا۔ کروڑوں آدمی اس کے سامنے سر جھکائیں گے۔ اور فوجیں سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوں گی۔

حضرت شاہ سید عبدالعلی قادریؒ کی یہ بشارت حرف بحرف پوری ہوئی۔ کروڑوں انسانوں نے محبت وعقیدت سے ان کی قیادت کے سامنے سر جھکا دیا۔ وہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ جسے موجودہ جمہوری دور میں بادشاہ کا نعم البدل سمجھنا چاہیئے۔

نواب رستم علی خاں مرحوم کرنال کے ایک جاگیردار تھے۔ قائدِ ملت نواب لیاقت علیخانؒ نے دنیائے اسلام کے سب سے بڑے ملک پاکستان پر حکومت کی اور اس پاک فوج نے جو دنیا کی بہترین فوجوں میں شمار کی جاتی ہے۔ قائدِ ملت کو سلامی دی اور ان کے ہر حکم کی تعمیل کے لیے ہر وقت کمربستہ رہی۔

حضرت شاہ سید عبدالعلی قادریؒ نے ۲۲ شعبان ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۵ دسمبر ۱۹۰۰ء کو سفرِ آخرت فرمایا اور اپنے جدّ امجد حضرت شاہ سکندر کیتھلیؒ کے روضۂ اقدس کے احاطہ میں دفن کئے گئے۔

حضرت شاہ سید عبدالعلیؒ قادری کے پردہ فرما جانے کے بعد حضرت مخدوم سید علی احمد شاہ قادریؒ اپنے جلیل القدر والد کے بعد مسندِ رُشد وہدایت پر فائز ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت فرما کر کیتھل سے پاکستان تشریف لے آئے اور ڈیرہ غازی خاں میں رونق افروز ہوئے۔ جن کے دم سے ڈیرہ غازی خاں میں آج تک طریقت کی شمع روشن ہے۔ دسمبر ۱۹۶۲ء میں انھوں نے پردہ فرمایا جہاں آپ کا نہایت حسین اور پُرشکوہ مقبرہ تعمیر ہو چکا ہے جو دربارِ قادریہ کے نام سے معروف ہے اور مرجعِ خلائق ہے۔

زکوٰۃ ان جانوروں پر فرض ہوتی ہے جو سال کا اکثر حصّہ جنگل میں کھا پی کر گزارتے ہوں اور گھر پر کھڑا کر کے ان کو نہ کھلایا جائے۔

اگر جانور کو گھر پر رکھ کر گھاس کھلائی جائے خواہ گھاس قیمتاً خرید کی گئی ہو یا جنگل سے مفت لائی گئی ہو تو پھر جانور سائمہ شمار نہ ہوں گے اور ان پر سالانہ زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔ البتہ جب ان کو فروخت کیا جائے گا تو ان کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اگر نصف سال ان کو جنگل میں چراتے ہیں اور نصف سال گھر پر کھڑا کر کے کھلاتے ہیں تب بھی یہ جانور سائمہ نہیں کہلائیں گے اور زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔



میاں خدا بخش رح

مادر زاد ولی

اللہ کی یہ پہچان ہے کہ وہ بچپن سے ہی کم گو۔ سنجیدہ و متین عابد و زاہد۔ متقی و پرہیز گار اور ذکر و فکر میں مشغول و محو رہتا ہے۔ حضرت میاں خدا بخش رحمۃ اللہ علیہ بھی پیدائشی ولی اور برگزیدہ اولیاءُ اللہ میں سے تھے۔ آپ نے ماہ رمضان المبارک ۱۲۱۵ھ میں جالندھر شہر کے ایک متمول اور تقویٰ و شرافت و نجابت میں مشہور و معروف گھرانے میں جنم لیا۔ بچپن سے ہی آپ کے انداز و اطوار۔ نشست و برخاست اور سوچ بچار کے انداز دوسرے ہم عمر بچوں سے بالکل جداگانہ و منفرد تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کے دل و دماغ میں طرح طرح کے خیالات و خدشات گزرتے، لیکن کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکے۔ یہ سوچ کر کہ ہر بچے کی جدا طبعتیں ہوتی ہیں۔ انتظار کرنے لگے کہ جب بڑا ہو گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ وقت گزرتا رہا۔ جب بیٹے کی طرز میں تبدیلی رونما نہ ہوئی تو سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کسی سے مشورہ کرنا چاہیے۔ احباب سے اس امر کا ذکر کیا۔ دوسرے لوگوں سے بات کی مگر کسی نے بچے کی عجیب و غریب عادات کا شافی و کافی جواب نہ دیا تو فکر دامن گیر ہوئی۔ ایک دن اسی فکر و تردد میں آپ کے والد بیٹھے تھے کہ القا ہوا۔

"تمہارا بیٹا خدا بخش مشائخ، عظام اور بزرگانِ دین میں سے ہو گا۔ خدشات و توہمات

کو دل سے نکال دو۔"

اس کے ساتھ ہی اِن کے چہرے پر اطمینان و سکون کی دلنشیں لہریں رقص کرنے لگیں۔ ذہنی و روحانی اُلجھن سے نجات مل گئی۔ سجدۂ شکر بجالاتے ہوئے فوراً بارگاہِ رب العزت میں دستِ دعا پھیلا دیے اور الحاح و زاری کے انداز میں بولے۔

"اے خالقِ کون و مکاں! اے دلوں کے بھید جاننے والے! اے رب وُدود! میرے اس بیٹے کو اپنے فضل و کرم سے عبادِ مخلصین اور اولیاء اللہ کی صف میں شامل فرما۔ اسے اپنے عرفان و معرفت کے بلند درجات عطا فرما اور اسے اپنا اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا متوالا و شیدا بنا دے۔"

اس کے بعد اکثر و بیشتر یہی دُعا فرمایا کرتے تھے جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے شرفِ قبولیت بخشا اور آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ آپ ایک ایسے روحانی پیشوا تھے جن کے فیض سے ایک دنیا مستفید ہوئی۔ ہزاروں نے اپنے قبلہ کا رُخ سیدھا کیا اور غیر کا راستہ چھوڑ کر خیر کی طرف آئے۔

آپ اوائل عمر سے ہی قلیل الطعام۔ قلیل الکلام اور قلیل المنام تھے۔ سنجیدگی و متانت آپ کا خاصا۔ راست گوئی و حق لوائی آپ کی صفت۔ ریاضت و عبادت و مجاہدہ آپ کی شان۔ بارگاہِ کبریت و حمدیت میں آہ و گریہ زاری۔ عجز و انکساری آپ کا وصف اور مخلوق اللہ کی خدمت و امداد فرمانا آپ کا جذبہ تھا۔ اکثر غلبۂ حال رہتا تھا۔ ہمیشہ اپنے ہم عمر بچّوں کے ساتھ کھیل کود اور بے مقصد گھومنے پھرنے اور وقت کے ضیاع سے احتراز و گریز کا پہلو اختیار کرتے تھے۔ اگر کبھی بچّے اصرار کرتے اور کھیلنے پر مجبور کرتے تو ارشاد فرماتے۔ بیلیو آپ کو کھیل کود کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔

طائرِ وقت تیزی سے محوِ پرواز رہا۔ ایک مرتبہ آپ کی آنکھیں دُکھنے آگئیں۔ سخت تکلیف تھی۔ والدِ محترم طبیب کے پاس بغرض علاج لے گئے۔ طبیب نے آنکھوں کا معائنہ کیا اور دوا کے ساتھ مشورہ دیا۔

"بیٹا! وضو نہ کرنا ورنہ پانی لگنے سے تکلیف میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔"

آپ نے سُنا تو کہا۔

"حکیم صاحب! آنکھیں خراب ہوتی ہیں تو بے شک سو بار ہوں لیکن وضو سنّت کی ادائیگی ضرور ہو گی۔"

طبیب نے سُنا تو حیرت مبہوت رہ گیا۔ اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ بات اس بچے نے کہی ہے وہ غور سے آپ کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

"ایسی عزیمت والی شخصیت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اٹھان بتاتی ہے کہ یہ بہت بڑا ولی ہوگا۔

خدائے عزّوجل کو اپنے ولی کی اُس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر پختہ و ثابت قدم رہنے کی یہ بات پسند آگئی۔ چنانچہ نمازِ ظہر کی ادائیگی کے لیے آپ نے جب وضو فرمایا تو طبیب کے مشورے کے برعکس آنکھیں بالکل ٹھیک ہوگئیں۔ حکیم صاحب نے جب سُنا تو اُسے اپنی حکمت کی دھجیاں بکھرتی دکھائی دیں۔ لاریب جن کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پر یقینِ کامل ہوتا ہے ان کے بگڑے کام بھی سنور جاتے ہیں۔ ناممکن ممکن بن جاتا ہے اور وہ اپنے ولیوں کی مدد ضرور فرماتا ہے۔

بچپن جوانی کے خوبصورت ایوانوں میں داخل ہُوا تو آپ کے شب و روز عبادت الٰہی۔ تلاوتِ قرآن مجید۔ قیام و رکوع و سجود۔ حمد و مناجات۔ تسبیح و تہلیل۔ صلوٰۃ و سلام اور خشیت الٰہی سے گریہ و زاری میں ڈھل گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا سے کوئی تعلق اور واسطہ نہ ہو۔ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا میں نہیں تھے۔ بس ہر لحظہ ایک ہی خیال گھیرے رہتا تھا کہ کسی طرح رب العالمین اور رحمۃ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو جائیں۔ ہر وقت اپنے ربّ کی بارگاہ میں دست بدعا رہتے تھے اور بڑے درد و سوز اور الحاح و زاری سے التجا کرتے رہتے تھے۔

"اے رحیم و کریم رب! مجھے اپنے کسی محبوب و مقبول۔ مقرب و انعام یافتہ بندے کا قرب و معیت نصیب فرما جو مجھے تجھ سے واصل کر دے۔"

رخ درست ہوا اور طلب صادق تو اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے بندے کے لیے خود حالات و اسباب پیدا فرما دیتا ہے اور بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے فیض نصیب ہونا ہوتا ہے۔

یہ دُعا مانگنا آپ کا معمول تھا۔ ایک دن آرام فرما رہے تھے کہ یہ نصیبہ جاگ اٹھا۔ حضرت غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ خواب میں تشریف لائے اور بغداد شریف آنے کا حکم دیا۔ فوراً بیدار ہوگئے۔ آفتابِ زنجان رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت بہت بڑی سعادت تھی۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ حضرت غوث الاعظم بہ نفسِ نفیس

عالم رویاء میں ایسا فرمائیں گے۔ اب تاخیر کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ تعمیلِ ارشاد میں فوراً رختِ سفر باندھا اور سوئے منزل کشاں کشاں چل پڑے۔ راستے کی تکالیف اور سفر کی صعوبتیں حضرت غوث الثقلین کے فرمان کے سامنے ہیچ تھیں۔ فکر تھا تو صرف اس قدر کہ حکم کی تعمیل میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ چنانچہ کئی دنوں کی مسافت طے کرنے کے بعد واردِ بغداد شریف ہوئے۔ سفر کے گرد و غبار سے خود کو پاک کیا اور پھر شہنشاہ بغداد کے مزارِ اقدس پر حاضر ہوئے۔ آنکھوں کو سرور اور دل کو قرار نصیب ہوا پھر نہایت محبت آمیز لہجے میں عرض گزار ہوئے۔

"حضور! حکم کے مطابق غلام قدموں میں حاضر ہے۔"

آپ وہاں چالیس سال تک مزارِ پاک کا طواف فرماتے رہے اور اپنے ربِ کریم کی عبادت و ریاضت میں مشغول رہے۔ بس یہی دو کام تھے جنہیں آپ بڑی محبت، لگن اور خلوص سے سرانجام دے رہے تھے۔ ابھی تک آپ کسی مردِ کامل کے دستِ حق پرست پر بیعت نہ ہوئے تھے اور مرشد کے بغیر معرفتِ الٰہیہ کا حصول ایں خیال است و محال است و جنون۔ ابھی تک آپ کی وہ دعا کہ اللہ! مجھے اپنے کسی مقرب کی معیت نصیب فرما جو مجھے تجھ سے واصل کر دے۔ ہنوز شرفِ قبولیت کے لباس سے محروم تھی۔ ایک دن کلیدِ بغداد غوثِ زماں حضرت احمد شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی۔ طالب و مطلوب دونوں آمنے سامنے تھے۔ آپ فوراً ان کے دستِ حق پرست پر بیعت ہو گئے۔ اب آپ اپنے شب و روز مرشدِ کامل کے حکم کے مطابق عبادت و ریاضت، مجاہدہ اور درود و وظائف میں گزارنے لگے۔ سلوک و معرفت کی منازل طے ہونے لگیں۔ عجابات سمٹنے لگے۔ ان گنت فیوض و برکات اور سعادت سے متمتع ہوئے۔ معرفتِ الٰہیہ کا رنگ روز افزوں گہرا ہوتا گیا۔ فنا فی الشیخ اور فنا فی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مشکبار وادیوں سے گزر کر فنا فی اللہ کے مقام مسعود پر پہنچے۔ جب روحانی تربیت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تو مرشد نے آپ کو سرتاجِ اولیاء کا مقام اور اپنے دورِ مسعود کا "معروف کرخی" ہونے کا شرف بخشا۔ طریقت کے چاروں معروف سلاسل میں لوگوں کو بیعت کرنے کا اجازت نامہ مرحمت فرمایا اور کہا۔

"بیٹا خدا بخش! اب اپنے وطن مالوف جا کر لوگوں کے سینوں میں رشد و ہدایت کے چراغ روشن کرو۔ جو انعام و اکرام ملے ہیں انہیں تقسیم کرو اور جن کی روحانی تربیت

تمہارے ذمے ہے ان کی تربیت کرو۔"

دل تو یہی چاہتا تھا کہ ساری عمر پیرِ طریقت کی خدمت اور قدموں میں بسر کر دیں مگر چراغ سے چراغ روشن کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تکمیل کے بعد مرید کو فارغ کر دیا جائے۔ اور کسی خاص مقام یا علاقے کے لوگوں کی اصلاح کے لیے وہاں بھیج دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگانِ دین اپنے خلفا کو کسی خاص علاقے میں جانے کے لیے کہتے ہیں اور وہاں کے لوگوں کی تربیت و اصلاح کی ذمہ داری ان کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ روحانی دنیا کا یہی دستور ہے۔ لہٰذا حسبِ الارشاد آپ واپس جالندھر تشریف لے آئے اور سیّد کبیر کے مقام پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں اولیاءِ عظام کے مقابر و مزارات مقدّسہ ہیں، لیکن یہاں آپ نے زیادہ دیر قیام نہیں فرمایا۔ یہاں سے نقل مکانی فرما کر جالندھر شہر سے دو میل دُور نکودر کو جانے والی سڑک سے ذرا ہٹ کر ڈیرے ڈال لیے۔ اور فرائض و سنن و نوافل کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ بندگانِ خدا میں خیر و برکت اور فیوض و برکات کی تقسیم فرمانے لگے۔

آپ کے درِ اقدس پر متلاشیانِ حقیقت و معرفت اسیرانِ دشتِ بلائے دنیا اور طالبانِ جادۂ مستقیم کا ہجوم ہونے لگا۔ دُور و نزدیک آپ کی شہرت پھیل گئی۔ جو بھی حاضرِ خدمت ہوتا تہی دست و تہی دامن نہ لوٹتا تھا۔ دنیا کے پرستار۔ دین کے دلدادہ اور بزرگانِ دین کے والا و شیدا درِ اقدس پر آتے اور اپنا اپنا حصّہ وصول پاتے۔ اگر کوئی حصولِ دنیا کی خواہشات کی نیّت لے کر آتا تو اُسے دنیا کے ساتھ معرفتِ الٰہیہ میں سے کچھ حصّہ عطا فرما دیتے تھے، لیکن جو شخص خالصتاً آپ کی معیت و محبت کی خاطر رحمت کدہ پر حاضر ہوتا تو آپ کے قرب و دعا برکت سے اس کے اندر سے منفی صفات رفتہ رفتہ معدوم و غائب ہونے لگتیں اور ان کی جگہ مثبت صفات جلوہ گری کرنے لگتی تھیں۔ حال منور و روشن ہونے لگتا اور تاریکیاں مٹنے لگتیں۔ اور پھر ایک ایسا وقت بھی آتا جب اُسے دوسروں کے قلوب و ارواح و اذہان کے اندھیرے اور ظلمتیں دُور کرنے کا شرف حاصل ہو جاتا تھا۔

آپ کی نسبت سے اس جگہ کا نام جہاں آپ جلوہ افروز تھے "آباد پور" پڑ گیا جو آج تک مشہور ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے نیک و مقبول بندے ہوتے ہیں حقیقتاً وہی جگہ آباد و منوّر ہوتی ہے اور جہاں مغضوب۔ منافق۔ مشرک اور کافر

رہتے ہیں وہ جگہ برباد ہی ہوتی ہے خواہ وہاں خوبصورت محلات ہی کیوں نہ ہوں۔

ایک دن بوقت عصر آپ اپنی گھاس پھوس کی جھونپڑی کے سامنے درختوں کے سائے میں تشریف فرما تھے۔ مریدین۔ معتقدین اور حاجت مند سامنے ادب سے بیٹھے تھے اور آپ فرما رہے تھے۔

"اہلِ حزب اللہ کی محبت انسان کو مشقت سے محفوظ رکھتی ہے جب کہ باقی تمام اشیاء کی محبتیں اور چاہتیں کلفتوں کے دلدل میں پھنسا دیتی ہیں۔"

کہ ایک چھبیس سالہ نوجوان جس کا نام فضل شاہؒ تھا اور جس نے بارہ سال شملہ کے جنگلوں اور پہاڑوں میں عالم مستی میں گزارے تھے باغیچی کے دروازے پر آکر رکا اور دیکھا کہ ایک نورانی چہرہ بزرگ جن کی عمر سو سال سے متجاوز۔ جسم موزوں۔ آنکھیں کشادہ اور حسین ـــــ رنگ شہودی۔ چہرہ متبسم۔ ڈاڑھی گھنی اور کھدر کا موٹا لباس زیب تن کیے چٹائی پر دوزانو بیٹھے حاضرین کو عارفانہ گفتگو سے نواز رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ نے نظریں اُٹھا کر اس نوجوان کی طرف دیکھا تو وہ آپ کی آنکھوں کی مقناطیسیت سے کھنچ کر باادب آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹا! ہم تو بڑے دنوں سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔"

آپ نے فرمایا اور اٹھ کر اُسے گلے لگایا۔ حاضرین حیران تھے کبھی حضرت میاں خدا بخش رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اور کبھی اس نوجوان کی طرف دیکھتے تھے اور سوچ رہے تھے کہ یہ کون نوجوان ہے جس کا حضرت صاحب کو انتظار تھا، لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ یہی وہ نوجوان فضل شاہ ہے جو اپنے وقت کا عظیم روحانی پیشوا اور قطب عالم ہو گا۔ اور جو مقام و منزلت درجات و فضیلت اسے نصیب ہو گی۔ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے مریدین میں سے کسی کو نہ ملے گی۔ جب یہ نوجوان منصب قطبیت پر فائز ہو گا تو اس کے قول کو سند کا درجہ۔ اس کے اعمال کو بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت۔ اس کے علم کو علم الٰہی ہونے کا مقام حاصل ہو گا اور اسے تزکیہ عطا کرنے کی بھی اجازت حاصل ہو گی اور بعد میں آنے والا سب سے آگے نکل جائے گا۔ حضرت میاں صاحبؒ کے روحانی خزانے میں سب سے زیادہ حصہ حضرت فضل شاہ قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ کا تھا جنہیں آپ فضل کریم کہا کرتے تھے۔ شرف بیعت سے سرفراز فرمانے کے بعد چودہ سال کی مدت میں وہ روحانی خزانہ حضرت فضل شاہؒ کے حوالے کر دیا گیا اور پھر وہ وقت بھی لوگوں نے دیکھا

کہ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی حاجت مند کو فرماتے کہ جا تیرا کام ہو جائے گا اوپر سے مہر تصدیق فضل کریم سے لگوا لو۔

سرتاج اولیاء حضرت میاں خدا بخش رحمۃ اللہ علیہ نمازِ تہجد سے لے کر نمازِ عشاء تک محبتوں اور معرفتوں کے خزانے لٹاتے رہتے تھے۔ خدمتِ خلق کے لیے ہمہ وقت آمادہ و تیار ہوتے۔ فرمایا کرتے تھے۔

"نفس عبادت کو قبول کر لیتا ہے خدمت کو نہیں کیوں کہ یہ اس پر انتہائی گراں گزرتی ہے۔"

اکثر حاضرین اور عقیدت مندوں سے ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

"صاحبو! دنیا کی محبت انسان کو مصیبتوں کے خونخوار درندوں کا شکار بنا دیتی ہے۔"

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ انسان اپنے دوست کے مذہب پر ہوتا ہے۔ دنیا کے دلدادگان کا انجام دنیا والوں کے ساتھ ہوگا۔ اور جن لوگوں کا تعلق اور واسطہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں اور مقربین کے ساتھ ہوتا ہے تو انجام بھی انہیں کے ساتھ ہوگا۔ ایک دن آپ تشریف فرما تھے کہ ایک محب نے عرض کیا۔

"یا شیخ! اللہ تعالیٰ کا محبوب کس طرح بن سکتا ہوں؟"

اردگرد بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی ہمہ تن گوش ہو گئے۔ سوچ رہے تھے کہ آپ بڑی سخت ریاضت و مجاہدہ کی تلقین فرمائیں گے۔ آپ نے قدرے توقف کے بعد اپنی زبان درخشاں کو جنبش دی اور فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے حسن سلوک سے رہو۔ اخلاقِ حسنہ کے جامع بنو اللہ تبارک و تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے۔"

حضرت میاں خدا بخش رحمۃ اللہ علیہ جنگل سے خود لکڑیاں کاٹ کر لایا کرتے تھے اور انہیں فروخت کر کے رزقِ حلال کماتے تھے اور اس طرح سے انہیں جو کچھ بھی حاصل ہوتا اُسے فرمانِ ربی کے مطابق غرباء و مساکین۔ اسیروں۔ مسافروں اور عزیز و اقربا کے علاوہ عام مسلمانوں اور حاجت مندوں پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔ ہمیشہ کھدر کا لباس زیبِ تن فرماتے تھے اور تلقین و نصیحت فرمایا کرتے تھے۔

"مرد کو بناؤ سنگار سے کوسوں دُور رہنا چاہیئے اور جو ایسا نہیں کرتا وہ غیر کو دعوت دیتا ہے۔"

دراصل مرد کو اس سے علاقہ بھی کیا ہے۔ اس حال پر بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ انسان سے ایک ایک سانس کا حساب لیا جائے گا۔ مرد کی مردانگی اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کا ہر گام راہِ حق پر بڑھے اور اس کا ہر سانس اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر ہو۔ آپ کی خوراک بھی بڑی سادہ تھی اور تکلف سے سخت کراہت تھی۔ فرمایا کرتے تھے۔

"محبوب ربّ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم مکلفین میں سے نہ تھے اور تکلف کو ناپسند فرماتے تھے۔ تکلف کی حاجت نہیں ہوتی اس لیے کہ آنے والا کسی شے کی خاطر نہیں بلکہ شے والے کے لیے آتا ہے۔"

دراصل جب سے انسان نے اپنی خواہشات کو معیار بنا لیا ہے گمراہیوں کے اندھیروں میں اُترتا چلا گیا ہے۔ معاشرے میں فساد پھیل گیا ہے اور یہ ہمارے اپنے ہاتھوں کے کرتوت ہیں۔ اس حال پر حضرت میاں صاحبؒ کے مرید حضرت فضل شاہ قطب عالم کا ارشاد ہے کہ فضیلت رُخ کو ہے۔ ابھی وقت ہے کہ ہم اپنی سمتیں درست کر لیں اور اپنے ہر عمل کی تصدیق حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ میں تلاش کریں۔ اگر تصدیق ہو تو عمل کو جاری رکھا جائے اور اگر تصدیق نہ ہو تو اس عمل کو فی الفور ترک کر دینا چاہیے۔

آپ کی خدمت میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مذاہب کے لوگ بھی آیا کرتے تھے اور حاجات بیان کیا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ حلقہ بگوش اسلام بھی ہوئے۔ ایک دن ایک سکھ جس کا نام شیر سنگھ تھا آپ کے پاس آیا۔ وہ آپ کے حسنِ اخلاق اور انسان دوستی سے بے حد متاثر تھا۔ کہنے لگا۔

"میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔"

آپ نے اُسے کلمہ پڑھایا۔ مسلمانوں کی شکل و صورت اختیار کرنے کو کہا اور پھر اُسے چالیس دن بھورے میں رکھا۔ (چھوٹے کمرے کی مانند زمین میں گڑھا کھود کر رہنے کے لیے جگہ بنا لی جاتی ہے اور اس کے اوپر گھاس پھونس کی چھت ڈال لی جاتی ہے اسے بھورا کہتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر تہہ خانہ کہہ سکتے ہیں) اور بتایا کہ وہ کس طرح عبادت و ریاضت کرے۔ چالیس دن کے بعد جب اُسے بھورے سے نکالا تو آپ نے فرمایا۔

"اب تم سائیں شیر محمدؐ ہو۔"

اور آجکل شیر محمد پاکستان میں ہے۔

لوگوں کی بیمار پرسی کے لیے آپ بعض اوقات دس دس میل دُور پیدل تشریف لے

جایا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔

"دوستو پیدل چلنے سے قوائے جسمانی وروحانی نشوونما پاتے ہیں"

اور وہاں تک پہنچنے کا جو کرایہ ہوتا تھا وہ فقراء میں تقسیم فرمادیا کرتے تھے۔ اگر ہم اپنے گردوپیش میں نظر دوڑائیں تو یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ جو لوگ زیادہ پیدل چلتے ہیں وہ ان لوگوں کی نسبت کم بیمار ہوتے ہیں جو پیدل نہیں چلتے یا بہت کم چلتے ہیں۔

سرتاج اولیاء شمس العارفین حضرت میاں خدا بخشؒ کلام کو نہایت سادہ۔ مختصر اور جامع الفاظ میں بیان فرمادیا کرتے تھے۔ ہمیشہ نرم آواز میں گفتگو کرتے تھے۔ اکثر اوقات خاموشی کی حالت میں رہتے تھے۔ آپ کا نطق وخاموشی علم الٰہی سے تھا۔ ہمیں اپنی زبان کو ویسے بھی قابو میں رکھنا چاہیے۔ اس سے محبتیں اور نفرتیں جنم لیتی ہیں۔ اپنے غیر اور غیر اپنے بن جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک صحابی بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے اور عرض کی۔

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! انسان امن وسلامتی کے ساتھ کس طرح رہ سکتا ہے؟"

آپ نے اپنی زبان مبارک کو تین مرتبہ پکڑ کر ارشاد فرمایا۔

"اس کی حفاظت کرو۔"

تقسیم ہند کے وقت آپ جالندھر سے اوکاڑہ تشریف لے آئے اور مخلوق خدا میں فیوض وبرکات تقسیم فرمانے لگے۔ رشد وہدایت سے ان کی تاریک زندگیوں میں چراغ روشن کرنے لگے۔ ایک دن تشریف فرما تھے کہ ایک شخص حاضر خدمت ہوا۔ وہ بڑا اداس ومغموم تھا۔ دریافت فرمایا تو اُس نے اپنے دائم المریض لڑکے کا ذکر کیا اور دُعا کے لیے استدعا کی۔ ساتھ تشریف لے جانے کی درخواست بھی کی۔ آپ اس کے ساتھ چل دیے۔

اطباء اس کے علاج سے عاجز آچکے تھے اور کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہوتی تھی۔ وہ چارپائی پر دراز تھا اور جوانی کی شوخیاں شرارتیں اور زور وقوت بجھ چکی تھی۔ حسرت ویاس کی تصویر بنا ہوا تھا۔ آپ نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ اصل وجہ کیا ہے۔ اس کے باپ سے مخاطب ہوکر فرمایا۔

"تمہارا بیٹا بزرگان دین کا بے ادب وگستاخ ہے اور یہ جو مرض اسے لاحق ہے اسی بے ادبی کا ثمرہ ہے۔"

باپ نے دریافت کیا تو اس نے اس امر کا اعتراف کیا اور اظہار پشیمانی کرنے کے بعد توبہ کی۔ آپ نے اس لڑکے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور دُعا کی جو مقبول

ہوئی۔ لڑکا چند دنوں میں صحت یاب ہو گیا اور پھر وہ بزرگانِ دین کا بے حد مؤدب بن گیا اکثر و بیشتر آپ کی خدمت میں حاضر رہنے لگا۔

جب آپ کی عمر سو سال سے متجاوز ہوئی تو اناج کھانا چھوڑ دیا۔ اکثر لسی یا شربت کا استعمال کرتے تھے۔ آخر کار وہ وقت آگیا جس کا ذائقہ انسان نے صرف ایک بار چکھنا ہوتا ہے۔ ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۶۹ ہجری کا زمانہ تھا۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۵۴ سال تھی کہ ملاءِ اعلیٰ کی طرف سے پیغام وصل آگیا۔ آپ کی روح اطہر جنت الفردوس کو انتقال کر گئی۔ آپ کے وصال کی خبر سن کر دُور و نزدیک سے لوگ سرتاجِ اولیاء کی آخری زیارت کے لیے جمع ہونے لگے اور پھر ہزاروں کی موجودگی میں آپ کے جسدِ خاکی کو بخاری قبرستان ساہیوال میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اگر آپ وہاں جائیں تو سامنے قدرے دائیں جانب سبز رنگ کا گنبد نظر آتا ہے۔ یہی آپ کی آخری آرام گاہ ہے جو آج بھی مرجع خلائق تھے۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ جو کوئی لاعلاج مریض ہو یا مصائب و آلام میں گرفتار ہو وہ اگر چالیس شب مزار پاک پر سرسوں کے تیل کا چراغ روشن کرے تو اللہ تعالیٰ اُس ولی کے صدقے میں اس کی مراد پوری کر دیتا ہے اور اُسے بیماری یا مصائب سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔

آپ کا عرس مبارک ہر سال ہوتا ہے جس کا اہتمام صاحبزادہ حضرت رضا حسینؒ سجادہ نشین "نور والوں کا ڈیرہ" کے زیرِ نگرانی ہوتا ہے۔

آپ کے ملفوظات و ارشادات زر و جواہر سے تولنے کے لائق ہیں۔ چند ایک ہدیہ قارئین کیے جاتے ہیں۔

ارشاد فرماتے ہیں۔

- سوائے پانچ اشیاء کے ساری دنیا فضول ہے۔

الف :۔ روٹی اس قدر جس سے زندگی قائم رہے۔

ب :۔ پانی اتنا جس سے پیاس رفع ہو۔

ج :۔ کپڑا اتنا جس سے ستر پوشی ہو سکے۔

د :۔ گھر جس میں رہائش ہو سکے۔

ر :۔ علم اتنا جس پر عمل ہو سکے۔

شیخ جلال الدین سہلٹی رح

سلہٹ سابقہ مشرقی پاکستان کا مشہور شہر ہے۔ یہاں ایک زمانے میں "راجا گوڑ گوبند" کی حکومت ہوتی تھی۔ یہ علاقہ آئے دن کی بارشوں کی وجہ سے دلدلی علاقہ کہلاتا تھا۔ یہاں کی زمین کیڑے مکوڑوں اور حشرات الارض کی آماجگاہ تھی۔ مچھروں سے یہاں سارا سال بیماریاں پھیلی رہتی تھیں۔ ان بیماریوں کا علاج جب سلہٹ کے نالائق اور جاہل معالج نہ کر پاتے تھے۔ تو ان امراض کو جادو کا نام دے دیتے تھے۔ سلہٹ کے شمال میں آسام کا صوبہ جس کا پرانا نام کام روپ تھا۔ جادو ٹونے کے لیے مشہور تھا۔ طبیبوں سے مایوس مریض آخر انھیں جادوگروں کے پاس لے جاتے جو آسام میں جادو ٹونے کے علاج کرنے میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ یوں سادہ لوح لوگ جادوگروں سے اپنی جیبیں کٹوانے کے باوجود بھی صحت یابی اور شفایابی سے ہمکنار نہ ہوتے تھے۔

سلہٹ اور آسام میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ پھر یہاں کا حکمران بھی ہندو تھا اس لیے یہاں ہندو رسم و رواج اور قاعدہ قانون کو اہمیت دی جاتی تھی۔ مسلمان تھے بھی اقلیت میں اس لیے اس علاقے کو ہندوؤں کا علاقہ ہی سمجھا جاتا تھا۔ اسی سلہٹ میں ایک شخص "برہان الدین" بھی رہتے تھے شاید یہ نومسلم تھے اسی لیے ان کا اسلام پر زبردست اور قوی ایمان تھا اور یہ عام مسلمانوں سے زیادہ اسلامی قوانین پر عمل پیرا بھی رہتے اور ہندوؤں کا

مقابلہ بھی کرتے تھے۔ برہان الدین کو اللہ پاک نے بیٹا عطا کیا تو انھوں نے اس خوشی کے موقع پر پوری بستی کے مسلمانوں کی دعوت کر دی اور اس دعوت کے موقع پر گائے ذبح کر دی۔

ہندو مذہب میں گائے ذبح کرنا مذہبی قواعد کے منافی سمجھا جاتا ہے اور برہان الدین نے تو گائے ذبح کر کے ایک طرح سے ہندوؤں کے منہ پر طمانچہ مار دیا تھا۔ یہ کھانا اور دعوت کیونکہ مسلمانوں کے علاقے میں زیرِ انتظام تھی اس لیے ہندوؤں کو بظاہر تو گائے کے ذبح ہونے کی خبر نہ ہو سکی لیکن خدا کے کام نرالے وہ ہمیشہ اپنے پیاروں کا امتحان لیتا ہے، وہ میدان جہاں کھانا پک رہا تھا وہاں چارپائی پر ایک طشت رکھا تھا جو گائے کے گوشت سے بھرا ہوا تھا۔ اچانک کہیں سے ایک چیل آئی اور وہ چند بوٹیاں اٹھا کر لے گئی۔ سوئے اتفاق ایک آدھ بوٹی اس کے منہ سے نکل کر کسی برہمن کے گھر کے صحن میں جا گری۔ بوٹی کیا گری کوئی بم گر گیا۔ برہمن کی بیوی نے بوٹی دیکھی تو اس کا ماتھا ٹھنکا اس نے بوٹی فوراً اپنے خاوند کو دکھائی اور کہا۔

"ذرا دیکھنا تو، چیل یہ بوٹی کہاں سے لائی ہے اور یہ کس جانور کی بوٹی ہے"۔

برہمن نے بوٹی کو ایک درخت کے پتے پر رکھا۔ ذرا غور کیا تو پہچان گیا کہ یہ تو گائے کے گوشت کی بوٹی ہے۔ اُس نے شور مچا دیا کہ سلہٹ میں کسی مسلمان نے گائے کاٹ دی ہے۔ اس شور سے بہت سے برہمن جمع ہو گئے اور تفتیش شروع ہو گئی۔ سلہٹ اتنا بڑا علاقہ تو تھا نہیں کہ وہاں سے یہ عقدہ حل نہ کیا جا سکتا کہ گائے کس نے اور کہاں کاٹی ہے۔ مسلمانوں کی بستی میں دیگیں پک رہی تھیں چنانچہ سب ہندو وہاں پہنچے اور اتفاق سے ان کی ملاقات برہان الدین سے وہیں ہو گئی۔ انھوں نے پوچھا۔

"برہان الدین! یہ دیگوں میں کیا پک رہا ہے؟"

برہان الدین نے برملا جواب دیا "گوشت، گائے کا گوشت پک رہا ہے"۔

یہ سُننا تھا کہ برہمنوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا لیکن اُن کے شور کو برہان الدین بھلا کہاں خاطر میں لاتے تھے۔ انھوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ برہمن روتے پیٹتے "راجا گوڑ گوبند" کے دربار میں پہنچے اور فریاد کرنے لگے۔

"مہاراج غضب ہو گیا۔ مسلمانوں نے گو ماتا کاٹ دی"۔

راجہ جو مسلمانوں کے لیے پہلے ہی بغض و عناد رکھتا تھا اس نے فوراً اپنے سپاہیوں کو

برہمنوں کے جلوس کے ساتھ روانہ کیا اور حکم دیا۔

"برہان الدین نے اپنے جس بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں گئو ماتا کاٹی ہے اس کے اس بیٹے کا سر کاٹ لیا جائے اور برہان الدین کا سیدھا بازو کاٹ دیا جائے اور یہ سر اور بازو فی الفور میرے دربار میں پیش کیے جائیں۔"

سپاہی راجہ کا حکم سُن کر برہمنوں کے ہمراہ برہان الدین کے گھر جا پہنچے جہاں مہمان آچکے تھے۔ کھانا لگ چکا تھا اور برہان الدین خوشی خوشی مہمانداری میں مصروف تھے۔

راجپوت سپاہیوں نے آواز دے کر برہان الدین کو طلب کیا اور راجہ کا حکم سُنایا۔ برہان الدین کے اوسان خطا ہو گئے۔ انھوں نے غضب ناک ہو کر سپاہیوں، ہندوؤں اور راجہ کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اس طرزِ عمل نے راجپوت سپاہیوں کو اور سیخ پا کیا اور وہ زبردستی برہان الدین کے گھر گھس گئے اور اُن کے نومولود بچے کا سر تن سے جُدا کر دیا اور پھر برہان الدین کا سیدھا ہاتھ بھی کاٹ دیا۔ سر اور بازو کو ایک کپڑے میں باندھ کر راجپوت سپاہی راجا گوڑ بند کے دربار میں آگئے۔

برہان الدین بچے کے اس طرح قتل ہونے اور خود زخمی ہونے کی وجہ سے بے کل و بے بس زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہے۔ خوشیوں کا گھر ماتم کدہ بن گیا تھا۔ بچے کی ماں کی حالت برہان الدین سے بھی زیادہ قابلِ رحم تھی جس نے نو ماہ اپنی کوکھ میں بچے کو رکھ کر جنم دیا تھا۔ پھر اپنی آنکھوں کے سامنے اس کا خُون ہوتا دیکھا اور ساتھ ہی اپنے رفیقِ سفر کو بازو سے محروم ہوتے بھی دیکھا۔ وہ تو جیسے جیتے جی مر گئی تھی۔ برہان الدین کو طبیب کے پاس لے جایا گیا۔ مرہم پٹی کرنے سے اُن کا خُون بہنا بند ہوا تو مسلمانوں نے راجہ کے اس ظلم کے تدارک اور سدِباب کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔

ایک عمر رسیدہ مسلمان نے سب کو مشورہ دیا "یہاں قریب ہی "لکھنوتی" ہے جہاں بادشاہِ وقت کا بھانجا" سکندر شاہ" رہتا ہے جو صاحبِ اقتدار بھی ہے اور صاحبِ اختیار بھی اور سب سے بڑی بات مُسلمان بھی ہے وہ اس ظلم کی سزا راجہ کو ضرور دے سکے گا۔"

اس تجویز کو سب مسلمانوں نے متفقہ طور پر تسلیم کیا اور برہان الدین سمیت مُسلمانوں کا ایک وفد سکندر شاہ کے پاس گیا۔ اپنی بپتا اور راجا گوڑ بند کے ظُلم کی داستان سناتی سکندر شاہ نے ساری رُوداد سُنی تو غُصّے سے مشتعل ہو گیا اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اُس نے سلہٹ کے راجہ پر چڑھائی کر دی۔ راجہ بھی کوئی کمزور نہیں تھا۔ اس کے علاوہ راجہ کی جادوگری کا شہرہ

بھی چہار سو پھیلا ہوا تھا۔ گو سکندر شاہ جادو پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔ تاہم اس کے فوجیوں کے دل میں راجہ کے جادو ٹونے کا خوف ضرور موجود تھا۔ اسی وجہ سے سکندر شاہ کے سپاہی شروع سے بددل تھے۔ اُوپر سے خُدا کا کرنا یہ ہوا کہ جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں تو اچانک زور کی آندھی چلی، بجلی چمکی اور مُوسلا دھار بارش ہونے لگی۔ بادلوں کی گرج نے انسانی حوصلے پست کر دیئے۔ راجہ کی فوج بارشوں میں لڑنے کی عادی تھی جبکہ سکندر شاہ کی فوج جو پہلے ہی لڑنے کے لیے تیار نہ تھی اور راجہ کے جادو سے ڈرتی تھی بارش میں اپنا رہا سہا حوصلہ بھی کھو بیٹھی۔ یوں راجہ کی فوج نے نہ صرف مُسلمانوں کے حملے کو پسپا کر دیا بلکہ اُن کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

ضعیف العتقاد مسلمانوں نے "سکندر شاہ" کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ یہ بارش قدرتی آفات میں سے نہیں تھی۔ بلکہ یہ تو راجہ کے جادو کا کرشمہ تھا جس نے چڑیلوں اور بھُوتوں کی آوازیں میں بادلوں کی گرج پیدا کی اور طاغوتی اور شیطانی طاقتوں کے ذریعے مسلمانوں کو میدان سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

سکندر شاہ راسخ العقیدہ مسلمان تھا اُس نے مُسلمانوں کو میدان جنگ سے بھاگنے سے نہ صرف روکا بلکہ سمجھایا بھی کہ اس جادو کی حقیقت کوئی بھی نہیں یہ محض مُسلمانوں کا وہم ہے۔ لیکن اُس کی کوئی کوشش بار آور ثابت نہ ہو سکی اور مسلمانوں کے اُکھڑے ہوتے قدم دوبارہ جم نہ سکے اور یوں مسلمانوں کو ہندوؤں سے شکست فاش ہوئی۔

سکندر شاہ نے اپنی اس شکست کا احوال اپنے ماموں جو بادشاہِ وقت تھا کو بتایا اور اپنی ہار کے اسباب بھی بیان کیے کہ مُسلمان ہندوؤں سے محض اس وجہ سے لڑنے کے لیے تیار نہیں کہ وہ ہندوؤں کے جادو ٹونے سے ڈرتے ہیں۔ بادشاہ نے یہ ساری صورت حال سُنی تو اس کو بہت دُکھ ہوا کہ ایک خُدا کو ماننے والے مُسلمان ہزاروں خداؤں کے پرستاروں سے مات کھا گئے۔ بادشاہ نے اپنے فنِ حرب کے ماہر سپہ سالار "نصیر الدین" کی سرکردگی میں ایک لشکر سکندر شاہ کے پاس روانہ کیا جن کو حکم دیا کہ وہ نہ صرف "راجا گوڑ گوبند" کی سرکوبی کریں بلکہ مُسلمانوں کے دل سے جادو ٹونے کا وہم بھی نکالیں۔

نصیر الدین ایک سیّاح، باکردار مُسلمان اور جنگی چالوں کا ماہر سپہ سالار تھا اُس نے سب سے پہلے تو اپنی ماتحت فوج کو خبردار کیا اور کہا۔

"دیکھو تم سب مسلمان ہو۔ اوّل تو راجا گوڑ گوبند جادو ٹونے سے واقف ہی نہیں اور اگر

وہ کسی طرح سے اس علم پر دسترس رکھتا بھی ہے تو اسے ہمارے ایمانی جذبے کے سامنے کوئی حیثیت حاصل نہیں۔"

اس تقریر نے مسلمان فوج کے حوصلے کو وقتی طور پر پختہ کر دیا لیکن جونہی یہ فوج سکندر شاہ کے فوجیوں سے ملی اور اُن سے سابقہ شکست میں راجا گوڑ گوبند کے جادو ٹونے کی کارروائی سُنی تو اُن کے پختہ حوصلوں میں دراڑیں پڑ گئیں ۔ وہ میدانِ جنگ میں پہنچنے سے پہلے ہی اپنے دلوں میں ایک خوف سا محسوس کرنے لگے۔

جب نصیر الدین اور سکندر شاہ کی افواج راجا گوڑ گوبند سے مقابلہ آراء ہونے کے لیے نکلیں تو راستے کی مسلسل بارشوں، دلدلی زمین اور کیڑے مکوڑوں نے افواج کے دل میں انجانے سے خوف پیدا کر دیتے۔ دوسری طرف راجہ بھی باخبر ہو چکا تھا کہ سکندر شاہ دوبارہ صف آرا ہونے کے لیے آرہا ہے۔ اُس نے اس مرتبہ بھی مسلمانوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کیا اور اپنی فوج کی ازسرِ نو تربیت کی اور مُسلمانوں کے مقابلے پر اُترا۔

اس سے پہلے کہ حق و باطل کی جنگ دوسری مرتبہ ہوتی ایک روز سکندر شاہ نے نصیر الدین سے پوچھا۔

"کہیں آپ کی فوج راجہ کے ٹونے جادو سے خوفزدہ تو نہیں"۔ نصیر الدین نے جواب دیا۔ "میں نے کوشش تو کی ہے کہ سپاہیوں کے دل سے یہ بات نکل جاتے مگر میں حتمی طور پر کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔"

سکندر شاہ نے کہا "نصیر الدین! پھر ایسی جنگ کرنے کا کیا فائدہ جس میں فتح سے زیادہ شکست کے امکان و آثار موجود ہوں۔ اس لیے پہلے ہمیں اپنے فوجیوں کے دل سے جادو کا جھوٹا خوف دُور کرنا چاہیئے اور جب تک ہم ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتے اجاگر گوبند کو تسخیر کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔ لہٰذا جنگ کی کارروائی معطل کر دی گئی۔

دونوں سپہ سالاروں نے اپنے اپنے تجربہ کار اور کہنہ مشق فوجی بُلا کر اُن سے مشورے کیے لیکن کوئی سپاہی بھی ایسا نہ تھا جو جادو اور ٹونے سے نہ ڈرتا ہو۔ یہ صورتِ حال نہ صرف تشویش ناک تھی بلکہ اسلام کے سچے نام پر بھی ایک داغ تھی۔ فوجیوں میں سے بعض نے یہ بھی مشورے دیتے کہ خفیہ طور پر ہمیں راجا گوڑ گوبند کی فوج میں بھرتی ہو جانا چاہیئے اور اُن سے جادو ٹونہ سیکھنا چاہیئے تاکہ راجہ اور اس کی افواج کی سرکوبی اُن کے سفلی عملوں سے ہی کی جائے۔ مگر یہ تجاویز نہ ہی سکندر شاہ کو پسند تھیں اور نہ ہی نصیر الدین نے ان پر عمل پیرا ہونے کی حامی

بھری۔ خدا تعالیٰ حق پرستوں کی ضرور امداد کرتا ہے۔ افواج میں ایک "مولانا" بھی تھے جو فوجیوں کو اسلامی تعلیم دیتے تھے۔ اُن کو جب اس معاملے کی خبر ہوئی تو انھوں نے سکندر شاہ اور نصیر الدین سے مُلاقات کی اور کہا۔

"جادو برحق ہے۔ لیکن اس کا کرنے والا کافر ہوتا ہے۔ سلہٹ کے گرد و نواح میں ایک ترکی نسل کے بزرگ رہتے ہیں جن کے دم قدم سے اس علاقے میں اسلام پھیل رہا ہے۔ اس علاقے کے مُسلمان اُن کے زیرِ اثر ہیں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اس مسئلہ باعثِ نزاع کو پیش کرنا چاہیئے۔ اللہ نے چاہا تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی سبیل نکال لیں گے۔"

سکندر شاہ نے مولانا سے موصوف بزرگ کا ذکر سُنا تو اس کو فوراً یاد آگیا کہ وہ تو اُن کو جانتا ہے اُس نے اپنی کُور ذہنی پر افسوس کیا اور کہا۔

"یہ بات تو میرے ذہن سے ہی نکل گئی تھی۔ موصوف بزرگ واقعی خدا رسیدہ ہیں۔ اُن کے ایمان و عمل سے مسلمان قوم کی سربلندی ممکن ہو سکتی ہے اور وہ علمِ الٰہی سے علمِ باطلہ کو ختم کر سکتے ہیں۔"

سکندر شاہ اور نصیر الدین۔ مذکورہ مولانا اور سرکردہ فوجیوں کی معیت میں حضرت جلال الدینؒ بزرگ موصوف جو ترکی نسل کے تھے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنی نامرادی و ناکامی کی داستان سنائی۔ اور امداد طلب کی۔

حضرت جلال الدینؒ نے مسکرا کر فرمایا۔

"راجا گوڑ گوبند" کا حساب کتاب ہو چکا ہے۔ اس کی رسّی جس حد تک دراز کی گئی تھی اس کی درازی ختم ہو گئی ہے۔ تم راجہ سے جنگ کرنے کے لیے نکل پڑو۔ تمھاری امداد میں خود اور میرے ایک سو تیرہ ساتھی کریں گے۔ میں بنفسِ نفیس جنگ کرنے کے لیے تم لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔ کیونکہ میرے مشرب میں عبادت و ریاضت کا ایک لازمہ جہاد بھی ہے جس کو ترک کرنا عبادت سے رُوگردانی ہے۔"

"راجہ گوڑ گوبند" یہ سمجھا تھا کہ مُسلمان اُس کے جادو ٹونے سے ڈر کر جنگ کا ارادہ ترک کر بیٹھے ہوں گے۔ اس لیے وہ اس طرف سے مطمئن ہو بیٹھا تھا۔ جبکہ یہ اُس کی خام خیالی تھی۔ سکندر شاہ اور نصیر الدین کی افواج جن کی تعداد چند ہزار تھی مگر اس میں حضرت جلال الدینؒ اپنے تیرہ سو مریدوں کے ساتھ شامل تھے جب راجہ کے کئی لاکھ فوجیوں کے سامنے پہنچی تو راجہ ایک مرتبہ تو ہل ہی گیا۔ جنگ شروع ہو گئی۔ ایک طرف ناقوس بجنے لگے اور دوسری طرف اللہ اکبر کی صداؤں

سے فضا گونجنے لگی۔ مُسلمانوں نے ہندوؤں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ راجہ کی فوج نے مسلمانوں کا یہ انوکھا روپ دیکھا تو اُن میں کھلبلی مچ گئی۔ اور راجہ کے روکنے کے باوجود اُس کی فوج میدان چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ راجہ نے فوج کو میدان چھوڑتے دیکھا تو خود بھی بھاگنے لگا مگر اس کو قدرت نے ایسا نہ کرنے دیا اور وہ حضرت جلال الدینؒ سلہٹی کے نرغے میں آگیا۔ راجہ نے جان بچانے کے لیے حضرت کو بہت واسطے دیتے اور کہا۔

"حضرت شاید آپ وہ وقت بھُول گئے ہیں جب آپ کو مَیں نے اپنی ہندو رعایا کے روکنے کے باوجود اس علاقے میں آنے اور رہنے کی اجازت دی تھی۔ آج میں بے بس ہوں۔ تو آپ کو میری مدد کرنی چاہیئے۔"

حضرت نے فرمایا "گوڑ گوبند"! مجھے اس علاقے میں خُدا نے بھیجا تھا۔ تاکہ میں یہاں آکر اس سرزمین کو نُورِ اسلام سے منوّر کروں۔ تُو اجازت نہ بھی دیتا تو بھی اوپر والے کے حُکم سے ہی میں آیا تھا اور میرے مسائل حل کرنے کی ذمہ داری بھی اس کی تھی۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو کیا تمھیں وہ وقت یاد نہیں جب تم نے بے گناہ برہا الدین کو بازو سے بھی محروم کیا اور اُس کے معصوم اور بے قصور نومولود بچے کو قتل کر دیا۔ اپنے جھُوٹے عقیدے کی لاج رکھنے کے لیے ایک حیوان کی خاطر تو انسان کاٹ دیتے۔ آج جب خُدا تم سے تمہارے ظلموں کا حساب لینے لگا ہے تو مَیں تیری مدد کیوں کروں۔"

یہ کہہ کر حضرت جلال الدینؒ نے راجہ گوڑ گوبند کا سر قلم کر کے نیزے پر رکھ کر بلند کر دیا۔ یہ دیکھتے ہی میدان میں موجود ہندو فوج نے ہتھیار ڈال دیتے۔ حضرت نے عام اعلان کر دیا جو تائب ہو کر اسلام میں داخل ہو جائے گا اُس کو عام معافی دے دی جائے گی۔ اس فراخدلانہ اعلان سے لاتعداد ہندو شہری و فوجی مسلمان ہو گئے۔ یوں ایک مسلمان بچے اور سچے مسلمان کے خون کے بدلے میں اللہ پاک نے سرزمین سلہٹ کو کافروں کے ناپاک وجود سے پاک کیا اور وہاں اسلام کا پرچم بلند کیا۔

شیخ جلال الدین سلہٹی مولانا روم کے شہر قونیہ میں پیدا ہوتے۔ آپ کے سن ولادت کے بارے میں کسی کتاب تاریخ میں کوئی ذکر نہیں۔ آپ کے والد صاحب شیخ الشیوخؒ محمد اپنے دور کے عالم و فاضل انسان تھے۔ ان کے علم و فضل اور روحانی فیض و کمال کا چاروں طرف چرچا تھا۔ شیخ الشیوخؒ کی شادی سہروردیہ سلسلہ کے معروف بزرگ سید احمد کبیری سہروردی کی ہمشیرہ

سے ہوتی تھی۔ جو شیخ جلال الدین کی ولادت کے بعد اللہ کو پیاری ہوگئیں اور یوں اس بچے کی پرورش اِن کے والد حضرت شیخ الشیوخؒ محمدؒ نے کی۔

گھر کا اور اِرد گرد کا ماحول بچے کے مزاج اور احساسات پر گہرے اثر مرتب کرتا ہے۔ ابتدائی طور پر بچہ جس ماحول سے متاثر ہوتا ہے بعینہٖ اُسی کو بڑا ہو کر اپناتا ہے۔ شاہ جلال الدینؒ نے بچپن اپنے والد صاحب شیخ الشیوخؒ محمدؒ کے پاس لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ جنھیں وہ ہر وقت علم کی باتیں لوگوں کو سناتے تھے۔ قرآن پاک کی تلاوتیں، ترجمے، تفسیریں، احادیث، بزرگان کے واقعات ان محافل میں زیر بحث رہتے۔ اِنھیں پاکیزہ باتوں نے شاہ جلال الدینؒ کی نشو و نما پر اثر انداز ہونا شروع کیا اور آپ دن بدن معرفت و عرفان کے سانچے میں ڈھلتے گئے۔ آپ کی والدہ کیونکہ بچپن میں وفات پا گئیں تھیں۔ اس لیے والد صاحب جب لوگوں کی تدریس میں مصروف ہوتے تو آپ کو سنبھالنے کی ذمہ داری ایک آیا کے سپرد ہوتی تھی۔ لیکن ننھے مُنے جلال الدین آیا کو اپنی کوئی ذمہ داری پوری نہ کرنے دیتے۔ اور اپنے سارے کام خود ہی کیا کرتے تھے۔

ایک روز آیا نے شیخ الشیوخؒ سے شکایت کی تو انھوں نے شیخ جلال الدین سے پوچھا "بیٹے! آپ کی آیا سے اپنے کام کیوں نہیں کرواتے۔ وہ آپ کی پرورش و نگرانی کے لیے رکھی گئی ہے۔ اُس کو اس کی ذمہ داریاں پوری کرنے دیا کریں۔"

جلال الدینؒ نے عرض کی "پدر بزرگوار! میں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ اور کانوں سے سُن لیتا ہوں وہ آیا یا کوئی اور نہ تو سُنا سکتا ہے اور نہ دیکھ سکتا ہے۔"

یہ جواب سُن کر شیخ الشیوخؒ حیرت زدہ رہ گئے۔ اُسی وقت جلال الدینؒ کے ماموں حضرت سید احمد کبیر سہروردی بھی تشریف لاتے۔ ان سے شیخ الشیوخ نے اپنے بیٹے کی معرفت آگیں باتوں کا ذکر کیا۔ جس پر سید احمد کبیرؒ نے مسکرا کر کہا۔

"جناب! میں آج اسی غرض سے آیا ہوں کہ یہ بچہ آپ کے پاس ہماری امانت ہے اور جس وقت حکمِ ربّی ہوگا ہم اس کو لے لیں گے اور پھر اس کی تربیت کی اصل ذمہ داری ہماری ہوگی۔"

شیخ الشیوخؒ سمجھ گئے کہ سید احمد کبیرؒ کا اشارہ خُدا کے حکم کی طرف ہے۔ اس لیے وہ خاموش ہو گئے۔ جلال الدینؒ باپ اور ماموں کی باتیں سُن رہے تھے لیکن بالکل خاموش رہے۔

اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد شیخ الشیوخؒ محمد کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام کے

دیگر ارکان جن میں جہاد بھی شامل ہے اس کی بجا آوری بھی ریاضت و عبادت اور رضائے خداوندی میں شامل ہے۔ اس لیے جہاد نہ کرنا بھی خُدا کے احکامات کی نفی ہے۔ مگر کم سن جلال الدین کے خیال سے آپ کا جذبہ اور جوشِ جہاد سرد پڑ گیا۔ جس کے لیے آپ دنوں تک پریشان رہے۔ ایک روز اچانک آپ کو القا ہوا کہ شیخ جلال الدین کے ماموں سید احمد کبیر سہروردیؒ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اس بچے کی پرورش ہم کریں گے۔ اس لیے بچے کا فکر کرنا بے معنی ہے۔ اور جہاد پر جانا ضروری ہے۔ یہ مسئلہ حل ہوا تو شیخ الشیوخؒ نے نہایت عجلت سے کام لیا اور اپنے بیٹے کو سید احمد کبیرؒ کے حوالے کر کے خود محاذِ جنگ پر روانہ ہو گئے۔ محاذِ جنگ پر جا کر شیخ الشیوخ نے مردانہ وار جنگ لڑی اور جامِ شہادت نوش کیا۔

شہادت کی خبر سُن کر سید احمد کبیر سہروردی نے سجدۂ شکر ادا کیا اور شیخ الشیوخ کے لیے دعائے مغفرت کی۔ شیخ جلال الدینؒ اپنے والد کی شہادت کی خبر سُن کر خاموش رہے تاہم آپ کے اندر جہاد اور اس کی عظمت و فضیلت کے متعلق ایک کامل جذبہ جاگ اٹھا اور آپ کی تعمیر و ترقی میں اس جذبے کا ہمیشہ تعلق رہا۔

شاہ جلال الدین شفقتِ مادری سے تو بچپن سے ہی محروم تھے جب ذرا سیانے ہوتے تو سایۂ پدری بھی سر سے اٹھ گیا۔ لیکن ان صدمات کو آپ زیرِ خاطر نہ لاتے۔ آپ کے قلب و ذہن پر تو خدا طلبی کی دُھن سوار تھی۔ آپ کی تربیت کے ابتدائی مراحل آپ کے والد شہید شیخ الشیوخ نے انجام دیئے لیکن آپ کے علم میں مزید ترقی آپ کے ماموں سید احمد کبیرؒ کے ہاتھوں ہوئی۔ انہوں نے آپ کو تعلیمات دیتے ہوئے فرمایا:

"جلال الدینؒ! ہم کسی ایک بات پر عمل کر کے قابلِ ذکر نہیں بن سکتے۔ حقوق اللہ اگر ہم ادا نہ کریں تو ہماری آخرت برباد ہو جائے گی لیکن اس کا ہماری دُنیا پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن اگر ہم نے حقوق العباد کی ادائیگی میں کوتاہی یا تغافل برتا تو اس سے نہ صرف دنیا برباد ہو گی بلکہ دین بھی برباد ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق کے سلسلہ میں اپنے بندے کو معاف کر سکتا ہے۔ لیکن بندے کی حق تلفی کو بندہ ہی معاف کر سکتا ہے۔ اللہ نہیں کرے گا۔ اسی لیے حقوق العباد کی ادائیگی میں مستعدی اور استقلال سے کام لے کر ہی تم روحانیت و ریاضت میں ترقی کر سکتے ہو۔"

یہ پہلا سبق تھا جو سید احمد کبیرؒ نے شیخ جلال الدینؒ کو دیا۔ یہیں سے راہیں جن کی منزل

ولایت و عرفان اور طریقت تھی حضرت جلال الدینؒ کے لیے متعین ہوئیں۔ پھر آپ اپنے اس سفر میں تیزی سے منازل طے کرنے لگے۔ آپ کے لیے قدم قدم پر انکشافات تھے۔ تحیّر تھا اور نت نئی معلومات تھیں۔ اس کے باوجود آپ کے دل میں جہاد کا تصور سب چیزوں سے زیادہ اُجاگر اور روشن تھا۔ آپ اکثر و بیشتر اپنے ماموں سے یہی عرض کرتے تھے کہ جہاد کے موضوع پر کچھ بیان فرمائیں۔ سید احمد کبیرؒ اس مضمون پر بولتے تو گھنٹوں تک بولتے رہتے اور ایک جامع اور مدلل تقریر کر ڈالتے تھے۔ شیخ جلال الدینؒ اپنے ماموں کے مُنہ سے موتی جھڑتے دیکھتے تو اُن کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت جلال الدینؒ نے سید احمد کبیرؒ سے عرض کی۔

"محترم ماموں جان! میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ دُنیا میرے پاؤں تلے سے سرکی جا رہی ہے۔ دُنیا کی کوئی چیز بھی مجھے اپنی طرف راغب یا متوجہ نہیں کر پا رہی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟"

شیخ سہروردی نے فرمایا "میاں برخوردار! یہ تو بڑی اچھی بات ہے، سارے صوفیاء اور بزرگانِ دین ہمیں یہی درسِ اخلاق دیتے ہیں اور خود بھی تارکِ دنیا اسی پر عمل پیرا رہتے ہیں۔

جلال الدینؒ کی تربیت کی تکمیل ہوئی تو اُن کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں نے اپنے ماموں سے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ایک مستقل سہارے کے زیرِ اثر عمل تھا۔ اب مجھے خود بھی کچھ اپنے لیے کرنا چاہیئے۔ یہ خیال آپ کے دل میں اس لیے بھی پیدا ہوا کہ آپ آبادی میں رہ کر یکسوئی سے اللہ سے لو لگانا اور اپنے نفس کو آزمائش اور ابتلا سے پاک صاف رکھنا دشوار سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے ماموں سے عرض کی۔

"بزرگِ محترم! والد صاحب کی شہادت کے بعد آپ نے جس شفقت سے میری پرورش اور تعلیم و تربیت کی وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ اب تک میں نے جو کچھ پایا ہے وہ آپ کی مدد، تعاون اور راہنمائی سے پایا ہے۔ میں نے اب یہ سوچا ہے کہ سہارے کی زندگی اختیار کرنے کی بجائے مجھے اپنے آپ پر بھی بھروسہ کرنا چاہیئے اور اس لیے میں شہر سے دُور جنگل میں تنہا رہ کر یادِ الٰہی میں مشغول ہونا چاہتا ہوں اور اسی امر کی آپ سے اجازت حاصل کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

شیخ سہروردی نے بخوشی اپنے جلیل القدر بھانجے کو آبادی سے دُور رہ کر یادِ الٰہی اور

این ای سی

دلکش قدرتی رنگوں کا امتزاج



جاپان سے درآمد شدہ پرزوں سے تیار کردہ

"14 رنگین ٹیلیویژن ریموٹ کنٹرول کے ساتھ

- آن سکرین چینل اور ٹائمر ڈسپلے
- ۲۴ گھنٹے آن / آف ٹائمر
- ڈبل ریسونگ سسٹم
- ای وی این / آؤٹ ڈیمیننلز
- بہتر اور واضح تصویر کے لیے مربع سکرین
- پکچر کنٹراسٹ کے لیے بٹنڈڈ گلاس کا فلٹر
- رنگوں کو نکھارنے کے لیے بلیک سٹرائپ پکچر ٹیوب
- کیبل ٹی وی (ایس جی / پی جی) کے لیے سہولت
- ۱۶ الیکٹرونک ٹیوننگ سسٹم
- ۵ سالہ پکچر ٹیوب کی گارنٹی اور بعد از فروخت سروس کی سہولت

ایسوسی ایٹڈ الیکٹرونکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۹- ایبٹ روڈ، لاہور فون: ۲۲۳۰۱۵-۲۲۳۰۰۶

ریاضتِ الٰہی کرنے کی اجازت دے دی۔ شاہ جلال الدینؒ سال ہا سال جنگلوں میں رہے۔ جہاں انھوں نے نئے تجربات کیے۔ ایک طویل عرصہ آپ نے ایک غار میں گزارا مگر رفتہ رفتہ لوگ آپ کے مقام اور مراتب سے واقف ہوگئے اور آپ تک پہنچنا شروع ہوگئے۔ کوشش کے باوجود بھی شاہ جلال الدینؒ مخلوقِ خدا سے اپنا دامن نہ چھڑا سکے۔ اور پھر آخر کار انھوں نے لوگوں کو فیوض و برکات سے نوازنا شروع کر ہی دیا۔

طویل ریاضت کے بعد حضرت شاہ جلال الدینؒ نے واپس شیخ سہروردی کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ جب آپ شہری آبادی کے قریب پہنچے تو لوگ آپ کا استقبال کرنے کے لیے راستوں کی دونوں جانب کھڑے ہوگئے۔ استقبال کرنے والوں میں شہر کی جوان اور خوبصورت لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ ہر لڑکی کی یہ خواہش تھی کہ شاہ صاحب اس کی طرف توجہ دیں لیکن آپ نے کسی لڑکی کی طرف بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ جس سے لڑکیوں کو مایوسی ہوئی مگر لوگوں میں آپ کا مقام بلند ہوگیا۔ آپ کے اس طرزِ عمل سے حضرت شیخ احمد کبیر سہروردی نے یہ اندازہ لگایا کہ آپ عمر بھر مجرد رہیں گے اور اُن کا یہ اندازہ حرف بہ حرف پورا ہوا۔

حضرت شیخ جلال الدینؒ جب علمی، روحانی اور عرفانی تعلیم مکمل کر چکے تو پھر آپ کے اندر وہ خواہش مچل اٹھی جس کو پورا کرنے کے لیے آپ ایک عرصے سے تمنائی تھے۔ آپ اپنے والد محترم کے نقشِ قدم پر چل کر جہاد کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے اپنی اس تمنا کا اظہار اپنے ماموں سے کیا اور اُن کی اجازت پا کر آپ اپنے ساتھ اپنے سات سو مریدوں کو لے کر جہاد کے لیے نکل پڑے۔ مختلف شہروں اور درگاہوں سے ہوتے ہوتے آپ خواجہ غریب نواز کے مزار پر اجمیر شریف پہنچے اور یہاں جہاد میں کامیابی کے لیے دعا مانگی اور اپنے سفر پر رواں ہوتے۔

مختلف اسلام و کفر کے مقابلوں میں آپ نے حصہ لیا اور کامیاب ہوتے۔ یہ معرکے سلہٹ میں اختتام پذیر ہوتے جس کا ذکر ابتداء میں کیا گیا ہے۔ آپ نے اپنا مستقل ٹھکانہ سلہٹ کو ہی اختیار کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا کہ اس کا حکم آپ کو آپ کے ماموں سید احمد کبیر سہروردی نے دیا تھا۔ انھوں نے اپنے حجرے کی مٹی آپ کو دی تھی اور کہا تھا۔

"بیٹا! یہ مٹی اپنے پاس رکھ لو۔ جس سرزمین کی مٹی رنگ اور خوشبو کے اعتبار سے اس

سے ملتی جلتی ہو تم وہیں اپنا مستقل ٹھکانہ بنالینا۔ چنانچہ سلہٹ کی مٹی میں شیخ احمد کبیر سہروردیؒ کی دی ہوئی مٹی سے ملتی جلتی تھی اور اس کے پیشِ نظر حضرت جلال الدینؒ نے مستقلاً سلہٹ میں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔

ایک روز آپ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ سلہٹ کے مضافاتی علاقے میں ایک قافلہ آکر ٹھہرا ہے جس میں ایک مغربی سیاح آیا ہوا ہے جس کا نام ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم ابنِ بطوطہ ہے۔ اس کو میرے پاس لے آؤ۔

مریدوں نے اپنے مرشد کا حکم سُنا تو وہ قافلے کی طرف بھاگے۔ وہاں انھوں نے مذکورہ سیاح کا نام لے کر پکارا تو ایک شخص قافلے سے نکل کر باہر آیا اور حضرت کے مریدوں سے پوچھا۔

"بھائیو! کہو کیا بات ہے۔ تم لوگ کون ہو اور مجھ سے تمھیں کیا کام ہے۔ میرے بارے میں اور میرے نام کے متعلق آپ لوگوں کو کس نے بتایا ہے جبکہ میں یہاں بالکل اجنبی ہوں مجھے تو یہاں کوئی جانتا بھی نہیں۔"

اتنی لمبی باتوں کا حضرت کے مریدوں نے مختصر جواب دیا۔

"بھائی سیاح! ہمیں ہمارے مرشد شیخ جلال الدینؒ نے بھیجا ہے۔" ابنِ بطوطہ حیران ہوتے اور کہا حضرت کو میرے اس طرف آنے کی خبر کیسے ہوئی لیکن اس کی یہ حیرت حضرت کے مریدوں نے دور کردی اور کہا۔

"جناب! یہ تو نہایت معمولی بات ہے۔ پیر و مرشد کا مکاشفہ تو انھیں دُنیا جہان کی خبریں دے دیتا ہے۔"

ابنِ بطوطہ کے دل میں حضرت کی بزرگی اور عظمت دوچند ہوگئی اور وہ فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

لانبے قد کے دُبلے پتلے شیخ جلال الدین کو ابنِ بطوطہ نے دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ حضرت نے بڑی محبّت سے ابنِ بطوطہ سے ملاقات کی اور اُن سے اُن کے علاقے کے متعلق دیگر معلوماتی باتیں پوچھیں جن کے جواب میں ابنِ بطوطہ نے عرض کی۔

"حضرت میں مراکش کے شہر طنجہ کا رہنے والا ہوں۔ سیاحت کے دوران بے شمار مُلک دیکھ چکا ہوں۔ عرب و عجم کا مسافر ہوں۔"

حضرت نے ابنِ بطوطہ کو اپنی خانقاہ میں ٹھہرایا اور مریدوں کو اُن کی خصوصی خدمت

کرنے کی ہدایت کی۔ ابن بطوطہ نے کچھ عرصہ حضرت کے پاس قیام کیا اور جب رخصت ہونے لگے تو حضرت نے آپ کو ایک اُونی چغہ اور طاقیہ یعنی عمامہ عنایت فرمایا اور پوچھا۔

"ابن بطوطہ! اب کس طرف جانے کا ارادہ ہے؟"

عرض کی حضرت! میں اب چین جاؤں گا۔"

حضرت نے فرمایا "ٹھیک ہے تو چین جاکر وہاں شیخ برہان الدین ساغرجیؒ کو ضرور ملنا وہ نہایت خُدا رسیدہ بزرگ ہیں۔"

ابن بطوطہ حضرت سے رخصت ہوکر عازم سفر ہوئے اور مختلف شہروں سے ہوتے ہوتے چین میں حضرت برہان الدین ساغرجیؒ کی خدمت میں پہنچے۔

جب ابن بطوطہ شیخ برہان الدین کی خدمت میں پہنچے تو اس وقت حضرت کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے وہی چغہ پہن رکھا تھا جو حضرت جلال الدینؒ نے ابن بطوطہ کو دیا تھا اور اُن سے امیر الامراء قرطی نے بااصرار لے لیا تھا۔

حضرت شیخ برہان الدینؒ نے ابن بطوطہ کی حیرانی کو بھانپ لیا اور بڑی محبت سے فرمایا۔

"اے سیاح! یہ چغہ حضرت شیخ جلال الدین نے میرے لیے تیار کروایا تھا اور اس کو وہ مجھ تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اور خُدا نے انھیں بتایا کہ ایک مغربی سیاح ادھر آرہا ہے۔ اُس کے ذریعے وہ یہ چغہ مجھے پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن آپ اس کو سنبھال نہ سکے۔ اور آپ نے یہ چغہ امیر الامرا قرطی کو دے دیا۔ لیکن ایک ولی کامل کی بات کو خُدا نے پورا کرنا تھا۔ اس لیے وہ اُسی امیر کے ذریعے مجھ تک پہنچ گیا ہے جس نے بااصرار یہ چغہ آپ سے لیا تھا۔"

ابن بطوطہ نے حضرت جلال الدینؒ کی بزرگی، کشف و کرامت کے احوال حضرت برہان الدینؒ سے سُنے تو حیران رہ گئے کہ خدا تعالیٰ ان حضرات کو کیسے کیسے مراتب عطا کرتا ہے جن پر رشک ہی کیا جا سکتا ہے۔

۱۹ ذیقعد ۷۴۰ھ کو حضرت شیخ جلال الدینؒ نے اپنے تمام مریدوں کو اکٹھا کیا اور فرمایا۔

"ساتھیو! اب میں اس دُنیا سے رخصت ہونے والا ہوں۔" ساتھی پریشان ہوگئے۔ آپ نے انھیں تسلی دی کہ میرے بعد کتاب اللہ اور اسوۂ رسولؐ پر عمل کرنا۔ یہی عمل تم لوگوں کو کامیابی کی راہ پر گامزن کریں گے۔

۲۰ ذیقعد ۷۴۰ھ کو ظہر کے وقت آپ اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ آپ کو آپ کے حُجرے میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کا مزار آج بھی سلہٹ بنگلہ دیش میں موجود ہے۔

سید احمد بدوی رح

ایک زمانے میں جب حجاج ابنِ یوسف نے شام اور عراق میں اپنے ظلم اور بربریت کا بازار گرم کر رکھا تھا تو بہت سے خاندان یہاں سے ہجرت کر کے افریقہ کے شہر فاس میں جا کر آباد ہو گئے۔ یہاں پر یہ لوگ کافی عرصہ تک مقیم رہے مگر جب بنو اُمیّہ کی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور بنو عباس کی حاکمیت کا دَور آیا تو یہ لوگ فاس سے ہجرت کر کے دوبارہ عراق اور شام میں آباد ہونا شروع ہو گئے لیکن ان میں سے بعض ایسے خاندان بھی تھے جو دوبارہ نقل مکانی کے قطعی خلاف تھے۔ ایسے ہی خاندانوں میں ایک خاندان ایسا تھا جس کے بزرگ فاس سے نقل مکانی کر کے مکہ معظمہ کی زیارت کے لیے جانا چاہتے تھے لیکن مالی طور پر وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ سفری اخراجات اور راستے کی دوسری صعوبتیں برداشت کر سکیں۔ اس خاندان کے سربراہ کا نام علی تھا جو مستقل طور پر فاس میں ہی سکونت اختیار کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ خاندان کے دوسرے لوگ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ علی کو اُس کے ارادے سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔

مگر ایک رات جب علی سو رہا تھا تو اُس نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ خواب میں اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بزرگ اُس کے سرہانے کھڑے ہیں مگر جب علی نے گردن گھما کر پیچھے کی جانب دیکھا تو اُسے کچھ نظر نہ آیا مگر ایک سایہ حرکت کرتا ہوا اُسے

ضرور دکھائی دیا جو اُسے کہہ رہا تھا" علی یہ تیری جگہ نہیں ہے تو آخر کس لیے پردیس میں پڑا ہے۔ تیرا ٹھکانہ تیرا مقام اور تیرا وطن تو وہی ہے جہاں سے تُو نے نقل مکانی کی تھی۔"
علی نے سائے سے کہا" وہ وطن میرا کہاں تھا وہ تو میرے آباؤ اجداد کا وطن تھا جہاں سے مَیں ہجرت کر کے یہاں آیا تھا۔"

" خدا کا حکم یہ ہے کہ جس طرح تیرے جدامجد نے نقل مکانی کر کے فاس کی سکونت اختیار کی تھی۔ اسی طرح تُو فاس سے نقل مکانی کر اور اپنے آبائی وطن واپس جا۔ مکّہ معظمہ کی سرزمین تیرا انتظار کر رہی ہے۔" سائے نے جواب دیا۔

علی نے آنکھیں پھاڑ کر ایک بار پھر سائے کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ نظر نہ آیا، پوچھا" کیا مَیں تنہا مکّہ معظمہ چلا جاؤں؟"

جواب ملا" نہیں، تو اپنے کنبے کے ساتھ مکّہ واپس جا، کیونکہ یہی مشیت ایزدی اور حکمِ ربّانی ہے۔"

علی نے کہا" بہتر ہے مَیں اپنے خاندان کے ساتھ عنقریب مکّہ معظمہ چلا جاؤں گا۔ اور مشیت ایزدی اور حکمِ ربّی کی تعمیل فرض کی طرح ہو گی۔"

پھر علی کی آنکھ کُھل گئی اور انھوں نے اپنے آس پاس بڑے غور سے دیکھا۔ یہاں بظاہر کسی کا پتہ نہ تھا لیکن اچانک انھیں ایسا لگا گویا کوئی سایہ سا دروازے سے نکل رہا ہے۔ علی نے دوڑ کر اس سائے کا تعاقب کرنا چاہا لیکن سایہ ہاتھ نہ آیا۔ اب علی کے لیے تعمیلِ حکم کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے خاندان والوں کو یکجا کیا اور انھیں حکمِ ربّی سے مطلع کیا۔ اس خاندان میں بیوی کے ساتھ ہی دو بچے بھی تھے۔ سیّد حسن اور سیّد احمد۔ سیّد حسن بڑے تھے اور سیّد احمد چھوٹے۔ سیّد احمد کی عمر سات سال کی تھی۔ علی کے ساتھ ان کا خاندان بھی مکّہ معظمہ کی طرف چل پڑا۔

اس خاندان کے ساتھ عرب اور بربری قبائل بھی سفر کر رہے تھے اور یہ لوگ حیرت انگیز طور پر اس خاندان سے عزّت و احترام سے پیش آ رہے تھے یہاں تک کہ فاس سے مکّہ معظمہ تک کا فاصلہ چار سال میں طے کیا۔ مکّے والوں نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ علی حیران تھے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو مکّے والوں کو اس خاندان کی عزّت و تکریم پر مائل کر رہی ہے۔

اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد علی کا انتقال ہو گیا اور سیّد احمد اور سیّد حسن یتیم ہو گئے۔ علی کو باب المعلاۃ میں دفن کر دیا گیا۔ سیّد احمد اپنے بڑے بھائی کی سرپرستی میں چلے گئے۔ یہ ہر اعتبار

سے اپنے بڑے بھائی سے جدا محسوس ہوتے تھے۔ سید احمد چُپ چُپ رہتے اور اکثر تنہائی میں غور و فکر کی کیفیت میں مبتلا دکھائی دیتے۔ انھوں نے ڈھاٹا باندھنا شروع کر دیا تھا۔ بڑے بھائی ڈھاٹے کی وجہ سے بدوی کہنے لگے اور بعد میں لفظ 'بدوی' ان کے نام کے ساتھ مستقل وابستہ ہو گیا اور انھیں سید احمد بدوی کہا جانے لگا۔ سید احمد کی خاموشی سراسیمگی میں بدل گئی اور انھوں نے لوگوں سے ملنا جُلنا ترک کر دیا۔ بڑے بھائی سید حسن نے آپ کی یہ کیفیت جو دیکھی تو ہمّت کر کے پوچھ لیا۔ "سید احمد! کیا بات ہے تم بات کیوں نہیں کرتے؟"

سید احمد نے بڑے بھائی کی طرف سرسری نظروں سے دیکھا اور خاموشی نہیں توڑی، آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہے۔ بڑے بھائی نے پھر پوچھا۔ "سید احمد! تم بولتے کیوں نہیں۔ مَیں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔"

سید احمد نے آنکھیں نہیں کھولیں، آسمان کی طرف انگلی اٹھا دی۔ سید احمد نے اس کا کیا مطلب لیا؛ کچھ پتہ نہیں، لیکن اس کے بعد چھوٹے بھائی سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس حالت کو کئی سال گزر گئے۔ سید احمد نے مستقل سکوت اختیار کر رکھا تھا۔ اب لوگوں نے ان کی خاموشی پر حیرت کرنا چھوڑ دیا تھا۔ سید احمد پر سراسیمگی کے بعد وارفتگی طاری ہو گئی اور حالتِ جذب میں آنے جانے والوں کی بھی خبر نہ ہوتی۔ اسی عالم میں ایک رات آنکھ جو لگی تو خواب میں دیکھا، کوئی کہہ رہا ہے "اے سید احمد! اب تم مشرق کا رُخ کرو۔"

سید احمد نے سوال کیا۔ "مَیں مشرق میں کہاں جاؤں؟"

جواب ملا۔ "آفتاب کے طلوع ہونے کی طرف تو اپنا سفر جاری رکھ۔ اس کے بعد جہاں بھیجا جائے گا تجھ کو مطلع کر دیا جائے گا۔"

سید احمد نے کچھ کہنا چاہا مگر آنکھ کھُل گئی۔ یہ کشمکش و پنج میں پڑ گئے کہ خواب کی ہدایت پر عمل کیا جائے یا نہیں؛ آخر انھوں نے اس مسئلہ کو خدا پر چھوڑ دیا اور دل ہی دل میں گڑگڑائے۔

"اے میرے ربّ! اگر خواب میں تو نے ہدایت کی ہے تو اس کی ایک بار اور ہدایت فرما تاکہ مَیں مطمئن ہو کر اس پر عمل کروں۔" سید احمد پھر عشقِ الٰہی میں کھو گئے۔

دوسری رات پھر خواب میں دیکھا۔ کوئی کہہ رہا ہے "اے سید احمد! کل تجھ کو جو ہدایت کی گئی تھی اس پر شک و شبہ کیوں؛ تُو کسی تذبذب کے بغیر مطلع آفتاب کی طرف سفر کر اور یہ سفر اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ تجھے کوئی اور ہدایت نہ کی جائے۔"

سید احمد نے عاجزی سے سوال کیا۔

"میں نے خود کو اپنے اللہ کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو اس پر فرمانبردار غلام کی طرح عمل کیا جائے گا لیکن میں یہ یقین ضرور کروں گا کہ یہ حکم ہے کس کا؟" ابھی اس سوال کا جواب ملا بھی نہیں تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ سید احمد سجدے میں گر گئے اور الحاح وزاری سے کہا۔

"اے بارالٰہی! میں کمزور، عاجز و ناتواں بندہ ہوں تیرے احکام کی بجا آوری سے بڑا اور لذت آمیز کوئی اور کام نہیں لیکن جیسا کہ میں خواب میں عرض کر چکا ہوں کہ میں خواب کی ہدایت کے بارے میں یقین کا خواہشمند ہوں یہ کس کا حکم ہے؟ تیرا؟ بس اس کی وضاحت ہو جائے تو بندہ پروری ہو گی۔"

سید احمد اتنے جذباتی ہو گئے تھے کہ ان کا دل بھر آیا اور زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ اس عالم میں بڑے بھائی سید حسن آ گئے۔ بھائی کو روتا دیکھ کر دریافت کیا۔ "سید احمد! کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟ یہ اتنا رو کیوں رہے ہو؟"

سید احمد نے کوئی جواب دینے کے بجائے مجبور نظروں سے بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔

بڑے بھائی نے کہا۔ "سید احمد! میں جانتا ہوں کہ تم نے ایک عرصہ سے بات چیت بند کر رکھی ہے اور زبان کو انسانوں سے بات کر کے آلودہ نہیں کرنا چاہتے لیکن تم یہ بھی تو سوچو کہ جب تک تم میری باتوں کے جواب نہیں دو گے میں تم سے کسی قسم کا رابطہ کیونکر قائم رکھ سکوں گا۔"

سید احمد نے اپنے بھائی کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور فرمایا "بھائی! میں نے اللہ کے لیے سکوت اختیار کیا تھا اور اب اللہ ہی کے لیے اس سکوت کو توڑ رہا ہوں۔ آج دو راتوں سے میں ایک ہی خواب دیکھ رہا ہوں اور پریشان ہوں کہ میں آخر کیا کروں اور اس کا کیا مطلب لوں۔"

بڑے بھائی نے کہا۔ "اگر ناگوار خاطر نہ ہو اور مناسب سمجھو تو وہ خواب بیان کر دو۔ ہو سکتا ہے میں اس کا کوئی مناسب جواب دے سکوں۔"

سید احمد نے خواب بیان کر دیا اور کہا۔ "میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ مجھے یہ حکم کون دے رہا ہے؟ اور میں اس کی تعمیل کروں یا نہ کروں؟"

بھائی نے کہا۔ "سید احمد! ایک بات طے ہے اور وہ یہ کہ شیطان تمہیں ورغلا نہیں سکتا۔ یقیناً یہ حکم خداوندی ہے۔ جو تمہاری رہنمائی کر رہا ہے۔"

سید احمد نے کہا۔ "شیطان تو کسی کو بھی ورغلا سکتا ہے، میری کیا حیثیت ہے۔"

بڑے بھائی نے مزید سمجھایا "سید احمد! بات یہ ہے کہ تم نے جو مقام حاصل کر لیا ہے۔ کسی مرشد

کے بغیر حاصل کیا ہے، اگر تمہارا کوئی مُرشد ہوتا تو یہ حکم وہ تمہیں دیتا لیکن تمہارا مرشد چونکہ خدا ہے اس لیے وہی حکم بھی دے رہا ہے۔ اب چونکہ تم ایک بلند مقام حاصل کر چکے ہو اس لیے خدا تمہیں کہیں تعینات کرنا چاہتا ہے۔"

سید احمد نے کہا: "آپ کا جواب اور وضاحتیں دل کو لگتی ہیں لیکن میں مطمئن ہوئے بغیر اس حکم کی تعمیل نہیں کروں گا۔"

بڑے بھائی نے کہا: "یہی تمہارا منصب ہے، لیکن میری ناقص عقل نے جو کچھ سمجھا تھا تمہیں سمجھا دیا۔ ورنہ جس خدا نے تمہیں دو بار حکم دیا ہے تیسری بار بھی حکم دے سکتا ہے اور اپنے حکم میں وضاحت اور طمانیت بھی بخش سکتا ہے۔"

سید احمد مراقبے میں چلے گئے۔ بڑے بھائی نے سکوت جو دیکھا تو اُٹھ کر چلے گئے۔ تیسری رات سید احمد نے پھر وہی خواب دیکھا۔ کوئی انھیں حکم دے رہا تھا۔ 'سید احمد! تو طلوع آفتاب کی سمت سفر کر اور یہ سفر اس وقت تک جاری رہے جب تک تجھے دوا حکم نہ دیا جائے۔"

سید احمد نے عرض کیا: "الٰہ العالمین! تیرا حکم سر آنکھوں پر۔ میں اس حکم کی تعمیل اس لیے کروں گا کہ یہ حکم تو دے رہا ہے۔"

آواز آئی: "ہاں یہ حکم میں دے رہا ہوں اور تجھ کو معلوم ہے کہ تو نے جو مقام حاصل کیا ہے اس میں براہ راست میں شامل ہوں اور جب میں براہ راست شامل ہوں تو کسی اور کی یہ مجال نہیں کہ اس میں دخل اندازی کرے یا تجھ کو ورغلائے۔"

سید احمد کانپ گئے۔ آنکھ کھلی تو چیخ نکل گئی۔ 'الٰہ العالمین اگر تو غفور الرحیم اور ستار العیوب نہ ہوتا تو آج میرا ٹھکانہ کہاں ہوتا، میں کہیں کا بھی نہ رہتا۔"

آپ نے اس وقت اپنے بڑے بھائی کو بُلایا اور کہا: 'بھائی! تمام اقربا کو بلوا کر مطلع کر دو کہ مجھے سفر کا حکم دیا گیا ہے اور میں عنقریب یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

سید حسن نے پوچھا: "کیا تمہارے خواب والے حکم کی وضاحت ہو گئی ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "ہاں ہو گئی۔ اس لیے تو میں سفر کرنے والا ہوں۔"

سید حسن نے اسی وقت تمام عزیزوں، رشتہ داروں کو یہ خبر پہنچا دی اور وہ سب سید احمد کے آس پاس جمع ہونے لگے۔

جب سارے عزیز رشتہ دار جمع ہو گئے تو آپ نے ان کو مخاطب کیا "میرے عزیزو! رشتے دارو! تم سب اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے ایک طویل عرصہ سے خاموشی اختیار کر رکھی تھی

میری یہ خاموشی خدا کے لیے تھی، کیونکہ ان دنوں میں عشقِ الٰہی میں سب کچھ فراموش کر چکا تھا اس لیے مجھے اس دنیا اور اس کائنات میں خدا کے سوا کچھ نظر ہی نہ آتا تھا لوگ مجھے مخاطب کرتے تھے لیکن میری قوتِ سماعت مجھ سے سلب کر لی گئی تھی اس لیے میں کسی کی بات سن ہی نہ سکتا تھا۔ اس لیے جواب بھی نہیں دیتا تھا۔ پھر خدا نے مجھے سکینت اور طمانیت عطا فرما دی۔ اور میں لوگوں کی آوازیں سننے کے لائق ہو گیا۔ اب خدا نے مجھے سفر کا حکم دیا ہے اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں طلوعِ آفتاب کی سمت سفر کروں، چنانچہ میں بہت جلد اس حکم کی تعمیل میں عراق کی سمت جانے والا ہوں۔ عراق کے بعد شاید میں ہند کا سفر کروں۔ اس کے بعد جاؤں گا جہاں کا دوبارہ حکم ملے گا۔"

آپ کی دوری کے صدمے نے سبھی کو سوگوار کر دیا۔ ہر شخص ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگا۔

سید حسن نے رقت سے کہا: "سید احمد! تم عمر میں مجھ سے چھوٹے ہو لیکن مرتبے میں کہیں زیادہ بڑے۔ اتنے ذی مرتبہ انسان کی جدائی کوئی معمولی سانحہ نہیں ہے۔ اگر یہ سفر حکمِ خداوندی کے زیرِ اثر نہ ہوتا تو میں تمہیں ہلنے بھی نہ دیتا اور زبردستی روک لیتا۔"

سید احمد نے فرمایا: "اگر حکمِ خداوندی نہ ہوتا تو میں یہ سفر کرتا ہی کیوں۔"

بڑے بھائی نے کہا: "سید احمد! مجھے سفر کا کوئی حکم تو نہیں دیا گیا ہے لیکن اگر میں تمہارے ساتھ چلوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

سید احمد نے جواب دیا: "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ بشوق میرے ساتھ چلیں۔"

چند دوسرے رشتے دار بھی بولے: "اور ہم۔ کیا ہمیں بھی ساتھ چلنے کی اجازت مل جائیگی۔"

سید احمد نے جواب دیا: "مجھے کوئی اعتراض نہیں، میرے ساتھ جو شخص بھی چلنا چاہے چلے، لیکن میں یہ خوب جانتا ہوں کہ آخر کسی بھی مرحلے پر میں تنہا رہ جاؤں گا اور تم سب میرا ساتھ چھوڑ دو گے۔ کیونکہ شوق کا سفر آسان نہیں ہے۔ عشق کی منزل تک پہنچنا ہما شما کے بس کی بات نہیں۔"

بڑے بھائی نے اپنے رشتہ داروں کی سفارش کی۔

"سید احمد! اگر لوگ تمہارے ساتھ چلنا ہی چاہتے ہیں تو تم ان کا دل تو نہ توڑو۔"

سید احمد نے جواب دیا: "میں دل کیوں توڑنے لگا۔ میں نے جو بات کہی ہے اس کے معانی و مطالب پر غور کرو تو حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی۔"

ایک دن بعد یہ قافلہ عراق کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب یہ لوگ عراق میں

داخل ہوئے تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

ان لوگوں نے جہاں کہیں بھی قیام کیا سید احمد نے خود کو ان سب سے الگ تھلگ ہی رکھا۔

قیام عراق کے دوران ایک رات عشاء کے بعد جب سید احمد تنہا بیٹھے تو انھیں اپنے حجرے کے در پر کسی قسم کی آہٹ سی محسوس ہوئی جیسے کوئی دروازے تک آکر رک گیا ہو۔

سید احمد نے بآواز بلند کہا۔ "کون ہے بھائی! اندر آجاؤ، یہاں مستورات نہیں ہیں۔"

اسی وقت..... سرزمین عراق کے مشہور بزرگ سید عبدالقادر اور سید احمد بن رفاعی حجرے میں داخل ہوئے۔ ان دونوں کو اپنے حجرے میں دیکھتے ہی سید احمد کھڑے ہو گئے۔ ان دونوں کی آمد پر سید احمد یوں زیادہ حیران اور پریشان ہوئے کہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ دونوں بزرگ ان دنوں دنیا میں نہیں ہیں، وصال فرما چکے ہیں۔ سید احمد نے حیرت سے ان دونوں کو دیکھا۔ دوسری طرف سے سید عبدالقادر زیادہ خوش تھے۔ جواب دیا۔

"سید احمد! میں تمہارے درد اور فکروں سے واقف ہوں تم ان باتوں کی فکر نہ کرو۔"

سید احمد نے کہا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ دونوں میرے پاس کیوں آئے ہیں؟"

سید عبدالقادر نے جواب دیا۔ "ہم تمہارے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ہمیں اس کا حکم دیا گیا تھا۔"

سید احمد نے عرض کیا۔ "آپ دونوں کی مہربانیوں کا میں کس زبان سے شکریہ ادا کروں، خدا کے لیے اس سفر میں میری رہنمائی کیجیے۔"

سید عبدالقادر نے جواب دیا۔ "اے احمد! عراق، ہند، یمن، روم غرضیکہ مشرق و مغرب کی کنجیاں ہمارے پاس ہیں۔ اگر تم چاہو تو ہم سے لے لو۔ اس پیش کش کے ساتھ ہم تمہارے پاس آئے ہیں۔"

سید احمد نے کہا۔ "آپ دونوں کا بہت بہت شکریہ لیکن ابھی تک میں نے کسی بھی انسان سے کچھ مانگا نہیں ہے۔ پھر آپ دونوں سے کیا مانگوں۔"

سید احمد بن رفاعی نے کہا۔ "بہرحال ہم دونوں حاضر ہیں۔ تم اپنی خواہش کا اظہار کر سکتے ہو۔"

سید احمد نے جواب دیا۔ "صاحبان! آپ کی ہمدردیوں اور پیش کشوں کا بہت بہت شکریہ۔ میں اپنے صاحب کلید سے واقف ہوں اس لیے مجھ کو جو کچھ بھی لینا ہے اس سے لے لوں گا۔"

یہ دونوں بزرگ کچھ دیر تک اس حجرے میں رہے۔ اس کے بعد چلے گئے۔ سید احمد نے عراق کے بزرگوں کے مزارات پر حاضری دی یہاں تک کہ حسین ابن منصور حلاج کے مزار پر

بھی گئے۔

یہاں انھیں خواب میں حکم ملا: "سید احمد! اب تو مصر کی طرف روانہ ہو جا وہاں تو طنطا جائے گا۔ طنطا کے بارے میں تجھے مصر میں معلوم ہو جائے گا کہ یہ کہاں ہے۔" آپ نے اپنے بڑے بھائی کو خدا کے نئے حکم کی اطلاع دی۔

سید حسن نے کہا: "بھائی سید احمد! بڑی خوشی کی بات ہے کہ خدا تمہاری رہنمائی کر رہا ہے، اب تمہیں مصر روانہ ہو جانا چاہیئے۔"

سید احمد نے پوچھا: "کیا آپ بھی میرا ساتھ دیں گے؟"

بڑے بھائی نے جواب دیا: "ہاں میں اس وقت تک شریکِ سفر رہوں گا جب تک کہ مشیت ایزدی حائل نہیں ہوتی۔"

سید احمد نے عراق کو چھوڑنا چاہا تو وہاں کے چھوٹے دعوے دار ان تصوف و روحانیات نے انھیں روک لیا اور سید احمد سے پوچھا۔

"حضرت! آپ کہاں سے تشریف لائے تھے۔"

آپ نے جواب دیا: "مکہ معظمہ سے، خانۂ کعبہ کی سرزمین سے۔"

ایک نے طنزاً کہا: "ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے لیکن آپ نے وہاں کی سرزمین چھوڑی کیوں؟"

آپ نے جواب دیا: "میرا ہر کام منجانب اللہ ہے۔ میرا ہر قدم اس کے حکم سے اٹھتا ہے۔"

ایک شریر نے کہا: "سبحان اللہ۔ یعنی جس خدا کا تو ذکر کر رہا ہے اس خدا نے تجھ کو اپنے گھر سے نکال دیا، یہ کیا بات ہوئی۔"

سید احمد نے بڑے دکھ سے کہا: "میں اپنے مالک سے اس قسم کے سوال نہیں کر سکتا۔ اس کی مرضی ہے کہ جہاں چاہے رک جانے کا حکم دے اور جہاں چاہے سفر کا حکم دے دے۔"

کسی اور شریر نے کہا: "بھائیو! مانو یا نہ مانو، خدا کے گھر سے چلے جانے کا حکم دینے والا ربّ نہیں، شیطان ہوگا۔ یہ حضرت اتنے سیدھے اور سادہ لوح ہیں کہ شیطانی حکم کو خدا کا حکم سمجھ بیٹھے اور خانۂ کعبہ چھوڑ کر در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔"

سید حسن کو ان کا لب و لہجہ پسند نہیں آیا، بولے۔ "عراق والو! تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر کسی قسم کا عذاب نازل ہو جائے۔"

ایک شریر قہقہہ مار کے ہنس دیا: "واللہ، خوش فہمی کی حد کر دی، خدا کے راندۂ درگاہ حضرات

کیسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔"

سید حسن نے طیش میں کہا۔" نالائقو! میں پھر یہی کہوں گا کہ تم لوگ حد سے نہ بڑھو، ورنہ پچھتاؤ گے۔"

شریر نے جواب دیا۔" پچھتاؤ نہ پچھتاؤ، تم پچھتاؤ، ہمیں کیا ہم لوگ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ اس دنیا میں کیسا کیسا بے وقوف جی رہا ہے۔"

سید حسن کو اور زیادہ غصہ آگیا۔ کھڑے ہو گئے اور کہا۔" اگر تم لوگوں نے زبان بند نہ کی تو میں وہ کچھ کر گزروں گا کہ تم لوگ اس کی توقع تک نہ کرو گے۔"

کوئی اور بولا۔" اے جناب! آپ لوگ اتنے گرم کیوں ہو رہے ہیں۔ ہم تو سیدھے سچے انسان ہیں۔ اگر ہماری باتوں سے آپ لوگوں کو تکلیف پہنچ رہی ہے تو ہم چپ ہو جائیں گے۔"

سید حسن نے جواب دیا۔" آپ لوگ بولیں اور خوب خوب بولیں لیکن ہمیں ذلیل و خوار تو نہ کریں۔" ایک اور شریر بولا۔" ہم کیا بولیں گے، آپ لوگ تو بولنے پر چراغ پا ہوئے جا رہے ہیں۔" پھر سید احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" کیا ان کو بولنا آتا ہے؟ انھوں نے چپ کیوں سادھ رکھی ہے؟ کیا خدا نے انھیں گنگ کر دیا ہے؟"

سید احمد نے انھیں مسکرا کر دیکھا اور جواب دیا۔" لوگو! مجھے بولنا آتا ہے لیکن میں فضول گوئی سے اپنی زبان کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔"

شریروں نے ایک ساتھ قہقہہ لگا۔ ایک نے کہا۔" خوب خوب، تو آپ کو بولنا بھی آتا ہے، ماشاء اللہ۔ چشم بد دور۔"

سید احمد نے جواب دیا۔" مجھے بولنے کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے۔"

شریروں نے پوچھا۔" یعنی؟ بولنے کے علاوہ آپ کو کیا آتا ہے؟" آپ نے انگلی کے اشارے سے انھیں زمین پر گر جانے کا حکم دیا۔ وہ سب زمین بوس ہو گئے۔ بڑے بھائی نے حیرت سے پوچھا" سید احمد یہ کیا کر دیا؟"

سید احمد نے جواب دیا۔" انھیں کچھ دیر یوں ہی پڑا رہنے دو یہ شریر یوں ہی راضی ہوں گے۔"

وہ سب اوندھے منہ زمین پر گرے پڑے تھے۔ انھوں نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ آخر بڑی عاجزی سے درخواست کی۔" اے احمد! ہم سب اپنی جہالت اور نادانی پر نادم ہیں خدا کے لیے ہمیں معاف کر دیجیے۔"

سید احمد نے جواب دیا۔" میں کیا معاف کروں گا، معافی تو اللہ سے مانگئے۔ وہی معاف

کر سکتا ہے۔

وہ سب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے نہایت عقیدت مندی سے سید احمد کی طرف دیکھا اور عاجزی سے کہا۔ "اے سید احمد! ہم نے آپ کو پہچاننے میں غلطی کی تھی۔ اب معافی کے طالب ہیں۔ آپ ہمارے پیر و مُرشد ہیں۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ہم سب نے آپ کو پہچاننے میں غلطی کی تھی۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اب تم لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ مَیں نے معاف کیا۔ میرے خدا نے معاف کیا۔ میرے دل میں تم لوگوں کے خلاف کسی قسم کی بھی کدورت نہیں۔

اس کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور آپ نے ام عبیدہ کا رُخ کیا۔ یہیں سید حسن کو سید احمد کے ذریعے یہ حکم ملا کہ تم مکّہ معظمہ واپس چلے جاؤ۔ بڑے بھائی کو جدائی کے غم نے بے حال کر دیا لیکن خدا کے حکم کی بجا آوری میں انھوں نے مکّہ معظمہ کا رُخ کیا اور سید احمد ام عبیدہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ام عبیدہ میں آپ نے ایک عارفہ کے یہاں قیام کیا۔ ان کا نام تھا فاطمہ بنت بری۔ ان کی قیام گاہ کے سامنے قبائل کا ایک شہر آباد ہو چکا تھا۔ یہ سارے قبائل وہ تھے جو فاطمہ بنت بری کے بزرگی کے قائل تھے ان میں وہ عارف بھی شامل تھے جو فاطمہ بنت بری سے ملنے آئے تھے لیکن ان کی بزرگی اور احوال کو فاطمہ نے سلب کر لیا تھا۔ آپ نے اس فاطمہ کو شرفِ میزبانی بخشا۔ فاطمہ آپ سے مل کر خوش ہوئی اور اس نے آپ کے ساتھ مختصر جمعیت دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کے ساتھ بس اتنے ہی آدمی ہیں؟"

سید احمد نے جواب دیا۔ "ہاں میرے ساتھ بس اتنے ہی آدمی ہیں۔"

فاطمہ نے اپنی قیام گاہ کے سامنے آباد قبائلی بستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ سب میرے عقیدت مند ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "خدا مبارک کرے اور اس آبادی کو قائم و دائم رکھے۔" یکایک آپ نے محسوس کیا کہ آپ کی کیفیات و واردات پر کوئی حملہ کر رہا ہے۔ آپ نے متنبہ کیا۔ "مَیں وہ نہیں ہوں جسکو شکار کر لیا جائے۔ اے حملہ آور اپنے ارادے سے باز آ، کیونکہ مَیں جوابی کارروائی نہیں کرنا چاہتا۔"

فاطمہ اُٹھ کر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی آپ سے ملنے دو بزرگ آئے یہ دونوں اپنے چہرے بشرے سے غیر معمولی نظر آتے تھے۔ انھوں نے آتے ہی پوچھا۔ "کیا فاطمہ چلی گئی؟"

آپ نے جواب دیا: "ہاں چلی گئی، کیوں، کیا کوئی خاص بات ہے؟"
ایک بزرگ نے کہا: "ہاں خاص بات ہے کیوں نہیں۔ ہم دونوں کو خوب غور سے دیکھو سیدی احمد! اور اگر خدا نے تمہیں کوئی مقام عطا فرمایا ہے تو خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ کیوں کہ یہ عورت تمہارے احوال اور کمال کو سلب کرے گی بالکل اس طرح جیسے تم سے پہلے ہمارا اور ہم جیسے دوسروں کا سلب کر چکی ہے۔"
سید احمد نے جواب دیا: "فاطمہ ہمارے احوال اور کمال کو سلب نہیں کر سکتی، اگر یہ بات ممکن ہوتی تو اب تک وہ اپنا کام کر چکی ہوتی۔"
دوسرے بزرگ نے کہا: "ہم تو بھگتے ہوئے ہیں۔ خدا کے لیے ہماری بات سمجھنے کی کوشش کرو ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔"
سید احمد نے جواب دیا: "میں یہاں پچھتانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو میں تم سب کو وہ واپس دلادوں گا جو فاطمہ نے سلب کر رکھا ہے کیونکہ یہاں میں خود سے نہیں آیا ہوں بلکہ بھیجا گیا ہوں۔"
پہلے بزرگ نے مایوسی سے کہا: "خدا کرے ایسا ہی ہو، ورنہ میں یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں۔"
سید احمد نے کہا: "آپ دونوں انتظار کریں۔ اللہ نے چاہا تو کل تک بہت کچھ ہو جائیگا۔"
سارا دن یوں ہی گزر گیا۔ رات کو عشاء کے بعد فاطمہ دوبارہ سید احمد کے پاس آئی اور دریافت کیا: "حضرت! آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں، اگر کوئی تکلیف ہو تو بتا دیجئے تاکہ اس کے ازالے کی کوئی صورت نکالی جائے۔"
آپ نے جواب دیا: "فاطمہ! یوں تو میں بہت خوش ہوں اور اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے میرے مزاج میں استغنا پیدا کر دیا ہے۔ میں نے ہوس اور خواہش کو اپنے دل سے نکال کر طمانیت خرید لی ہے اس لیے تکلیف اور شکایت کا لمحہ آتا ہی نہیں۔"
فاطمہ نے اصرار کیا: "میزبان کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میں آپ کی دل جوئی کروں اور آپ کی شکایت اور خواہش کے بارے میں سوال کرتی رہوں۔"
آپ نے کہا: "اگر تو مصری ہے تو سن۔ میں تجھ سے چند سوال کروں گا اور یہ امید کروں گا کہ تو ان کے معقول جواب دے گی۔"
فاطمہ نے خوشی کا اظہار کیا: "میں جھوٹ نہیں بولتی، ہمیشہ سچ بولتی ہوں۔"

آپ نے پوچھا: "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تیری قیامگاہ کے سامنے انسانوں کا یہ جنگل کہاں سے آگیا؟"

فاطمہ نے جواب دیا: "یہ سب میرے عقیدت مند ہیں اور میرے بن داموں غلام ہیں اگر میں انھیں یہ حکم دے بھی دوں کہ تم سب چلے جاؤ۔ یہ لوگ پھر بھی نہیں جائیں گے۔"

آپ نے بے رُخی سے کہا: "یہ بات نہیں ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ تُو نے ان کو زبردستی روک رکھا ہے۔"

فاطمہ نے جواب دیا: "آپ ان سب سے معلوم کر سکتے ہیں۔"

آپ نے دوسرا سوال کیا: "اور وہ بزرگ، جو صاحبِ احوال و کمال تھے، وہ تیرے پاس کیوں رُکے ہوئے ہیں؛ انھیں کس نے روک رکھا ہے؟" فاطمہ نے چڑ کر جواب دیا: "وہ بھی اپنی مرضی سے رُکے ہوئے ہیں۔ میری طرف سے انھیں اجازت ہے کہ جہاں چاہیں چلے جائیں لیکن وہ مجھے چھوڑ کر کہیں جانے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔"

آپ نے کہا: "فاطمہ! کیا تجھے معلوم ہے کہ میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟"

فاطمہ نے جواب دیا: "ملنے، ملاقات کرنے۔"

آپ نے کہا: "نہیں، میں تجھ سے محض ملاقات کرنے ہی نہیں آیا ہوں بلکہ میں قیدیوں کو رہائی دلوانے آیا ہوں اور جن سے جو کچھ چھینا گیا ہے اس کو واپس دلوانے آیا ہوں۔"

فاطمہ مسکرانے لگی بولی: "آپ اپنے وحواس میں تو ہیں؛ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟"

آپ نے کہا: "بی بی! میں نے جو کچھ کہا، اس پر غور کرو اور جھگڑے کو مت بڑھاؤ، کیونکہ میں یہاں آیا ہی اس لیے ہوں کہ حقدار کو اس کا حق دلا دیا جائے۔ میں اس سے باز نہیں رہ سکتا۔"

فاطمہ نے کوشش کی کہ سید احمد کے احوال اور کمال کو سلب کر لے لیکن ناکام رہی، سید احمد مسکراتے رہے۔ فاطمہ پسینہ پسینہ ہو گئی۔

آپ نے طنزاً پوچھا: "فاطمہ! کیا تو وہی وار مجھ پر بھی کر رہی ہے جو دوسروں پر کرتی رہی ہے؟"

فاطمہ نے غصّے میں جواب دیا: "اگر وہ یہ کہتے ہیں تو سب کے سب میرے خلاف محاذ آرائی کر رہے ہیں اور میں ایک ایک کو مزہ چکھا دوں گی۔"

آپ نے فرمایا: "میری طرف سے اجازت ہے اور تو اس کا آغاز مجھ پر حملہ کر کے کر سکتی ہے۔"

فاطمہ نے آنکھیں بند کیں اور سید احمد کے کمال اور بزرگی کو سلب کرنا چاہا لیکن اس میں ناکام رہی۔

سید احمد نے پوچھا۔ "کیوں فاطمہ، بس یا کچھ اور؟"
فاطمہ نے ایک کوشش اور کی، اور سید احمد سے ان کا سب کچھ چھین لینا چاہا لیکن ناکام رہی۔
سید احمد نے کہا۔ "فاطمہ! ایک کوشش اور، میں تیرا منتظر ہوں۔" فاطمہ نے جواب دیا۔ "سید احمد! زیادہ اتراؤ نہیں، میرا جو دل چاہے گا کروں گی کسی کے حکم یا مشورے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ میں عاقل بھی ہوں اور صاحب احوال بھی۔" سید احمد نے کہا۔ "تو نے کوشش تو کی تھی کہ مجھے بھی بیکار کردے لیکن میں اتنا موم بھی نہیں کہ تو اپنے ارادوں میں بے بس کردے۔"
فاطمہ گھبرائی ہوئی تھی، بولی! "میں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ یہ آپ کو بلاوجہ کا وہم ہو گیا ہے اور کچھ نہیں۔"
سید احمد نے آنکھیں بند کیں۔ فاطمہ کو ایک جھٹکا لگا اور وہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔ کافی دیر بعد جب ہوش آیا تو سرد آہیں بھرنے لگی۔ بولی۔ "سید احمد! آپ نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ ہائے میں تو کہیں کی بھی نہیں رہ گئی۔ میں تو برباد ہو گئی، تباہ ہو گئی، لٹ گئی۔"
سید احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔
فاطمہ نے کہا۔ "سید احمد! میں آپ کو یہاں سے جانے نہیں دوں گی۔" سید احمد نے کہا۔ "میں چند دنوں کے لیے یہاں آیا تھا۔ اب مجھے بار بار یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ میں طنجہ تا چلا جاؤں، چنانچہ اب مزید یہاں نہیں رکوں گا۔"
فاطمہ نے خوشامدانہ دریافت کیا۔ "کل تک تو آپ رک سکیں گے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، میں کل تک تو یہاں ضرور رہوں گا لیکن کل کے بعد میں یہاں نہیں نظر آؤں گا۔"
فاطمہ نے عاجزی سے کہا۔ "سیدی احمد! بہر حال میرے حال پر رحم کیجیے۔" آپ نے جواب دیا، "اگر تو نے دوسروں پر رحم کیا تھا تو آج تو بھی رحم کی مستحق ٹھہرتی ہے۔"
فاطمہ نے کہا۔ "میرے ذکر میں دوسروں کو نہ شامل کیجیے۔ مجھے دوسروں سے الگ ہی رہنے دیجیے۔"
سید احمد نے خاموشی اختیار کی۔ فاطمہ چلی گئی لیکن اس کا چین سکون چھن چکا تھا۔ وہ ساری رات کروٹیں بدلتی رہی اور علی الصباح آپ کے پاس پہنچ گئی۔ بولی "سیدی احمد! میرے حال پر رحم کیجیے۔"
سید احمد نے پوچھا۔ "تیرے ساتھ ہوا کیا تو اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہے آخر؟" فاطمہ نے قبائلیوں کی بستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب یہ لوگ بھی بھاگے جا رہے ہیں اور اس

طرح بھاگ رہے ہیں گویا مجھے پہچانتے تک نہیں۔"

سید احمد نے دیکھا، واقعی خیمے اکھڑ رہے تھے اور قبائلی اپنے جانوروں کی پشت پر سامان لاد رہے تھے۔

اس وقت ان بزرگوں کا پرا آ گیا جن کے احوال اور کمال کو فاطمہ نے سلب کر لیا تھا۔ اب ان کی چھنی ہوئی دولت واپس مل چکی تھی اور اب وہ سب بہت خوش اور مطمئن تھے۔ ایک نے سید احمد سے کہا۔ "حضرت! ہم لوگ آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کریں۔"

سید احمد نے جواب دیا۔ "صاحبان! شکریہ میرا نہیں اپنے خدا کا ادا کیجئے، یہ سب کچھ اس کے کرم سے ہوا ہے۔" ایک دوسرے بزرگ نے آپ کا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بوسہ دیا اور پھر اس کو دونوں آنکھوں سے لگا لیا۔

فاطمہ نے پھر خوشامد کی۔ "سیدی احمد! میرے حال پر رحم کیجئے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ جو دیا کہ اپنے اللہ سے رحم کی درخواست کیجئے۔" فاطمہ نے کہا۔ "سیدی احمد! اگر آپ میرے لیے محرم نہ ہوتے تو اس وقت میں نے آپ کا دامن پکڑ لیا ہوتا اور آپ کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنی دولت واپس لینے کی کوشش کرتی۔"

آپ نے کہا۔ "میں ایک شرط پر تیری پونجی واپس کر سکتا ہوں۔"

فاطمہ نے بے چینی سے پوچھا۔ "کس شرط پر؟"

آپ نے جواب دیا۔ "تو پھر سے یہ وعدہ کر کہ آئندہ کسی کو نہیں ستائے گی۔"

فاطمہ نے کہا۔ "میں وعدہ کرنے کو تیار ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "اور فاطمہ! یہ یاد رکھنا کہ اگر تو وعدہ کر کے بعد میں اس سے پھر گئی تو میں اس سے زیادہ سخت رویہ اختیار کروں گا اور تجھے وہ سزا دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔"

فاطمہ نے اپنے کان پکڑ لیے بولی۔ "میں اپنی سزا کو پہنچ چکی۔ اب میری توبہ کہ ایسا نہیں کروں گی۔"

آپ نے حکم دیا۔ "جاؤ وضو کر اور نماز چاشت ادا کر اللہ نے چاہا تو اپنی مراد کو پہنچے گی۔"

فاطمہ بے اختیار اٹھی اور نماز چاشت کے لیے وضو کرنے چلی گئی۔

نماز چاشت کی ادائیگی کے بعد فاطمہ کو احساس ہوا کہ ان کا روحانی کمال واپس آ رہا ہے۔ فاطمہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ آپ نے فاطمہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا "اب تم کسی سے اس کے احوال اور کمال کو سلب نہیں کرو گی۔"

فاطمہ نے جواب دیا: "میں وعدہ کرتی ہوں، میں نے اب تک جو کچھ کیا تھا نفس کی بے جا پیروی میں کیا تھا۔ محض اس لیے کہ لوگ میرے سامنے عاجزی سے حاضر رہیں اور میں خود کو ان سب سے بدتر اور اعلیٰ سمجھتی رہوں۔"

سید احمد نے کہا: "اور یہی بات تیری بربادی کا باعث بن سکتی ہے۔ ان سارے قبائل کو رخصت کر دے۔"

فاطمہ نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور ہر ایک کو آزاد کر دیا۔ چند ہی دنوں میں سارے قبائل وہاں سے چلے گئے اور جن بزرگوں کی روحانی قوت سلب کی جا چکی تھی کمال اور احوال کی سچائی کے بعد یہ لوگ بھی ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔

یہاں ایک بار پھر سید احمد کو ہدایت کی گئی کہ "طندتا کا سفر کر۔"

آپ رخصت ہو کر مصر پہنچے اور وہاں سے طندتا روانہ ہو گئے۔ طندتا افریقہ کے دُور دراز حصّہ میں واقع تھا۔ جب آپ طندتا کے قریب پہنچے تو وہاں طندتا کے ایک بزرگ ابنِ شحیط آپ کے منتظر تھے۔ وہ سید احمد کے قریب پہنچے اور پوچھا۔

"کیا سید احمد آپ ہی کا اسم مبارک ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "جی ہاں سید احمد میرا ہی نام ہے ارشاد؟"

ابنِ سحیط نے کہا: "میں طندتا کا ایک معمولی انسان ہوں، مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ طندتا تشریف لا رہے ہیں۔ چنانچہ میں آپ کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ آپ میرے مہمان ہیں اس لیے میرے ساتھ میرے گھر تشریف لے چلیے۔" آپ ابنِ شحیط کے ساتھ ان کے گھر چلے گئے۔ آپ کو رہنے کے لیے ایک کمرہ دے دیا گیا۔

رات کو ابنِ شحیط نے ایک عجیب تماشا دیکھا۔ اس نے دیکھا سید احمد کھڑکی پر چڑھے ہوئے ہیں پھر کھڑکی سے چھت پر پہنچ گئے اور وہاں سے آسمان کا نظارہ کرنے لگے۔ پھر تو یہ نظارہ عام ہو گیا اور آپ مستقلاً چھت پر ہی رہنے لگے۔ آپ کی حیرت میں اتنا زیادہ اضافہ ہو چکا تھا کہ آنکھیں سُرخ رہنے لگیں۔ ایک دن آپ نیچے اترے تو ابنِ شحیط نے پوچھا: "حضرت آپ کی دونوں آنکھیں تو لہولہان ہو رہی ہیں، یہ ہوا کیا؟ خیریت تو ہے۔"

آپ نے جواب دیا: "ہاں، اپنی آنکھوں کی سُرخی کا مجھے اندازہ ہے اور میں خود ہی اس کا علاج بھی کر لوں گا۔ تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ابنِ شحیط نے عرض کیا: "حضرت! آپ میرے لیے سب کچھ ہیں کیا آپ بتائیں گے کہ آپ

چھت پر کیوں تشریف فرما ہیں اور یہ آپ آسمان کی طرف کیا دیکھتے رہتے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔" ابن شحیط! اس لامتناہی کائنات کا نظارہ مجھے اس کے خالق سے خوفزدہ رکھتا ہے۔ میری نیند اڑ چکی ہے اور میں دہشت اور خوف سے دنیا اور آرائش دنیا سے بے نیاز ہو چکا ہوں اس لیے میں چھت پر رہتا ہوں۔"

ابن شحیط نے خاموشی اختیار کر لی۔ سید احمد چھت پر چلے گئے اور چالیس دن مستقل چھت پر ہی رہے۔ کھانا پینا تک بھلا بیٹھے۔

ابن شحیط بار بار اوپر جاتا اور آپ کو محوِ نظارہ دیکھ کر واپس آجاتا۔ چالیس دن بعد آپ تیزی سے نیچے اترے اور مکان سے باہر چلے گئے۔ شہر کے باہر فیشا المنارہ نامی جگہ تھی، آپ اس طرف جا رہے تھے۔ آپ کے پیچھے پیچھے چند لڑکے بھی چلے ان میں دو لڑکوں کے نام عبدالمعالی اور عبدالمجید تھے۔ فیشا المنارہ کے قریب پہنچ کر آپ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ عبدالمعالی آپ کے بالکل قریب تھا۔ آپ نے اسے نظر بھر کر جو دیکھا تو عبدالمعالی لرز گیا۔ آپ کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔

عبدالمعالی نے پوچھا۔" حضرت! یہ آپ کی آنکھوں کو کیا ہو گیا؟ یہ سُرخ کیوں ہو رہی ہیں۔"

آپ نے کہا۔" میری آنکھیں سُرخ ہو رہی ہیں؟ کیا واقعی؟"

عبدالمعالی نے جواب دیا۔" نہ صرف سُرخ بلکہ ایسا لگتا ہے گویا آنکھوں سے خون ٹپکنے والا ہے۔"

آپ نے کہا۔" میں آنکھوں کی سُرخی کا علاج کر سکتا ہوں۔ تو اپنے گھر جا اور میرے لیے ایک انڈا لے آ۔"

عبدالمعالی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ آپ انڈے کا کیا کریں گے؟"

آپ نے جواب دیا۔" اپنی دونوں آنکھوں کو اس انڈے سے چھواؤں گا۔ پھر دیکھنا۔ میری دونوں آنکھیں اپنی اصلی حالت پر آجائیں گی۔"

اس وقت آپ کے پاس ایک لکڑی تھی جس کا رنگ سبزی مائل تھا۔ عبدالمعالی نے لکڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" یہ لکڑی مجھے عنایت فرما دیجئے میں اسے تبرک کے طور پر اپنے پاس رکھوں گا۔"

آپ نے لکڑی بلا تامل عبدالمعالی کو دے دی اور کہا۔" یہ لے لے جا اسے اور گھر سے انڈا لے کر آجا۔"

عبدالمعالی لکڑی لے کر بھاگا بھاگا گھر پہنچا اور اپنی ماں سے کہا۔" ماں! مشہور بزرگ

سیدی احمد نے ایک انڈا مانگا ہے۔ اگر ہو تو عنایت فرما دیجئے۔"

ماں نے جواب دیا: "بیٹے! سیدی احمد کی بزرگی اپنی جگہ، لیکن گھر میں انڈا ہے ہی نہیں تو میں دوں گی کہاں سے؟"

عبدالمعالی نے انڈے کی تلاش میں کئی گھر اور دیکھے، لیکن انڈا نہیں مل سکا۔ آخر سیداحمد کے پاس واپس گئے اور منہ لٹکا کر عرض کیا۔

"حضرت! انڈا تو نہیں مل سکا، اب میں کیا کروں؟"

سیداحمد نے افسوس سے کہا: "کمال ہے کہ تو ایک انڈا نہ لاسکا، جا ابن شحیط کے پاس جا اور اس سے کہہ کہ اس نے مجھ کو رہنے کے لیے جو کمرہ دیا تھا اس کو کھول دے اس کمرے میں انڈا مل جائے گا۔"

عبدالمعالی بھاگا بھاگا ابن شحیط کے پاس پہنچا اور سیداحمد نے جو کچھ کہا تھا کہہ دیا۔ ابن شحیط نے جواب دیا: "میں کمرہ تو کھول دوں گا لیکن کمرے میں انڈا کہاں سے آجائے گا۔ میری سمجھ میں تو یہ بات آئی نہیں۔"

ابن شحیط نے کمرہ کھول دیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پورا کمرہ انڈوں سے بھرا پڑا ہے۔ عبدالمعالی نے اس میں سے ایک انڈا لے لیا اور سیدھا سیداحمد کے پاس پہنچ گیا، انڈا دیتے ہوئے کہا: "حضرت! انڈا مل گیا، یہ لیجئے۔"

آپ نے انڈا لے کر دونوں آنکھوں سے چھوایا اور کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور پھر جو کھولیں تو دونوں آنکھوں کی سرخی غائب ہو چکی تھی۔ عبدالمعالی نے اس واقعے کے بعد اپنا گھر چھوڑ دیا اور آپ کے ساتھ ساتھ رہنے لگا۔

طنجہ تا میں ایک بزرگ وجہ القمر نامی تھے۔ ان کے در پر غرضمندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ وجہ القمر میں نخوت آگئی تھی اور وہ اپنے سامنے کسی کی بزرگی کا قائل ہی نہ ہوتا تھا۔ لوگوں سے بداخلاقی سے پیش آتا اور غصے میں برا بھلا کہنا شروع کر دیتا تھا۔ غرضمند باؤلے تو ہوتے ہی ہیں۔ گالیاں اور جھڑکیاں سننے کے باوجود در نہ چھوڑتے۔ ان بزرگ کی شکایت سیداحمد سے کی گئی تو آپ نے فرمایا: "خوش اخلاقی کو رسول اللہ نے بہت ضروری اور جزو ایمان قرار دیا ہے پھر یہ کیسا درویش ہے کہ لوگوں سے درشتی اور بداخلاقی سے پیش آتا ہے۔"

کسی نے سیداحمد کی یہ باتیں وجہ القمر تک پہنچا دیں۔ اس کو غصہ آگیا اور بولا: "اب یہ بدو

مجھ پر تنقید کرنے لگا ہے جب کہ میں اسے اس لائق ہی نہیں سمجھتا کہ اس بارے میں کوئی بات کروں۔ میرے پاس اس کی حاسدانہ باتوں کا کوئی جواب نہیں۔"

وجہ القمر کے ارادت مندوں میں سے کسی نے کہا: "حضرت! میں آپ سے بے پناہ عقیدت رکھتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی جانتا ہوں کہ حضرت سیدی احمد نہایت بلند مقام پر فائز ہیں ان کے خلاف آپ کا یوں زبان کھولنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔"

وجہ القمر نے برہمی میں اپنے مرید کی پٹائی کر دی اور دھکے دے کر نکال دیا۔ یہ شخص روتا ہوا سید احمد کے پاس گیا اور رو رو کر سارا حال سنا ڈالا۔ آپ نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"تو اب اس کی بداخلاقی یہاں تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے پاس واپس جا اور کہدے کہ درویشوں کو چھیڑنا اچھا نہیں۔"

یہ شخص وجہ القمر کے پاس دوبارہ گیا اور سید احمد کا پیغام پہنچا دیا۔ وجہ القمر نے اور زیادہ برہمی کا اظہار کیا اور کہا کہ ان سے جا کر کہہ دے کہ انھیں مجھ پر حاکم نہیں بنایا گیا ہے، وہ میرے بارے میں اپنا لب و لہجہ درست رکھیں ورنہ میں ان کے خلاف کارروائی کروں گا۔"

سید احمد کو وجہ القمر کی ہٹ دھرمی کا جو علم ہوا تو آپ مراقبے میں چلے گئے اور اس عالم میں حکم دیا۔ "وجہ القمر تو کہاں ہے؟ میرے پاس آ اور مجھ سے دو بدو، روبرو باتیں کر۔"

وجہ القمر کو سید احمد کا حکم صریحاً سنائی دی اور وہ بے اختیار کھنچا ہوا سید احمد کے پاس پہنچ گیا۔ آپ نے پوچھا۔ "وجہ القمر! کیا بات ہے، تو مجھ سے خواہ مخواہ کیوں الجھ رہا ہے؟"

وجہ القمر نے جواب دیا۔ "میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ بلاوجہ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟"

سید احمد نے کہا۔ "میں تو تیرے پیچھے نہیں پڑا تو مجھ سے البتہ الجھ رہا ہے۔"

وجہ القمر کی طبیعت کا غصہ عود کر آیا۔ پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور تند و تیز لہجے میں بولا۔ "سیدی احمد! تجھے درویش کس نے بنا دیا؟ تو تو محض بدو ہے۔ میں اگر چاہوں تو تیرا کمال و احوال سلب کر لوں۔"

سید احمد نے نرمی سے کہا۔ "غصہ کو تھوک دے اور یہ فضول دھمکی نہ دے کیونکہ اس سے تجھ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

وجہ القمر کا غصہ اور بڑھا۔ "میں دھمکی نہیں دے رہا، حقیقتِ حال بیان کر رہا ہوں۔"

سید احمد نے بدستور نرمی سے کہا: "تجھے اجازت ہے کہ میرے احوال و کمال کو سلب کر لے۔"

وجہ القمر نے آنکھیں بند کرلیں اور دیر تک مراقبے میں رہا لیکن جب آنکھ کھولی اور سید احمد کی طرف دیکھا تو شرم سے آنکھ تک نہ ملا سکا۔

سید احمد نے پوچھا: "کیا بات ہے؟ رک کیوں گیا۔ میری طاقت اور احوال کو سلب کیوں نہیں کرتا؟"

وجہ القمر نے غصّے میں کہا: "اے بدو! تو نے اچھا نہیں کیا میرے احوال اور کمال کو واپس کردے ورنہ میں دوسرا طریقہ اختیار کروں گا۔"

سید احمد نے جواب دیا: "تو ہر طریقہ اختیار کرسکتا ہے۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

وجہ القمر غصّے میں مارنے بڑھا لیکن اس وقت ٹانگوں میں ایسا درد اُٹھا کہ زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔ سید احمد نے کہا: "اے شخص! اپنے گھر واپس جا میرا اور اپنا وقت فضول ضائع نہ کر۔"

وجہ القمر نے بدستور غصّے میں کہا: "میری دونوں ٹانگیں بیکار ہوگئی ہیں اور میرا درد سے بہت بُرا حال ہے لیکن میرے دل سے تیری خلاف نفرت ابھی تک نہیں نکلی۔"

سید احمد نے کہا: "گھر واپس جا۔"

وہ سختی سے بولا: "میری طاقت اور احوال مجھ سے چھن چکے ہیں لیکن میں تیری عظمت اور بزرگی سے انکار ہی کروں گا۔"

آپ نے پھر نرمی سے کہا: "گھر واپس جا۔"

وجہ القمر نے کہا: "میری دونوں ٹانگیں بیکار ہو رہی ہیں۔ میں گھر کیسے جاؤں گا۔"

آپ نے جواب دیا: "تو چل کے تو دیکھ۔ میں نے تیرا درد سلب کیا۔ اب تو اچھا ہے، جا، اپنے گھر جا، پریشان نہ ہو۔"

وجہ القمر کی ٹانگوں کا درد جاتا رہا، وہ واپس جانے لگا تو آپ نے اس کو ایک بار پھر مخاطب کیا۔ "تجھ سے جو کچھ بھی چھنا ہے اس پر پردہ پڑا رہے گا۔ تجھے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

وجہ القمر نے طنزاً کہا: "شکریہ شکریہ۔ حالانکہ میں تیرا احسان نہیں لینا چاہتا۔"

آپ نے جواب دیا: "تیری مرضی۔ اب تو دفعان ہو جا اور گھر واپس جا کر خوب خوب گالیاں دینا مجھ کو۔"

سید احمد کے مُرید اور ارادت مند اس جھگڑے کو بڑی خاموشی اور تحمّل سے دیکھ رہے تھے۔ وجہ القمر کے چلے جانے کے بعد ایک مرید نے پوچھا: "آپ نے اس کو معاف کردیا۔ حالانکہ وہ اس کا قطعی مستحق نہ تھا۔"

آپ نے جواب دیا: "میں نے تو اس کو معاف کردیا لیکن میرے خدا نے اس کو معاف نہیں

کیا۔ اس کا انجام بہت بُرا ہوگا۔"

مُرید نے کہا: "اگر اُس کی دنیا سُدھر گئی اور عقبیٰ بگڑ گئی تو اس سے عبرت کون حاصل کریگا؟"

آپ نے جواب دیا: "اس کی دنیا سُدھر گئی ہے۔ میرا یہ مطلب تھا کہ لوگ اس کے مرتے دم تک اس کو بزرگ سمجھیں گے اور اس کی دکان چلتی رہے گی لیکن اس کی عقبیٰ بڑی خراب ہو چکی ہے اور اس کی قبر پر عبرت برستی رہے گی۔" مُرید نے کہا: "میری سمجھ میں تو آپ کی باتیں آ نہیں رہی ہیں۔"

آپ نے جواب دیا: "میری باتیں بہت جلد تیری سمجھ میں آجائیں گی تو فکر نہ کر۔"

وجہ القمر اپنی خانقاہ میں واپس آگیا اور دکانداری کرنے لگا۔ وہ سب کچھ کھو دینے کے باوجود خوش تھا کہ اس کا اپنا جو حال تھا اس سے وہ واقف تھا یا اس کا خدا۔ تیسرا کوئی واقف نہ تھا کچھ عرصہ بعد اس کا انتقال ہوگیا اور اس کے ارادت مندوں نے اس کا شاندار مقبرہ تعمیر کرا دیا۔ مقبرے کی تعمیر کا حال سید احمد کے مرید خاص عبدالمعالی نے سُنا تو سیدھا وجہ القمر کے مزار پر پہنچا اور قبر کو ایک ٹھوکر مار کر کہا: "جب سب کچھ تیرا چھن چکا ہے تو یہ شان اور آن بان کیسی؟"

اس کے بعد لوگوں کو وجہ القمر کی قبر پر معلوم نہیں کیا نظر آیا کہ بھاگنا شروع کر دیا اور چند ہی دنوں میں مزار کا یہ حال ہوگیا کہ آدمیوں کا تو وہاں گزر نہ ہوتا، کتوں نے اسے اپنا مسکن بنا لیا اور دن رات وہیں پڑے رہتے۔

سید احمد نے اپنی زندگی ہی میں اپنے خلفاء کو مختلف شہروں میں روانہ کر دیا تھا۔ ان میں یوسف نامی مرید اور خلیفہ کو ابنا بہ اور احمد البوطرطور کو انبالہ کے وسیع و عریض میدان کا مالک بنا دیا۔ یوسف کے حال پر یہ نوازش ہوئی کہ مصر کے امراء اور اکابران کی طرف رجوع ہوگئے اور ان کے گھر کو زر و مال سے بھر دیا۔ جب کہ خود سید احمد نے اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو مسور اور پیاز کھلایا تھا اور اس کی ہدایت فرمایا کرتے تھے، چنانچہ آپ کے تمام خلفا اس پر سختی سے عمل کرتے تھے۔

سید احمد ایک صاحبِ حال اور صاحبِ کمال بزرگ تھے نفس کے خلاف جہاد آپ کی زندگی کا مشن تھا۔ آپ کی فیوض و برکات سے بے شمار بندگانِ خدا فیض یاب ہوئے آپ کی تعلیمات میں احکاماتِ خداوندی کی سختی سے تلقین کی گئی ہے۔ سید احمد کو چونکہ اپنے نیک اور عظیم کام کی خاطر مختلف ممالک کا سفر کرنا پڑا اس لیے انھیں سید احمد بدوی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے آپ کا وصال ۶۷۵ ہجری کو ہوا اور آپ کی جانشینی کا شرف بھی عبدالمعالی کو حاصل ہوا۔

بہت سی کتابوں میں درج ہے کہ آپ کا مزار مصر میں ہے تاہم بعض مؤرخین اس سے اختلاف رائے بھی رکھتے ہیں۔

حضرت سائیں کرم الٰہی

المعروف کانواں والی سرکار

سائیں سردار محمد قادری کی باطنی تربیت حضرت سائیں کرم الٰہی المعروف کانواں والی سرکار رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔ حالانکہ اوّل الذکر کو خلافت حضرت سید محمد حسین پٹی شریف والے بزرگوں نے عطا کی تھی۔ راقم الحروف قادری صاحب کے حجرہ میں بیٹھا تھا۔ میرے استفسار پر کہ حضرت سائیں کانواں والی سرکار کا وصال تو ۱۸ر جولائی ۱۹۲۹ء کو ہوگیا تھا پھر انھوں نے آپ کی باطنی تربیت کیسے کی تو فرمانے لگے۔ یہ انیس سو ستاسٹھ یا ارسٹھ کا واقعہ ہے۔ ایک دن خیال آیا کہ آج سے تہجد کی نماز داتا صاحب جاکر پڑھا کروں گا اور پھر اس کو میں نے اپنا معمول بنا لیا۔ ہر نماز کے بعد صرف یہی دُعا مانگتا۔

"اے اللہ تعالیٰ مجھے اپنے کسی ولی کی صحبت نصیب فرما تاکہ ایسی زندگی گزارنے کا ڈھنگ آجائے جس میں تیری اور تیرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا شامل ہو۔"

بس یہی ایک دُعا تھی جو میں مانگتا تھا۔ اس طرح کافی عرصہ گزر گیا۔ ایک دن حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت نصیب ہوئی اور ارشاد فرمایا۔

"کس سلسلہ میں جانا چاہتے ہو؟"

"آپ بہتر جانتے ہیں حضور۔" میں نے عرض کی۔

" اچھا کانواں والی سرکار کے پاس بھیج دیتے ہیں۔"

دُعا کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک دن پھر حضرت داتا صاحبؒ نے ارشاد فرمایا۔

" تم کانواں والی سرکار کے پاس چلے جاؤ۔"

حسبِ ارشاد میں حضرت کانواں والی سرکار رحمتہ اللہ علیہ کے دربار پر حاضر ہوا۔ دل میں کشادگی کا احساس نہ ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ سارا دن عجیب و غریب خیالات دل و دماغ میں گردش کرتے رہے۔ رات کو سویا تو حضرت کانواں والی سرکار رحمتہ اللہ علیہ خواب میں تشریف لائے اور مجھے چھڑی سے مارا لیکن زبان مبارک سے کچھ ارشاد نہ فرمایا۔ فوراً آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو جسم پر مار کے نشان موجود تھے۔ صبح چند ایک احباب کو بھی دکھائے۔ مار کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی کہ ولی اللہ کے مزارِ اقدس پر حاضری کے وقت دل وسوسے کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ بہرکیف بوقتِ تہجد داتا صاحب گیا۔ سارا واقعہ عرض کیا اور پھر مجھے یوں لگا جیسے داتا صاحب فرما رہے ہوں۔

" پھر وہاں جاؤ۔"

گجرات پہنچا تو وہاں صاحبِ قبر کی زیارت ہوئی لیکن اس دفعہ آپ خاموش رہے دوسرے دن پھر داتا صاحب سے واقعہ بیان کیا تو عالمِ رویا میں یوں ارشاد فرمایا گیا۔

" میرے پاس آنے کی بجائے ہر روز گجرات جایا کرو۔"

اب میں نے یہ معمول بنا لیا کہ نمازِ تہجد داتا صاحب پڑھتا اور پھر وہاں سے سیدھا حضرت کانواں والی سرکار کے مزار پر پہنچ جاتا۔ اس طرح اکیس دن گزر گئے۔ ایک دن خواب میں تشریف لائے اور ارشاد فرمایا۔

" بابا رانجھا کے پاس چلے جاؤ۔"

ان دنوں حضرت بابا سائیں رانجھا گدی نشین تھے اور اب بھی بفضلِ تعالیٰ حیات ہیں۔ میں سیدھا ان کی خدمت میں پہنچا اور سارا ماجرا عرض کیا کہ سرکارؒ نے بھیجا ہے۔ حضرت بابا رانجھا نے سُنا تو کہا۔

" ٹھیک ہے آیا جایا کریں۔"

اس کے بعد میں اکثر و بیشتر وہاں حاضری دینے لگا۔ اب یہ کیفیت ہے کہ جب حضرت کانواں والی سرکار رحمتہ اللہ علیہ کے دربار پر حاضری دینا ہوتی ہے تو حضرت سائیں

بابا رانجھا کو سرکارؒ بتا دیتے ہیں کہ میرا بچہ لاہور سے آرہا ہے۔

حضرت سائیں سردار محمد قادری اپنا حال بیان کر رہے تھے اور میں بزرگانِ دین کے تصرف اور فیض رسانی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور پھر مجھے اپنے مرشد حضرت فضل شاہ قطبِ عالم رحمتہ اللہ علیہ کا فرمان یاد آگیا کہ وصال کے بعد اولیاء اللہ کا فیض ستر گنا زیادہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ آزمائش گاہِ دنیا سے گزر چکے ہوتے جہاں انھیں پھونک پھونک کر قدم اُٹھانا ہوتا ہے۔

حضرت سائیں کرم الٰہی المعروف کانواں والی سرکار رحمتہ اللہ علیہ ۱۲ اپریل ۱۸۴۸ء کو محلہ اندرونی کانیا والی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق گجرات کی قوم ارائیں سے تھا۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی مہر غلام محمد تھا۔ پیشہ زمینداری تھا۔ بڑے سیدھے سادے انسان تھے۔ اپنی شرافت و سادگی اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے بڑے مشہور تھے۔ اہلِ خاندان اور کئی دوسرے لوگ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے اور دُعا کے لیے عرض کرتے تھے تاکہ اللہ تعالیٰ اُن کی مشکلیں اور پریشانیاں دُور فرمائے۔ اس طرح خیر و برکت اور فیض کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا اسم مبارک بھولاں بی بی تھا۔ نہایت پاکدامن اور نیک خاتون تھیں۔ گھر میں ہر وقت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ خیر کی خوشبو پھیلی رہتی تھی۔

جب حضرت سائیں کرم الٰہیؒ ذرا بڑے ہوئے تو آپ کو مسجد میں تعلیم کے لیے بٹھا دیا گیا اور قرآن پاک ناظرہ پڑھنے لگے۔ ان دنوں مسجد کے امام و خطیب حضرت سائیں نتھا تھے۔ بڑے نیک و پارسا اور صاحبِ کشف بزرگ تھے۔ آپ حضرت چشتی بادشاہ رحمتہ اللہ علیہ کے مجاور بھی تھے۔ عموماً مساجد میں جاکر وعظ فرمایا کرتے تھے اور لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر چلنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے تاکہ روزِ محشر شرمساری نہ ہو۔ آپ کی بزرگی و پاکبازی کا ایک عالم معترف تھا۔ آپ کے پاس شہر کے کافی بچے درس لیا کرتے تھے۔ حضرت سائیں کرم الٰہیؒ بھی انھیں بچوں میں شامل تھے۔

ایک دن آپ کا بڑا بھائی مہر فضل دین حضرت سائیں نتھا کے پاس بغرض نیاز و ملاقات حاضر ہوا۔ چندے گفتگو کے بعد مہر فضل دین نے دریافت کیا۔

"حضرت صاحب آپ کے پاس کافی بچے درس قرآن پاک لیتے ہیں کیا بتا سکتے

ہیں کہ ان میں سب سے زیادہ سعید و نیک بخت کون ہے ؟"

سائیں نتھا صاحب نے سنا تو بات کو ٹالنا چاہا۔ لیکن مہر فضل دین کے اصرار پر رازدارانہ انداز میں ارشاد فرمایا۔

" آپ کا چھوٹا بھائی کرم الٰہی۔"

جب مہر فضل دین نے سُنا تو سوچ میں پڑ گیا۔ چہرے پر حیرانگی کے آثار تھے

" اس میں حیرانگی کے کیا بات ہے مہر فضل دین۔ یاد رکھو کرم الٰہی ایک دن بہت بڑا ولی اللہ ہو گا اور ایک دنیا اس سے فیضیاب ہو گی۔" حضرت سائیں نتھا نے باوثوق انداز میں کہا۔

گھر پہنچے پر ماں نے جب بڑے بیٹے کی حالت کو پہلے سے مختلف پایا تو وجہ دریافت کی۔ جو سائیں نتھا نے بتایا تھا وہ اُس نے ماں کو بتا دیا۔

" یہ درست ہے۔ بیٹا۔ جب تمہارا چھوٹا بھائی اس عالم رنگ و بُو میں آیا تھا تو صبح صادق کا وقت تھا۔ اس وقت کمرے میں تیز نورانی روشنی ظاہر ہوئی تھی۔ اُسی وقت سمجھ گئی تھی کہ نومولود بڑا نیک نام ہو گا۔" اور پھر بیٹے سے کہا کہ وہ اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرے۔

ایک دن سائیں کرم الٰہی قرآن پاک پڑھنے میں مشغول تھے کہ آپ کا بڑا بھائی آیا اور حضرت سائیں نتھا سے کہا کہ وہ کرم الٰہی کو چھٹی دے دیں تاکہ پھلے چلانے کے کام میں ہماری مدد کرے۔

" بہت اچھا۔ آپ چلیں میں کرم الٰہی کو لے کر آتا ہوں۔"

مہر فضل دین یہ سُن کر چلا گیا تو سائیں نتھا، کرم الٰہی کو ساتھ لے کر کھیتوں میں پہنچا۔ اُسے ایک سایہ دار درخت کے نیچے بٹھا دیا اور خود پھلے چلانے لگے۔ مہر فضل دین نے جب دیکھا تو عرض کیا۔

" حضرت! اس لڑکے کو خود کام کرنے دیں۔"

" اس لڑکے کے بارے میں جو میں دیکھ رہا ہوں وہ آپ نہیں جانتے لہذا مجھ پر لازم ہے کہ میں اس کا ادب کروں۔ اس کی جگہ میں جو پھلے چلا رہا ہوں۔"

جو پیدائشی طور پر ولی اللہ ہو اس کے رنگ ڈھنگ شروع سے ہی دوسرے بچوں سے جداگانہ ہوتے ہیں۔ حضرت سائیں کرم الٰہی بھی انہی میں سے تھے۔ آپ کبھی روتے

نہیں تھے۔ شیرِ مادر پینے کے بعد آپ کو لٹا دیا جاتا تو آرام وسکون سے لیٹے آسمان کی طرف دیکھتے رہتے اور کھیلتے رہتے تھے۔ دودھ پینے کا وقت ہوتا تو کبھی کبھار پیتے اور متعدد بار منہ موڑ لیتے تھے اور جب کھانا کھانے کی عمر کو پہنچے تو پھر بھی یہی عادت شریف تھی۔ یعنی بچپن سے ہی آپ قلیل الطعام تھے۔

بچپن سے ہی آپ کا رنگ درویشانہ تھا۔ ہم مکتبوں اور دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود اور فضول باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ اگر کبھی کھیتی باڑی میں اپنے والدِ گرامی کا ہاتھ بٹاتے اور ہل چلانے لگتے تو استادِ محترم کو بذریعہ کشف علم ہو جاتا تو فوراً گجرات میں آپ کے کنویں پر پہنچتے۔ سائیں کرم الٰہی سے ہل لے کر انھیں بٹھا دیتے اور خود ہل چلانے لگتے اور جب تک کام ختم نہ ہوتا اس وقت تک نہ جاتے تھے۔ باپ نے جب یہ حال دیکھا تو سوچنے لگتا کہ اگر ایک بزرگ اور عالم میرے اس بچے کی استدعا رد تو فیر کرتا ہے تو یقیناً آنے والے وقت میں یہ بہت بڑا ولی اللہ بننے والا ہے لہٰذا اس کے بعد باپ نے بیٹے کو کام کرنے کے لیے کہنا چھوڑ دیا لیکن بعض اوقات سائیں کرم الٰہیؒ اپنی مرضی سے ہل چلا لیا کرتے تھے۔

جب آپ سولہ برس کے ہوئے تو فقیروں اور درویشوں کی طرف فطری میلانِ طبع میں روز افزوں عروج آنے لگا۔ روزمرّہ کے معمولات میں بھی شدّت آتی گئی۔ صوم وصلوٰۃ کے سختی سے پابند تھے۔ تلاوتِ قرآن پاک باقاعدگی سے کرتے۔ شب وروز کا بیشتر حصّہ عبادت وریاضت میں گزرتا تھا۔ آپ کے بھائی مال مویشی لے کر شام کو شہر چلے جاتے تھے۔ اور آپ رات بھر وظیفہ پڑھتے تھے۔ زیادہ تر قصیدہ غوثیہ کا وظیفہ کرتے تھے۔ اگر کسی اللہ والے کے متعلق سنتے تو فوراً اس کی خدمت میں حاضر ہو جاتے کہ شاید مقصود حاصل ہو۔ لیکن ہنوز منزل نظروں سے اوجھل تھی۔ بقول حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ رحمۃ اللہ علیہ جانتے تھے کہ شیخ کامل سلوک کی راہوں کا رفیق ورہنما ہوتا ہے۔ راہ حق کو جاننے والا اور ہلاکت واندیشہ کے موقعوں سے آگاہ وبینا ہوتا ہے تاکہ مریدین کو ہدایت وضلالت اور مفید ومضر سے واقف کر سکے۔ آپ کو علم تھا کہ مُرشد و شیخ کا قلب اطہر دروازہ کی مانند ہے جو عالمِ غیب سے کھول دیا جاتا ہے اور حق تعالےٰ کے فیوض کی امداد جو ہر لحظہ مُرید تک پہنچتی ہے وہ مُرشد ہی کے واسطے سے پہنچتی ہے۔ لہٰذا آپ جس درویش کے بارے میں سنتے درِ دولت پر حاضر ہو جاتے اور تہی دامن لوٹ آتے۔

حضرت سائیں کرم الٰہی اس وقت کا انتظار بڑی بیتابی سے کر رہے تھے کہ کب کسی کامل کے حلقہ ارادت میں شامل ہوں۔ لیکن جب تک اللہ تعالیٰ کی مشیت نہ ہو فیض کے دروازے نہیں کھلتے اور پھر جس سے فیض نصیب ہونا ہو اس تک اللہ تعالیٰ خود پہنچانے کے اسباب بھی پیدا فرما دیتا ہے۔ ایک دن ایک سید صاحب کی خدمت میں پہنچے اور مدعا بیان کیا۔ سید صاحب نے آپ کی طرف دیکھا اور قدرے توقف سے فرمایا۔

"مجھے خوشی ہوتی اگر تیرا فیض میرے پاس ہوتا۔ ان دنوں حضرت بابا امام شاہ رحمتہ اللہ علیہ چودھویں مرتبہ حج پر تشریف لے گئے ہیں۔ تمہیں ان سے فیض حاصل ہوگا، جب واپس آئیں تو ان کے پاس چلے جانا۔"

یہ سنا تو دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔ منزل کا نشان مل گیا تھا۔ بڑی بے تابی سے آپ کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

حضرت امام شاہ رحمتہ اللہ علیہ کا اصل وطن پیر کوٹ سدھان ضلع جھنگ تھا۔ نقل مکانی فرما کر آپ جمن چنڈالہ ضلع گجرات میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ بڑے کامل بزرگوں میں سے تھے۔ کئی ولی اللہ آپ سے فیض یافتہ تھے اور آپ ہی کے پاس ہوتے تھے۔ دن میں کئی بار حضرت سائیں کرم الٰہی لوگوں سے دریافت فرماتے کہ حضرت امام شاہ حج سے واپس تشریف لے آئے ہیں یا نہیں۔ سفر انتظار کا ایک ایک لمحہ کوہ گراں کی مانند تھا، کٹنے سے نہ کٹتا تھا۔ نادیدہ مرشد کے واقعات و حالات لوگوں سے سنتے تو اضطراب کی لہریں سینے میں موجزن ہو جاتی تھیں۔ بالآخر ایک دن پتہ چلا کہ حضرت امام شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ حج سے واپس تشریف لے آئے ہیں۔ بس پھر کیا تھا کشاں کشاں درِ اقدس پر پہنچے چہرہ انور پر نظر پڑی تو بیتاب جذبوں کو سکون میسر آگیا۔ اب انتظار کس بات کا تھا۔ آگے بڑھے اور عرض کی۔

"حضور! غلام حاضر ہو گیا ہے قبول فرمالیں تو مہربانی ہو گی۔"

حضرت امام شاہ رحمتہ اللہ علیہ نے دیکھا کہ جس کی امانت ان کے پاس ہے وہ لینے کے لیے آگیا ہے تو حلقہ ارادت میں شامل فرما لیا۔

اب آپ مرشد کے زیر سایہ راہ سلوک پر گامزن ہوئے۔ آپ دیکھتے کہ لوگ مصائب و آلام اور امراض کے دفعیہ کے لیے آتے ہیں اور بامراد لوٹتے ہیں۔ ایک کوڑھی حضرت شاہ صاحب کے پاس آیا۔ مریدین کو حکم دیا کہ اس کے جسم کو نامے کی گرم ریت کے اندر دبا دیا

جائے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ شام کو جب اُسے ریت سے نکالا گیا تو وہ بالکل تندرست تھا۔ مرض کا نام و نشان نہ تھا۔ آج کل چین میں یہ طریقۂ علاج بڑا مشہور ہے مختلف امراض کا علاج مریضوں کے اعضا کو ریت میں دبا کر کیا جاتا ہے اور اسے نئی دریافت سمجھتے ہیں حالانکہ ہمارے بزرگ اس سے ناواقف نہ تھے۔ اب حضرت سائیں کرم الٰہی اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق عبادت و ریاضت و مجاہدہ میں مصروف رہتے تھے۔ وقت گزرتا رہا۔

ایک دن مُرشد نے آپ کو طلب فرمایا اور کہا "کرم الٰہی! فیوض ربّانی میں سے تمہارا کچھ حصّہ دہلی میں ایک درویش کے پاس بھی ہے۔ وہ بھی جا کر لے لو۔"

حکم سُنا تو بغیر کسی تاخیر کے پاپیادہ بجانب دہلی چل پڑے۔ یہ نہیں پوچھا وہ درویش کون ہے اور کہاں ملے گا۔ یہ آداب مریدی کے منافی ہے۔ سفر کی صعوبتیں، مشکلات اور مشقتیں برداشت کرتے ہوئے کئی دنوں کے بعد وارد دہلی ہوئے۔ اس درویش کو بھی بذریعہ کشف معلوم ہو گیا تھا کہ حقدار آگیا ہے۔ چنانچہ اچانک راستے میں اس درویش سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ وہ آپ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جب توجّہ کاملہ سے آپ پر نظر فرمائی تو دل روشن ہو گیا۔ چند روز اس درویش کے پاس قیام فرمایا۔ اس کے بتائے ہوئے طریقہ سے مجاہدہ کرنے پر علم مکاشفہ عطا ہوا۔ حال اس قدر غالب ہوا کہ مجذوبیت کے آثار نمودار ہو گئے۔ جب اس درویش نے آپ کی امانت لوٹا دی تو حکم دیا کہ کشمیر چلے جاؤ وہاں بھی کسی اللہ والے کے پاس تمہارا حصّہ موجود ہے۔ چنانچہ آپ سوئے کشمیر چل پڑے۔

آپ ایک دُھن میں کشمیر کی جانب رواں دواں تھے نہ راستے کی مشکلات پر نظر تھی نہ زادِ راہ کی عدم موجودگی کا خیال۔ اللہ والوں کی نظر تو اسباب پر نہیں مسبب الاسباب پر ہوتی ہے۔ راستے میں دریائے جہنا کو عبور کرنے کے لیے کافی دُور تک پانی میں سے گزرنا پڑا۔ آخر کئی دنوں کے بعد کشمیر میں داخل ہوئے تو ایک بزرگ کو منتظر پایا۔ بولے "میں دو دن سے انتظار کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد وہ بزرگ حضرت سائیں کرم الٰہی رحمتہ اللہ علیہ کو خلوت میں لے گئے اور کاسۂ طلب میں معرفتِ الٰہیہ کے بے شمار آبدار و گرانما یہ موتی ڈال دیئے اور پھر اونٹ پر بٹھا کر حضرت بابا امام شاہ رحمتہ اللہ علیہ کے پاس گجرات جانے کے لیے کہا۔

مُرشد کی خدمتِ اقدس میں پہنچ کر آپ نے تمام احوال گوش گزار کیے۔ مُرشد خنداں بہ لب مُرید باصفا کی طرف دیکھتا اور سنتا رہا۔ بعدہٗ کافی دیر تک دونوں میں رازو

نیاز کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس وقت آپ زندگی کی پچیسویں منزل میں تھے لیکن ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے۔ مُرشد جانتا ہے کہ مُرید کو کس کس مقام سے اور کیسے گزارنا ہے تاکہ اس کی تکمیل ہو سکے۔ حکم ملا کہ گوجر خاں میں جہاں ترقی والا پُل تعمیر ہو رہا ہے وہاں چلے جاؤ۔ مُرشد کے حکم کی ادائیگی میں تاخیر مُرید کو کئی منزلیں پیچھے لے جاتی ہے۔ فوراً اُٹھے اور گوجر خاں کی طرف چل پڑے۔

گوجر خاں پہنچ کر آپ نے مزدوری شروع کر دی۔ دن گزرتے رہے۔ ایک دن ٹھیکیدار پیر بخش نے دیکھا کہ کرم الٰہی مزدور نے جو ٹوکری اُٹھائی ہوئی ہے وہ سر پر ہونے کی بجائے تقریباً ایک ہاتھ اونچی اُٹھی ہوئی ہے۔ سخت متعجب ہوا۔ سمجھ گیا کہ اللہ کا ولی مزدوروں میں شامل ہے۔ اس نے آپ کو بُلایا اور کہا کہ آج سے آپ مزدوری کی بجائے چوکیداری کا کام کریں گے۔ آپ نے یہ کام شروع کر دیا۔ ایک دن آپ کی کٹیا کے قریب سے گزرا تو دیکھا آپ آٹا پکانے کی بجائے صرف پانی میں گھول کر پی رہے ہیں۔ یہی آپ کی خوراک تھی۔ اب وہ کبھی کبھی آپ کے پاس آکر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنی کسی مرضِ کہنہ کا ذکر کیا کہ کافی علاج معالجہ کے باوجود صحت نہیں ہوئی اور دُعا کے لیے التجا کی۔ آپ نے سُنا تو پانی میں مرچیں گھولیں اور پیالہ اس کی طرف کرتے ہوئے فرمایا۔

"اسے پی لو۔"

مرچیں پینے کی دیر تھی کہ ٹھیکیدار تندرست ہو گیا اور مرضِ کہنہ کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ اس واقعہ کے بعد وہ آپ کا بے حد گرویدہ اور مداح ہو گیا اور عرض کیا۔

"حضور! آج سے آپ کو چوکیداری بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں آرام سے رہیں اور جس چیز کی طلب ہو حکم دیا کریں۔" اور خدمت کے لیے حاضرِ خدمت رہنے لگا۔ آپ نے جب دیکھا کہ راز افشاں ہو گیا ہے تو واپس گجرات مُرشد کے پاس لوٹ آئے۔ اس وقت ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔

ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد سلوک کی تمام منازل طے ہو گئی تھیں۔ عشق و معرفت کے رنگ میں رنگے جا چکے تھے۔ مُرشد نے جب دیکھا تو مخلوق اللہ کو فیوض و برکات سے نوازنے کے لیے حکم دیا کہ آپ جھنگی میں ڈیرہ لگا لیں جہاں آپ کا کنواں بھی تھا۔ اب وہ وقت آگیا تھا کہ جو انعام و اکرام آپ کو ملا تھا اُسے آگے تقسیم کیا جائے۔

حضرت سائیں کرم الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں ڈیرہ لگایا تو لوگ جوق در جوق آپ کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہونے لگے۔ جو لوگ نذر نیاز لے کر آتے تو اسے آپ کوؤں کے آگے ڈال دیا کرتے تھے۔ اگر وہاں اور آدمی موجود ہوتے تو ان کو بھی دے دیا کرتے تھے۔ اس طرح وہ جگہ سائیں کانواں والے کی جھنگی مشہور ہوگئی۔ اور لوگ آپ کو کانواں والی سرکار سے یاد کرنے لگے۔ یہ نام اس قدر مشہور و معروف ہوا کہ اصل نام لوگوں کو یاد نہ رہا۔ آپ کا زیادہ تر وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا۔ لیکن روز افزوں مجذوبیت کا رنگ غالب آتا جا رہا تھا۔ حاجت مند درِ اقدس پر حاضر ہوتے اور مرادوں سے جھولیاں بھر کر لوٹتے۔ کبھی کوئی بے مراد نہیں لوٹتا تھا۔ آپ فنا فی اللہ کے مقام پر تھے۔ بعض اوقات دنیا کے متوالوں کو جھڑک بھی دیا کرتے تھے لیکن وہ آس و امید کے چراغ روشن کیے بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی کبھی آپ ملحقہ علاقے چاہ سپالاں جو آجکل بستی الداعی سپالاں کے نام سے منسوب ہے میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ وہاں آپ کے تمام اہلِ خاندان کی اراضی تھی۔ ایک دن آپ مہر فتح دین کے کنویں پر تشریف فرما تھے کہ اس نے اپنے داماد مہر نور الٰہی کے توسط سے عرض کی کہ کنویں میں پانی کم ہے دعا کریں۔ حضرت کانواں والی سرکار رحمۃ اللہ علیہ نے مہر نور الٰہی سے فرمایا کہ اُٹھ کر کنواں چلاؤ۔ وہ چلانے لگا تو آپ نے متبسم ارشاد فرمایا۔

"جوان اب اس میں پانی کبھی کم نہ ہوگا۔"

آپ نواسۂ رسول حضرت حسین ابن علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے اسم پاک کی بے حد عزت و تکریم کرتے تھے۔ سید حسین شاہ کی آپ سے بڑی دوستی تھی۔ دونوں پیر بھائی بھی تھے۔ ان دنوں کشتی کا بڑا رواج عام تھا۔ ایک دن دونوں دوستوں میں کشتی ہوئی تو آپ ہار گئے۔ سید حسین شاہ نے کہا۔

"دیکھا میں نے آپ کو پچھاڑ لیا ہے۔"

آپ نے بڑی محبت و عقیدت سے کہا۔

"بھئی اپنے نام کی مناسبت دیکھو کس عظیم ہستی سے ہے اُسے کون پچھاڑ سکتا ہے۔"

جو اللہ تعالےٰ کا ہو جاتا ہے اُسے پھر دنیا کی حاجت نہیں رہتی۔ دنیا کی تمام اشیاء اس کے گرد چکر لگاتی ہیں مگر وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ ایک دفعہ آپ کے بھائیوں، نظام دین اور فضل دین میں اراضی پر جھگڑا ہو گیا۔ آپ دونوں سے چھوٹے تھے۔

وہ تصفیہ کے لیے آپ کے پاس آئے۔ آپ نے ایک روٹی لے کر اس کے دو برابر حصے کر دیئے اور خود اپنے حق سے دستبردار ہو گئے۔ کیونکہ آپ دُنیا سے بے نیاز تھے اور اس سے دُور بھاگتے تھے۔

آپ سے بے حد کرامات منسوب ہیں۔ یہ خوارق عادت بزرگانِ دین جان بوجھ کر نہیں دکھاتے بلکہ از خود رونما ہو جاتی ہیں۔ لاریب جو اللہ تبارک و تعالیٰ کا ہو جاتا ہے تو تصرف شروع ہو جاتا ہے۔ ان کو دیکھ کر بہت سے گم کردہ راہِ حق اپنے کارسازِ مطلق کی طرف لوٹ آتے ہیں اور بہت سے لوگ بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کے تقرب سے فیضیاب ہونے کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ ایک دن عالمِ جذب و مستی میں لنگوٹ باندھے بیٹھے یادِ حق میں مگن تھے کہ اسی اثناء میں ایک سالک درویش وہاں آنکلا اور آپ کے قریب رکھے ہوئے گھڑے میں سے پانی انڈیل کر پینے لگا۔ آپ نے منع فرمایا تو وہ بولا۔

"اس میں کونسا دودھ ہے جو آپ پینے سے منع کر رہے ہیں۔"

سُنا تو آپ نے اپنی زبان ترجمان حق بیان سے ارشاد فرمایا۔

"اگر دودھ پینا ہے تو کنویں سے جا کر پی لو۔"

درویش مسکراتا ہوا اُٹھا اور کنویں میں جھانک کر دیکھا۔ کنویں کا سارا پانی دودھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا اور پھر آکر قدموں میں گر پڑا۔ اپنی گستاخی کی معافی مانگی۔ آنِ واحد میں یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ بیشمار لوگ جمع ہو گئے۔ گھڑے اور برتن دودھ سے بھر کر گھروں میں لے گئے اور پیٹ بھر کر پیا۔ آٹھ پہر کے بعد کنویں کا دودھ پھر پانی کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ اس کرامت کا مشاہدہ کرنے اور سننے کے بعد ہزاروں لوگ دُور دُور سے آکر خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان گنت لوگوں نے اپنا رُخ ظلمات سے نور کی طرف کر لیا۔ اور کئی لوگ حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ کئی غیر مسلم بھی اپنی حاجات لے کر درِ اقدس پر حاضر ہوتے تھے۔ ایک دفعہ ایک سکھ حاضر ہوا اس کے پانچ آدمی مقدمۂ قتل میں ماخوذ تھے۔ منت سماجت کرنے لگا کہ نظرِ کرم فرمائیں کہ اس کے آدمی بری ہو جائیں۔ آپ نے اُٹھ کر اُسے ڈنڈے مارنے شروع کر دیئے۔ چار پڑے تو وہ درد سے تلملا کر بھاگ گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔

"پانچواں بیچ میں ہی چھوڑ گئے ہو۔"

جب مقدمے کا فیصلہ ہوا تو چار آدمی بری کر دیئے گئے اور پانچویں کو سزائے موت

ہوگئی۔ اب وہ افسوس کرنے لگا کہ پانچواں ڈنڈا بھی کھا لیتا۔ اس حال پر مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اولیاء راہست قدرت از الٰہ
تیر جستہ باز گرد انداز راہ

ترجمہ:۔ اولیاء کو اللہ کی طرف سے قدرت ہوتی ہے وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس لا سکتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک بوڑھی عورت حضرت کانواں والی سرکار رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ مجھ کو ایک سال سے بخار ہے اترتا ہی نہیں ہے۔ آپ نے سُنا تو ارشاد فرمایا۔

"اپنا بخار اس کیکر کے درخت کو دے دو۔"

اور پھر ایک کیکر کے درخت کی طرف اشارہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ عورت اُسی وقت تندرست ہوگئی اور کیکر کا درخت خشک ہوگیا اور اس میں شگاف پڑ گئے اور پھر ایک مدت کے بعد اس میں نئی کونپلیں پھوٹیں۔

آپ ہر وقت عشقِ الٰہی میں سرمست رہتے تھے۔ بولنا بہت کم کر دیا تھا لیکن خاص خاص مریدین اور محرم راز افراد سے گفتگو فرماتے تھے۔ فیوض و برکات کی تقسیم ہو رہی تھی لوگ اپنے دکھوں کے مداوا کے لیے دُور و نزدیک سے کھچے چلے آرہے تھے۔ مریدین و عقیدت مندوں کا حلقہ وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ آپ کی عمر مبارک اکانوے سال کی ہوگئی۔ یہ جمعرات کا دن دیسی مہینے ساون کی پانچ تاریخ اور شام چھ بجے کا وقت تھا کہ خالقِ حقیقی کی طرف سے پیغامِ وصل آگیا۔

اولیاء اللہ موت کو وصال کا دروازہ کہتے ہیں۔ اس لیے منتظر ہوتے ہیں کہ کب شاہی قاصد آئے اور لے جائے۔ چنانچہ آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اس دارِ فانی سے رخصت فرما گئے۔ آپ کی موت کس طرح واقع ہوئی اسکے بارے میں تفصیلات نظر سے نہیں گزریں۔ بہرکیف آپ کے وصال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح دور دور تک پھیل گئی۔ اس مردِ حق کا آخری دیدار کرنے کے لیے بیشمار لوگ جھنگی کانواں والی سرکار کی طرف چل پڑے۔ آپ کو غسل پیر سید ولایت علی شاہ نے دیا جو آپ کے بے حد عقیدت مند تھے وہ کہتے ہیں کہ بوقتِ غسل حضرت کانواں والی سرکار رحمتہ اللہ علیہ کی پیشانی مبارک پر ستارہ چمک

رہا تھا اور ساتھ ہی کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔

دوسرے دن انبوہ کثیر کی وجہ سے آپ کی نمازِ جنازہ تین مرتبہ پڑھی گئی اور شام ساڑھے پانچ بجے کے قریب آپ کو اپنے کنویں پر جو سائیں کانواں والے کی جھنگی کہلاتی ہے سپردِ خاک کر دیا گیا۔ آپ کا عرس ہر سال ساون کی پہلی اتوار اور سوموار کو منایا جاتا ہے جس میں بیشمار عقیدت مند محبت کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے حاضر اور انعام و اکرام سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ آپ کا مزارِ اقدس شہر گجرات سے بجانب شمار تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ مقبرہ کی عمارت بڑی خوبصورت ہے۔ دُور سے آنے والوں کے لیے رہائش کا بھی انتظام ہے اور نماز کے لیے مسجد بھی ہے۔ آپ کا سلسلہ قادریہ رزاقیہ تھا جو اکتیس واسطوں سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ حال پر مسند سجادگی پر حضرت سائیں بابا رانجھا نوشاہی جلوہ افروز ہیں اور حضرت سائیں سردار محمد قادری زمرہ خلفاء میں شامل ہیں۔ حضرت کانواں والی سرکار رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب کئی محبین نے اشعار میں بیان کئے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

کانواں والا مست قلندر اچیاں شاناں والا اے
ہر دم یاد خدا نوں کردا دکھدا دم سکھالا اے
فیض دے چشمے وچوں ہر نوں دیندا بھر پیالا اے
روندا آوے ہسدا جاوے اوہ دربار نرالا اے
پورا کردے اللہ سائیں مونہوں جو فرمایا اے
سائیں کرم الٰہی اُتے سائیں کرم کمایا اے

لقمان نے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: بیٹے دیانت اور ایمانداری کے بعد ایک مخلص اور دانا دوست کو تلاش کرنا ہرگز نہ بھولنا، کیونکہ ایک مخلص اور دانا دوست پھل دار درخت کی طرح ہوتا ہے کہ اگر اس کے نیچے بیٹھو گے تو سایہ دے گا اور اوپر چڑھو گے تو پھل پاؤ گے۔"

بابا حسن کاظمی صاحب رح

اللہ کے نیک ولی کا جب وقتِ آخرت آن پہنچا تو اُس نے اپنے بیٹے کو قریب بُلا کر کہا بیٹے مَیں نے تیرا نام کستیر گل رکھا تھا کیا تمہیں معلوم ہے کہ مَیں نے تیرا یہ نام کیوں رکھا تھا۔" بیٹے نے کہا " ابّا جان مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں آپ ہی کچھ بتائیں۔" باپ نے کہا۔ "جانِ پدر فارسی میں کستوری مُشک کو کہتے ہیں اور اسی کستوری کا پشتو زبان میں کستیر بن گیا ہے لہذا میری یہ دلی خواہش ہے کہ تو دنیا میں مُشک کی طرح مہکتا رہے۔ کیونکہ مَیں نے تیری ذات سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔"

بیٹا باپ کی باتیں بڑی توجہ اور انہماک سے سُن رہا تھا۔ اُس نے کہا۔" ابّا جان مَیں آپ کی نصیحت پر پورا پورا عمل کروں گا۔ کیونکہ مَیں جانتا ہوں کہ علم کے بغیر انسان ایک جانور کی مانند ہوتا ہے۔"

چنانچہ اس ولی اللہ کے سعادت مند بیٹے نے اپنے باپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے علومِ حدیث و تفسیر پر غیر معمولی توجہ دی اور ہر وقت ریاضت و عبادت میں مصروف رہنے لگا چونکہ باپ کا تعلق سہروردیہ سلسلے سے تھا۔ چنانچہ بیٹے نے بھی اسی سلسلے کی پیروی اختیار کی۔ اسی دوران باپ کا انتقال ہو گیا تو بیٹے کو کسی عظیم چیز کی کمی کا شدّت سے احساس ہونے گا۔

چونکہ باپ ولی اللہ تھا لہذا اُس کے اُنتقال کے بعد مُرید اب اُن کے بیٹے کے پاس آنے لگے اور کستیر گل نے انھیں اپنا مُرید کرنا شروع کر دیا اس پر دوسرے ہم عصر صوفیائے کرام کو سخت اعتراض ہوا انھوں نے کستیر گل کو ایسا کرنے سے منع کرتے ہوئے کہا: "چونکہ آپ خود کسی کے مُرید نہیں ہیں اسی لیے آپ خود بھی کسی کو مُرید نہیں کر سکتے۔

کستیر گل نے ان صوفیائے کرام سے کہا۔ مَیں بھی کسی کا مُرید ہوں آپ کو یہ کس نے کہہ دیا کہ مَیں کسی کا مُرید نہیں ہوں۔ اس پر اعتراض کرنے والے صوفیا نے کہا: "اگر واقعی ایسا ہے تو پھر آپ اپنے مُرشد کا نام بتائیں۔" کستیر گل نے کہا۔ "مَیں اس بات کا پابند نہیں ہوں کہ کسی کو اپنے مُرید ہونے کا ثبوت فراہم کروں۔ اس پر ایک معترض صوفی نے کہا۔ "اگر آپ کسی کے مُرید ہوتے تو مُرشد کا نام بھی بتاتے مگر آپ تو کسی کے مُرید ہی نہیں۔"

کستیر گل نے ان معترضین کی باتوں کا بہت بُرا منایا اور فرمانے لگے: "مَیں نہیں چاہتا تھا کہ اپنی پیری مُریدی کا چرچا کروں۔ کیونکہ میرے نزدیک یہ کوئی اچھی بات نہیں لیکن اگر آپ مجبور کرتے ہیں تو مَیں یہ بھی آپ کو بتائے دیتا ہوں، تو سُنو! میرے والد بزرگوار ہی میرے مُرشد و رہنما تھے اور مَیں اُنہی کا مُرید ہوں۔ مَیں اس راز سے پردہ اُٹھانا نہیں چاہتا تھا لیکن آپ لوگوں کے مجبور کرنے پر مَیں نے ایسا کیا ہے۔

اسی دوران کستیر گل کی روحانی باتوں کے چرچے دوسرے علاقوں میں بھی ہونے لگے۔ اس زمانے میں حاجی بہادر کوہاٹ کی بھی اچھی خاصی شہرت تھی اُن کے مُرید بھی بیشمار تھے۔ لہذا جب اُن کی محفل میں بھی کستیر گل کا تذکرہ ہونے لگا تو حاجی بہادر کوہاٹ نے اپنے مُریدوں سے پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ کستیر گل کو اپنے صوفی ہونے کا دعویٰ ہے۔" اس پر مُریدوں نے کہا۔ "حضرت صاحب! اُن کے اعمال و اشغال سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ولیوں میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔"

حاجی بہادر کوہاٹ نے دریافت کیا۔ "مَیں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کو خلافت کس نے دی ہے۔"

مُریدوں نے کہا "وہ خود کہتے ہیں کہ وہ اپنے والد مرحوم کے جانشین اور خلیفہ ہیں۔" یہ سننا تھا کہ حاجی بہادر کوہاٹ کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ اپنے مُریدوں سے کہنے لگے۔ "یہ تو مبہم سی بات ہے مَیں بالکل واضح اور صاف بات سننا چاہتا ہوں۔" پھر وہ اپنے

مُریدوں سے کہنے لگے۔

" میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میں سے کچھ لوگ کستیر گل کے پاس جائیں اور اُن سے کہیں کہ وہ پیری مُریدی کا چکّر چلانے سے باز رہیں"۔ حاجی بہادر کوہاٹ نے مُریدوں کو کستیر گل کے نام وضاحت طلب امور کے لیے ایک خط بھی دیا۔ مُرید یہ خط لے کر کستیر گل کی خدمت میں حاضر ہوئے خط کا متن کچھ اس طرح سے تھا۔

" میرے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ تم نے فقر کے نام پر ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ باطنی کمالات حاصل کرنے کے لیے تمہارے پاس خٹک اور یوسف زئی قبیلے کے لوگ آتے ہیں تم انھیں تلقین اور ارشاد کی راہ دکھا کر اپنا مُرید بنانے کی کوشش کرتے ہو حالانکہ میری معلومات کے مطابق تمہارا کوئی پیر و مُرشد ہی نہیں ہے جب کہ یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ پیرِ طریقت کے اذن کے بغیر پیری کرنا جائز نہیں ہے اور جو ظاہری پیر و مُرشد نہیں رکھتا وہ اویسی کہلاتا ہے اور طالبانِ حق کو اُس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔"

چنانچہ حاجی بہادر کوہاٹ کے مُرید، کستیر گل کے پاس پہنچے تو انھوں نے ان مریدوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑی خاطر مدارت کی۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اُس وقت کستیر گل کے پاس خٹک اور یوسف زئی مریدوں کی اچھی خاصی تعداد بھی موجود تھی۔ کستیر گل نے مریدوں سے جب آمد کا سبب دریافت فرمایا تو مریدوں کے وفد کے قائد اخوند اللہ داد نامی مرید نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

" ہم حاجی بہادر کوہاٹ کے پاس سے آئے ہیں"۔ اس کے ساتھ ہی اخوند اللہ داد نے اپنے پیر و مُرشد کا خط کستیر گل کے حوالے کر دیا اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ہمارے پیر نے فوری طور پر اس کا جواب طلب کیا ہے۔"

کستیر گل یہ بات سُنتے ہی چیخ مار کر بیہوش ہو گئے۔ یہ عجیب و غریب صورتحال دیکھ کر نہ صرف حاجی بہادر کوہاٹ کے مُرید حیرت زدہ رہ گئے بلکہ خود آپ کے اپنے مُرید بھی سخت پریشان ہوئے۔ وہ سب آپ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔

پھر چند ہی لمحوں بعد کستیر گل نے ہوش میں آنے کے بعد اپنے ارادت مندوں کو حکم دیا کہ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں وہ لوگ جب چلے گئے تب

اخوند اللہ داد نے آپ سے جواب مانگا۔ کستیر گل نے چند لمحے خاموشی اختیار کی اور پھر بولے "افسوس کہ میں جواب دے چکا ہوں اب تمہیں اور کس قسم کا جواب چاہیئے"۔ اب تو اخوند اللہ داد بہت حیران ہوا اور کہنے لگا۔ "آپ نے تو مجھے کسی قسم کے جواب سے نہیں نوازا؟"

اس پر کستیر گل نے فرمایا۔ "اخوند اللہ! تم بہت بھولے ہو کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میں نے اپنے سارے ارادت مندوں کو رخصت کر دیا ہے اب تمہیں اور کس قسم کا جواب درکار ہے"۔ چنانچہ اس کے بعد اخوند اللہ داد وہاں سے رخصت ہو کر واپس اپنے پیر و مرشد حاجی بہادر کوہاٹ کے پاس چلے گئے اور کستیر گل کے ہاں جو واقعہ پیش آیا تھا وہ من و عن اُن کے روبرو بیان کر دیا۔ اخوند اللہ داد کی بات سُن کر حاجی بہادر کوہاٹ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور انھوں نے آہستگی سے کہا۔

"کستیر گل تو بہت بھلا اور نیک آدمی ہے یہ تو رحمکار اور اللہ کا نیک بندہ ہے اب تم اس سے جا کر کہو کہ اب وہ کستیر گل نہیں بلکہ 'رحمکار' ہے"۔

اخوند اللہ داد نے پوچھا۔ "اعلیٰ حضرت کیا ہم ابھی آپ کا پیغام لے کر اُن کے پاس جائیں؟"

حاجی بہادر کوہاٹ نے کہا۔ "اتنی جلد بازی کی ضرورت نہیں فی الحال کچھ انتظار کیا جائے"۔ ادھر دوسری جانب کستیر گل اس خیال سے سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کہ اب وہ تنہا رہ گئے ہیں۔ اسی عالم میں وہ سجدے میں چلے گئے اور گڑگڑا کر عرض کرنے لگے۔ "اے باری تعالیٰ! میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں لوگوں کا کہنا ہے کہ میں اولیی ہوں۔ اس لیے دوسروں کو رشد و ہدایت کا درس نہیں دے سکتا"۔ آخر روتے روتے آپ کو قرار آگیا۔

اسی طرح مزید بیس پچیس روز بیت گئے اور پھر ایک روز حاجی بہادر کوہاٹ نے اپنے مُرید اخوند اللہ داد سے کہا۔ "تم ابھی کستیر گل کے پاس جا کر اُسے کہو کہ وہ کستیر گل سے رحمکار ہو گیا ہے اب دنیا اس کو اسی نام سے جانے گی"۔

کستیر گل کو جب حاجی بہادر کوہاٹ کا پیغام ملا تو انھوں نے ایک نعرہ بلند کیا اور اعلان کر دیا کہ "لوگو! اب میرے پاس آؤ ممانعت ختم ہو گئی ہے کیونکہ کوہاٹ کے صاحب نے مجھے اس کی اجازت مراحمت فرما دی ہے"۔

مذکورہ بالا بزرگ جن کا تعارف ابتدا میں کستیر گل کے نام سے کرایا گیا ہے یہ اپنے

وقت کے وہ عظیم صوفی بزرگ اور ولی اللہ تھے جو بعد میں بابا رحمکار صاحب کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ سرحد کے ایک صاحبِ کمال ولی تھے جو آج بھی ہر خاص و عام کے مرجع ہیں۔ آپ کے خاندان کا تعلق علاقہ خوست سے تھا جو دسویں صدی ہجری میں یہاں آکر آباد ہوا۔ بابا رحمکار صاحب ولی ابنِ ولی تھے یہ وہ ولی اللہ تھے جن کی عظمت و بزرگی کا اعتراف حضرت مجدد الف ثانی بھی کر چکے ہیں۔ آپ کے عقیدت مندوں میں اکبر اعظم اور خوشحال خاں خٹک جیسی ہستیاں شامل ہیں۔ آپ نے سرحد کے علاقہ کو علم کی روشنی سے منور کر دیا۔ آپ کے دادا اور والد بھی اپنے وقت کے بہت بڑے ولی اللہ تھے۔ اس طرح ولایت آپ کو ورثے میں عطا ہوئی۔ بابا رحمکار صاحب کے والد محترم کا نام بہادر بابا تھا جنہوں نے آپ کا نام کیتر گل اس لیے رکھا تھا تاکہ آپ اپنے آباؤ اجداد کی صوفیانہ روایات کو آگے لے کر چلیں۔

بہرکیف حاجی بہادر کوہاٹ کی جانب سے ممانعت ختم ہونے کے بعد بابا رحمکار صاحب دوبارہ اپنے مریدوں کو تعلیماتِ اسلامی سے بہرہ ور کرنے لگے۔ آپ کو اپنے ارادت مندوں میں ایک ایسا شخص بھی نظر آیا جو اپنی وضع قطع اور باتوں سے دوسروں سے بہت مختلف نظر آرہا تھا۔ بابا رحمکار نے ان صاحب کو دور سے دیکھا اور اپنے ایک خادم سے پوچھا۔ "یہ کون شخص ہے اور یہاں کیا کرنے آیا ہے؟"

مُرید نے جواب دیا۔ "حضرت! مَیں تو اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن مَیں نے دوسرے لوگوں سے سُنا ہے کہ یہ بہت اہلِ علم آدمی ہیں"۔ آپ نے مُرید سے کہہ کر اُس شخص کو اپنے پاس بلوایا اور کہا۔

"تم مجھے ان سب سے مختلف اور جدا نظر آئے ہو اسی لیے مَیں نے تمہیں اپنے پاس بلوایا ہے۔ مَیں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو اور یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہو؟"

اُس شخص نے جواب دیا۔ "میرا نام" اخون دین "ہے میرے بے شمار شاگرد ہیں جنہیں مَیں احادیث کا درس دیتا ہوں"۔ پھر وہ کہنے لگا۔ "مَیں یہاں پر صرف آپ کی شہرت سُن کر آیا ہوں۔ چونکہ میری طبیعت تصوف کی جانب مائل ہے اسی لیے آپ کی نگاہ کرم کی طلب مجھے آپ کے پاس لے آئی ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ آپ ہمیشہ کے لیے مجھے اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دیں۔"

بابا رحمکار نے کہا۔ "آپ محدّث ہیں آپ اگر میرے ہاں رہیں گے تو یہ امر میرے لیے

باعث مسرّت ہوگا۔"

چنانچہ اخون دین آپ کے پاس رہنے لگے ان کی زندگی کا بیشتر حصّہ درس وتدریس کے شعبے میں ہی گزرا تھا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کو پڑھایا تھا اور اُن پر اپنا حکم چلایا تھا اُن سے اپنی ہر بات منوائی تھی۔ مگر جب وہ یہاں آئے تو انھیں اُلٹا تجربہ ہوا یہاں پر تو انھیں بابا رحمکار کا حکم ماننا پڑ رہا تھا۔ اُن کی ہر بات کے سامنے سر جُھکانا پڑتا تھا۔ لہٰذا اُن سب باتوں نے اخون دین کو اذیت میں مبتلا کر دیا۔ اخون دین کے یہاں آنے کا بنیادی مقصد تو یہ تھا کہ اسی بہانے انھیں کتابوں میں جگہ مل جائے گی اور جب بابا رحمکار کے حالات زندگی قلمبند ہوں گے تو بابا کے ساتھ اُن کا نام بھی آجائے گا۔ لیکن یہاں تو نتیجہ اُن کی توقعات کے برعکس نکلا۔ کئی مرتبہ اُن کے دل میں خیال آیا کہ وہ بابا رحمکار سے گھر واپس جانے کی اجازت طلب کریں لیکن ہمّت نہیں پڑتی تھی۔ کیونکہ ان کو یہ معلوم تھا کہ اس اجازت طلبی پر بابا رحمکار اُن سے کیا کہیں گے ظاہر ہے وہ یہی کہیں گے۔ مَیں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ یہاں رُکیں گے نہیں۔ بس اس کشمکش نے اخون دین کو خاصا پریشان کر رکھا تھا۔

آخر ایک روز اخون دین نے تہیہ کر لیا کہ وہ بابا رحمکار کے سامنے اپنا مدّعا ضرور بیان کریں گے۔ لہٰذا ایک صبح نمازِ فجر کے بعد وہ بابا رحمکار صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس وقت بابا رحمکار زیرِ لب کچھ پڑھ رہے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد آپ نے اپنے اوپر دم کیا اور پھر اخون دین سے پوچھا۔

"اخون کیا آپ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں؟"

اخون دین کا حوصلہ ایک بار پھر جواب دے گیا۔ کہنے لگے "کوئی خاص بات نہیں مَیں تو یوں ہی آپ کی زیارت کے لیے چلا آیا تھا۔"

بابا رحمکار کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور فرمانے لگے "اخون دین! آپ دل میں جو مقصد لے کر یہاں آئے ہیں وہ بیان بھی کر دیں کیونکہ آپ کی آمد کا مقصد آپ کے چہرے سے عیاں ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ آپ مجھے کچھ کہنا چاہ رہے ہیں مگر کہہ نہیں پا رہے۔"

اب تو اخون دین کچھ اور بھی گھبرا گئے اور کہنے لگے "کوئی خاص بات نہیں مَیں تو ویسے ہی آپ کے دیدار کی خاطر چلا آیا تھا۔" اتنا کہنے کے بعد اخون دین وہاں سے چلے گئے۔ اُن

کے چلے جانے کے بعد بابا رحمکار نے اپنے مُرید سے کہا: "یہ مجھ سے کچھ باتیں کرنے آئے تھے لیکن کسی وجہ سے نہیں کر سکے۔" پھر دوسرے روز آپ نے اپنے ایک مُرید کو بلوایا اور فرمایا "اخون دین سے کہو کہ وہ مجھے ذرا آکر مل لیں میں اُن سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

مُرید نے کہا۔ "اعلیٰ حضرت! اخون دین اپنی جگہ پر موجود نہیں ہیں جیسے ہی وہ تشریف لائیں گے انھیں آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔" مگر کافی دیر بعد مُرید نے آکر یہ اطلاع دی کہ اخون دین اپنا سامان لے کر یہاں سے چلے گئے ہیں۔

بابا رحمکار نے فرمایا۔ "وہ مجھے بتائے بغیر واپس کس طرح چلے گئے انھیں میرے پاس آنا ہی پڑے گا۔"

کہنے کو تو اخون دین چلے گئے تھے مگر راستے میں انھیں بہت سی مشکلات پیش آئیں۔ وہ جس قافلے میں شامل ہو کر جا رہے تھے اُسے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا جو کچھ اخون دین کے پاس تھا وہ بھی سب چھن گیا۔ لُٹے پٹے قافلے میں اب اپنا سفر جاری رکھنے کی ہمت نہ تھی۔ قافلے میں شامل اخون دین کو بھی بابا رحمکار کی خانقاہ کے سوا کوئی ٹھکانہ نظر نہیں آرہا تھا۔ دوسرا زادِ راہ بھی نہ تھا اس لیے مجبوراً انھیں بابا رحمکار کے پاس واپس آنا پڑا۔

بابا رحمکار چاہتے تو واپسی پر اخون دین کو شرمندہ کرتے مگر انھوں نے کسی طور پر انھیں شرمندگی کا احساس نہ ہونے دیا۔ آپ نے مُریدوں سے صرف اتنا کہا کہ شاید اخون دین بھوکے ہیں اس لیے انھیں لے جا کر کھانا کھلاؤ اور آرام کرنے دو۔ مُریدین نے بابا رحمکار کے حکم کی فوراً تعمیل کی اور اخون دین کو کھانا کھلا کر آرام کرنے کا موقع دیا مگر اخون دین کی تو نیند اُڑ چکی تھی وہ دل ہی دل میں بہت شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔

اس واقعہ کو جب کئی روز گزر گئے تب ایک روز آپ نے اخون دین سے پوچھا۔ "آپ کس مقصد کی خاطر میرے ہاں تشریف لائے تھے اور پھر بغیر مقصد حاصل کیے یہاں سے کیوں چلے گئے۔" اخون دین نے شرمندگی کے عالم میں کہا۔

"حضرت میں نے اپنے آپ کو ٹٹولنے کی کوشش تو بہت کی کہ میں یہاں کس مقصد کے لیے آیا تھا؟ میرا یہ بھی ارادہ تھا کہ میں آپ سے معرفت و سلوک حاصل کروں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر میری یہ بات درست ہوتی تو میں اپنا مقصد حاصل کیے بغیر یہاں سے نہ چلا جاتا۔ دراصل اب پھر وہی سوال مجھے پریشان کیے ہوئے ہے کہ میں آپ کے پاس کس لیے آیا تھا؟"

بابا رحمکار کچھ دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا۔" اخون دین آپ کے سوال کا جواب میرے پاس موجود ہے لیکن پہلے آپ مجھے اپنی خواہش بتائیں۔"

اخون دین کہنے لگے۔" میں یہ چاہتا ہوں بلکہ میری یہ خواہش ہے کہ آپ مجھ سے مشکوٰۃ کے چند اسباق پڑھ لیں۔"

بابا رحمکار نے کچھ سوچتے ہوئے فرمایا۔" اگرچہ میں اس کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں سمجھتا لیکن اس کے باوجود میں آپ کی خواہش پوری کروں گا۔" اب تو اخون دین خوشی سے بے قابو ہوتے جارہے تھے۔ اس واقعہ کے کچھ ہی دیر بعد ایک مرید نے تنہائی میں آپ سے دریافت کیا۔" حضرت اس ناچیز نے آپ دونوں کی باتیں سن لی ہیں۔" اخون دین نے جب یہ کہا کہ میں اپنے اس سوال سے پریشان ہوں کہ میں یہاں کیوں آیا تھا تو آپ نے جواب دیا تھا کہ اس سوال کا جواب میرے پاس ہے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

بابا رحمکار صاحب نے فرمایا۔" اگر میں اخون دین کی خواہش پر مشکوٰۃ کے چند اسباق پڑھ لوں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ چنانچہ آپ نے وعدہ کے مطابق اخون دین سے مشکوٰۃ کے چند اسباق پڑھ لیے اور اس طرح اخون دین کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہوگئی۔ صوفیا کی تاریخ میں جہاں بھی بابا رحمکار کا تذکرہ آتا ہے اُس کے ساتھ اخون دین کا ذکر بھی ضرور آتا ہے۔

چونکہ آپ لوگوں کے مسائل کے سلسلے میں بڑی شفقت اور محبّت سے اُن کی رہنمائی کیا کرتے تھے۔ اس لیے عقیدت مندوں اور عام لوگوں نے آپ کو احتراماً کاکا صاحب کہنا شروع کردیا۔ آپ نے اپنے آبائی مکان کو خیرباد کہا اور میلہ نامی مقام پر ہی سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا اور یہاں پر آپ لوگوں کو اپنی تعلیمات سے بہرہ ور کرنے لگے۔

آپ کے پاس جو مرید وغیرہ آتے تھے قرب وجوار کے لوگ اُن کے لیے اپنے گھروں سے کھانا پکا کر بھجوایا کرتے تھے۔ مگر آپ کو یہ بات نامناسب لگی چنانچہ آپ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو میری جانب سے مطلع کردو کہ وہ زائرین کو کھانا پکا کر نہ دیا کریں چنانچہ آپ کا یہ حکم قریبی دیہات میں پہنچا دیا گیا کہ اگر ایسا کیا گیا تو رحمکار کاکا ناراض ہوجائیں گے بابا رحمکار کے اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ اُن کے پاس جو کثیر تعداد میں زائرین آتے ہیں اُن کی تعداد میں کمی ہوجائے چنانچہ جب آس پاس کے لوگوں نے

آپ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے زائرین کے لیے کھانا پکانا چھوڑ دیا تب آپ کے مریدوں کو یقین ہو گیا کہ زائرین کی تعداد میں خاصی کمی آجائے گی لیکن اس کا نتیجہ توقع کے برعکس نکلا اور زائرین کی تعداد میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا۔

اس پر بابا رحمکار نے جب مُریدوں سے دریافت فرمایا تو مُریدوں نے عرض کیا: حضرت! لوگ فاقے کر رہے ہیں بھوکے رہ رہے ہیں مگر وہ یہاں آنے سے باز نہیں آرہے۔ یہ سن کر بابا رحمکار کو زائرین کی حالت پر رحم آگیا۔ آپ کافی دیر تک افسردہ بیٹھے رہے آخر آپ نے اپنے مریدوں سے کہا۔ باہر جا کر اعلان کر دو کہ مَیں نے کھانے پینے کے بارے میں اپنی جانب سے عائد کردہ ساری پابندیاں واپس لے لی ہیں۔ یہ سنتے ہی آس پاس کے علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو بے پناہ مسرّت ہوئی یوں لوگوں کے ہجوم کے ہجوم آپ کے پاس آنے لگے۔

بابا رحمکار اپنے وعظ میں تعلیم پر بہت زور دیا کرتے تھے اس مقصد کے لیے آپ نے اپنے علاقے میں سات ایسے مدرسے قائم کئے جہاں پر قرآنی تعلیمات دی جاتی تھیں۔

بابا رحمکار صاحب کی شہرت جب آگرے تک پہنچی تو مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے دل میں آپ سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ پشاور آپ سے ملنے کے لیے چلا آیا۔ آپ نے اُس سے ملاقات کی اجازت تو دے دی مگر اُس سے مل کر کسی خوشی کا اظہار نہ فرمایا۔ اس موقع پر جب اکبر اعظم نے آپ سے پوچھا کہ اُن کی گزر بسر کیسے ہو رہی ہے تو آپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں بڑی پُرمسرّت زندگی بسر کر رہا ہوں۔ مجھے کسی آسائش یا دنیاوی شے کی ضرورت نہیں۔"

مگر اکبر کا اصرار تھا کہ وہ انھیں کچھ دینا چاہتا ہے اس سے وہ دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ اس پر بابا رحمکار نے فرمایا۔ "مشکل تو یہی ہے کہ مَیں آپ سے کچھ بھی نہیں لینا چاہتا" مگر بادشاہ سے بار بار انکار کرنا بھی کوئی اچھی بات نہیں تھی چنانچہ اُس کی خواہش پر آپ نے اُس کی جانب سے دی جانے والی خٹک اور اتمان جوق کی جاگیر کو قبول کر لیا تاہم بابا رحمکار نے بعد میں یہ ساری جاگیر پشتو کے مشہور شاعر خوشحال خان خٹک کے باپ شہباز خاں خٹک کو سونپ دی۔

آپ کے ایک صاحبزادے تھے جن کا نام شیخ عبدالحلیم تھا۔ بابا رحمکار نے اپنے صاحبزادے کو وعظ اور درس کی بہترین تعلیم دی۔ ایک روز نہ جانے آپ کے دل میں کیا آئی کہ آپ

نے اپنے بیٹے سے کہا: "میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اس ہجوم کے سامنے وعظ کرو۔" گو! یہ کام بہت مشکل تھا تاہم باپ کے حکم کی تعمیل میں شیخ عبدالحلیم نے بڑی خود اعتمادی سے وعظ شروع کر دیا مگر سننے والوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا لیکن جب بابا رحمکار وعظ کرنے لگے تو لوگ بے اختیار رونے لگے۔ اس پر عبدالحلیم نے آپ سے کہا: "بابا جان! آخر یہ کیا بات ہے کہ جب آپ وعظ کرتے ہیں تو لوگوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں مگر جب میں وعظ کرتا ہوں تو اس کا اُن پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔"

بیٹے کی بات سن کر بابا رحمکار نے مسکراتے ہوئے کہا: "اے جانِ پدر! تم جو کچھ کہتے ہو وہ اپنی زبان سے کہتے ہو اس میں تمہارا دل شامل نہیں ہوتا۔ مگر یہ فقیر جو کچھ کہتا ہے اس میں اُس کے دل اور زبان دونوں شامل ہوتے ہیں اور یاد رکھو کہ کسی کی بات کا اُس وقت اثر ہوتا ہے جب وہ دل سے بات کہہ رہا ہو۔"

بابا رحمکار کے عہد کے ایک اور صوفی بزرگ آدم بنوریؒ جب اپنے مُرشد حضرت مجدد الف ثانی سے ملاقات کے بعد اپنے وطن واپس جا رہے تھے تو راستے میں اکوڑہ کے مقام پر اُن کا بابا رحمکار نے استقبال کیا اور پُرزور اصرار کر کے انھیں اپنی خانقاہ پر لے گئے۔ پھر جب نماز کا وقت آیا تو حضرت آدم بنوریؒ نے آپ سے کہا: "حضرت آپ آگے تشریف لائیں اور ہمیں نماز پڑھائیں شاید آپ کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہم پر بھی رحم فرمائے مگر بابا رحمکار صاحب نے فرمایا: "میں تمہاری امامت نہیں کر سکتا۔"

مگر حضرت آدم بنوری نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا اور انتہائی عقیدت کے ساتھ منبر پر لے جاتے ہوئے کہا: "حضرت آپ ہمارے لیے امامت فرمائیے یہ ہماری خواہش ہے۔"

چنانچہ آدم بنوریؒ کے بے حد اصرار پر آپ نے امامت کروائی اور حضرت آدم بنوری نے ان کی اقتدا کی۔ آدم بنوری تین دن تک بابا رحمکار کی خانقاہ میں رہے اور اسی طرح آپ کی امامت میں نمازیں ادا کرتے رہے۔ اس کے بعد آدم بنوریؒ نے کہا: "حضرت میں اب حج بیت اللہ پر جانا چاہتا ہوں مگر میری یہ خواہش ہے کہ آپ اپنے صاحبزادگان میں سے کسی ایک کو میرے ساتھ روانہ کر دیں۔"

بابا رحمکار نے اپنے صاحبزادے محمد گل کو آپ کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد آدم بنوری حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں انھوں نے اپنے مریدوں سے کہا: میں نے چند نمازیں اپنے شیخ احمد سرہندی کے پیچھے پڑھی تھیں اور پندرہ نمازیں آپ کے پیچھے ادا کیں

اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ کوئی نماز اس طرح نہ تو میں خود ادا کر سکا اور نہ کوئی دوسرا ہے جو اس قسم کی طاقت رکھتا ہو۔"

ایک مرتبہ آپ قبیلہ یوسف زئی اور خٹک کی سرحد پر تشریف لے گئے وہاں جو وعظ دیا تو لوگ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ یہاں بھی آپ نے اپنا کام جاری رکھا اور اپنے وعظ حسنہ سے لوگوں میں شعور اور بیداری پیدا فرماتے رہے۔

ایک رات آپ کے بعض مریدوں نے یہ محسوس کیا جیسے آپ کسی سے باتیں کر رہے ہیں مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہاں کوئی بھی دوسرا موجود نہ تھا۔ اس پر آپ کے ایک مرید نے پوچھا: "حضرت آپ کس سے گفتگو فرما رہے تھے۔"

بابا رحمکار نے فرمایا۔ "میں یہاں کی زمین سے مخاطب تھا وہ مجھے کہہ رہی تھی کہ آپ کی آخری آرام گاہ یہاں ہونی چاہیئے وہ اس بات کو اپنے لیے باعثِ عزت سمجھ رہی تھی۔"

مریدوں نے دریافت کیا۔ "حضرت! کیا اس سلسلے میں آپ کوئی وصیت کرنا پسند فرمائیں گے؟"

"بابا رحمکار نے فرمایا۔" میری یہی وصیت کافی ہے کہ جو لوگ اس وقت یہاں موجود ہیں اور میری گفتگو سن رہے ہیں وہ میری آخری رسوم کی ادائیگی کے وقت اس پر عمل کرائیں۔"

آپ اس علاقے میں کچھ دن گزار کر واپس آ گئے۔ اسی دوران بابا رحمکار صاحب کی طبیعت ناساز رہنے لگی۔ آپ کے بھائی جو آپ کی تیمارداری کیا کرتے تھے وہ آپ کی حالت سے گھبرا کر کافی افسردہ رہنے لگے جس پر آپ نے اُسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ "جب موت برحق ہے تو پھر اس سے کس لیے گھبراؤں، موت تو وہ شے ہے جو محبّ کو اپنے محبوب سے ملا دیتی ہے۔" اسی طرح آپ روز بروز کمزور ہوتے چلے گئے۔ آپ کی صحت مسلسل خراب ہوتی جا رہی تھی حتیٰ کہ جب نماز کا وقت ہوتا تو آپ کو اپنے بھائی عفان کے بازوؤں کا سہارا لے کر مسجد جانا پڑتا۔ جب بابا رحمکار کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ بہت جلد اپنے خالق حقیقی سے ملنے والے ہیں تو انھوں نے اپنے ستر مریدوں کو اپنے پاس بلوایا۔ جن میں آپ کے بھائی عفان بھی شامل تھے اس دن آپ نے بستر پر لیٹے لیٹے مریدوں کو جو درس دیا اُس کا موضوع فنا فی اللہ اور بقا باللہ تھا۔ آپ نے وعظ کرتے ہوئے فرمایا۔

"ابرِ رحمت سے برقِ رحمت چمکی اور مکاشفے سے جمالِ ذات ظاہر ہوئی اور فنا فی اللہ سے بقا باللہ کے کمال تک پہنچایا، کون و مکاں سے گزر کر

وہاں پہنچا جہاں نہ دن تھا نہ رات تھی نہ آسمان تھا نہ زمین، نہ دایاں تھا نہ بایاں، نہ تخت تھا نہ فوق نہ آگے تھا نہ پیچھے کہ اللہ کے ہاں نہ رات ہے نہ دن۔ اُس نے مجھ کو سمجھایا میری سمجھ کے مطابق اور وہی سمجھ سکتا ہے جس کو سمجھایا جائے، کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔"

بابا رحمکار کی سحر بیانی سے تمام حاضرین ہوش و حواس سے عاری اور محروم ہو گئے اس کے ساتھ ہی آپ کی طبیعت زیادہ ناساز ہو گئی۔ اس موقع پر خوشحال خاں خٹک کو بلوایا گیا۔ آپ نے نحیف آواز میں دریافت کیا۔ "خوشحال خاں تُو میرے پاس کس لیے آیا ہے؟" خوشحال خاں خٹک نے جواب دیا۔ "حضرت مَیں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے خوشحال خاں کو دُعا دیتے ہوئے کہا۔

" اللہ نے چاہا تو تُو بھی شہرت کے آسمان پر سورج کی طرح چمکے گا۔" چنانچہ ایک روز جب سورج غروب ہوا تو آپ کی طبیعت مزید خراب ہو گئی۔ اس حالت میں آپ کسی مدد کے بغیر اُٹھے وضو کیا اور پھر نماز کھڑے ہو کر ادا فرمائی۔ نماز کے فوراً بعد آپ اپنے مریدوں، خوشحال خاں خٹک اور بھائی عفان کی موجودگی میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ کتابوں میں درج ہے کہ آپ ۱۰۶۲ ہجری واصل الحق ہوئے۔ وصال کے وقت آپ کی عمر تقریباً اسّی سال تھی۔ آپ کو یوسف زئی اور خٹک کی سرحد پر دفن کیا گیا۔

ہارون الرّشید کی بہن عباسہ کی جس شخص سے شادی ہوئی تھی اس کا کچھ عرصے بعد انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد عباسہ ایک دوسرے شخص سے وابستہ کر دی گئی۔ کچھ عرصے بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ پھر عباسہ ایک اور شخص سے منسوب ہو گئی اور یہ تیسرا شخص بھی کچھ عرصے بعد مر گیا۔ ابھی چوتھے شخص سے شہزادی منسوب نہیں ہوئی تھی کہ ہارون رشید نے ایک باغی کے خلاف سزائے موت کا حکم صادر کیا۔ دربار میں موجود ایک شاعر کی رگِ ظرافت پھڑکی اور اس نے جان کا خطرہ مول لیکر چند شعر عباسی خلیفہ کو سُنا دیئے۔ شاعر نے اپنے اشعار میں کہا۔ "امیرالمومنین! خطاکار باغی کو تلوار سے مارنے کا حکم خواہ مخواہ دے رہے ہیں۔ قتل کا آسان طریقہ یہ ہے کہ امیرالمومنین مجرم سے عباسہ کو وابستہ فرما دیں۔ مجرم خود بخود ٹھکانے لگ جائے گا۔" ہارون رشید اس تلخ اور دل آزار مزاح کو برداشت کر گیا اور مسکرا کر چُپ ہو رہا۔

مولانا رشید احمد گنگوہی رح

ایک شخص نے گاؤں کے کنویں میں ڈول ڈال کر پانی نکالا تو وہ انتہائی کڑوا اور تلخ تھا۔ وہ شخص ایک نیک بزرگ ولی اللہ کے پاس چلا گیا اور کنویں کا پانی کڑوا ہونے کی شکایت کی۔

بزرگ نے کہا "کنویں کا پانی میٹھا ہے کڑوا ہرگز نہیں ہے"۔

اُس شخص نے کنویں کا پانی ایک برتن میں ڈال کر بزرگ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بزرگ نے پانی چکھا تو واقعی وہ کڑوا تھا۔ اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا۔ بزرگ نے نماز پڑھنے کے بعد سلام پھیرا اور پھر نمازیوں سے فرمایا کہ کوئی جس قدر زیادہ کلمہ طیب پڑھ سکتا ہے پڑھے۔ اس کے ساتھ وہ خود بھی کلمہ پڑھنے لگے۔ پھر تھوڑی دیر بعد اُنہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگ کر ہاتھ منہ پر پھیر لیے۔ اس کے بعد جب اُنہوں نے برتن سے پانی لے کر پیا تو وہ بے حد شیریں تھا۔ مسجد میں موجود تمام نمازیوں نے بھی شیریں پانی چکھا اور حیرت زدہ رہ گئے تب اس بزرگ نے فرمایا جس برتن کو کنویں میں ڈال کر پانی نکالا گیا تھا وہ اس قبر کی مٹی سے بنایا گیا تھا جس پر عذاب نازل ہو رہا تھا الحمدللہ کہ کلمہ کی برکت سے یہ عذاب رفع ہو گیا۔

یہ نیک بزرگ اور ولی اللہ جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے وہ فخر المحدثین قطب العالم

حضرت مولانا الحاج حافظ رشید احمد گنگوہی تھے جن کی احادیث اور تعلیمات سے بندگانِ خدا آج بھی رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ تیرھویں صدی کے اس گوہر شہوار اور درِ فرید کو کئی مسلمانوں کے دینی باپ اور کئی سو علما کے سردار اور پیشوا کا مقام بھی حاصل ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہ مولانا رشید احمد گنگوہی نے چھ ذیقعد ۱۲۴۴ ہجری نبوی کو اس گہوارہ عالم فانی میں قدم رکھا۔ آپ کی ولادت قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور محلہ سرائے میں خانقاہ شیخ المشائخ مولانا عبدالقدوس گنگوہی کے جدّی مکان میں ہوئی۔ حضرت رشید احمد گنگوہیؒ ماں اور باپ دونوں سلسلوں سے شریف النفس یعنی نجیب الطرفین شیخ زادہ انصاری اور ایوبی نسل تھے۔ چنانچہ ماں باپ کی جانب سے خاندانی سلسلہ جس کو حضرت نے خود سے بیان فرمایا تھا اس طرح سے ہے۔

مولینا رشید بن مولانا ہدایت احمد صاحب بن قاضی پیر بخش بن قاضی غلام حسین بن قاضی غلام علی بن قاضی علی اکبر بن قاضی محمد اسلم الانصاری الایوبیؒ

آپ کے بچپن کے واقعات کا معلوم ہونا کوئی آسان امر نہیں ویسے بھی کوئی شخص دینی یا دنیاوی حیثیت سے خواہ کیسا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ اس کے زمانہ طفولیت کے بارے میں کسی کو کوئی مصدقہ خبر نہیں ہو سکتی۔ حضرت رشید احمد گنگوہی کے بچپن کے بارے میں کتابوں میں جو معلومات درج ہیں اُس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے علما زمانہ کے مقتدا بننے والے اس امام کو ابتدا سے ہی عادات حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کے ساتھ سنوارا تھا۔ آپ بچپن ہی سے بہت خداترس، رحمدل، عابد، خوش خلق، مہذب و باادب اور انتہائی درجہ سلیم الطبع ثابت ہوئے تھے عام بچوں کی طرح آپ کو ضد اصرار اور شرارت و چیخ چوڑ اپن سے شدید نفرت تھی۔ حضرت ابھی آٹھ برس کے تھے کہ والد محترم کا سایہ سر سے اُٹھ گیا مگر آپ نے کمسن ہونے کے باوجود یہ صدمہ بڑے حوصلے اور صبر سے برداشت کیا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم میاں جی قطب بخش صاحب گنگوہی (مرحوم) سے حاصل کی اور چند ہی روز میں استاد کی زبان سے ذہانت و ذکاوت اور قوتِ حافظہ و یاداشت کے متعلق تعریفی الفاظ سن لیے۔ میاں جی صاحب اپنے شاگردوں سے انتہائی پدرانہ مشفقانہ سلوک روا رکھتے تھے اُن کی ایک پیاری اور دلچسپ عادت یہ تھی کہ وہ شاگردوں کے مُنہ سونگھ کر دریافت فرمایا کرتے تھے کہ وہ کیا کھا کر آئے ہیں اور جب شاگرد بتاتا کہ فلاں چیز کھا کر آیا ہوں تو میاں جی انتہائی سادگی سے فرماتے "واہ میاں خود کھا کر چلے آئے مگر ہمارے لیے



اپنے دانتوں پر
مسوڑھوں کی گرفت
ڈھیلی نہ پڑنے دیجئے

صرف

کولینوس

میں ہی مسوڑھوں کو مضبوط بنانے والا ایسٹرنجنٹ شامل ہے۔
دانتوں کے ماہر ڈاکٹروں نے کولینوس ٹوتھ پیسٹ میں
ایسٹرنجنٹ شامل کیا ہے جو مسوڑھوں کو شیرازہ کر دانتوں پر ان کی گرفت مضبوط کرتا ہے
اس طرح دانتوں کو صحت مند بنیاد ملتی ہے اور ان کی زندگی میں اضافہ ہوتا ہے
دانتوں کی بقا صحت مند مسوڑھوں سے وابستہ ہے۔



کولینوس ۔ مسوڑھوں کی حفاظت ۔ مضبوط دانتوں کی ضمانت

لے کر نہ آئے۔"

چنانچہ اُستاد کی اس مخصوص عادت کے بعد محسن رشید احمد نے اپنا یہ معمول بنا لیا تھا کہ جو بھی چیز گھر میں پکتی وہ خود نہ کھاتے بلکہ جیب میں ڈال کر مکتب لے آتے اور اُستادِ محترم کی نذر کر دیتے۔ اس معمولی قصّہ سے خدانخواستہ میاں جی (مرحوم) کی بُرائی کرنا مقصود نہیں بلکہ اس معمولی واقعہ سے شاگرد کے دل میں استاد کی جو وقعت و عزّت ایثار و قلب اور خدمت و رضا جوئی ہونی چاہیئے۔ یہاں پر محض اُسے بیان کرنے کے لیے یہ واقعہ رقم کیا گیا ہے۔

آپ کی عمر کا غالباً چوتھا یا پانچواں سال تھا کہ ایک روز آپ کی والدہ ماجدہ نے آپکو اور آپ کے بڑے بھائی احمد صاحب کو پینے کے لیے کچھ دودھ بانٹ دیا جس پر حضرت نے بتقاضائے عمر کچھ حجت فرمائی اور زیادتی کے متعلق اصرار کیا۔ آپ کے بڑے بھائی مولوی عنایت احمد صاحب نے چھوٹے بھائی کی اس محبت و اصرار کو بزرگانہ شفقت کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنا حصّہ پینے کے بعد حضرت کا حصّہ بھی نوش فرما گئے۔ یہ چھوٹا سا قصّہ تو یہیں ختم ہو گیا مگر حضرت مولانا نے ایسی چھوٹی عمر میں یہ سبق پا لیا کہ محبت و اصرار یا ضد کرنے کا ثمرہ اپنا نقصان اور حق کا ضیاع کر دینا ہے چنانچہ اس کے بعد تمام عمر آپ نے کبھی ضد نہ کی جو چیز جتنی بھی مل گئی اُسے بخوشی اور راضی ہو کر قبول کر لیا بلکہ وہ خود فرمایا کرتے تھے۔

"مجھے دودھ کے قصّے سے یہ تجربہ حاصل ہو چکا ہے کہ ضد کرنے کا نتیجہ اپنے اصل حصّے سے بھی محروم ہونا ہے۔"

آپ جب ساڑھے چار برس کے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس میں استقلال و توکل کی کرامت معنویہ کے ساتھ بچپن کے زمانہ کی کرامت حسیّہ اور مقبولیت بارگاہ احدیت کا پتہ چلتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابتدا سے ہی نماز کے اس قدر پابند تھے کہ کیسے ہی کھیل یا بچپن کے کسی تفریحی مشغلہ میں مشغول کیوں نہ ہوں مگر جیسے ہی کانوں میں اذان کی آواز آتی تو فوراً باجماعت نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد پہنچ جاتے۔ ایک روز آپ قصبہ سے باہر ٹہلتے ٹہلتے جنگل کی جانب تشریف لے گئے۔ شام کا سہانا وقت تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے دل کی کلیاں کھلا رہے تھے یہاں تک کہ عالم کو منوّر کرنے والے آفتاب نے افق مغرب کے قریب پہنچ کر بندگانِ خدا کے دروازہ دل پر دستک دی کہ چلو مسجد کی جانب لپکو کیونکہ مغرب کا وقت قریب ہے حضرت مولانا اگرچہ محسن تھے مگر اپنے مولیٰ کی یاد میں

گویا شیخ عبادت گزار تھے۔ اس لیے فوراً گھر کی جانب پلٹے۔ آپ کے ہاتھوں میں عباسی کے کے پھولوں کی دو چھڑیاں تھیں اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے گھر کی جانب روانہ ہوئے گھر پہنچ کر اپنی والدہ سے کہا۔

"اماں جان! ذرا ان چھڑیوں کو اپنے پاس رکھیں میں مسجد میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔"

اتنا کہنے کے بعد آپ بچھتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے مگر باوجود عجلت کے یہاں پر جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ پھر وضو کے لیے پانی لینے جب کنویں پر آئے تو لوٹے خالی پائے۔ اسی طرح مزید دیر ہو گئی۔ اسی کیفیت میں گھبرا کر پانی کی غرض سے ڈول کنویں میں ڈالا۔ دل نماز میں تھا اور ہاتھ ڈول رسّی پر جبکہ دھیان شرکت جماعت میں تھا اور نگاہ کنویں کی من پر، ایک پریشان حالت تھی ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے کہ رسّی پاؤں میں اُلجھی اور حضرت مولٰنا دھم سے کنویں میں گر پڑے مگر قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ آپ کا بال تک بیکا نہ ہوا کیونکہ آپ کنویں میں جس وقت گرے پانی نے اپنی گود پھیلا کر آپ کو لیا اور آہستہ سے "جھکولا دے کر نیب" کی اُس جڑ پر بٹھا دیا جو تہہ میں جمی اور سطح پر اُبھری ہوئی تھی۔

اس واقعہ کے سلسلے میں حضرت کے ماموں محمد شفیع کا بیان ہے۔ چونکہ ڈول کی رسّی آپ کے ساتھ ہی کنویں میں گر گئی تھی۔ اس لیے قدرت نے ڈول کو اُلٹا کر کے آپ کو اُس پر بٹھا دیا اور آپ باآرام اس طرح ٹہلتے رہے جس طرح کسی چھوٹی سی ڈونگی کے ملائم گدّے پر کوئی شخص بیٹھ کر سیر کرے۔

بہرکیف جس وقت آپ کے کنویں میں گرنے کی وجہ سے دھماکہ سا ہُوا تو مغرب کی ایک رکعت ہو چکی تھی۔ نمازیوں کے لیے دوسری رکعت کا پورا کرنا دشوار ہو گیا۔ بالآخر لوگ جلدی جلدی سلام پھیر کر کنویں کی جانب لپکے اور حضرت کی دادی صاحبہ کے بھائی سیّد فیض علی صاحب سے کہا۔ کہ یہ گرنے والا تو رشید احمد معلوم ہوتا ہے۔"

نماز کے بعد کنویں کی من پر ایک بھیڑ سی لگ گئی اور اچھا خاصا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ یہ لوگ ایک دوسرے کا منہ تکتے اور پریشان حال ہکا بکا کنویں کے نیچے جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اتنے میں اندر سے آواز آئی۔ "گھبراؤ نہیں میں بہت آرام سے بیٹھا ہوں۔" چنانچہ ایک پیڑھا ڈال کر جس وقت آپ کو باہر نکالا گیا تو اس بات نے تمام لوگوں کو حیران کر دیا کہ آپ کے پاؤں کی چھوٹی سی انگلی میں خفیف سی خراش کے علاوہ بدن کے کسی حصّہ پر مطلق کوئی چوٹ نہیں آئی۔ اس واقعہ سے آپ کے استقلال اور خدا پر توکل و اعتماد

کی ایک روشن مثال سامنے آتی ہے۔

اس قصہ کے بعد جب حضرت مولانا کے والد مولوی ہدایت احمد صاحب آٹھ ماہ کی رخصت پر کلکتہ تشریف لائے تو مکتب کے سب بچوں کا امتحان لیا جن میں حضرت مولٰنا بھی شامل تھے چونکہ یہ سارے بچے ایک میاں جی کے شاگرد اور نماز کا قاعدہ یکھتے تھے اس لیے اسی میں امتحان ہوا۔ اتفاق سے التحیات خود میاں جی کو غلط یاد تھی۔ اس لیے بچوں میں سے جس بچے نے سنائی برکاتہ کو بہ تشدید و برکاتہ پڑھا۔ چنانچہ مولانا ہدایت احمد صاحب نے اس کی تصحیح فرمائی اور کہا برکاتہ پڑھو۔ سوائے حضرت مولانا رشید احمد کے باقی سارے بچوں نے بہ تمرد انکار کر دیا اور جواب دیا "ہم تو وہی پڑھیں گے جو ہمارے استاد جی نے پڑھایا ہے"۔

حضرت مولانا نے گردن جھکالی جو صحیح ہے ہمیں وہی ماننا چاہیے کوئی کیوں نہ بتلائے

حضرت مولانا قدس سرہ کی والدہ ماجدہ بھی نہایت پارسا اور عابدہ، زاہدہ ولیہ تھیں۔ باوجود عورت ذات ہونے کے انہوں نے اپنے اندر عورتوں جیسی ضعیف الاعتقادی اور بال بچوں پر دین و ایمان کی بربادی کو پاس بھی نہیں آنے دیا۔ حضرت مولاناؒ نے ایک مرتبہ اپنی طفولیت کا یہ واقعہ خود بیان کیا تھا کہ میری والدہ مرحومہ بیان فرمایا کرتی تھیں کہ رشید احمد! جب تو بچہ تھا تو مجھے اللہ بخش جن نظر آیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ تیری چارپائی کے قریب آکر کھڑا ہو گیا ہے اور مجھے کہا کہ تو فلاں مزار پر عطر کے پھول چڑھا ورنہ میں تیرے لڑکے کو مار ڈالوں گا"۔

والد فرماتی تھیں کہ میں نے اس سے کہا "اچھا مار ڈال تیرے سامنے تو لیٹا ہے"۔

گنگوہ میں شاہ دادو شاہ صادق صاحب کا مزار ہے وہاں ایک طاق پر اللہ بخش کے کے نام کے چڑھاوے چڑھتے اور عطر کے پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ والدہ فرماتی تھیں کہ جب کبھی اللہ بخش نظر آیا اور تجھے مارنے کی دھمکیاں دیتا تو میں اس کو یہی جواب دیتی کہ میں تو ہرگز چڑھاوا نہ چڑھاؤں گی اگر تو میرے بیٹے کو مار سکتا ہے تو مار ڈال"۔ اس کورے اور صاف جواب پر بھی جن تیرا بال بیکا نہ کر سکا۔ مارنا تو دور کی بات رہی وہ تو کبھی تجھے ڈرا بھی نہ سکا۔

حضرت مولانا رشید احمد کے والد مولانا ہدایت احمد صاحب کا جس وقت گورکھپور میں

Herbs
SHAMPOO

انتقال ہوا اُس وقت آپ کی عمر سات ماہ سے کچھ زائد تھی۔ باپ کا سایہ عاطفت سر سے اٹھنے کے بعد آپ کے دادا قاضی پیر بخش صاحب نے آپ کی پرداخت کی۔ آپ بچپن میں بھی نہایت خوش الحان تھے مگر واہیات اشعار پڑھنے یا بچوں کی طرح گلی کوچوں میں گاتے پھرنے کے کبھی روادار نہیں ہوئے آپ کی خوش الحانی کی وجہ سے آپ کے رفقاء واحباب کی آپ سے فرمائشیں ہوا کرتی تھیں۔ مگر آپ اکثر گریز فرماتے تھے البتہ جب کبھی زیادہ اصرار ہوتا تو کوئی نظم خصوصاً قصۂ ابراہیم بن ادہم خوش الحانی کے ساتھ پڑھ کر جلسہ کو محظوظ فرمایا کرتے تھے آپ کے ان اشعار پڑھنے سے اہلِ جلسہ کی حالت غیر ہو جایا کرتی تھی اور رقت طاری ہوکر بے خود اور گریہ کے غلبہ سے مدہوش و بیتاب ہو جاتے تھے۔

اِس نوعمری کے زمانہ میں حضرت رشید احمد گنگوہی نے کرنال میں مقیم اپنے ننھیالی ماموں مولوی محمد لفتی صاحب مرحوم سے فارسی پڑھی۔ چونکہ آپ کے یہ ماموں آپ کے اُستاد بھی تھے۔ اس لیے حضرت ان کا بہت ہی لحاظ وادب ملحوظ رکھتے تھے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فارسی کا کچھ حصہ مولوی محمد غوث صاحب سے بھی پڑھا ہے۔ علم فارسی سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو عربی کا شوق ہوا اور آپ نے ابتدائی حرف ونحو کی کتابیں مولوی محمد بخش صاحب رامپوری سے پڑھیں۔ آپ اپنے ہم عمروں اور ہم سبقوں میں ہمیشہ سب سے زیادہ ممتاز رہے آپ کی ذہانت وصلاحیتِ خداداد کے باعث ہر اُستاد کی آپ پر نظرِ عنایت وشفقت رہی اگر کبھی کسی عذر کے باعث آپ درس میں تشریف نہ لاتے تو شفیق استاد آپ کی قیام گاہ پر آکر آپ کی عیادت فرمایا کرتے تھے۔ علوم عقلیہ کے سلسلے میں آپ کے دوسرے اُستاد جناب مفتی صدر دین صاحبؒ تھے البتہ حدیث آپ نے حضرت مولانا المولوی شاہ عبدالغنی صاحب مہاجر مدنی سے پڑھی۔ حدیث بھی آپ نے زیادہ تر اپنے والد ماجد روحانی مربی پیر طریقت شیخ وقت حضرت ابوسعید دہلوی سے پڑھی۔ آپ کی اسناد متعدد طرف سے بالتفصیل یانع الجنی میں درج ہے۔ موطا امام مالک مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ بالاستیعاب والد ماجد سے پڑھی اور بخاری شریف قرۃً وسماعاً شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے (شاہ اسحاق صاحب اور آپ کے والد شاہ ابوسعید صاحب دونوں شاگرد ہیں) شاہ عبدالعزیز بن اشاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری قدس اللہ اسرارہم کے ہر دو سلسلہ سے آپ کی اسناد حدیث

سلور جوبلی سال میں



قابلِ اعتماد

نیشنل انڈسٹریل کوآپریٹو فنانس کارپوریشن لمیٹڈ

امدادِ باہمی کا سب سے مستحکم مالیاتی ادارہ

پنجاب بھر میں ۲۲۵ شاخیں ممبران کی خدمت میں سرگرم

قائم شدہ ۱۹۶۴ء منظور شدہ زیر کوآپریٹو سوسائٹیز ایکٹ ۱۹۲۵ء

سنٹرل آفس

مال دیو پلازہ بنک سکوائر۔ لاہور

فون:۔ ۳۲۴۷۲۳ ۔ ۳۲۳۹۸۹ ۔ ۳۲۱۱۹۶

تیسری پشت پر حجۃ اللہ البالغہ پر جا ملی ہے۔

زمانہ طالب علمی میں حضرت مولانا اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کے پڑھانے کی طرف بھی شوق ظاہر فرمایا کرتے تھے مگر اُس وقت جبکہ یہ اپنے کام سے فارغ ہوجائیں اور کچھ جرح واقعہ نہ ہو چنانچہ سب سے پہلی جماعت جن کو حضرت نے دہلی میں سبق شروع کرایا وہ ہے جس میں ملّا محمود دیوبندی شامل تھے اور ان کے بعد آپ کی شاگردی کا فخر آپ کے ماموں زاد بھائی مولوی ابوالنصر اور دوسرے ماموں زاد بھائی یعنی حکیم مسعود احمد صاحب کے حقیقی ماموں ابوالقاسم صاحب کو حاصل ہوا۔ جو بعد میں انسپکٹر پولیس لدھیانہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی کے چار حقیقی ماموں تھے جن میں بڑے مولانا محمد نقی صاحب کی صاحبزادی مسماۃ خدیجہ سے آپ کا رشتہ قرار پایا۔ مولوی محمد نقی صاحب خاندان قادریہ میں شاہ سیف اللہ صاحب نارنولی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت اور مجاز تھے نہایت پابند شرع اور عاشق سنت شیخ تھے۔

جب حضرت مولانا کی عمر شریف اکیس برس کی ہوئی تو آپ کے ماموؤں کا تقاضا ہوا کہ نکاح ہوجائے چونکہ منگنی اور نسبت کی تجویز پہلے ہی پختہ ہو چکی تھی اس لیے آپ کے دادا جو آپ کے سرپرست بھی تھے اُن کے دہلی سے واپس آنے پر آپ کے نکاح کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ نکاح کے دن جب حضرت مولانا کو شادی کا لباس پہنا کر گھر لایا گیا تو اتفاق سے ایک نابینا میراثن بھی مجمع میں موجود تھی جس کا نام چندیا تھا۔ اُس بیچاری نے دنیا کی رسم کے مطابق اپنی بھونڈی آواز میں گیت گانے کا ارادہ کیا اور بے تکا مصرعہ "گوند لاری مالن سہرا" زبان سے نکالا اس فقرے کو سننے کی حضرت میں بھلا کہاں تاب تھی۔ بے اختیار آپ نے اُسے ایک دھول رسید کی میراثن پر دھول کا لگنا تھا کہ اس کا منہ یوں بند ہوگیا گویا سانپ سونگھ گیا ہو اور گھر کے چھوٹے بڑے سب دولہا کو بھول کر پٹنے والی چندیا کی طرف جھک پڑے اور اُس پر پیسوں کا مینہ برسانے لگے۔ چندیا پر ٹکوں پر ٹکے پڑتے اور چاروں طرف سے خوشامدیں ہو رہی تھیں کہ خدا کے واسطے دولہا کو مت کوسو جو ہونا تھا سو ہو چکا اب بدنامی کا کوئی لفظ زبان سے نہ نکلے۔

حضرت مردانہ جلسہ نکاح میں جب تشریف لائے تو ناکح نے خطبہ پڑھا اور پانچ ہزار سکہ

آنکھیں آپکے حسن کا مرکز ہیں

ہاشمی سُرمے

اِنکی حفاظت کے لئے



اوقات مطب صبح ۱۱ تا ۱ بجے۔ شام ۵ تا ۷ بجے

محمد ہاشم تاجر سُرمہ

عیدگاہ ایم۔ اے۔ جناح روڈ۔ کراچی فون:727860

قائم شدہ ۱۷۹۴ء

چہرہ شاہی کا تذکرہ ہوا حضرت نے اس مجمع میں جہاں دولہا بنے بیٹھے تھے صاف انکار فرما دیا اور کہہ دیا کہ میں اس قدر بوجھ کا متحمل نہ ہوسکوں گا۔ حضرت کے خسر جناب مولوی محمد نقی صاحب اتفاق سے نکاح کے وقت موجود نہ تھے رشتہ داروں کی طرف سے بہت ردّوکد ہوئی آخر بڑے بوڑھوں کے اصرار پر آپ کو ماننا پڑا اور پانچ ہزار مہر پر بساعت سعید نکاح ہوگیا مگر نکاح کے بعد فوراً ہی حضرت مولانا کی اہلیہ نے برضاء ورغبت مہر خود معاف فرما دیا تب آپ کے قلب کو راحت حاصل ہوئی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علم دین کے نہایت قدردان جوہری تھے۔ مقدس مذہب کی اس پاک خدمت اور لطیفۂ پیغمبر کی اس سچی نیابت کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتے اور آخرت کی بہبودی کا بہت بڑا وسیلہ سمجھتے تھے۔ طلباء اور علماء کے ساتھ آپ کو خاص انس تھا اور مدارس اسلامیہ عربیہ کے ساتھ مخصوص محبّت تھی۔

یوں تو آپ کو دینی محبّت کے باعث ہندوستان کے جملہ مدارس اسلامیہ کے ساتھ محبّت تھی مگر مدرسہ عالیہ اسلامیہ دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے ساتھ گویا عشق تھا۔ یہ دونوں مدارس اپنی نوعیت کے اعتبار سے قریب قریب ہمعصر تھے۔ دونوں مدرسوں کی بنیاد حضرت مولانا قاسم العلومؒ کے ہاتھوں رکھی گئی مگر مدرسہ عالیہ دیوبند کی شروعات ماہ محرم ۱۲۸۳ھ نبوی میں ابتدا ہوئی اور مظاہر العلوم سہارنپور کا چھ مہینے کے بعد ۱۲۸۳ھ رجب کے مہینے میں افتتاح ہوا۔

دیوبند میں حضرت رشید احمد گنگوہیؒ کو بارہا تشریف لانے کا اتفاق ہوا بالخصوص اُن کی وہ آمد تو قابل ذکر ہے جس کو ہر نظر بصیرت مدرسہ عالیہ دیوبند کی پیشانی پر آب زر سے لکھا ہوا محسوس کر رہی ہے۔ وہ جلسہ جس میں امام ربانی اس وقت دیوبند تشریف لائے جلسہ دستار بندی کے نام سے موسوم ہے۔

آپ کے سامنے علما کا گردنیں جھکا لینا اور پڑھے لکھے سمجھدار آنکھوں والے مولویوں کا حلقہ بگوش ہو جانا اندھا دھند عامیانہ تقلید کی صورت میں نہیں تھا بلکہ برسوں جانچ پڑتال اور دیکھ بھال کے بعد جب اس جماعت کو کلّی اطمینان اور وثوق ہوگیا کہ امام ربانی قدس سرہ کا وجود باوجود خداوندی نمونہ کا سچا نمونہ اور عملی مجسم سانچہ ہے۔ اور اس وقت دستگیری کی درخواست کا منظور ہونا اخروی سعادت سمجھ کر سلسلہ بیعت میں منسلک ہوئے۔

مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ عمر میں مولانا رشید احمد گنگوہی سے بڑے تھے مگر عقیدت کے اعتبار سے گویا حضرت کے جانثار خادم اور عاشقِ جان تھے۔ جب بھی تشریف لاتے تو بے اختیار حضرت کے قدموں پر بوسہ دیتے اور آنکھوں میں آنسو بھر لایا کرتے۔ ایسے میں مولانا شرما جاتے اور پھر یوں فرمایا کرتے تھے کہ مولانا آپ مجھے کیوں نادم کیا کرتے ہیں۔ آپ میرے بڑے ہیں مجھ پر آپ کا ادب لازم ہے لیکن جب آپ ایسا کام کرتے ہیں تو مجھے شرم آتی ہے۔"

مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے دادا بوڑھے شخص تھے اس کے ساتھ ہی حق تعالیٰ نے قلب میں نور فراوانی رکھا تھا جس کی وجہ سے حضرت امام ربانی کے مرتبہ شناس تھے۔ جب تشریف لاتے تو اس قدر عقیدت و اخلاص کے ساتھ خادمانہ برتاؤ کرتے کہ دیکھنے والے ان کو حضرت کا مرید سمجھتے تھے۔ ایک بار مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میرے دادا آپ کے معتقد ہی تھے یا بیعت بھی تھے۔

آپ نے فرمایا کہ بیعت تو قاضی مولوی محمد حسن صاحب مرحوم سے تھے مگر اعتقاد میں مریدوں سے بھی زیادہ تھے اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں ایک مرتبہ حجرہ کے اندر بیٹھا بخاری شریف پڑھا رہا تھا۔ تمہارے دادا صاحب آئے وہ باوضو تھے مگر اس کے باوجود پیر پاؤں ـــــ دھوکر حجرہ میں داخل ہوئے۔ بڑھاپا ہونے کے باوجود اُن کا یہ برتاؤ جو میں نے دیکھا تو بہت شرمندہ ہوا اور میں نے کہا۔

"حضرت مجھے شرمندہ کیوں کرتے ہیں۔"

انہوں نے جواب دیا کہ آپ کی بڑی شان ہے شاید میرے پاؤں میں کوئی شے لگی ہو۔

ایک مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میرے دادا صاحب اتنے محتاط تھے کہ ہندو دھوبی کے دھوئے ہوئے کپڑے کو جب تک خود نہ دھولیں کسی صورت نہیں پہنتے تھے۔

اس پر حضرت نے بے ساختہ ارشاد فرمایا "یہ تمہارے دادا صاحب کا وہم تھا ورنہ شرعاً ہندو دھوبی کے یہاں دُھلے ہوئے کپڑے ناپاک نہیں ہیں۔ اب دیکھو نا انگریزوں کی ولایت سے کس قدر پارچہ جات آتے ہیں اُسے بھی تو سب پہنتے ہیں۔"

آپ میں گوناں گوں صفات تھیں بالخصوص خادم نوازی اور سادگی و بے تکلفی امام

ربّانی کی خاص شان تھی۔ ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی اتفاق سے سحر کو وقتِ معمول پر نہ اُٹھ سکے۔ حضرت قدس سرہ نے ان کے حجرے کے دروازہ پر کھڑے ہوکر آواز دی۔ مولوی صاحب گھبرا کر اُٹھے اور باہر آکر عرض کیا کہ حضرت آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔

آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا "مجھے اس وقت خیال آیا کہ حبیب سو گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ سحر کا وقت اخیر ہونے والا ہے اگر میں نہ جگاؤں گا تو وہ تمام دن بھوکا رہیگا"

بارہا ایسا ہوا کہ مؤذن کی وقت پر آنکھ لگ گئی اور حضرت چپکے سے مسجد میں تشریف لائے اور آذان دے کر اپنے حجرہ میں چلے گئے پھر مؤذن سے یہ بھی دریافت نہ کیا کہ آج اذان کے وقت کیوں سو گئے تھے۔ آپ انتہائی رقیق القلب تھے۔ کسی کی تکلیف آپ سے دیکھی نہ جاتی تھی اپنا ہو یا بیگانہ اگر اُسے ذرا بھی تکلیف میں دیکھتے تو فوراً بے تاب ہو جاتے۔

ایک مرتبہ مولانا رشید احمد گنگوہی دیوبند تشریف فرما تھے مولوی حسین شریف مدراسی جو حضرت کے شاگرد بھی ہیں۔ ایک محفل میں چھ پیالیاں چائے کی تیار کر کے لے آئے مگر جب یہاں آکر دیکھا تو مکان آدمیوں سے بھرا ہوا تھا اور اکثر علماء اور مولوی حسین شریف کے اساتذہ تھے۔ اب حیران ہوئے کہ کس کو چائے دیں اور کس کو نہ دیں آخر یہ سوچ کر کہ وہ خاص خاص شخصیات کو ہی چائے پلوادیں گے چائے لے کر دہلیز پر بیٹھ گئے۔ یہ سارا منظر جب مولانا رشید احمد گنگوہی نے دیکھا تو ارشاد فرمایا۔

"مولوی شریف ایک طرف سے چائے دینا شروع کرو"

حضرت کے ارشاد کے مطابق انہوں نے چائے پیالی میں ڈال کر داہنی طرف سے تقسیم شروع کر دی اُس وقت مجمع میں تقریباً بیس پچیس آدمی موجود تھے جب سب نے چائے پی تو اُس وقت بھی برتن میں وافر چائے موجود تھی۔

مولانا کا یہ معمول تھا کہ حجرہ کی گھڑیاں روزانہ بارہ بجے گھڑی دھوپ سے ملایا کرتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ آسمان پر کئی روز تک متواتر گہری گھٹائیں چھائی رہیں جس کی وجہ سے گھڑی ملانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اس سلسلے میں مولوی علی رضا صاحب جو آپ کے شاگرد ہیں فرماتے ہیں۔

"انہی ایام میں ایک روز ابر کچھ چھٹا ہوا تھا کبھی دھوپ ہو جاتی تو کبھی گھٹا چھا جاتی۔

fabrics that know the way to your heart

Kanwal Linen

Dyed Poplin

Sadaf Linen

Cannon Linen

Silver Queen Printed Lawn

Anokhi Lawn

H-2810 White Lawn

Gulshan Dyed Lawn

Bedsheets

Printed Flannel

Readymade Garments

Printed Bedsheets



Where there are Husein's fabrics, there's elegance – your kind of elegance that adds grace to your person

These fine fabrics are favourites with men and women. Look for the latest varieties the next time you are out shopping.

HUSEIN

FABRICS

add elegance to your person

HUSEIN TEXTILE MILLS | A division of HUSEIN INDUSTRIES LTD KARACHI

اُس روز مولانا بارہ بجے سے قبل ہی مکان میں شریف لے آئے چھپر کے نیچے جو شریف کی شرقی جانب پڑا تھا وہاں لیٹ رہے اور مجھے فرمایا کہ گہری دھوپ کے پاس کھڑے ہو جاؤ۔ اور جب بارہ بجیں تو مجھے خبر کر دینا۔ چنانچہ میں گہری دھوپ کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اُس وقت آفتاب پر ابر بالکل نہ تھا لیکن جب وقت سایہ خط کے برابر پہنچنے کے قریب آیا تو دفعتہً ابر کا ایک طویل و عریض ٹکڑا آفتاب پر چھا گیا میں نے گھبرا کر عرض کیا کہ حضرت دھوپ چھپ گئی آپ اُسی وقت اُٹھ بیٹھے اور گھڑی ہاتھ میں لے کر گہری دھوپ کے پاس آن کھڑے ہوئے آپ کا کھڑا ہونا تھا کہ آفتاب کے اوپر آیا ہوا ابر کا ٹکڑا یکایک پھٹ گیا چنانچہ آپ نے گھڑی ملائی اور حجرہ میں تشریف لے آئے۔ میں حیران تھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔

صوفی کرم حسین کا بیان ہے کہ ایک روز میں حضرت کی خدمت میں حاضر تھا۔ میرے پاس ایک دوست کا خط پہنچا کہ میں ایک مقدمے میں ماخوذ ہوں۔ رہائی کی کوئی صورت معلوم نہیں ہوتی تم حضرت سے دُعا کرا دو۔ چنانچہ میں نے حضرت سے عرض کیا۔ آپ نے نہایت شفقت کے ساتھ مقدمہ کی صورت دریافت فرما کر یوں ارشاد فرمایا "تم اُن کی تسلی کر دو۔ انشاءاللہ بری ہو جائیں گے"۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا کہ باوجود اندیشہ ناک اور مایوسانہ حالت کے صاف رہا ہو گئے۔

میر محبوب علی دہلوی کے والد ایک مرتبہ مقروض ہوئے ہر چند فکر کی مگر ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہ آئی اُدھر دُکان خالی ہوتی جا رہی تھی۔ اُدھر قرض بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہمت پست ہو گئی اور گھبرا اُٹھے۔ محبوب علی صاحب سے باپ کی یہ پریشانی دیکھی نہ گئی۔ چنانچہ انہوں نے حضرت کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ مال تیار کرنے کا موسم آ گیا اور یہاں ابھی قرض سے بھی سبکدوشی نہیں۔ اگر حضرت دُعا فرمائیں تو میرا بیڑا پار ہو سکتا ہے"۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ چند روز میں قرض بھی سب ادا ہو گیا۔ فصل پر مال بھی تیار ہو گیا اور یہ بھی معلوم نہ ہُوا کہ روپیہ کہاں سے آیا؟

اِسی طرح ایک مرتبہ علاقہ میں گھوڑوں کا مرض پھیل گیا۔ کچھ گھوڑیاں تو فوراً مر گئیں مولوی نظر محمد نے بھی ایک گھوڑا پال رکھا تھا اور اُن کو اُس کے ساتھ محبت بھی بہت زیادہ تھی۔ اس زمانے میں اُس پر بھی مرض کا خاصا اثر ہوا۔ اُس کی تمام چستی اور پھرتی جاتی رہی اور وہ ہر وقت سر جھکائے کھڑا رہتا۔ لوگوں نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی کہ گھوڑا بیمار ہو گیا ہے، چنانچہ مولوی نظر محمد صاحب کو فکر دامن گیر ہوئی وہ اُسی وقت اُس

Reckitt & Colman

a household name...
worldwide fame...



Around the world millions of people are using Reckitt & Colman products and coming back for more. Why? Guaranteed quality and a standard of excellence that is hard to beat.

So relax.... as Reckitt & Colman reach out to you wherever you are.

Reckitt & Colman of Pakistan Ltd

گھوڑے پر سوار ہو کر گنگوہ پہنچے راستے میں بھی گھوڑے کی کیفیت برقرار رہی اور بڑی سست رفتاری سے چلتا رہا۔ بہر کیف کسی نہ کسی طرح گنگوہ پہنچ گئے اور جمعہ کی نماز کے بعد حضرت سے عرض کرنے لگے۔

"میرے پاس ایک گھوڑا ہے سواری کا بہت آرام ہے جب بھی جی چاہتا ہے اُس پر بیٹھ کر گنگوہ آجاتا ہوں مگر اب وہ گھوڑا بیمار ہو گیا ہے۔"

مولانا رشید احمد گنگوہی نے دریافت فرمایا "کیا گھوڑوں میں بیماری ہے۔"

انہوں نے عرض کیا کہ حضرت دو پٹھانوں کے گھوڑے مر چکے ہیں۔"

آپ نے کہا: "اچھا تعویذ باندھو خدا فضل کرے گا" اور مولوی محمد صاحب سے فرمایا کہ ان کو گھوڑے کے لیے ایک تعویذ دو۔ چنانچہ مولوی نظر محمد نے تعویذ لے کر گھوڑے کی گردن میں ڈال دیا اور اُس پر سوار ہو گئے۔ چنانچہ دو ہی دن میں گھوڑا بالکل صحت یاب اور چست و توانا ہو گیا۔

مولوی محمود حسن صاحب نگینوی فرماتے ہیں کہ میری خوشدامن صاحبہ جو اپنے والد کے ہمراہ مکہ معظمہ میں بارہ سال تک مقیم رہیں نہایت پارسا اور عابدہ زاہدہ تھیں۔ سینکڑوں احادیث بھی اُن کو حفظ تھیں۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ بیٹا حضرت کے بہت شاگرد و مرید ہیں۔ مگر کسی نے حضرت کو نہیں پہچانا۔ جن ایام میں میرا قیام مکہ معظمہ میں تھا روزانہ میں نے صبح کی نماز حضرت کو حرم شریف میں پڑھتے دیکھا ہے اور لوگوں سے سنا بھی ہے کہ یہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں۔ گنگوہ سے تشریف لایا کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ مولوی نظر محمد خان صاحب کو کوئی ایسا مرض لاحق ہو گیا تھا کہ صبح و شام اُن کے ہاتھ پاؤں اور سارا منہ سوج جاتا تھا مگر آفتاب نکلنے پر سوج اُتر جاتی۔ ایک مرتبہ جب مولانا رشید احمد گنگوہی رامپور تشریف لائے۔ مولوی نظر محمد خان بھی وہاں پر موجود تھے۔ عصر کی نماز کے بعد اُنہوں نے مرض کی شدت کے باعث واپس گھر جانے کا ارادہ کیا۔ اس موقع پر حکیم ضیاء الدین (مرحوم) بھی موجود تھے۔ انہوں نے مولوی نظر صاحب سے کہا۔ "رخصت سے پہلے اپنے پیر صاحب سے اجازت تو لے لو۔ مگر انہیں اجازت نہ ملی۔ یوں حکیم ضیاء صاحب اور مولوی نظر محمد خان کو وہیں ٹھہرنا پڑا۔

مغرب کے وقت دونوں حضرات تشریف فرما تھے۔ انہوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی سے اپنے مرض کا ذکر کیا۔ حضرت نے حکیم صاحب سے فرمایا۔ "آج مونگ کی دال بھی پکوانا

کیا آپ کے بال صحت مند ہیں؟

• نہیں • ہاں

اس سوال کا جواب آپ کو ۲ منٹ میں مل جائے گا۔ مندرجہ ذیل پانچ اہم سوال ہیں جن کا جواب آپ نے صرف ہاں یا نہیں میں دینا ہے۔

- کیا آپ کے بال خشک دکھائی دیتے ہیں؟
- کیا آپ کے بال جھڑتے ہیں۔؟
- کیا آپ کے بالوں میں سکری و خشکی موجود ہے؟
- کیا آپ کے بال قبل از وقت سفید ہو رہے ہیں؟
- کیا آپ بالوں کی مصنوعی خوبصورتی پر توجہ دیتے ہیں؟

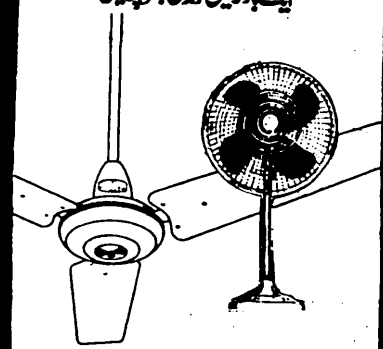
اگر آپ کا جواب کم از کم ۲ سوالوں کے لئے ہاں میں ہے تو آپ کے بال صحت مند نہیں ہے۔ ہم آپکو مشورہ دیں گے کہ آپ کو جلد از جلد اپنے بالوں کو صحتمند بنانے کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ بالوں کی صحت کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ اُن کی دیکھ بھال پر کتنی توجہ دیتے ہیں۔

بالوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے اور اُن کا حسن برقرار رکھنے کے لئے بالوں کا دھونا، بالوں میں تیل لگانا و مالش کرنا اور بالوں میں کنگھی کرنا تینوں باتیں بے حد اہم ہیں۔

برگمین لیبارٹریز پاکستان نے برسوں کے تجربات کے بعد اور جدید سائنٹفک ریسرچ کی روشنی میں برگ آملہ ہیئر ٹانک تیار کیا ہے جس میں قدرتی تیل، چکنائیں، پروٹین اور جلد میں جذب ہو جانے والے قدرتی اجزا شامل ہیں جو فوری جذب ہو کر سر کی جلد کے امراض کا علاج کرتے ہیں اس کے مسلسل استعمال سے بالوں کی قدرتی رنگت بحال رہتی ہے اور سفید بالوں کی رنگت آہستہ آہستہ سیاہی مائل ہو جاتی ہے۔ بالوں کی جڑوں کو مضبوط بناتا ہے جس سے بال گرنے سے رک جاتے ہیں۔ اس طرح بالوں کی افزائش میں اضافہ ہوتا ہے۔ خاندان کے ہر فرد کیلئے اس کا استعمال ہر موسم میں یکساں مفید ہے ● برگمین کی تحقیق کا نچوڑ

ایئر پاک فین

ایک بار لائیں زندگی بھر چلائیں



airPAK FANS

PH: airPAK FANS 7840

COASTER INDUSTRIES

G.T. ROAD, GUJRAT

غرض شب کو جس وقت کھانا آیا تو دستر خوان پر مونگ کی دال بھی تھی اور گوشت بھی موجود تھا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے اُن کے سامنے سے گوشت کا پیالہ اٹھا لیا اور مونگ کی دال سامنے سرکا دی۔ اس پر حکیم صاحب نے دریافت فرمایا کہ حضرت گوشت کیوں اٹھا لیا۔

آپ نے فرمایا "ان کو کچھ مرض ہے لہٰذا ان کے لیے گوشت مُضر ہے۔"

حکیم صاحب نے حیرت سے فرمایا "ان کو تو ضعف جگر ہے لہٰذا اس کے لیے دال مُضر ہے۔" یہ کہہ کر حکیم صاحب نے دال سامنے سے اُٹھا لی اور گوشت کا پیالہ سامنے رکھ دیا۔

اس پر مولوی نظر محمد صاحب نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا "حضرت کی اجازت کے بغیر میں تو گوشت نہیں کھاؤں گا۔"

اس موقع پر مولانا رشید احمد گنگوہی نے مولوی نظر محمد خان سے کہا "اگر جانے کا ارادہ ہو تو جاؤ۔"

انہوں نے عرض کیا "بہتر۔"

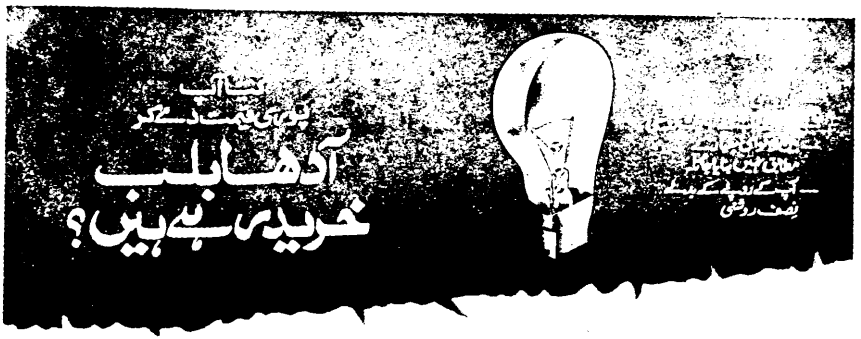
حضرت نے کہا "کچھ کھانا ساتھ رکھ لینا۔"

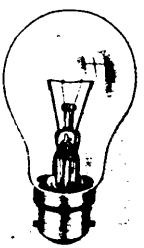
انہوں نے کہا کہ حضرت اگر ایسی ضرورت ہوئی تو گھر جا کر کھا لیں گے۔"

آپ نے فرمایا "خدا جانے کیا قصہ پیش آئے لہٰذا تم کھانا ساتھ رکھ لو۔" اب خدا کی شان دیکھیے کہ جب مولوی صاحب گنگوہ سے دو ڈھائی میل نکل آئے تو یکے کا ایک پہیہ ٹوٹ گیا۔ ہر چند کوشش کی مگر اصلاح نہ ہوئی آخر مجبوراً انہیں رات جنگل میں ہی گزارنا پڑی اور ساتھ رکھا ہوا کھانا بھی کام آگیا یوں آپ کی بات درست ثابت ہوئی۔

آپ کی اور بھی بے شمار کرامات ہیں مولوی محمد یٰسین صاحب دیوبندی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں مولانا عبدالمومن اور حافظ لیاقت علی کی معیت میں گنگوہ حاضر ہوا جب واپسی کے وقت حضرت سے رخصت ہونا چاہا تو دوپہر کا وقت تھا اور یوں لگتا تھا جیسے رامپور دس کوس ہے اور عصر کے وقت وہاں آسانی سے پہنچ جائیں گے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ ایک رات حضرت حکیم ضیاء الدین کی خدمت میں گزار کر اگلی صبح دیوبند روانہ ہو جائیں گے۔ حضرت امام ربانی نے فرمایا "اس وقت کیوں جاتے ہو رات کو بھلا کہاں مارے مارے پھرو گے۔"

میں نے عرض کیا "حضرت شب کو رامپور میں ٹھہرنے کا قصد ہے۔"





مکمل بلب خریدیئے
فلپس ہی خریدیئے

بالکل ٹھیک۔ فلپس بلب آپ کے کئی بلب کے بدلے مکمل روشنی دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ہر فلپس بلب... اسّی تجربہ اور سو فیصد کوالٹی کی جانچ کا حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلپس بلب زیادہ عرصے تک مسلسل بھرپور روشنی فراہم کرتے ہیں۔ اپنے روپے کی قدر کیجئے۔ فلپس ہی خریدیئے۔ فلپس بہتر بلب۔ آپ کے پیسے کا پورا مکمل انعام۔

ار جنٹا۔ کے چاندنی جیسی روشنی	**فلپس کے روشن روشن بلب آپ کے لئے مکمل انتخاب**	**سُپر کلس** ۳۰ فیصد زائد روشنی
پرل خوشگوار روشنی بغیر زائد قیمت	**سافٹون** ؟ عنقریب دستیاب	**ار جنٹا۔ کے ای ۵۰** کینڈل لیمپ کا جدید نعم البدل

ASIATIC

Philips Lighting

PHILIPS

اس پر بھی آپ نے یہی فرمایا "بھئی رات کو ناحق پریشانی ہوگی کیا فائدہ صبح چلے جانا"
سب کو حضرت کی بات پر تعجب ہوا کہ گرمی کا موسم ہے۔ ایسے بڑے دن میں دس کوس مسافت کی بھلا حقیقت ہی کیا ہے اگر چار گھنٹے نہیں تو زیادہ سے زیادہ پانچ گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے۔

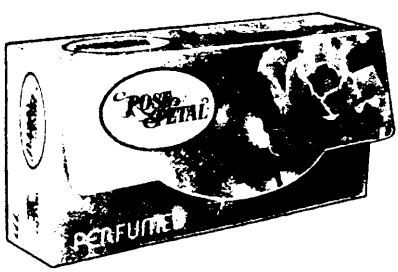
میں نے پھر عرض کیا کہ کل بندہ کا مدرسہ میں حاضر ہونا بہت ضروری ہے۔
حضرت نے فرمایا "مدرسہ کے جرح کا تو مجھے بھی بہت خیال ہے لیکن میں تمہاری تکلیف کی وجہ سے کہتا ہوں کہ ناحق راستے میں مارے مارے پھرو گے اور سخت تکلیف اٹھاؤ گے"
حضرت کے بار بار فرمانے کے باوجود ہمیں مطلق خیال نہ ہوا کہ "شیخ ہر چہ گوید دیدہ" اپنی ہی کہے گئے۔ آخر حضرت نے مصافحہ کیا اور فرمایا "اچھا بھئی جاؤ فی امان اللہ"
غرض یہ کہ ہم چل دیے مگر جب آبادی سے باہر نکلے تو حافظ لیاقت علی خاں کے دل کو بے چینی سی ہوئی اور کہنے لگے "میاں خدا خیر کرے آج دیکھئے کیا مصیبت جھیلنی پڑے کیونکہ ہم نے حضرت کا حکم نہیں مانا اور اس وقت کچھ نہیں سوچا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے مجھے لگتا ہے کہ حضرت کا فرمانا خالی نہ جائے گا کیونکہ میں ایک مرتبہ پہلے بھی تجربہ کر چکا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا قصہ سنایا کہ حضرت سے ایک بار میں رخصت ہونے لگا تو آپ نے فرمایا "اب نہ جاؤ ورنہ راستہ میں بھیگ جاؤ گے"
چونکہ اس وقت آسمان بالکل صاف اور آفتاب نکلا ہوا تھا اس لیے مجھے بارش کا قطعی اندیشہ نہ ہوا۔ میں نے عرض کیا "حضرت صاحب! آسمان پر تو ابر کا نشان تک نہیں ہے۔ آپ نے پھر یہی فرمایا کہ راستے میں بارش ہوگی اور تم بھیگ جاؤ گے۔
میں نے پھر عرض کیا "حضرت ابھی تو بارش کا کوئی امکان نہیں اور مجھے بوجہ ملازمت آج ہی وطن پہنچنا ہے"
میرے اصرار پر حضرت نے اجازت دے دی اور میں گنگوہ سے نکل کر ابھی تین کوس ہی چلا تھا کہ دفعتہً ابر نمودار ہوا اور چاروں طرف گھٹا چھا گئی اور اس زور کی بارش ہوئی کہ پاؤں اٹھانا اور ایک قدم اٹھانا بھی مشکل ہو گیا۔ سر سے لے کر پاؤں تک خوب نہایا اور بروقتِ تمام منزل پر پہنچا۔
آپ کے ارشادات سے بندگانِ خدا کی رہنمائی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ شاہ نانک جن کو سکھ لوگ بہت مانتے ہیں حضرت بابا فرید الدین شکر گنج کے خلفا

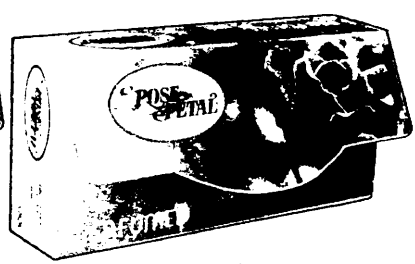
ROSE PETAL

روز پیٹل پرفیومڈ ٹشوز

The Perfumed Collection







تین مسحور کن پرفیوم
777, 555 اور 999

آج کی ضرورت

معیاری مصنوعات P پیکیجز لمیٹڈ

Karo.pk

میں سے ہیں چونکہ اہلِ جذب سے تھے اس وجہ سے ان کی حالت مشتبہ ہو گئی۔ مسلمانوں نے ان کی جانب کچھ توجہ نہ دی یوں سکھ اور دوسری قومیں کشف و کرامات دے کر ان کو ماننے لگیں۔



ایک روز کسی خادم نے تصورِ شیخ کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ خیال دو طرح کا ہوتا ہے ایک آمد جیسے خیال وغیرہ جو خود بخود آئے اس طرح پیر کا تصوّر بوجہ محبت ہو تو کچھ مذائقہ نہیں۔ دوسرا آورد کہ خواہ مخواہ تصوّر باندھا جائے سو اس کی حاجت نہ ہو۔ ایک روز فرمانے لگے کسی نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ میاں تیرا کوئی پیر بھی ہے۔ اُس نے کہا "جی پیر تو میرے بہت ہیں مگر دو پیر میرے اصلی ہیں۔ ایک طوطا اور ایک تلنگا (سپاہی) اور یہ اس طرح کہ میرے محلّے میں ایک تلنگا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ صبح سویرے اُٹھتا منہ ہاتھ دھو کر وردی پہنتا اور پھر بادشاہ کے ہاں نوکری کرنے جایا کرتا تھا۔ مَیں اُس کو دیکھا کرتا تھا آخر ایک دن مجھے خیال ہوا کہ اگر ایک روز یہ اپنی نوکری پر نہ جائے تو بادشاہ اس کو موقوف کر دے اسی طرح اگر تُو اپنے آقائے وحدہ لاشریک کی حضوری اور اللہ کی یاد سے غافل ہوا۔ تو بھی تلنگے کی طرح موقوف کر دیا جائے گا۔ پس اس دن سے مَیں ذکرِ الٰہی میں مشغول ہوں اور کبھی ناغہ نہیں کرتا۔

طوطے کا پیر ہونا اس طرح سے ہے کہ میرے محلّے میں ایک پڑوسی نے طوطا پال رکھا تھا جو میٹھی میٹھی باتیں کر کے اپنی بولیوں پر لوگوں کو فریفتہ بنایا کرتا تھا پھر ایک دن ایسا اتّفاق ہوا کہ اُس کو بلّی نے آن دبوچا جس وقت بلّی کا پنجہ پڑا تو اُس نے کہا "ٹیں" بجز اس لفظ کے اُس کو کچھ بھی یاد نہ رہا ساری بولیاں دل بہلانا چہچہانا بھول گیا۔ مَیں یہ قصہ دیکھ رہا تھا اس وقت دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اسی طرح موت کے پنجہ کا شکار ہوتے وقت آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے بجز اُس اصلی حالت کے جو طبعی ہے اور کوئی بات یاد نہیں رہتی پس میں سب کچھ چھوڑ کر اللہ کی یاد میں لگ گیا تاکہ مرتے وقت ذکرِ اللہ کے سوا مُنہ سے کچھ نہ نکلے اس کے بعد حضرت نے فرمایا سو ذکرِ الٰہی اس واسطے کرتے تھے کہ مُنہ سے آخری وقت میں اللہ ہی نکلے۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب دام مجدہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ حضرت امام ربّانی قدس سرہ کی ولایت و مقبولیت تو ظاہر ہے مگر اولیا اللہ کے مراتب مختلف



مشروب کوئنس

بہترین انتخاب
پہلے بھی اور اب بھی

انڈس فروٹ جوس کمپنی (پرائیویٹ) لمیٹڈ

پوسٹ بکس نمبر 8026 کراچی 75400 پاکستان

TRANSWORLD

ہیں خدا جانے حضرت کا مرتبہ کیا ہے ؟ ایک دن میں کچھ سوتے جاگتے کی کیفیت میں تھا کہ کیا دیکھتا ہوں مولانا رشید احمد گنگوہی مسجد میں تشریف فرما ہیں اور میں اُن کے سامنے بیٹھا ہوں ایک بزرگ عصا ہاتھ میں لیے ہوئے تشریف لائے اور حضرت کی طرف اشارہ فرما کر مجھ سے یوں ارشاد فرمایا "دیکھو یہ قطب الارشاد ہیں۔ اس کے فوراً بعد میری آنکھ کھل گئی اور دل کو اطمینان ہو گیا۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی بابرکت ذات اور موردِ رحمت خاصہ وجود باوجود سے صرف نوع انسان ہی متمتع نہیں ہوئے بلکہ خوشحالی و فارغ البالی اور کسی درجہ میں اطمینان و راحت کے ساتھ گزارہ کا نفع ہر جاندار مخلوق کو پہنچا یا بلکہ سرسبزی و شادابی کی منفعت سے زمین کی ہری گھاس اور درختوں کے پتے بھی محروم نہ رہے۔

۱۳۲۳ ہجری نبوی جو مخدوم العالم قدس سرہ کے وصال کا سال ہے جو شروع ہی سے اپنا رنگ بدلے ہوئے تھا۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے وصال کی خبر آنے سے چند روز قبل آپ کے متوسلین میں سے کسی شخص نے خواب دیکھا تھا کہ حاجی صاحب دیوبند میں تشریف لائے آپ کا چہرہ آفتاب جیسا روشن ہے اور فرما رہے ہیں کہ میرا تو انتقال ہو چکا ہے مولوی رشید احمد صاحب کو لینے کے لیے آیا ہوں ۲۰ ذی الحجہ تک لے جاؤں گا۔ اس خواب پر مخلصین کو پریشانی لاحق ہوئی اور خواب حضرت کی خدمت میں بیان بھی کیا گیا مگر آپ نے تاویل اور تعبیر بیان فرما کر پریشانی کو دفع فرما دیا۔ بہرکیف اسی سال آپ کا وصال ہوا۔

آپ کے دم واپسیں پر جم غفیر کی کتنی تمنائیں مردہ ہو گئیں اور آپ کی میت کے دفن ہونے کے ساتھ ہی نہ جانے مخلوق خدا کے کیا کیا خیالات بھی دفن ہو گئے۔

مورخہ ۸ جمادی الثانی ۱۳۲۳ ہجری میں حضرت نے الوداع کہا۔ نورانی جسم زیرِ زمین گیا اور پاک روح بالائے آسمان پر چلی گئی۔



حضرت نجانیؒ
میراں حسین

حضرت ابوالفضل ختلیؒ

نے اپنے کامل مرید حضرت علی ہجویریؒ سے فرمایا۔ "بیٹا! تبلیغ اسلام کے لیے لاہور چلے جاؤ۔" تو آپ نے جواباً عرض کیا۔ "پیر و مرشد وہاں تو میرے بڑے پیر بھائی شیخ میراں حسین زنجانیؒ پہلے سے موجود ہیں تو پھر وہاں میرے جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

حضرت ختلیؒ نے تنبیہہ کے انداز میں فرمایا۔ "علی! مرید کا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے یہ کیوں اور کیا قانونِ مریدیت و مرشدیت کے یکسر منافی ہے۔ اس لیے تعمیل سے غرض رکھو اور لاہور روانہ ہو جاؤ۔"

حضرت علی ہجویریؒ نے مرشدِ کامل کے حکم پر رختِ سفر باندھا اور عازمِ لاہور ہوئے۔ جب آپ لاہور پہنچے تو رات کا وقت تھا۔ صبح ہوئی تو آپ نے شہر کی مشرقی جانب سے ایک جنازہ نکلتا ہوا دیکھا اور لوگوں سے دریافت فرمایا۔ "یہ کس کا جنازہ ہے؟" جواب ملا یہ حضرت شیخ میراں حسین زنجانیؒ اپنے سفرِ آخرت پر روانہ ہو رہے ہیں۔ تب داتا علی ہجویریؒ کو اپنے مرشد کا حکم یاد آیا کہ انہوں نے سچ ہی فرمایا تھا کہ روحانی سلسلہ کو جاری رکھنے کے لیے اُن کا لاہور پہنچنا بے حد ضروری تھا۔

حضرت داتا صاحب نے جنازہ روکنے کا حکم دیا۔ کفن کھول کر اپنے بڑے پیر بھائی

کے روئے پر نور کی زیارت کی اور پھر آپ نے جنازے میں باقاعدہ شرکت کی۔ نمازِ جنازہ پڑھائی اور باغِ زنجان میں جہاں حضرت میراں حسینؒ ذکر و افکار اور عبادت کیا کرتے تھے۔ اس میں حضرت داتا صاحب نے حضرت میراں حسین کو اپنے دست مبارک سے قبر میں اُتارا۔

حضرت میراں حسین زنجانیؒ برِصغیر پاک و ہند میں ان قدیم اکابر اولیاء سے ہیں جو نورِ اسلام پھیلانے، تعلیماتِ اسلام کو گھر گھر پہنچانے، کفر و شرک مٹانے اور بھولے بھٹکوں کو راہ دکھلانے کے لیے لاہور میں سب سے پہلے تشریف لائے۔ لاہور شہر کی وجہ تسمیہ اگرچہ مختلف مؤرخین کے نظریات کے مطابق مختلف ہے۔ تاہم اکثریت کا یہ خیال ہے کہ اس شہر کو سب سے پہلے رام چندر کے بیٹے لوہ نے آباد کیا چنانچہ ابتدا میں اس کا نام لوہارو رکھا گیا۔ اسی لوہارو کو کسی نے لوہور کہا۔ کسی نے الہارو کہا۔ امیر خسرو نے لاہور کو لھانور لکھا۔ ان باتوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مختلف زبانوں میں یہ نام اگرچہ مختلف رہا تاہم اس کا ماخذ ایک ہی ہے جو بالآخر لاہور کے نام سے معروف ہُوا۔ لاہور شہر میں بے شمار اہل اللہ کے مزار اس بات کے شاہد ہیں کہ ان خدا رسیدگان نے دینی خدمات سے اسلام کا نام روشن کیا اور اسی وجہ سے بعد از وصال بھی ان لوگوں کو وہی توقیر و تکریم حاصل ہے جو انہیں زندگی میں حاصل تھی۔

حضرت سیّد میراں حسین زنجانی ۲۶ شعبان ۳۴۷ھ میں ایران کے مشہور تاریخی شہر زنجان میں پیدا ہوئے اسی نسبت سے آپ کو زنجانی کہا جاتا ہے جبکہ آپ کا اصل نام فخر الدین تھا۔ زنجان ایران کے شمال میں کوہ البرز کے دامن میں واقع ہے۔ کسی زمانے میں یہ شہر بھی اندرجان اور سنجان کی طرح محض ایک قصبہ تھا مگر امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ شہر کی صورت اختیار کر گیا۔ یہ علاقہ بڑا زرخیز تھا اور قدرتی دولت سے مالا مال تھا۔ یہاں کی بیشتر آبادی خوشحال تھی شہر کی گلیاں اور سڑکیں کشادہ تھیں اور شہر زیادہ تر پختہ تھا۔ حضرت میراں عام بچوں سے بہت مختلف تھے نہ زیادہ روتے تھے نہ کسی چیز کے لیے چیختے چلاتے تھے بلکہ ہر وقت خوش و خرم رہتے تھے۔ آپ کی شکل و صورت بڑی پیاری اور بھولی بھالی تھی۔ اس لیے آپ کو جو دیکھتا آپ کو بے پناہ پیار کرتا تھا۔

حضرت میراں حسین زنجانیؒ کے والدِ گرامی کا نام سیّد علی محمود تھا۔ آپ سادات تھے اور آپ کا خاندانی علاقہ و ناطہ مختلف واسطوں سے حضرت امام حسینؓ کے ساتھ ملتا ہے۔ آپ کے اباء اسلاف کے خاندان خلافتِ راشدہ میں بھی اور اس کے بعد بھی عراق میں آکر آباد ہو گئے۔

تیسری صدی ہجری میں اسی سادات خاندان کے ایک بزرگ جو حضرت امام موسیٰ کاظم کی اولاد میں سے تھے بغداد سے زنجان میں آباد ہو گئے۔ اُن بزرگوار کا اسم گرامی حضرت سیّد جعفر برقعی تھا اور انہی سے ساداتِ زنجانیہ کا سلسلہ نسب آگے بڑھا۔ یہ بزرگ ہی حضرت میراں حسین زنجانی کے دادا تھے۔

حضرت میراں زنجانی کے والد سیّد علی محمود ایک خدا رسیدہ اور کامل انسان تھے۔ آپ جیّد عالم ہونے کے علاوہ کاشت کار بھی اوّل درجے کے تھے۔ آپ نے روحانیت میں بھی بلند مقام حاصل کر رکھا تھا اور اُس زمانے کے معروف پیر طریقت حضرت موسیٰؒ کے مرید تھے یہی وجہ ہے وہ اپنے نام کے ساتھ سیّد علی محمود موسوی بھی لکھا کرتے تھے۔ حضرت میراں حسین زنجانی کی والدہ ماجدہ حضرت مریم صغریٰ بڑی زاہد، عابد اور عفیفہ خاتون تھیں وہ صوم و صلوٰۃ کی پابند اور شب زندار اور تہجد گزار تھیں۔ حضرت میراں زنجانی کُل آٹھ بہن بھائی تھے آپ سب سے بڑے تھے آپ کے بعد دو بہنیں کلثوم اور زینب تھیں جبکہ اُن دونوں کے بعد تین بھائی یعقوب۔ موسیٰ۔ علی تھے اور پھر ایک چھوٹی بہن فاطمہ تھی۔ حضرت میراں حسین زنجانی کے حالات زندگی میں آپ کے ساتھ آپ کے جن دو بھائیوں کی رفاقت کے تذکرہ جات زیادہ مشہور ہیں اور وہ یعقوب زنجانی اور موسیٰ زنجانی ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں بزرگ زنجان سے نقل مکان ہو کر آپ کے ہمراہ لاہور تشریف لائے تھے۔ حضرت یعقوب زنجانی تو آپ کے والد کے مرید تھے تاہم حضرت موسیٰ زنجانی حضرت میراںؒ کے مرید تھے۔

حضرت میراں زنجانی نے ابتدائی تعلیم زنجان میں ہی ایک امام مسجد سے حاصل کی وہ بڑے فاضل اور عالم تھے انہی کی صحبت فیض سے آپ کے دل میں روحانیت باطنی اسرار و رموز جاننے کی تڑپ پیدا ہوئی۔ اسی تلاش و تڑپ میں آپ نے مرشدِ کامل کا دامن تھامنے کی جستجو شروع کی۔ اُن دنوں ابوالفضل ختلیؒ کی روحانیت کے چرچے ہر سُو عام تھے حضرت میراں حسین زنجانی کو غیبی اشارہ ہُوا کہ حضرت ابوالفضل ختلیؒ کی ہی بیعت کریں۔ چنانچہ آپ نے اپنے والد ماجد سیّد محمود سے عرض کی۔

"پدرِ من! مجھے حضرت ابوالفضل کی خدمت میں لے جائیں اور اُن سے مجھے مرید کروائیں"۔

خوش نصیب باپ نے اپنے عظیم بیٹے کی خواہش کو تسلیم کیا اور ان کو ساتھ لے کر حضرت ختلی کی خدمت میں گازرون جا پہنچے اور بیعت کی گزارش کی۔ حضرت ختلیؒ تو پہلے ہی منتظر تھے وہ بھی تائید ایزدی حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے فوراً حضرت میراں زنجانیؒ کو بیعت

کرلیا۔ یوں حضرت میراں سلسلہ جنیدیہ میں داخل ہوکر طریقت و حقیقت اور سلوک کی منازل سر کرکے روحانیت کے تاجداروں میں شامل ہوگئے۔

حضرت میراںؒ کا روحانی سلسلہ حضرت ابوالفضل ختلیؒ سے چلتا ہوا بڑے بڑے اکابروں اور صلحاؤں کے واسطوں سے حضرت خواجہ حسن بصریؒ پر جا تمام ہوتا ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے مرید تھے، حضرت میراں زنجانی نے ایک طویل عرصہ اپنے مُرشد کی خدمت میں گزارا۔ اسرارِ باطنی حاصل کرکے طویل مجاہدے اور عباداتِ الٰہی کی۔ ان ریاضتوں، عبادتوں اور مجاہدوں کے دوران آپ نے ناقابل برداشت مصائب اور سختیاں برداشت کیں۔ آپ کی تربیت حضرت ختلیؒ نے بڑی احتیاط سے کی آپ کو اشغال و اذکار سکھائے اور خلوت میں بیٹھنے کی تاکید کی۔ حضرات میراں نے اپنے مُرشد کے زیرِ نگرانی کئی ایک چلّے کاٹے۔ لمبی مدّت تک بحکم مرشد آپ ایک مکان میں گوشہ نشین بھی رہے اور اس سارے عرصہ میں آپ اکثر فاقہ سے رہتے تھے اور جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے بالکل معمولی غذا کھاتے۔ اس سے آپ کے اندر فقر و فاقہ اور قناعت کی دولتِ لازوال پیدا ہوگئی۔ آپ کو اللہ یعنی اسمِ ذات کا ذکر کثرت سے کرنے کا حکم تھا۔ اس ذکر نے آپ کو روحانیت کے چرخِ ہفتمیں پر پہنچا دیا۔

آپ کا معمول تھا کہ آپ عشاء کی نماز کے بعد عبادت الٰہی میں اس قدر مشغول ہو جاتے تھے کہ ایک وضو سے ہی عشاء و فجر کی نماز ادا فرمالیتے تھے۔ آپ نے اپنے مُرشد حضرت ختلیؒ کی خدمت بالکل غلاموں اور خادموں کی طرح کی۔ اور باادب بانصیب ہوکر آپ نے خدا سے بہت سے انعام و اکرام حاصل کیے۔ یہی خدمت ہی تھی جس نے آپ کو طریقت و تصوّف کی عملی تعلیم سے بہرور کیا۔ آپ نے اپنے مرشدِ عالی مقام کے ساتھ بے شمار سفر کیے۔ دورانِ سیاحت آپ نے جہاں اپنے شیخ کی شخصیّت کا بغور مطالعہ کیا اور اُن کی صحبت صالح سے استفادہ حاصل کیا وہاں مزدوروں کی طرح اُن کا سامان اٹھا کر خدمت بھی کرتے رہے۔ اسی اعزازِ خدمت نے حضرت میراں زنجانی کو سرتاجِ اولیا بنا دیا۔

حضرت ابوالفضل ختلیؒ نے جب یہ دیکھا کہ اُن کے مُرید میراں حسین زنجانی روحانیت کے شہباز بلند پرواز بن گئے ہیں اور وہ چراغ طریقت پر اختر روحانیت ولایت بن کر اس کائنات کو ضوفشاں اور درخشاں کرسکتے ہیں۔ تو انہوں نے حضرت میراں زنجانی کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور آپ کو رموزِ ولایت میں اعلیٰ مدارج طے کرنے پر میراں کا خطاب دیا۔

اس نام نے آپ کی شخصیت کو ایسا تاب دار کیا کہ آپ میراں کے نام سے ہی زمانے میں مشہور ہو گئے۔

خرقۂ خلافت اور خطابِ میراں حاصل کرنے کے بعد حضرت میراں زنجانی کو اُن کے مُرشد نے حکم دیا "اے میراں حسین زنجانی! تم ہندوستان جاؤ اور اسلام کی تبلیغ سے مخلوق کی خدمت کرو اور اسلام کا نام روشن کرو۔ کیونکہ تبلیغ ہمارے پیغمبر محسن الانسانیتؐ کی بہترین تقلید ہے۔"

مرشد کا حکم پاتے ہی حضرت میراں واپس زنجان والدین کے پاس آئے اور اُن کو مرشد کے حکم اور منشا سے آگاہ کیا۔ والدین نے انہیں سفر کی اجازت دے دی۔ آپ کے ہمراہ آپ کے دو برادران حضرت یعقوب زنجانی اور موسیٰ زنجانی نے بھی ارادۂ سفر کیا۔ حضرت میراں زنجانی نے ۳۸۵ھ میں اس تبلیغی سفر کا آغاز کیا۔

جس وقت آپ زنجان سے روانہ ہوئے اُس وقت رات بھیگ رہی تھی۔ آپ نے اپنا سفر جاری رکھا جب کافی رات ہو گئی تو آپ ایک بستی میں پہنچے جہاں ایک کاشت کار سلیمان نامی کے گھر آپ نے قیام کیا۔ خوش نصیب کاشت کار سلیمان نے آپ کی بہت خدمت و تواضع کی۔ اگلے روز آپ نے دوبارہ سفر شروع کیا۔ راستے میں "تُونہ" کے مقام پر زرتشی قبائل کا ٹھکانہ تھا انہیں آپ نے پیغام توحید اور درسِ رسالتؐ دیا۔ فی الفور تین آدمی مسلمان ہوئے۔ اس سے آپ کا دل بہت مطمئن ہوا یہاں ایک مہینہ قیام کے بعد آپ نے کوچ کیا اور ایران کے ایک قدیم شہر قذوین پہنچے۔ اس شہر کے لوگ اگرچہ مسلمان تھے تاہم روحِ مسلمانی سے محروم تھے۔ آپ نے قذوین میں ایک مسجد میں قیام کیا اور تبلیغ اور درس و تدریس سے اہلِ قذوین کو اسلام کی حقیقی روح سے روشناس کروایا۔ آپ کی سعی بلیغ بار آور ہوئی۔ اور صادق الیقین لوگ پیدا ہو گئے۔ قذوین سے آپ اپنے برادرِ خورد یعقوب زنجانی کے اصرار پر شہر "رے" پہنچے۔ امام فخرالدین رازی کا شہر "رے" علم و دانش اور فکر و حکمت کا گہوارہ تھا۔ آپ نے اس خوبصورت، کشادہ اور بارونق شہر میں ایک دن بسر کیا اور "رے" سے صرف پینتیس میل کے فاصلے پر واقع سبزوار پہنچے۔ اس شہر میں ساداتِ غلام کی اولاد موجود تھی۔ اس شہر میں چند زرتشتیوں کے علاوہ سب لوگ مسلمان تھے۔ یہاں سے آپ "تمنان و واقطان" سے ہوتے ہوئے نیشاپور پہنچے۔ نیشاپور عیسائیوں اور کشتیوں کا گڑھ تھا۔

یہیں پر معروف بادشاہ سلطان محمود غزنوی سے آپ کی ملاقات ہوئی جو اُن دِنوں

اپنے باپ کی حکومت کے حصول کیلئے سخت پریشان تھا۔ جو اس کے بھائی اسماعیل کے قبضے میں تھی۔ ایک روز حضرت میراں نیشاپور کی ایک مسجد میں درس دے رہے تھے کہ محمود بھی وہاں آ پہنچا۔ اور آپ کا وعظ سنتا رہا، جب وعظ ختم ہو گیا تو محمود نے آپ کی خدمت میں دست بستہ ہو کر دُعا کی یہ درخواست کی۔

"حضرت! میرے لیے خدا سے دُعا فرمائیں کہ اللہ مجھے میرے والد کا تخت حاصل کرنے میں کامیابی عطا فرمائے۔"

آپ نے محمود کے حق میں دعا فرمائی جو بارگاہ ایزدی میں قبول ہوئی۔ چند ہی دنوں کے بعد ہرات کے مقام پر اسماعیل اور محمود کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ اسماعیل میدان میں کام آیا اور محمود کامران ہوا۔

فتح حاصل کرتے ہی محمود سیدھا حضرت میراں کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی فتح کی خبر سنائی۔ آپ نے مبارکباد دے کر اُس کو ہمیشہ کامیاب و کامران ہونے اور اسلام کی بہترین خدمت کرنے کی دعا دی اور اجازتِ رخصت چاہی، محمود نے آپ کو نذرانے کے طور پر سامانِ رسد۔ گھوڑے دیے اور پروانہ حفاظت بھی دیا تاکہ اثنائے سفر میں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

نیشاپور سے آپ نے ہرات کا رُخ کیا۔ سفر طویل۔ مصیبت آگیں اور صعوبت دہ تھا۔ چنانچہ آپ کے عزیز و اقارب میں بعض جنہیں اپنا وطن مالوف چھوڑنے کا غم تھا وہ پریشان رہنے لگے۔ حضرت میراں نے ان کے لیے دعا کی اور یوں وہ آسودہ ہوئے۔ جب آپ ہرات پہنچے یہاں افغان قوم آباد تھی جن کی زبان پشتو تھی، آپ بھی پشتو زبان سے واقف تھے یہاں آپ نے دل کھول کر تبلیغ کی۔ اسی علاقے میں ایک گاؤں اسماعیل خیل بھی تھا۔ یہاں وحشی قبیلے آباد تھے۔ جو آپ اور آپ کے ساتھیوں در پہ آزار تھے۔ مگر آپ نے انہیں محمود غزنوی کا تحریر کردہ پروانہ حفاظت دکھایا تو اُن لوگوں نے آپ سے تعرض نہ کیا۔ یہاں سے آپ چھتیس میل دور "کاکا خیل" تشریف لائے۔ یہاں کے مکیں حضرت خالد بن ولید کی اولاد میں سے تھے۔ یہاں ہر گھر میں سامانِ جنگ اور چھت پر مورچہ موجود تھا۔ آپ کا قافلہ افغانستان کی حدود میں جب داخل ہوا تو آپ کے ساتھیوں نے زیادہ تر پھلوں پر گزارا کیا۔ کیونکہ انگور۔ انار۔ بادام۔ پستہ۔ خوبانی اور سردا یہاں کے مشہور پھل ہیں۔ یہاں سے اگلی منزل پر پہنچنے کے لیے آپ کو ایک تکلیف دہ پہاڑی سلسلے کو عبور کرنا تھا۔ مگر آپ نے اس کو ناپسند کیا اور طویل میدانی راستہ

اختیار کیا۔ اور ایک طویل عرصہ کے بعد آپ افغانستان کے وسطی شہر ہزارہ میں پہنچے۔

ہزارہ ایک غیر آباد پہاڑی علاقہ تھا جہاں صرف بیس گھر آباد تھے۔ جن کا سردار ایک بارعب افغانی شیبانی خان تھا جو نہایت متواضع مسلمان تھا۔ آپ اور آپکے قافلے نے تین دن مذکورہ سردار کی مہمانی میں گزارے۔ یہاں سے آپ پندرہ میل کے فاصلے پر "جنجوعہ" نامی ایک مقام پر پہنچے۔ یہ جگہ بہت پرفضا تھی۔ چہار سو ہرے بھرے باغات تھے یہاں کے لوگ بااخلاق تھے۔ یہاں سردار حشمت خان تھے جس نے آپ کی بڑی آؤ بھگت کی۔ یہاں کی زبان پشتو تھی۔ یہ جگہ بھی پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی۔ یہاں سے تین سو میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف ریگستانی علاقہ صحرائے سیستان واقع ہے۔

حضرت میراں "جنجوعہ" سے "مہمند" پہنچے یہاں کے باسی سادات اور سچے مسلمان تھے۔ ان کا پیشہ شبانی تھا۔ اب حضرت کا سفر اچھا اور تیزی سے طے ہونے لگا تھا کیونکہ محمود کی دی ہوئی سواریوں نے سفری مشکلات کا کافی حد تک آسان کر دی تھیں۔ آپ نے اگلا پڑاؤ "چنبہ" نامی مقام پر ڈالا۔ یہ دیہاتی علاقہ تھا۔ یہ لوگ سلطان محمود غزنوی کے دوست اور محب تھے۔ یہاں کا سردار وراب خان عرصہ دراز سے آشوب چشم کے مرض میں مبتلا تھا۔ اُس نے آپ کی خدمت میں دُعا کی درخواست کی آپ نے اس کی آنکھوں پر دم کیا اور وہ شفایاب ہوا۔ چنبہ کے لوگ مُصر تھے کہ آپ وہاں مستقل رہیں، مگر آپ نے اُن سے اجازت لے لی۔ اور آگے روانہ ہوئے۔ پھر آپ مسلسل سو میل تک چلتے رہے۔ اتنی لمبی مسافت کے بعد "ہلمند" نامی ایک مقام پر آپ نے رُکنے کا ارادہ فرمایا۔ یہ آبادی غریب غربا اور محنت کش لوگوں کی تھی۔ یہاں پر ایک تالاب تھا جس کا پانی کھاری تھا جس سے اہل بستی کو بڑی تکلیف تھی۔ آپ نے خدا سے دُعا فرمائی "اے ربّ العزت ہلمند کی اس بستی کے تالاب کا پانی میٹھا کر دے" اللہ نے اپنے فقیر کی دُعا قبول فرمائی اور تالاب کا پانی میٹھا ہو گیا۔ اس بستی کے سردار حمید گل نے آپ کو نقد زر پیش کرنا چاہا آپ نے اُس کو قبول نہ فرمایا۔ تاہم سامان سفر اور سواری وغیرہ آپ نے قبول کر لی۔ ہلمند کی بستی کے لوگ آپ کو رُخصت کرنے کے لیے بستی سے سات میل باہر آئے۔ اور آپ کو الوداع کہہ کر واپس چلے گئے۔

آگے کوہِ ہندوکش کا پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا، جنہیں عبور کرنا دشوار گزار تھا۔ یہاں بھی آپ نے طویل میدانی سفر کیا اور غزنی پہنچے: اُن دنوں سلطان محمود ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے پَر تول رہا تھا۔ حضرات میراں نے غزنی میں محلہ دارالسّلام میں سکونت اختیار کی جہاں

سادات غلام کے چند گھرانے رہائش پذیر تھے۔ محمود غزنوی کے افغان سردار نجیب خان نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کو شرفِ میزبانی بخشنے کی درخواست کی جو آپ نے قبول فرمائی۔ نجیب خان بڑا ہی راست باز اور پرہیزگار انسان تھا۔ روحانیت سے اُس کو بھی گہری دلچسپی تھی اس ضمن میں اُس نے ایک روز حضرت میراں سے پوچھا۔

"حضرت! اوّلین و آخرین اور بدترین بخت کون سے دو افراد ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اوّلین و آخرین اور بدترین انسان قدار بن عمر اور عبدالرحمٰن بن ملجم ہیں۔ حضرت صالحؑ کی اونٹنی کو قدار بن عمر نے قتل کیا تھا اور یہ شخص ولدالزنا تھا۔ اسی طرح عبدالرحمٰن بن ملجم بھی ایک زنازادہ تھا اور اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ حضرت علی کا مزار اور حضرت صالحؑ کی اونٹنی کی قبر دونوں نجف میں ہیں۔ ایسے ہی قدار بن عمر کی محبوبہ کا نام قطام تھا اور عبدالرحمٰن بن ملجم کی معشوقہ کا نام بھی قطام تھا۔ حضرت صالحؑ کی اونٹنی کو مقتدر اعلیٰ غیزہ کی سازش سے ہلاک کیا گیا تھا اور حضرت علی بھی مقتدر اعلیٰ جماعت خارجی کی سازش سے شہید ہوئے تھے۔"

غزنی سے حضرت اپنے قافلے سمیت کابل کے راستے جلال آباد پہنچے۔ راستے میں قصبہ جانباز میں ایک گنجا شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دُعا کا طالب ہوا۔ اس کو آپ کے برادرِ خورد یعقوب زنجانی نے پانی دم کر کے دیا۔ اور فرمایا کہ اس پانی سے پانچ دن غسل کرو۔ اُس نے ایسا ہی کیا اور وہ بالکل تندرست ہو گیا۔ اس بات کی شہرت اتنی پھیلی کہ آگے چل کر جلال آباد کا سردار یار خان اپنی بیٹی آسیہ جو جذام (کوڑھ) کے مرض میں مبتلا تھی کو لے کر حضرت میراںؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عشاء کی نماز کے بعد آپ نے خود اور اپنے تمام ساتھیوں سے یار خان کی بیٹی کی شفایابی کے لیے دُعا کرائی اور پانی دم کر دیا۔ قدرت نے اپنے کلام کی تاثیر سے اُس لڑکی کو مرض جذام سے دائمی شفا عطا فرما دی۔

اس کرامت نے آپ کی شہرت اور نیک نامی کو دو چند کر دیا۔ محمود غزنوی کا مقرر کردہ حاکم جلال آباد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اصرار کرنے لگا کہ آپ یہاں قیام فرمائیں۔ مگر آپ نے فرمایا۔

"ہم ایسا کس طرح کر سکتے ہیں۔ ہماری منزل ابھی بہت دور ہے ہمیں بلادِ ہندوستان پہنچنے کا حکم ملا ہے ہم جب وہاں پہنچیں گے پھر ہمیں قیام کرنے کا حکم ملے گا۔"

جلال آباد سے آپ کوہ سفید جو کوہ ہندوکش کی شاخ ہے اور بکثرت جنگلات کا علاقہ ہے

میں سے گزرتے ہوئے درّہ خیبر میں سے گزرے۔ یہاں آپ نے ایک بستی لقمان میں قیام کیا جو پشاور سے بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ جب قدرے سفری وتھکاوٹ تمام ہوئی تو آپ نے پشاور کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ پشاور میں پہنچ کر چند روز رُکنے کے بعد آپ ویمند بستی پہنچے اور یہاں سے دریائے سندھ کو کشتی کے ذریعے عبور کر کے مارگلہ کے مقام پر تشریف فرما ہوئے۔

مارگلہ ہندوؤں اور بُت پرستوں کا گڑھ تھا۔ یہاں ایک جادوگر بدّو نامی تھا۔ وہ جادو کے ذریعے اپنے مُنہ سے آگ نکالتا تھا۔ لوگ اُس کے کرتبوں کی وجہ سے اس کے معتقد و عقیدت مند تھے۔ حضرت میرانؒ نے یہاں پہنچ کر لوگوں کو سب سے پہلے اسلام کی دعوت دی۔ لوگوں نے آپ کی دعوت کا جواب یہ دیا کہ پہلے گوسائیں یعنی بدّو کو مسلمان کریں۔ بدّو اپنے آپ کو گوسائیں کہلواتا تھا۔

گوسائیں کو اپنے جادو پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اُس نے جب حضرت میرانؒ کی آمد اور دعوتِ اسلام کے بارے میں سُنا تو اکڑ کر بولا: "یہ کون ہے جو اپنی درویشی کا زور دکھانے آیا ہے۔ مَیں تو اُسے مانوں گا جو مجھے زیر کرے گا۔ بڑے بڑے درویش میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔"

حضرت میرانؒ نے اس شیخی خورے گوسائیں کو اپنے پاس بُلایا اور فرمایا "سُنا ہے تم اپنے مُنہ سے آگ نکال لیتے ہو۔"

عرض کی: "ہاں مَیں ایسا کرتا ہوں۔"

حضرت نے فرمایا۔ "تو دکھاؤ اپنا کمال۔"

اُسی وقت گوسائیں نے اپنے مُنہ سے آگ نکالی۔ آپ نے اللہ کا نام لے کر آگ کو پھونک ماری: آگ ہمیشہ کے لیے نکلنا بند ہو گئی۔ گوسائیں پہلے تو بہت تلملایا۔ بڑے کرتب اور منتر اُس نے پڑھے مگر آخر اُسے بے بس ہونا پڑا۔ جب اُس کی ساری شیخی نکل گئی تو وہ حضرت کے قدموں میں گر کر معافی کے لیے گڑگڑایا آپ نے اسکو معاف کر دیا۔ کلمہ پڑھایا اور مسلمان کر دیا۔

گوسائیں کی دیکھا دیکھی مارگلہ پورے کا پورا علاقہ حضرت میرانؒ کے دستِ مبارک پر بیعت ہو گیا۔ کچھ روز مزید مارگلہ میں قیام کے بعد آپ نے رختِ سفر باندھا اور گکھڑ پہنچے۔ تب یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی مگر اب گوجرانوالہ اور وزیر آباد کے درمیان واقع مشہور شہر

ہے۔ گکھڑ سے اگلی منزل آپ کی حقیقی منزل بلا ہندوستان لاہور بھی۔

۹۹۷ھ بمطابق ۱۵۸۸ء آپ نے لاہور میں قدم رنجہ فرمایا۔ یہاں پہنچتے ہی آپ نے بذریعہ کشف اپنے مرشد سے عرض کی۔ "حضرت! کیا یہی لاہور شہر ہے جہاں مجھے پہنچنے کے لیے حکم دیا گیا تھا۔"

جواب ملا: "بالکل یہی تمہاری منزل ہے۔ یہاں رہ کر ہی تمہاری روحانیت و ریاضت ثمر آور ہو گی۔"

منزل کی توثیق جب حضرت ابوالفضل ختلی نے فرما دی تو حضرت میراں نے لاہور سے آگے جانے کا سفر موقوف کر دیا۔ اور اپنے ساتھیوں کو لاہور کے مختلف حصوں میں اپنے اپنے مسکن بنانے کی ہدایت کی۔ خود آپ نے لاہور شہر کے مشرقی علاقے میں اپنا ڈیرہ لگایا۔ یہ جگہ آبادی سے تقریباً ایک کوس دور تھی۔ یہ جگہ آپ نے غالباً اس وجہ سے پسند کی کہ ایک تو یہ بڑی پُرفضا اور سکون بخش جگہ تھی دوسرے خلوت اور تنہائی زیادہ سے زیادہ میسر آسکتی تھی اہل اللہ کے لیے تنہائی۔ علیحدگی اور خاموشی تو ایک گراں بہا نعمت ہوتی ہے۔ انہیں تین چیزوں کی معاونت سے یہ افرادِ صالح عبادت و ریاضت اور روحانیت ولایت کے بلند و بالا زینوں پر قدم رکھتے ہیں۔ پھر قربِ الٰہی ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

حضرت میراں اپنی ولایت و ریاضت اور عبادت کے مردِ میدان تو تھے ہی۔ اسم با مسمیٰ بھی تھے۔ میر کا مطلب سردار ہوتا ہے اور میراں ایسے سردار کو کہا جاتا ہے جو اپنے اندر تمام سرداروں کی خوبیاں۔ اچھائیاں اور سربلندیاں سمیٹے ہوئے ہو۔ حضرت میراں حسین نے دریا کے کنارے جس جگہ پر اپنا مسکن بنایا اُس کو آپ کے نام کی نسبت سے چاہ میراں کہا جانے لگا۔ آپ کے بھائی یعقوب زنجانی چونکہ عیال دار تھے لہٰذا انہوں نے جنوبی لاہور موجودہ شاہ عالمی میں اپنی رہائش اختیار کر لی۔ اور وہ بھی اپنے دریائے فیض سے مخلوقِ خدا کو سیراب کرنے لگے جبکہ حضرت میراں کے برادر خورد حضرت موسیٰ زنجانی جو پہلے پہل اپنے بھائی یعقوب زنجانی کے ہاں تشریف فرما رہے بعد میں انہوں نے بھی اپنا مسکن مستی دروازے کے اندر بنایا۔ یوں یہ افراد صالحہ جو دور دراز کی مشکلات سہہ کر لاہور پہنچے تھے اپنے میرِ کارواں۔ صاحبِ منزل بڑے بھائی حضرت میراں زنجانی کی سرپرستی میں اور زیرِ نگرانی عبادتِ الٰہی میں مگن ہو گئے اور اس کے ساتھ ساتھ اشاعتِ اسلام اور دینِ مصطفویؐ کی فروزاں قندیلیں روشن کرنے لگے۔

لاہور میں اِن دنوں ہندو مذہب کا بول بالا تھا۔ یہاں کے باسی سورج دیوتا کے مندر میں اپنی مذہبی رسومات ادا کیا کرتے تھے۔ اس عقیدت مندی کے لیے انہوں نے بہت سے بُت بنا رکھے تھے۔ علی اہذالقیاس لاہور کو جاہلیت کے بادلوں نے پوری طرح لپیٹ رکھا تھا۔ ایسے میں کٹر ہندوؤں کو اُن کے آبائی مذہب سے متنفر کر کے اسلام کی طرف راغب کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ آپ کا زمانہ غزنوی دورِ حکومت سے بھی پہلے کا زمانہ ہے کیونکہ آپ ۴۳۸ھ میں لاہور تشریف لائے جبکہ غزنوی حکومت ۴۰۵ھ میں قائم ہوئی تھی۔ بلاشبہ ہندوستان پر مسلمان بادشاہوں نے صدیوں کامیاب حکومتیں کیں نہ اسلام کا بول بالا کیا لیکن ہندوستان میں اسلام کو روشناس کرانے اسلام کی بالادستی قائم کرنے اور اسلام کا پرچم سربلند کرنے میں بزرگان دین کا ہی زیادہ حصہ ہے۔ بزرگان دین میں اکثریت نے دور دراز سے آکر اس خطے کو نورِ اسلام سے منور کیا۔ لاہور میں تو بے شمار اہل اللہ مختلف اوقات میں مختلف علاقوں سے آئے اور یہاں ہی آسودہ خاک ہوئے۔

حضرت میراں حسین زنجانیؒ نے مسلسل تین سال نہایت مشکلات میں گزارے۔ باوجود پیہم جدّوجہد اور دن رات کی بھرپور محنت کے ایک شخص کو بھی آپ مسلمان نہ کر سکے۔ یہ وہ وقت تھا جب بڑے سے بڑا حوصلہ مند انسان بھی ہمت ہار کر اپنا پنڈ چھوڑ جاتا ہے، لیکن حضرت نے اپنے نفس کو ملامت کیا کہ اے نفس! تُو ابھی اتنا کمزور و خام ہے جو اپنی زبان کی تاثیر اور علم کی شمشیر کے جوہر دکھانے سے ایک دم قاصر ہے۔ آپ نے اپنی کوشش کو پختہ عزم کے ساتھ تین سال تک جاری رکھا۔ مگر کوئی ثمر بار نتیجہ حاصل نہ ہوا۔ ایک روز آپ نے بذریعہ کشف اپنے مُرشد حضرت ابوالفضل ختلیؒ سے درخواست کی۔

"اے پیر و مُرشد! کیا میں اسی طرح بے نیل و مرام گھومتا پھرتا رہوں گا۔ حضرت مجھے دُعا دیجئے کہ خدا مجھے اس مشن و مقصد میں کامران فرمائے۔ کیونکہ اگر اتنا دور دراز سے آکر بھی میں اسلام کی خدمت نہ کر سکا تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری زندگی بالکل بے مصرف رہی۔

آپ کو حضرت ختلیؒ نے فرمایا۔

"بیٹا! صبر کرو۔ تمہارے امتحان اور آزمائش کے دن تمام ہوئے جاتے ہیں اب وہ وقت آگیا ہے کہ تمہیں یوں گلی گلی مارا مارا پھرنا نہیں پڑے گا۔ تم سوائے جمعہ کے دن کے اپنے گھر سے بالکل نہ نکلا کرو۔ انشاءاللہ لوگ خود تیرے پاس حاضر ہو کر اسلام کی تعلیم حاصل کریں گے۔ یہ تمہارے صبر کا امتحان اللہ پاک کو لینا منظور تھا جو لے لیا گیا ہے اور تم اس آزمائش

میں سرخرو ہو گئے ہو۔"

حضرت میراں حسین زنجانی نے لاہور میں کل چوالیس سال تبلیغ کی جس میں اکتالیس سال انتہائی کامیابی کے سال تھے جب کہ پہلے تین سوال آزمائش۔ امتحان اور صبر آزمائی کے سال تھے۔ اس تبلیغ کے دوران ایک جمعۃ المبارک کے روز آپ لاہور شہر میں سے گزر رہے تھے کہ ایک ہندو شخص جو بیمار تھا لوگ اُس کو طبیب کے پاس لے کر جا رہے تھے۔ آپ نے اُس بیمار کو معالج کے پاس جانے سے روک دیا اور اس کو پانی دم کر کے دیا۔ یہ خدا کے کلام کا اعجاز تھا کہ پانی میں شفایابی کی تاثیر پیدا ہو گئی اور بیمار فوراً اچھا ہو گیا۔ بس یہ ایک ایسی کرامت تھی جس نے ہندوؤں کو آپ کی طرف اس طرح راغب کیا کہ سارا دن ہندو آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے اور رفتہ رفتہ یہی ہندو مسلمان ہوتے گئے اور آخر کار لاہور کی بیشتر آبادی مسلمان ہو گئی۔

اِسی ایک بات سے آپ کی روحانیت و ولایت متعارف ہُوئی۔ آپ لوگوں میں صاحبِ فیض و کمال بزرگ مشہور ہو گئے۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔

"ایمان کی بُنیاد، دل کی تصدیق، زبان کا اقرار، تن کا عمل اور سُنت کی متابعت ہے۔ ایسا کرنے سے ایمان محکم اور محفوظ رہتا ہے۔ تقویٰ کے بارے میں آپ کا یہ فرمان تھا۔ کہ دنیا ایک دریا کی مانند ہے۔ اس دریا کا کنارہ آخرت ہے اور تقویٰ کی کشتی کے بغیر اس دریا کو پار کرنا مشکل ہے۔ ایک مسلمان کے لیے قرآن کے احکام پر عمل کرنا دنیا سے بے رغبت ہونا ایک اہم جزو مسلمانی ہے۔ جو شخص جوانی میں فرمانِ خداوندی کو ضائع کرتا ہے خدا اس کو بڑھاپے میں ذلیل و خوار کرتا ہے۔"

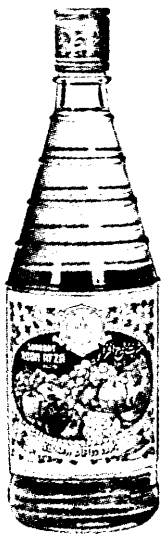
تبلیغ اسلام میں حضرت میراں حسین زنجانیؒ کے برادراں نے برابر آپ کی معاونت کی۔ حضرت یعقوب زنجانیؒ حضرت میراںؒ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی پیدائش ۳۵۶ھ میں ہوئی۔ انہوں نے بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح دینی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی۔ اور والد کے ہاتھ پر ہی طریقت کی بیعت کی تھی۔ اور بیس سال کی عمر میں علوم ظاہری و باطنی سے مکمل طور پر فراغت حاصل کر لی تھی۔ اسلام کی تبلیغ کے لیے زنجان سے لاہور کا سفر اپنے بڑے بھائی میراں صاحبؒ کی معیت میں طے کیا۔ صعوبتِ سفر برداشت کیں۔ ان کی زنجان ہی میں شادی ہو چکی تھی چنانچہ ان کے اہل و عیال بھی لاہور کے سفر میں حضرت میراںؒ کے ہمراہ تھے۔

تبریک اور تحفہ

پاکستان تفسیرِ سُورۂ رحمان ہے۔ ۲۷ رمضان المبارک کو قائم ہوا
اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ہر ہر نعمت سے نوازا۔ ہمدرد نے ان نعمتوں کو جمع کر کے
رُوح افزا جیسا مشروب تیار کیا جو پاکستان کے ہر فرد کے لیے تازگیٔ رُوح
کا سامان اور دنیا بھر کے لیے راحتِ جان ہے۔

رمضان کے مقدّس مہینے کی آمد پر ہم آپ کی خدمت میں مبارکباد اور
فرحت و تازگی کے لیے رُوح افزا پیش کرتے ہیں۔

اپنی ضرورت کے مطابق رُوح افزا ماہِ رمضان سے پہلے خرید لیں
تاکہ سحر و افطار، دونوں وقت یہ آپ کو باآسانی میسّر آئے۔



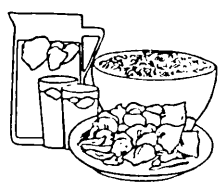
مشروبِ مشرق

رُوح افزا

رُوحِ پاکستان

ہمدرد

ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں



ادارۂ خدمتِ خلق رُوحِ اخلاق ہے

لاہور پہنچ کر حضرت یعقوب زنجانی نے کسبِ کمال اور رزقِ حلال کمانے کے لیے محنت مزدوری بھی کی اور اس کے ساتھ اسلام کی تبلیغ بھی کرتے رہے۔ آپ شریعت کے سختی سے پابند تھے آپ نے اپنے فکر و عمل سے لوگوں کو اپنا مقلد و محب بنایا۔ حضرت یعقوب زنجانی کی خدمت میں ایک مرتبہ چند مصیبت زدہ ہندو حاضر ہوئے۔ انہوں نے آپ سے دعا کے لیے عرض کیا۔ آپ نے ایسے پُرتاثیر انداز میں خدا سے دعا فرمائی کہ اسی وقت کھڑے پاؤں وہ ہندو بامراد ہو گئے۔ آپ کی اس کرامت سے لاہور شہر میں آپ کی بزرگی کے چرچے ہو گئے۔ آپ کے فیوض و برکات سے لوگوں نے بہت فائدہ اُٹھایا۔ آپ نے حضرت میراں کے مشن کو آگے بڑھانے میں اُن کی بھرپور مدد کی۔ لاہور میں لاتعداد لوگوں کو مسلمان کیا۔ لاہور کے مضافات میں میلوں آپ جا کر اسلام کی تبلیغ کرتے رہے اور لوگوں کو حلقہ بگوشِ اسلام کرتے رہے۔

حضرت یعقوب زنجانی نے ۴۶۰ھ میں وفات پائی آپ کو آپ کی قیام گاہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔ آپ کا مزار تالاب سرائے رتن چند موجودہ لیڈی ایچ سن ہسپتال کے قریب میں واقع ہے اور آج بھی زیارت عام و خاص کا مرکز ہے۔

حضرت میراں زنجانی کے دوسرے چھوٹے بھائی سیّد موسیٰ زنجانیؒ تھے یہ بھی حضرت کی معیت میں صعوبت اُٹھا کر زنجان سے لاہور آئے تھے۔ موسیٰ زنجانیؒ ۳۵۹ھ میں پیدا ہوئے۔ گھریلو ماحول علم آگیں تھا چنانچہ آپ نے بحرِ علم میں آنکھ کھولی۔ اس پاکیزہ ماحول کا اثر تھا کہ آپ شروع سے مذہبی و روحانی رجحان کے مالک تھے۔ آپ نے اپنے برادرانِ بزرگ کی طرح اپنی ابتدائی تعلیم کے مدارج اپنے والد محترم کی تربیت میں سر کیے۔ آپ نے حضرت میراں کے ہاتھ پر بیعت کی اور بھائی کی مریدی اور سرپرستی میں اسلام کی خدمت و سربلندی کے لیے لاہور کا سفر اختیار کیا۔

ایک زمانے تک آپ سُکر و جذب میں مشغول رہے۔ پھر آہستہ آہستہ آپ سلوک میں آ گئے۔ جب آپ پر مجذوبی کیفیت طاری تھی تو لاہور کے ہندو آپ کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک ہندو عورت اپنی لاچار و بیمار بیٹی کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی آپ نے تھوڑی مٹی زمین سے اُٹھا کر لڑکی کے مُنہ میں ڈال دی۔ لڑکی بفضلِ تعالیٰ صحت یاب ہو گئی۔ یوں ہندوؤں کے دل میں آپ کی عزّت و فضیلت پیدا ہوئی۔

آپ اپنی تعلیم میں توحید و رسالتؐ کا پرچار بکثرت فرماتے تھے۔ اس کے ساتھ آپ اپنے مُرشد اور بڑے بھائی حضرت میراں کی خدمت بھی بہت کرتے تھے۔ آپ عمر کے آخری حصّہ میں مستی دروازے سے نقل مکان ہو کر شمالی لاہور یعنی ریلوے اسٹیشن کی آبادی بھارت نگر جس کا نام اب پاک نگر ہے وہاں رہائش پذیر ہو گئے۔ یہیں آپ نے اپنی عمر کے بقیہ سال گزارے اور ۸۱ سال کی عمر میں واصلِ حق ہوئے۔

اوپر کی سطور پر میں نے حضرت میراں حسین زنجانی کے برادران کا مختصراً تذکرہ محض اس وجہ سے کیا ہے کہ ان دونوں حضرات نے اسلام کی تبلیغ کے اس سفر میں حضرت میراں کا بھرپور ساتھ دیا اور ان کا ذکر ناگزیر تھا۔ حضرت میراں کی شادی کا تذکرہ کسی کتاب میں رقم نہیں۔ اس لیے آپ کی نسل حضرت یعقوب زنجانی کی اولاد سے ہے۔

حضرت میراں حسین زنجانی نے جب اسلام کی دعوتِ عام کر دی تو پھر آپ کے حجرے میں عقیدت مندوں اور حاجت مندوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ آپ کی درگاہ کے قریب آپ کے مریدوں نے ایک کنواں کھدوایا تاکہ آنے والے مریدوں، عقیدت مندوں کو پانی کی سہولت ہو جائے۔ کیونکہ پہلے پانی دریا سے لانا پڑتا تھا۔ کنواں کھودا تو گیا مگر اس سے پانی جو نکلا وہ کھاری تھا۔ حضرت میراں کو جب بتایا گیا کہ پانی کھارا ہے تو آپ نے کنویں کی منڈیر پر کھڑے ہو کر پانی پر دم کیا اور یوں کھاری پانی کو ربّ العزّت نے حلاوت و مٹھاس اور شرینی عطا فرما دی۔ یہ کنواں اب بھی "میراں دی کھوئی" کے نام سے مشہور و موجود ہے۔

حضرت میراں زنجانیؒ خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ آپ نے درویشی اختیار کر کے فقرِ صادق کو حاصل کر لیا۔ حالانکہ آپ گھریلو طور پر ایک صاحب علم اور متموّل خاندان کے چشم و چراغ تھے مگر ان تمام آسائشوں کے باوجود آپ نے خدا کی رضا و منشا کے حصول کے لیے اپنے تمام سکھ و چین اور آرام تیاگ دیے۔ لاہور پہنچنے کے لیے نہ صرف سفر کی تکلیفیں اٹھائیں بلکہ لاہور کے غیر مسلموں کو راہِ حق دکھانے کے لیے اپنی زندگی خطروں میں ڈالے رکھی۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ شاہ و گدا آپ کی درگاہ پر حاضری دینا اور آپ کی جوتیاں سیدھی کرنا اپنی سعادتِ عین سمجھتے تھے۔

حضرت میراں حسین زنجانی کا فیض اتنا عام تھا کہ جو بھی خدمت میں حاضر ہوتا خالی دامن

واپس نہ لوٹتا تھا۔ چنانچہ ایک روایت ہے کہ اس زمانے میں لاہور میں ایک امیر و کبیر اور متمول ہندو شخص رہتا تھا جس کا نام رام چندر تھا۔ عالی شان مکانات اور بہت ساری زرعی زمینیں اسکی ملکیت تھیں۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ موصوف رام چندر جذام کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ بیماری نے ایسی صورت اختیار کی کہ وہ اپنے آپ اور زندگی سے نالاں ہو گیا۔ اُس کی کسمپرسی اس حد تک پہنچی کہ وہ اپنے بدن پر لباس پہننے سے بھی قاصر ہو گیا۔

حضرت میراں کی روحانیت کی شہرت اُن دنوں چرخ ہفتمیں پر ستاروں کی طرح چمک رہی تھی۔ رام چندر بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "حضرت! مجھے اس بیماری کے عذاب سے نجات دلائی جائے۔"

رام چندر جس کے جسم سے لوُ کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ اس کو حضرت میراں زنجانی نے اپنے قریب بٹھا کر اس کے پورے جسم پر دَم کیا اور پھر اس کو پانی دم کر کے دیا کہ وہ اسے عام پانی میں ملا کر اس آب پُر تاثیر سے روزانہ غسل کرے۔ رام چندر نے حضرت کی ہدایت پر عمل کیا۔ صرف تین روز متواتر غسل کرنے سے اُس کی ساری بیماری جاتی رہی۔ اس پر آپ کی اس نظرِ عنایت کا ایسا اثر ہُوا کہ وہ بلا تامل مسلمان ہو گیا۔ اُس نے چونکہ رام چندر کے نام سے شہرت حاصل کر رکھی تھی اس لیے تذکرہ جات میں اُس کا اصل نام کہیں درج نہیں۔

حضرت میراںؒ زنجانی نے اپنی زندگی میں ایک پیشن گوئی کی تھی جو حرف بہ حرف پوری ہوئی جس کا ذکر حضرت کی عظمت و شان کا بین اعتراف ہے۔ آپ نے فرمایا۔

"زنجان سے ہمارے آنے کے بعد وہاں ایک ولیٔ کامل پیدا ہوں گے۔ جن کو کشف و کرامت میں بلند مرتبہ حاصل ہو گا۔ اُن کو دنیا سعد بن علی زنجانی کے نام سے جانے پہچانے گی۔ ان کے والد کا نام بھی میرے والد محترم کی طرح علی ہو گا اور یہ بزرگ ولایت کے نابغۂ روزگار ہوں گے۔"

آپ کی یہ پیشن گوئی پوری ہوئی حافظ الحدیث سعد بن علی ۳۸۱ھ میں پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنی زندگی میں اُمّتہ المسلمہ کی اور اسلام کی بے پناہ خدمت کی۔ مذہب کی دعائیں لیں۔ خدا اور اُس کے رسولؐ کے دینِ متین کو سربلند کیا اور ۴۷۱ھ میں موصوف سعد بن علی کی وفات ہوئی۔

اس چھوٹے سے اور بظاہر معمولی سے واقعہ سے بھی حضرت میراں حسین زنجانیؒ کے روحانی مدارج اور شان کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام پڑھنے کے عمل کو بہت پسند فرماتے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر بزرگانِ دین اور اولیائے عظام نے اپنی تعلیمات میں درود پاک کو بہت اوّلیت دی ہے۔ یہ بات ہی بالکل حق ہے کہ درود پاک کی فضیلت کسی بیان کی محتاج نہیں۔

"جب ارشاد ربانی ہے: اللہ اور اس کے فرشتے اپنے حبیبؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ ایمان والو تم بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور سلام بھیجو جس طرح بھیجنے کا حق ہے۔"

اسی لیے حضرت میراں زنجانیؒ نے بھی آنحضرتؐ پر درود پاک پڑھنے کو مسنون اور افضل عمل قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ جو دلچسپی سے خالی نہیں اور جو حضرت میراں زنجانی کے وصال سے مدتوں بعد پیش آیا بیان کرنا ضروری ہے۔

"ایک شخص حضرت میراں حسین زنجانی کو کوئی اکابر ولی نہیں مانتا تھا۔ اُس کے دماغ میں ہمیشہ یہ فتور متحرک رہتا تھا کہ حضرت اتنے بڑے ولی نہیں جتنا زمانے بھر میں مشہور ہیں۔ اُس کے اندر یقین و بے یقینی کی سرد جنگ ایک مدت تک جاری رہی۔ ایک دن شیطان نے یلغار کی اور اُس نے کسی کے کہنے پر حضرت میراں زنجانیؒ کے مزار پر آکر اُن کی پائنتی کی طرف کھڑے ہو کر درود پاک پڑھنا شروع کر دیا اور دل میں سوچا۔ اگر صاحب مزار کوئی جلیل القدر اور صاحبِ کمال ہوں گے تو مجھے زور بازو سے اس عمل بد سے روک لیں گے۔"

جس نبیؐ رحمت پر خدا خود درود بھیجتا ہو وہ اپنے نبیؐ کی شان میں ایسی گستاخی کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ اُسی رات مسجد و مزار کے متولی کو خواب میں حضرت میراں زنجانی کی زیارت ہوئی انہوں نے متولی کو سختی سے ہدایت کی فلاں حلیے اور شکل و صورت کا آدمی ہمارے مرقد کی پائنتی کی طرف کھڑے ہو کر درود و سلام پڑھتا ہے۔ وہ بے وقوف ایک ولی کی آزمائش کرنے کے واسطے رسول اللہؐ کی حرمت کو داؤ پر لگانے کے لیے تُلا ہُوا ہے۔ کل جب وہ آئے تو اُس کو مزار سے باہر نکال دینا۔ ایسے ناخلف حضرات کا فقیروں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

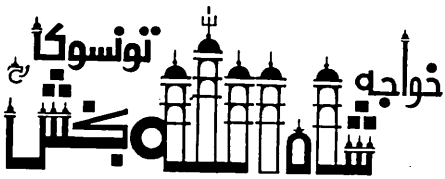
متولی نے بیدار ہو کر مذکورہ شخص جس کا تذکرہ حضرت نے عالمِ خواب میں فرمایا تھا، تلاش کرنا شروع کر دیا۔ شامتِ اعمال وہ شخص پھر اللہ کے ولی کی آزمائش کرنے مزار کی پائنتی کی طرف آ کھڑا ہوا۔ متولی نے تائیدِ غیبی سے اُسے پہچان لیا اور حضرت میراں حسین کے حکم کے مطابق اُس گستاخ رسولؐ اور دشمنِ اولیاء کو مزار سے نکال باہر کیا۔

مذکورہ بالا واقعہ بیان کرنے سے جہاں درود پاک کی فضیلت و عظمت اور ہمت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں اولیاء کے بلند مراتب اور خدا رسیدگی کی پہچان بھی ہو جاتی ہے۔

زندگی کے آخری ایام میں آپ بیمار ہو گئے۔ جب حضرت میراں کی بیماری زیادہ بڑھی تو آپ کو آپ کی عبادت گاہ یعنی حجرے سے آپ کا چہیتا عقیدت مند و مرید رام چندر بہ اصرار تمام اپنی رہائش گاہ پر لے گیا۔ آپ نے بحکم ایزدی وہاں جانے پر تامل نہ کیا۔ خدا کا یہی حکم تھا کہ آپ کا جنازہ رام چندر کے گھر سے نکلے۔ رام چندر کے گھر چند دن قیام کے بعد حضرت نے ۱۹ شعبان ۴۳۱ھ بروز جمعرات اِس دارِ فانی سے عالمِ دائمی سفر کیا اور واصل حق ہو گئے۔ آپ کے وصال کی خبر بجلی بن کر اہلِ لاہور کے دلوں پر گری۔ لوگ رام چندر کے گھر جمع ہونے لگے۔ جب آپ کا جنازہ اُٹھایا گیا تو راستے میں روایات کے مطابق حضرت داتا گنج بخش نے جنازے کو روکا۔ پوچھا یہ کس کا جنازہ ہے جب پتہ چلا کہ یہ قطب الاقطاب حضرت میراں حسین زنجانیؒ عازمِ سفرِ آخرت ہو رہے ہیں تو پھر اُن کو اپنے مُرشد کا حکم یاد آیا کہ اس جلیل القدر ولی کی مسندِ ولایت سنبھالنے کے لیے انہیں بھیجا گیا ہے۔

یوں ایک ولی لاہور شہر سے خدا کے حضور پہنچا تو دوسرا کامل انسان اہلِ لاہور کی راہنمائی کے لیے خدا نے یہاں بھیجا۔

حضرت میراں حسین زنجانیؒ کا مزارِ اقدس مطہر چاہ میراں کی خوبصورت آبادی میں سطحِ زمین سے بلند سبز گنبد کے ساتھ ایستادہ ہے اور تجلیات ہی کا مرکز ہے جہاں زائرین کا ہر وقت میلہ لگا رہتا ہے۔



بہادر شاہ ظفر مغلیہ سلطنت کے آخری تاج داروں میں سے تھا۔ یہ بادشاہ اہلِ اللہ کا بہت عقیدت مند تھا۔ اُس کو جب علم ہوا کہ دہلی میں کوئی کامل ہستی تشریف لائی ہوئی ہے تو وہ بڑے کروفر کے ساتھ ایک جلوس کی شکل میں ہاتھی پر سوار ہو کر اُس بزرگ کی زیارت کرنے اور فیوض و برکات سے اپنا دامن بھرنے حاضرِ خدمت ہوا۔

ابوالمظفر سراج الدّین

دینِ کامل کے سچے پیروکاروں کا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ وہ دُنیا داروں سے دُور بھاگتے ہیں۔ یہ بزرگ جن کی قدم بوسی کو بادشاہِ وقت آ رہا تھا کے دل میں بھی اِس چیز کی مطلق پرواہ نہ تھی کہ حاکمِ وقت اِن سے مِلنا چاہتا ہے۔ لہٰذا بادشاہ کی آمد کی خبر سُن کر دہلی شہر سے تنِ تنہا نکل کر صحراء کی طرف چل دیے۔ بادشاہ کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ آپ کے راستے میں آپ کا منتظر کھڑا رہا۔ اور حضرت کو بہت مشکلوں اور منتوں سے واپس لایا گیا۔ جب بادشاہ نے حضرت کو واپس آتے دیکھا تو آگے بڑھا اور اُن کے قدموں میں بیٹھ کر دعائے خیر کی درخواست کی۔ بادشاہ نے آپ کی خدمت میں بہت سا نقد و زر اور ایک ہاتھی پیش کیا۔ ہاتھی آپ نے حضرت نظام الدّین کے صاحبزادے کی نذر کر دیا اور دیگر نقد روپیہ اہلِ مجلس میں تقسیم کر دیا۔

بادشاہ کا آنا تھا کہ شاہی خاندان کے بے شمار افراد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شرفِ مریدی حاصل کیا۔ بادشاہ اپنے شہزادوں کو بھی آپ کی خدمت میں لے کر آیا اور اُن کو بھی بیعت کروایا اور ایک جلیل القدر اور کامل انسان کی دعائیں لیں۔

یہ بزرگ جن کا سطور بالا میں ذکرِ خیر بیان کیا گیا ہے۔ خواجہ شاہ اللہ بخش تونسویؒ تھے۔ آپ جلیل القدر بزرگ اور شہباز ولایت حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کے پوتے تھے۔ غوثِ زمان حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے تین بیٹے تھے۔ جن میں سب سے بڑے حضرت خواجہ گل محمدؒ تھے۔ دوسرے دو حضرت خواجہ درویش محمدؒ اور حضرت عبداللہ معصوم تھے۔

حضرت خواجہ گل محمدؒ بڑے نیک اور پارسا انسان تھے آپ کی بیعتِ ارادت مورثِ اعلیٰ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ سے تھی۔ حضرت گل محمدؒ اسم بامسمّٰی یعنی ایسے پھول تھے جس کی خوشبو سے مشام جان تازہ ہو جاتا تھا۔ انہی خواجہ گل محمد صاحبؒ کے ہاں ۱۲۴۱ھ میں ذوالحجہ کے مہینے میں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کی پیدائش کی خوش خبری حضرت سلیمان تونسویؒ کو حضرت نور محمد مہارویؒ کے مزار پر ملی کیونکہ وہ اُن دنوں خواجہ نور محمد صاحبؒ کے عرس پر گئے ہوئے تھے خواجہ تونسوی پوتے کی پیدائش کی خبر سُن کر بہت خوش ہوئے اور نومولود کا نام اللہ بخش رکھا۔

خواجہ اللہ بخش نسلاً اور نسبتاً خانوادہِ ولایت سے تعلق رکھتے تھے اس لیے اُن کو مادر زاد ولی کہنا بے جا نہ ہو گا۔ آپ جب بڑے ہوئے تو آپ کی تعلیم کا آغاز ہُوا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے مولوی محمد امین صاحب سے حاصل کی جنہوں نے آپ کو قرآن کریم۔ عربی حرف و نحو کی چند کتابیں اور پھر تفسیر و حدیث پڑھائی۔ یہاں تک کہ مجملہ علومِ ظاہری کی تکمیل کر دی۔ ظاہری تعلیم سے جونہی آپ فارغ ہوئے تو آپ کے دادا حضرت خواجہ سلیمان غوثِ زمان نے آپ کی باطنی تعلیم کی طرف توجہ دی اور سلوک و معرفت کی تعلیم اپنے پوتے کو خود دینے کا فیصلہ کیا۔ پھر جوں جوں وقت گزرا خواجہ اللہ بخش روحانیت کے اعلیٰ وارفع مدارج طے کرتے ہوئے اہلِ اللہ کی جماعت میں شامل ہو گئے۔

حضرت غوثِ زمان خواجہ سلیمان تونسویؒ نے اپنے وسائل سے بہت عرصہ پہلے ہی آپ کو اپنی "دلائل الخیرات" عطا فرمائی اور حکم دیا۔

"اللہ بخش اب یہ مجھ سے نہیں پڑھی جاتی۔ اُس کو میری طرف سے آپ پڑھا کریں۔ اس کے علاوہ مریدوں کے شجروں پر میری جانب سے دستخط کیا کریں۔"

اس حکم کے مطابق حضرت غوثِ زماںؒ کی زندگی میں یہی خواجہ اللہ بخش مریدوں کے شجروں پر جب دستخط کرتے تو اپنا نام لکھنے کی بجائے اپنے جلیل القدر جدِ امجد کا نام ہی تحریر کرتے۔ اور جب غوثِ زماںؒ کا وصال ہو گیا اور آپ سجادہ نشین بن گئے تب بھی حضرت غوث زماںؒ کا نام ہی دستخطوں کی جگہ تحریر فرماتے۔

حضرت سلیمان تونسویؒ تو شروع سے ہی جانتے تھے کہ ان کی مسندِ روحانیت و معرفت پر متمکن اگر ہو گا تو اُن کا یہی پوتا اللہ بخش ہو گا تاہم اس بات کی بشارت خواجہ اللہ بخش کے والد بزرگوار خواجہ گل محمد صاحب کو سیّد جمال بیکانیری نے دی۔ کیونکہ ایک مرتبہ بچپن میں خواجہ اللہ بخش شدید بیمار ہو گئے۔ اُن کی زندگی کی کوئی اُمید باقی نہ رہی۔ حضرت گل محمدؒ بیٹے کی بیماری سے سخت پریشان تھے۔ انہوں نے حضرت سلیمان تونسویؒ کے ایک چہیتے مُرید سیّد جمال بیکانیری سے کہا کہ وہ خواجہ اللہ بخش کی بیماری کے متعلق استخارہ کریں۔ حضرت بیکانیری نے حسبِ ارشاد جب استخارہ کیا اور خواب میں جو احوال دیکھا وہ خواجہ گل محمد سے یوں بیان فرمایا۔

"ایک مجلس لگی ہوئی ہے جس میں خواجہ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ۔ حریق المحبت حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ محبِ النبی حضرت مولانا فخر الدین دہلوی اور خواجہ نور محمد مہارویؒ تشریف فرما ہیں۔ ان حضرات میں سے ایک بزرگ جو ہندوستانی وضع قطع کے بزرگ تھے۔ انہوں نے خواجہ اللہ بخش کا ہاتھ پکڑا اور حضرت غوثِ زماںؒ کے بنگلہ شریف میں جا کر اُن کے مصلّہ پر بٹھا دیا اور پھر اُن کے سر پر سبز رنگ کی دستارِ فضیلت باندھی اور واعظ کرنا شروع کر دیا۔ میاں جمال بیکانیری نے حالتِ خواب میں ہی کسی سے پوچھا کہ یہ خواجہ اللہ بخش کو حضرت سلیمان تونسویؒ کے مصلّہ پر کیوں بٹھایا جا رہا ہے تو اہلِ مجلس نے یک زبان ہو کر فرمایا۔

"یہ حضرت سلیمان تونسویؒ کی مسند کا وارث ہو گا۔

یہ خواب جمال بیکانیری نے خواجہ گل محمد کو سنایا تو انہیں خوشی بھی ہوئی اور دُکھ بھی۔ خوشی اس بات کی کہ اُس خواب میں بیٹے کی صحت یابی کی نوید تھی اور دُکھ اس بات کا تھا کہ اُن کی زندگی یقیناً تمام ہونے والی تھی۔ کیونکہ اُن کی زندگی میں تو خواجہ اللہ بخش حضرت غوثِ زمان کے خلیفہ نہیں ہو سکتے تھے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ خواجہ گل محمد کا انتقال حضرت خواجہ

سلیمان تونسویؒ کی زندگی میں ہی ہو گیا اور مسندِ سلیمان پر اُن کے صاحبزادے کے بیٹے خواجہ اللہ بخش متمکن ہوئے جو درحقیقت اس خلافت کے صحیح حقدار بھی تھے۔

حضرت سلیمان تونسویؒ کا جب وصال ہوا تو سوئم کے روز حضرت خواجہ اللہ بخشؒ کی رسم دستار بندی سجادگی ہوئی۔ آپ کو حضرت غوثِ زمانؒ کے مصلّے پر بٹھا دیا گیا اور حضرت سلیمان کا پیراہن اور کُلاہ پہنایا گیا۔ پھر اس کلاہ کے اوپر حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کا پٹکہ دار ٹوپ رکھا گیا اور اس طرح آپ روحانیت کی شہنشاہیت تونسوی کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔

حضرت اللہ بخشؒ میں سجادہ نشین بنتے ہی نمایاں تبدیلیاں آگئیں۔ صاحب زادگی کے زمانے میں آپ اعلیٰ پوشاک زیبِ تن کیا کرتے تھے اور دن میں کئی لباس تبدیل کرتے تھے۔ قیمتی گھوڑوں پر سواری کیا کرتے تھے مگر سجادگی کے بعد آپ حضرت سلیمان تونسویؒ کے پیرہن کی طرز کا پیرہن سادہ، کلاہ اور نیلے رنگ کا تہہ بند پہنا کرتے تھے۔ نیلے رنگ کا تہہ بند تو گویا خواجگان تونسویؒ کی پہچان ہوا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے کسی نے آپ سے سوال کیا۔

"حضرت کیا آپ کے سلسلہ کی پہچان نیلا تہہ بند ہے؟"

آپ نے جواباً فرمایا۔ "نہیں ہمارے سلسلہ کی پہچان تو پانچ وقت کی نمازِ باجماعت سے ہے۔"

خواجہ اللہ بخش نے اگرچہ روحانیت کی بلند منزل بغیر مجاہدہ پائی تھی مگر حصولِ نعمت کے بعد اس طرح وہ اشغال عبادت و مجاہدہ میں مصروف ہو گئے کہ اپنے جدِ امجد کے جملہ معمولات میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں رکھتے تھے۔ شب و روز اشغال باطنی و ورد میں مصروف رہتے تھے آپ نے بے شمار وظائف حضرت نور محمد مہارویؒ کے مزار پر کیے۔ اور ہر سال باقاعدگی سے خواجہ نور محمد مہاروی اور خواجہ فرید الدین گنج شکر کے مزار پر حاضری دیتے تھے۔ اس دوران بیشمار درویش آپ کے ہمراہ ہوتے تھے اور ہر سال لاتعداد لوگ آپ سے بیعت کرتے تھے۔

آپ کے دل میں مشائخ عظام کی درگاہوں پر زیارت کے لیے جانے کا بے حد شوق تھا۔ اس لیے آپ نے ۱۲۷۰ھ میں سیاحت کا ارادہ فرمایا اور ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ کے ہمراہ سینکڑوں کی تعداد میں درویش تھے۔ آپ کی پہلی منزل چشتیاں تھی جہاں آپ نے حضرت نور محمد مہاروی کی درگاہ پر حاضری دی اور اُن کے صاحب زادگان سے ملاقاتیں کیں اور پھر خواجہ غلام فخر الدین مہاروی کو اپنے ہمراہ لیا اور چشتیاں سے ناگور تشریف لے گئے۔

اور حضرت حمید الدین ناگوریؒ سے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔ آپ کی اگلی منزل اجمیر شریف تھی۔ ۲۷ جمادی الثانی ۱۲۷۰ھ کو آپ درگاہِ خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی اجمیری میں پہنچے اور اپنا دامن فیوض و برکات سے بھر لیا۔

اُن دنوں خواجہ غریب نواز کا عرس ہونے والا تھا۔ چنانچہ آپ نے عرس کی تقاریب میں بھی شرکت کی۔ خواجہ زادگان اور خادمانِ درگاہ جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی بیعت کی۔

اجمیر سے آپ جے پور کے لیے روانہ ہوئے اور چار روز تک حضرت فخر الدین دہلویؒ کی درگاہ پر قیام کیا کیونکہ مولانا آپ کے سلسلۂ طریقت کے جدِ امجد تھے۔ یہاں سے آپ دہلی روانہ ہوئے اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزارِ پاک پر حاضر ہوئے اور پھر نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے مزار مقدس پر بھی تشریف لے گئے۔ یہیں آپ کی خدمت میں بادشاہِ وقت بہادر شاہ ظفر حاضر ہوا جس کی ملاقات سے پہلے آپ نے گریز کیا مگر بعد میں اُس کی مسلسل درخواست پر آپ نے تلطف فرمایا اور شاہی خاندان کے متعدد افراد کو بیعت بھی کیا۔

دہلی سے واپسی پر آپ نے راستے میں کچھ عرصہ دربارِ مہار شریف میں قیام کیا اور پھر چشتیاں سے ہوتے ہوئے تونسہ شریف پہنچے۔

بزرگانِ دین کی زیارتوں سے بامشرف ہونے کے بعد آپ کے دل میں شاہِ کونینؐ کی خدمت میں حاضری کی اُمنگ جاگی چنانچہ آپ بقول خواجہ شمس الدین سیالویؒ ۱۲۹۹ھ میں ۱۴ جمادالثانی کو دو سو درویشوں کے ہمراہ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ کے پاس زادِ راہ کیلئے ساٹھ ہزار روپے تھے۔ آپ کا یہ منشا تھا کہ زادِ راہ زیادہ سے زیادہ ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ درویشوں کو اپنے ہمراہ لے جا کر حج کی سعادت سے بامشرف و بامراد کریں۔ آپ کے ہمراہ صاحب زادگانِ مہاروی اور دیگر احباب بھی تھے۔ ان سب کے ساتھ آپ بزرگانِ دین کی درگاہوں پر حاضریاں دیتے ہوئے۔ بمبئی سے بحری جہاز کے ذریعے جدّہ شریف پہنچے وہاں ایک رات کا قیام کر کے مکّہ شریف حاضر ہوئے ایک مہینہ سترہ دن مکّہ میں قیام کرنے کے بعد مدینہ منوّرہ پہنچے اور آنحضرتؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضری دی اُن دِنوں رمضان کا مہینہ تھا آپ مدینہ منورہ میں دو مہینے اور تین دن ـــــ رہے اور دن رات حضورؐ کی قدم بوسی میں مصروف رہے۔ پھر ۱۹ ذی قعدہ کو آپ دوبارہ مکّہ تشریف لے گئے اور مناسکِ حج میں مصروف ہو گئے۔ آپ کی یہ مصروفیات ۱۸ ذوالحجہ تک جاری رہیں۔ حج ادا کرنے کے بعد آپ

جدّہ روانہ ہوئے اور پھر دُخانی جہاز کے ذریعے بمبئی پہنچے اور وہاں سے بذریعہ ریل دہلی کے کے راستے لاہور اور ملتان پہنچے اور وہاں ۸؍ دسمبر ۱۸۸۳ء بمطابق ۲۷؍ محرم ۱۳۰۰ھ تونسہ شریف واپس پہنچ گئے۔

آپ کی خدمت میں ایک نیک انسان حاجی غلام حسین ہوا کرتے تھے۔ کے سفر میں وہ بھی آپ کے ہمراہ تھے اُن کو زمانے کے قطبِ مدار کی زیارت کرنے کا بہت شوق تھا وہ اکثر آپ کی خدمت میں اپنی اِس خواہش کا تذکرہ کیا کرتے تھے آپ مسکرا کر فرما دیتے تھے۔

"غلام حسین جب حج پر چلیں گے تو مکّہ شریف کی ایک مسجد میں تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائیں گی اور تمہیں زمانے کے قطب مدار کی زیارت کروا دی جائے گی۔"

غلام حسین اور اُن کے ایک پیر بھائی احمد علی روایت کرتے ہیں۔

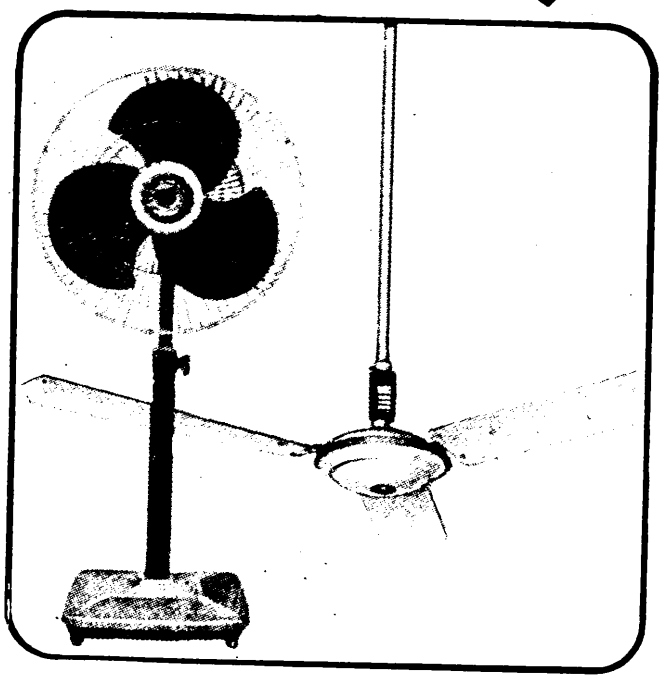
"حج کے موقع پر ہم بھی حضرت خواجہ اللہ بخش کے ہمراہ تھے ایک روز مکّہ شریف کی ایک مسجد میں ہم لوگ نماز ادا کرنے گئے۔ نماز کے بعد ہم نے دو اشخاص جو نہ تو ہماری جماعت میں سے تھے اور نہ ہی عربی تھے اُن کا حُلیہ ہمارے پہچان سے باہر ہی تھا اُن کو یہ کہتے سُنا کہ آج اس مسجد میں قطبِ مدار تشریف لا رہے ہیں سب لوگ ہماری طرح قطب مدار کی زیارت کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ ہمارا اشتیاق بھی بڑھا اور اِس بات کی ــــ خوشی بھی ہوئی کہ ہمارے مُرشد حضرت خواجہ اللہ بخشؒ کا فرمانا بالکل برحق ثابت ہوا کہ قطبِ مدار کی زیارت مکّہ شریف کی ایک مسجد میں ہو گی۔ انہی خوشیوں سے سرشار دیگر حضرات کے ساتھ ہم بھی زمانے کے قطبِ مدار کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں حضرت خواجہ اللہ بخش ایک جلوس کی شکل میں اُسی مسجد میں تشریف لائے جہاں قطبِ مدار کی آمد کا انتظار ہو رہا تھا۔ لوگ بھاگے اور آپ سے مصافحہ کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا کہ "زمانے کے قطبِ مدار آ گئے۔"

ہم دونوں جو حضرت اللہ بخش کے خاص مریدوں میں سے تھے خوشی سے ہواؤں میں اُڑنے لگے کہ زمانے کے قطب مدار کے ہم مریدِ ماضی ہیں۔ ہمیں دیکھ کر حضرت خواجہ اللہ بخشؒ فرمانے لگے "غلام حسین و احمد علی! دیکھا اللہ تعالیٰ نے تمہاری خواہش پوری کر دی۔"

ہم نے عرض کی "حضور! اللہ تعالیٰ نے ہماری خواہش بھی پوری کر دی کہ ہمیں وقت کے

PRINCE

پرنس پنکھے



پرنس انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ ۲۹/اے، سمال انڈسٹریز اسٹیٹ۔ جی۔ ٹی روڈ گجرات

فون:(04331) 3305 پانچ لائنیں

قطبِ مدار کی زیارت نصیب فرمائی اور یہ اعزاز و مرتبہ بھی عطا فرمایا کہ زمانے کے قطبِ مدار ہمارے خواجہ ہیں۔ ہم کہاں تک اپنی خوش بختیوں پر ناز کریں اور خدا کے حضور سجدہ ہائے شکر تو جتنا زیادہ ادا کریں اتنا ہی کم ہے۔"

ایک مرتبہ سفرِ ہندوستان کے دوران آپ کی ملاقات کے لیے بیکانیر کے والی راجہ سردار سنگھ آئے اور عرض کی۔

"حضرت! میں آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ مگر بزرگ حضرات کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتے۔ میں آپ پر احسان تو نہیں کرنا چاہتا صرف خدا کی رضا جوئی اور عاقبت اندیشی کے لیے آپ کی خدمت کرنے کا آرزومند ہوں مجھے اجازت دیجئے۔"

حضرت نے فرمایا "سردار سنگھ! ہم فقیر ہیں ہماری ملاقات و خدمت سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ تم خدا کے دینِ اسلام کو نہیں اپناتے۔" یہ کہہ کر آپ نے اُس کی پیش کش سے دامن بچا لیا۔

حضرت کا اخلاق نہایت اعلیٰ تھا۔ آپ علم و عمل۔ لطف و کرم اور زہد و ارتقا کے مجسمہ تھے۔ کریم النفس اور خوش اخلاق ایسے تھے کہ خواہ دوست ہو چاہے دشمن آپ کا تلطف بلا فرقِ مراتب ہر ایک پر یکساں ہوتا تھا۔ آپ کے اخلاق کا نقش ہر ملنے والے کے دل پر ثبت ہو جاتا تھا۔

آپ کی نظر میں اہلِ دنیا کی ذرہ برابر وقعت نہ تھی آپ بے حد غریب نواز تھے امیروں اور دنیا داروں کو بالکل قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ غریبوں اور بے کسوں کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور اُن کی طرف خصوصی توجہ دیتے تھے۔

آپ نے مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لیے اصلاح و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ آپ کے ملفوظات میں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ علماء کے طبقے کی اصلاح پر خاص طور پر توجہ فرماتے تھے کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ اگر علماء کی اصلاح ہو جائے تو پھر اسلامی معاشرہ کسی صورت میں بھی نہیں بگڑ سکتا۔ ایک مرتبہ کسی مسئلہ پر مختلف علماء نے مختلف فتوے دیئے اور گروہ بندی کے زیرِ اثر شریعت کو مسخ کرنے کی

کوشش کی۔ آپ کے علم میں جب یہ بات آئی۔ تو آپ نے تمام علماء کو اکٹھا کیا اور بھری مجلس میں اُن کی مذمت کی۔

اسی طرح قادیانی، دجالی فرقے کے فرتوت و کذاب بانی نے جب اپنے عقائدِ باطلہ کی ترویج و اشاعت شروع کی اور علماء اور اکابرین کو مباحثہ و مناظرہ کی دعوت دی تو آپ نے اپنی جگہ بیٹھ کر نہایت سختی سے اِن فتنوں۔ فسادوں کی تردید کی اور یہ آپ کی صالحہ کوشش کا بہترین نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کا مذہبی احساس و وجدان ان گمراہ تحریکوں سے متاثر نہ ہُوا۔ آپ اور آپ کے زیرِ اثر مرید اور بزرگوں نے قادیانی مرتد کو کیفر کردار تک پہنچانے میں بہترین کردار ادا کیا۔

حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ نے ایک مرتبہ ایک مجلس میں خواجہ اللہ بخش تونسویؒ کے اوصاف یگانہ کا ذکر چھیڑا تو آپ نے فرمایا۔

حضرت خواجہ اللہ بخش تونسوی باوجود خاندانی عظمت و بزرگی کے عبادت و ریاضت میں سب سے سبقت لے گئے اور قربِ ذات حاصل کر لیا۔ آپ کے فضائل میں تین چیزیں سب سے نمایاں اور قابلِ ذکر ہیں۔ جن میں ایک تو خدمتِ فن قرأت دوسری پاک پتن شریف کی خانقاہ کی خدمت اور تیسری خدمتِ حرمین الشریفین ہے۔

اوّل الذکر خدمت فن قرأت کی خدمت یہ تھی کہ آپ کے علاقہ میں عرصہ دراز سے کسی کو بھی قرآن پاک کی قرأت کی صحت کا کوئی خیال نہ تھا۔ آپ نے ایک حافظ اجل جس نے قرآن پاک عرب شریف میں علم تجوید و قرأت و فوائد کی پابندی کے ساتھ سیکھا تھا۔ اپنے ہاں مقرر کیا اور علاقے کے لوگوں کو قرأت کی تصحیح کی دعوت دی۔ چنانچہ بے شمار لوگوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآنی تعلیم سے بہرہ یاب ہونے کی سعادت حاصل کی۔ اس سلسلۂ تدریس کی شہرت یوں ہوئی کہ تمام علاقے میں قرأتِ قرآن کی صحت بہتر ہو گئی اور خواجہ اللہ بخش نے قرآن پاک کی دعائیں لیں۔ اور خدا سے بلند مراتب پائے۔"

حضرت خواجہ اللہ بخش جہاں عبادت و ریاضت اور معرفت و طریقت کے مردِ میدان تھے وہاں آپ انتظامی صلاحیتوں سے بھی مالا مال تھے۔ آپ نے تونسہ شریف میں آنے والے مریدوں اور زائرین کے لیے تعمیرات کیں۔ اِن تعمیرات میں خانقاہ عالیہ سلیمانیہ کی بیشتر عمارتیں قابلِ ذکر ہیں۔ یعنی روضۂ مبارک۔ جامع مسجد، حوض۔ گھنٹہ گھر۔ مہمان سرائے۔ لنگر خانے۔ مسافر خانے۔

اسی طرح جامع مسجد کے دروازے کے قریب رہٹ والا کنواں بھی تعمیر کروایا جس سے تمام گھروں۔ لنگر خانوں اور مہمان خانوں کو پانی جاتا تھا۔ بلکہ سارا شہر اس میٹھے پانی کے کنویں سے پانی بھرتا تھا مسجد کے جنوبی کونے پر ایک گھنٹہ گھر تعمیر کروایا تھا جس کی آواز سے دور دور تک وقت کا پتہ چلتا تھا۔

تونسہ کی تعمیرات کے بارے میں مشہور مورخ فاربس نے لکھا ہے۔

"حضرت خواجہ اللہ بخش تونسوی میں انتظام و تعمیرات کے کام کی بہت بڑی لیاقت تھی۔ انہوں نے لنگر خانے۔ سرائے و مکانات وغیرہ بنائے۔ جب ان کے بڑے خلفاء دادا حضرت غوث زماں خواجہ سلیمان تونسویؒ کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے کچے مکانات گروا کر اُن کی جگہ فراخ آستانے۔ درگاہیں اور مسجدیں بنوائیں اور ان کے اردگرد پختہ اینٹوں کے مدرسے اور درویشوں۔ مولویوں کے لیے رہائشی مکانات تعمیر کروائے۔"

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سخت قحط پڑ گیا اس قحط سالی کے سبب سب لوگ بہت پریشان ہو گئے۔ لوگ حضرت اللہ بخش تونسوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی۔

"حضرت! اللہ پاک سے دُعا فرمائیے خدا ہمارے قصور معاف فرمائے اور خشک سالی سے نجات دلائے اور ہمیں پانی جیسی نعمت سے مالا مال فرمائے۔ انہی عرض گزاروں میں ایک شخص نے گڑگڑاتے ہوئے یہ شعر بھی پڑھا۔

ما ہمہ تشنہ لبانیم تو ئی آبِ حیات
لطف فرما کہ زحدمے گزرد تشنہ لبی

حضرت اللہ بخش تونسویؒ نے آزردہ خاطر لوگوں کو تسلی دی اور انہیں کچھ پڑھنے کی ہدایت کی اور خود بھی خدا سے گزارش کی کہ اے اللہ ان پریشان حال لوگوں کی دادرسی فرما۔

ایک ہفتہ کے بعد انہیں آشفتہ حالوں کا گروہ دوبارہ آیا اور شاکی انداز سے عرض کی۔

"حضرت ہم نے تو آپ کے ارشاد کے موجب جتنا ہو سکا ہے پڑھا ہے مگر ابھی تک مُراد بر نہیں آئی۔"

آپ نے یہ بات سُنی تو مسکرا کر فرمایا۔ "فکر کیوں کرتے ہو ذرا نالے (نہر) کو جا کر دیکھو۔" لوگ نالے کی طرف بھاگے دیکھا تو خشک اور سوکھا ہوا نالہ پانی سے بھر چکا تھا اور اُس پانی نے تمام علاقے کو سیراب کر دیا اور یوں خشک سالی دور ہو گئی۔

حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کے وصال کے بعد اُن کے ایک چہیتے مرید جو بہت متقی اور اور صالح درویش تھے اور جن کا نام میاں حبیب یوسف زئی تھا۔ اُن کے دل میں ایک مرتبہ خیال آیا کہ زندگی بھر حضرت کے قریب رہا مگر پیر و مُرشد سے اذکار و اشغال اور مراقبہ کے طریقے کار نہیں سیکھے۔ اب وہ پاس نہیں ہیں۔ یہ خیال انہیں بے چین کرنے لگا۔ اِسی پریشانی میں غلطاں وخیزاں جب حبیب یوسف زئی حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے مزار پر گئے اور اپنی مشکل حضرت کی خدمت میں بیان کی اُسی رات خواب میں حبیب یوسف کی ملاقات حضرت تونسوی سے ہوئی۔ حضرت خواجہ صاحب اپنے بنگلہ میں مصلّہ پر تشریف فرما ہیں اور اُن کے پاس حضرت خواجہ اللہ بخش بھی موجود ہیں۔ حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا۔

"اے حبیب! تو ہمیں مردہ سمجھتا ہے۔ ہم تو زندہ ہیں یہ صرف پردۂ شریعت ہے۔ پھر آپ نے حبیب کا ہاتھ پکڑ کر خواجہ اللہ بخش کے ہاتھ میں دے دیا اور فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ اللہ بخش کو فقیری سے خالی رکھا گیا ہے۔ انہیں اپنی جگہ اپنی نعمت عطا کر کے مقرر کیا گیا ہے اس لیے جو کچھ پوچھنا مقصود ہو۔ اِن سے پوچھ لیا کرو۔ کیونکہ میں اور یہ ایک ہیں۔"

اس خواب نے حبیب یوسف زئی کے دل میں ڈلی ہوئی گرہ کھول دی اور اُن کی نظر میں حضرت خواجہ اللہ بخش کا مقام دوچند ہو گیا۔

حاجی نجم الدینؒ فرماتے ہیں "حضرت سلیمان تونسویؒ میرے پیر و مُرشد تھے۔ اُن کے وصال کے بعد میں ایک دفعہ میں تونسہ شریف آ رہا تھا راستے ــــ میں ملتان میں حافظ جمال الدین ملتانی جو حضرت قبلۂ عالم خواجہ نور محمد مہاروی کے خلیفہ ہیں کی خانقاہ میں قیام کیا وہاں میری ملاقات عمر خان نامی ایک افغان کے ساتھ ہوئی جو ایک صالح اور درویش صفت پیر بھائی تھے انہوں نے مجھے بتایا۔ "میں نے ایک شب خواب میں دیکھا کہ حضرت غوثِ زماں جناب خواجہ سلیمان تونسویؒ اپنے پوتے اللہ بخش کو اپنے جسم مبارک سے لپٹا رہے ہیں اور اُن کا قد لمبا ہوتا جا رہا ہے اور حضرت اپنے دہنِ مبارک سے حضرت صاحب زادے اللہ بخش کے دہن مبارک میں اپنا سانس داخل کر رہے ہیں۔ میں قریب ہی کھڑا تھا۔ میری طرف حضرت غوثِ زمان نے دیکھا اور فرمایا کہ یہی "نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ" ہے۔"

مولوی "دُرِ محمد سوکڑی" فرماتے ہیں "ایک دن میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہم غریب

لوگ کئی کئی کوس کے فاصلہ سے حضرت اللہ بخش کی خدمت میں زیارت و قدم بوسی کے لیے حاضر ہوتے ہیں آپ عالی مرتبت اتنے مصروف ہوتے ہیں آپ کو کیا خبر ہوگی کہ کون آیا اور کون گیا ہے۔ بھلا شاہ کو گدا سے کیا کام۔ ایک مرتبہ میں حضرت کی محفل میں بیٹھ کر جب رُخصت ہونے لگا تو آپ نے فرمایا۔

"اے دُر محمدؐ! ہم بے پرواہ نہیں سچے مریدوں کو ہم ہمیشہ یاد رکھتے ہیں" یہ سن کر میرا دل مطمئن ہُوا اور میرے دل میں حضرت ثانی صاحب کی بزرگی اور کریمی کا اعتقاد و یقین اور زیادہ پختہ ہو گیا۔

حضرت اللہ بخش تونسویؒ کا حلیہ مبارک بہت ہی پُرکشش اور جاذبِ نظر تھا۔ آپ کا چہرۂ مبارک فراخ۔ پیشانی کشادہ۔ آنکھیں بڑی بڑی مگر خوبصورت تھیں۔ پیشانی کشادہ اور ڈاڑھی گھنی تھی۔ جسم مبارک بھاری بھرکم اور قد درمیانہ تھا۔ لمبا کُرتہ زیب تن کرتے تھے اور نیلے رنگ کی تہہ بند استعمال فرماتے تھے۔ سر پر قادری لوٹی پہنتے تھے۔ سردیوں میں اتنی تبدیلی آتی کہ سر پر روئی دار لوٹی اور روئی دار قبا پہن لیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کو جب اپنے پیارے بندوں کو اپنے پاس بُلانا مقصود ہوتا ہے تو بیماری محض ایک بہانے اور ظاہری شکل کے لیے آتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحب کو بھی یکم جمادی الاوّل ۱۳۱۹ھ کو معمولی بخار ہوا۔ جو رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ کمزوری کی وجہ سے آپ میں مسجد تک جانے کی بھی ہمت نہ رہی۔ آپ نے ایسی حالت میں اپنے دونوں لڑکوں حافظ محمود اور حافظ موسیٰ کو اپنے پاس بُلایا اور اُنہیں ضروری نصیحتیں اور وصیتیں کیں۔ اس کے بعد آپ کی حالت مسلسل بگڑتی گئی۔ آپ متواتر کلمہ شہادت اور کلمہ طیبہ کا ورد کرتے رہنے لگے۔ ۲۹ جمادی الاوّل کو آپ کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ آپ نے اس روز نماز تہجّد بھی اشاروں سے پڑھی مگر فجر کی نماز باقاعدہ وضو کر کے مصلے پر جا کر ادا کی۔ نماز کے بعد جب دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو آپ کے ہاتھ دستِ یزداں نے تھام لیے اور یوں آپ ۲۹ جمادی الاوّل ۱۳۱۹ھ بروز ہفتہ بوقتِ نماز فجر واصل حق ہوئے۔ آپ کو آپ کے صاحب زادے حافظ احمد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ آپ کے بعد آپ کے بڑے فرزند حافظ موسیٰ سجادۂ سلیمانی پر رونق افروز ہوئے۔

آج بھی لوگ جب تونسہ شریف جاتے ہیں تو حضرت سلیمان تونسویؒ اور اُن کے اِس جلیل القدر پوتے کے مزار پر حاضری دینا اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔

ابوالبرکات سید حسن بادشاہ قادری رح

حضرت ابوالبرکات میراں سرکار امرباالمعروف کے لیے دو آبہ (ہشت نگر) تشریف لے جا رہے تھے۔ آپ عراقی گھوڑے پر سوار تھے ایک خادم جو اکثر آپ سے کرامات طلب کیا کرتا تھا گھوڑے کی رکاب تھامے آگے چل رہا تھا۔ آپ کی منزل دریا کے پار تھی اور دریا کو عبور کرنے کے لیے کشتی درکار تھی۔ آپ جب کشتی کے قریب پہنچے تو آپ نے گھوڑے کی لگام کھینچی، گھوڑا بجائے کشتی کے دریا میں کود گیا اور رکاب تھام کر چلنے والا خادم بھی دریا میں گر پڑا۔ دریا کے پار آپ کا استقبال کرنے والے مرید و معتقد کھڑے تھے۔ انھوں نے جب حضرت کو گھوڑے اور خادم سمیت دریا میں کودتے دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ یہ لوگ اب دریا سے نہیں نکلیں گے مگر ابھی اُن کی فکر دماغ کے اندر ہی تھی کہ آپ بمعہ خادم و سواری اپنے فکرمند مریدوں اور معتقدوں کے درمیان کھڑے تھے عجیب حیرت و استعجاب کا عالم تھا۔ عقیدت مند پروانہ وار آپ کے ہاتھ چومنے لگے اور ایک حیران کن بات یہ تھی کہ آپ کے کپڑے، گھوڑا اور خادم بالکل خشک تھے۔ حضرت نے اپنے رکاب بردار خادم کو مسکرا کر فرمایا۔

"اے عزیز! تو نے خدا کی قدرت کا مظاہرہ دیکھا۔ تمھیں اولیاء کی کرامات سے بہت دلچسپی ہے اور تو مجھ سے بھی کرامت کا طالب رہتا تھا۔ آج تو نے دیکھ لیا کہ اہلِ اللہ پر

خُدا کا کرم کس طرح ہوتا ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھو یہ جو تم نے دیکھا ہے اور جو کچھ سُنا ہے یہ بچّوں کا کھیل ہے۔ مگر یاد رکھو کہ کرامات جتلانا باعثِ آفت ہے اور راہِ سلوک میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔"

حضرت ابوالبرکات میراں سرکار جمادی الآخر ۱۰۲۳ھ میں ٹھٹہ (سندھ) کے مقام پر پیدا ہوتے۔ آپ کے والدگرامی حضرت سید عبداللہ صاحب تھے جو صحابی رسُولؐ کے لقب سے مشہور تھے۔ جناب سید عبداللہ صاحب حما سے تبلیغ کی غرض سے سندھ تشریف لاتے۔ اولیائے عظام کا خاصا ہوتا ہے کہ وہ سیاحت کے ذریعے تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ سید عبداللہ صاحب بھی ہندوستان میں رشد و ہدایت کی انجام دہی کے لیے آئے اور اس سرزمین کو قرآن و حدیث اور توحید و رسالت کے نُور سے منوّر کیا۔

حضرت ابوالبرکات میراںؒ سرکار ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو علم و عرفان کا دارالعلوم تھا۔ آپ نے بچپن سے ہی ایسے ماحول میں زندگی گزاری جو ماحول یادِ الٰہی اور اتباعِ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم کی نورانیت سے جگمگا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے اپنی خاندانی عظمت و شرافت، علمی فضیلت اور فقرِ نبوت سے وافر حصّہ پایا۔ آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے والدِ گرامی کے زیرِ سایہ ہوئی۔ یہ آپ کے علم و فضل آگیں گھرانے کا اعجاز تھا کہ آپ نے سولہ سال کی عُمر میں جُملہ علوم درسیہ کی تکمیل کر کے درس و تدریس کے امور سنبھال لیے۔ اس کے بعد آپ روحانیت کی راہ پر گامزن ہوئے۔ اور کمالِ استقامت و استقلال سے منازلِ سلوک و تصوّف طے کرنے لگے۔ یہ روحانی خصائل و علوم بھی آپ نے اپنے محترم پدرِ گاہی سے حاصل کیے۔ جب سیّد عبداللہ شاہ نے اپنے فرزندِ ارجمند جو صاحبِ اوصاف تو تھے ہی انھیں مقامِ معرفت پر پہنچا ہوا پایا تو انھیں قادریہ سلسلہ میں اپنی بیعت میں لے لیا۔

قادریہ سلسلہ کے اس وقت کے تمام بزرگ و اکابر حضرت سید عبداللہ شاہؒ کے ہی مرید تھے اور آپ سے اکتساب و فیضان حاصل کرنے والے تمام احباب مقامِ ولایت اور مسندِ قطبیت پر متمکن تھے۔ اس خاندان کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ اس میں پیدا ہونے والے بزرگ صاحبانِ خوارق و کرامت تھے۔

حضرت ابوالبرکات میراں سرکارؒ کا نسب چودہ واسطوں کے بعد قطب الدائرہ حضرت سید عبدالرزاقؒ صاحب بن حضرت محبوبِ سبحانی غوثِ اعظم سیّد عبدالقادر جیلانیؒ تک پہنچتا

ہے اور پھر تیرہ واسطوں سے مظہر العجائب و الغرائب حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک منتہی ہوتا ہے۔

آپ کے والد کا انتقال جب ہوا تب آپ روحانیت و طریقت میں یکتا ہو چکے تھے۔ ذکر، فکر، مراقبہ، ریاضت نفس اور مکمل خلوت میں آپ کو بدطولیٰ حاصل تھا۔ آپ نے سات سال کا عرصہ مجاہدات و چلہ کشی کے لیے دریا کے کنارے گزارا۔ آپ دن کے وقت دریا کے کنارے بیٹھ کر یادِ الٰہی کرتے اور رات بھر سینہ تک پانی میں کھڑے ہو کر عبادت کرتے۔ ان سالوں میں شدید گرمیوں اور شدید سردیوں کے ایام بھی آتے مگر آپ کے پائے ثبات ہمیشہ مضبوط رہے۔ چلہ کشی کے دوران آپ نے خوراک کے طور پر درخت کے پتے استعمال کرتے تھے۔ یہ سب خدا کا فضل تھا کہ اس نے آپ کو مائع اور صاحب فکر بنایا تھا۔

جب آپ روحانیت و قطبیت کے مقام سر کر کے مقام اُولیٰ پر پہنچ گئے تو پھر آپ نے سیاحت کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے پہل آپ سیاحت صرف بزرگانِ دین کے مزاروں پر زیارت کرنے کے لیے کرتے رہے۔ اس ضمن میں آپ نے کئی ایک صاحبانِ عرفان کی درگاہوں پر وظائف کیے اور چلے بھی کاٹے۔

تبلیغی سفر بھی آپ کی شخصیت کے حصے ہیں جن سے آپ نے اسلام کی بے پناہ خدمت کی۔ وہ زمانہ جب کی یہ باتیں ہیں سفر بہت دشوار گزار ہوتے تھے مسافر موجودہ دور جیسی سفری سہولتوں سے یکسر محروم تھے۔ اسی لیے آپ نے جملہ سفر پیدل طے کیے۔ اس دوران آپ کو بے شمار مصائب اور لاتعداد تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر بے لوث خدمت اور محبت ہمیشہ لالچ سے مبرا ہوتی ہیں۔ ایسے سفروں میں آپ کے برادرِ خورد ابوالمکارم حضرت شاہ محمد فاضل خانیاریؒ بھی آپ کے ہمراہ رہے۔ سیاحت میں بے شمار بے دین اور بداخلاق لوگوں سے آپ کو واسطہ پڑا۔ آپ خود فرمایا کرتے تھے۔ کہ

"تبلیغ کے لیے ہم جس علاقے میں بھی گئے وہاں سوائے بُت پرستی اور کُفر کے کوئی دین و آئین نہ تھا" اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تاریکی میں روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ خشک اور بنجر زمین کو پانی کی اشد ترین حاجت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور مقبول بندوں کا وجود یادِ الٰہی کی وجہ سے نُور اور رحمت ہوتا ہے۔ اور یہ لوگ جہاں بھی پہنچتے ہیں ظلمت و تاریکی کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور کفر و شر کا دَور ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوالبرکات کے دستِ حق پرست پر ہزاروں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ آپ نے

ایسے ایسے علاقوں میں اسلام کے چراغ روشن کیے جہاں لوگ اسلام کا نام سُننا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ آپ کا معمول تھا جہاں آپ دین کا چراغ روشن کرتے وہاں مساجد بھی تعمیر کرتے اور پھر قرآن اور احادیث کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کرتے اور جب یہ مسجد و مکتب اسلام کی تعلیم باقاعدگی سے دینے لگتے تو پھر آپ اپنی اگلی منزل کے لیے روانہ ہو جاتے تھے گجرات کے علاقے میں آپ نے کوئی دو سو سے زائد مساجد تعمیر کیں اور پانچ خلفاء مقرر کیے۔ اسی طرح کاٹھیاواڑ جیسی کفر گاہ میں آپ نے اسلام کی اشاعت اور تبلیغ و ترویج کے زبردست اور شاندار سلسلے جاری کیے۔ آپ کے خلفاء جو آپ کے ہمراہ قریہ قریہ اور شہر شہر اسلام کی تبلیغ کرنے کی مہارت رکھتے تھے مختلف شہروں میں انھوں نے اپنی خلافت کی ذمہ داریاں اس طرح پوری کیں کہ اردگرد کے تمام علاقوں میں بھی بے شمار اسلام کے داعی اور رشیدائی پیدا ہو گئے۔

حضرت میراں سرکارؒ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین فرماتے ہوتے صدقِ عقائد اور اکلِ حلال پر بھی زور دیتے تھے کیونکہ یہی چیزیں درحقیقت عبادتِ الٰہی کی رُوح ـــــ ہوتی ہیں۔ شاہ جہاں آباد میں آپ نے ایک لمبا عرصہ قیام کیا اور راہِ سلوک و معرفت سے لوگوں کو روشناس کیا۔ آپ نے اپنی زندگی کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا اور اسی خدمت کے وسیلے سے آپ سفر کرتے کرتے لاہور تشریف لاتے۔ آپ کی کوئی مستقل منزل نہ تھی۔ آپ ہر مقام پر ٹھہرے ضرور مگر رُکے کہیں بھی نہیں۔ طرح طرح کے آتار چڑھاؤ کا سامنا کیا مگر آپ کے قدم کبھی ڈگمگاتے نہیں۔ بہت سے مصائب اور غیر یقینی حالات کا مقابلہ کرنا پڑا مگر آپ ہمیشہ ثابت قدم رہے۔

سیاحت کے دوران ہی آپ کو خواب میں ایک مرتبہ حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی زیارت نصیب ہوئی جنھوں نے فرمایا "اے ابوالبرکات تو اپنا مشن جاری رکھ مگر تیری آخری منزل پشاور ہو گی۔

۱۰۸۹ھ میں آپ نے کشمیر کا سفر اختیار کیا اور آپ تقریباً چھ ماہ تک کشمیر میں مقیم رہے۔ وہاں آپ نے تبلیغ اور جود و سخا کا ایسا سلسلہ جاری کیا کہ آپ کے دربار میں ایک وقت میں سینکڑوں افراد معہ توحید و رسالت سے آبیار ہوتے اور اسی طرح آپ کے لنگر سے اتنے افراد کھانا کھاتے تھے جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مفلوک الحال لوگوں کی آپ دیگر ضروریات بھی پوری فرمایا کرتے تھے۔ اس ضمن میں آپ فرمایا کرتے تھے۔

"اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی بے بہا نوازشات سے نوازا ہے اور اس قدر دولت مرحمت فرمائی ہے کہ اگر تمام دُنیا کے لوگ جمع ہو کر مجھ سے نفقہ طلب کریں تو میں سب کو دے کر بھی کسی قسم کی کمی نہ محسوس کروں۔" آپ کے جود وسخا اور دستِ عطا کو دیکھ کر ہی تاریخ اعظمی کے خالق نے لکھا ہے۔

"باوجود ازیں قلیل البضاعت احتیاج استکشاف نبود" کشمیر سے واپسی پر آپ نے وہاں اپنے چھوٹے بھائی ابوالمکارم سیّد شاہ محمد فاضلؒ کو خلافت عطا فرما کر وہاں تعلیم و تربیت اور تبلیغ کے کام پر مامور کیا۔ کشمیر سے واپسی پر آپ کابل کے گورنر امیر خان کے پُرزور اصرار اور درخواستوں پر تشریف لے گئے۔ وہاں کے ارباب بست وکشاد کو آپ نے شریعت اسلامیہ کی پابندی اور غرباء و مساکین کے حقوق کی پاسداری کی نصیحت فرمائی۔ آپ کے ارشاد کے مطابق ہی حکومتِ کابل نے طالب علموں، ناداروں اور بیواؤں و یتیموں کے وظائف مقرر کیے۔ سیاحت ہی کے دوران آپ جب پشاور پہنچے تو شہر کے مغرب کی طرف ایک گاؤں کوٹلہ محسن خان ہے۔ وہاں کے ایک جاگیردار جس کو بڑا خان یا اُس علاقے کی زبان میں "ارباب" کہتے ہیں۔ اُس نے آپ کی خدمت میں درخواست کی کہ حضرت اس ناچیز پر کرم فرمائیے۔ اور میری بیٹی کے ساتھ نکاح منظور فرمالیجئے۔ آپ نے خُدا کے حکم سے یہ نکاح منظور فرمایا اور یوں آپ کی شادی اس ارباب زادی کے ساتھ ہوگئی۔ اس خاتونِ عفیفہ سے آپ کو خدا تعالیٰ نے ایک بیٹا عطا فرمایا۔ جن کا نام سیّد زین العابدین تھا اور وہ اپنے زمانے کے محدثِ جلیل، فقیہ اعظم شیخ الشیوخ بنے۔

زمانے بھر کے لوگ آپ کی پارسائی، دین داری اور خدا رسیدگی کی وجہ سے آپ پر دیوانہ وار جان قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ مذکورہ "ارباب" کی بیٹی کی شادی کے بعد موضع کنڑ کے صحیح النسب سادات نے بھی آپ کی خدمت میں اپنی ایک صاحبزادی کے ساتھ شادی کی درخواست کی۔ یہ گھرانہ عظیم المرتبت ولی اللہ غوثِ خراسان حضرت سیّد علی ترمذی المعروف پیر بابا کا گھرانہ تھا۔ اور جس لڑکی کے ساتھ سادات آپ کی شادی کے خواہش مند تھے یہ حضرت پیر بابا کی پوتی تھی اور خود بھی عبادت و ریاضت میں یگانہ و یکتا تھی یہی وجہ ہے آپ نے اس رابعہ عصر کے ساتھ شادی منظور کرلی۔ اس دوسری بیوی کو آپ خُدا کی نصیحتِ غیر مترقبہ خیال فرماتے تھے۔ تاہم آپ نے ہمیشہ پہلی اور دوسری بیوی میں عملِ مساوات اور عدل و انصاف جاری رکھا۔

آپ کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ آپ کبھی بھی کسی حاکمِ وقت سے کوئی تحفہ یا نذرانہ قبول نہیں کرتے تھے۔ بلکہ جب بھی کوئی حاکم اس غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا آپ اس کو فرماتے "مجھے نذر و نیاز دینے کی بجائے اپنی زندگی کا صحیح مقصد پہچانو اور انصاف، دیانت داری، مساوات، اخوت، عدل، غربا پروری اور حسنِ سلوک سے رعایا کے ساتھ معاملات طے کرو۔"

ایک مرتبہ کابل کا گورنر نواب امیر خان نے اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ سے آپ کے فرزند جناب حضرت سیّد محمد غوثؒ کے نان گزرانِ معیشت کے لیے زمین کے ایک قطعہ کا فرمان لکھوا کر حضرت کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے فرمایا۔

"یہ زمین اُن لوگوں کو دی جاتے جو محتاج اور ضرورت مند ہیں۔ تاکہ وہ پُرسکون زندگی بسر کر سکیں۔"

اورنگ زیب آپ کے جذبہ کاملہ و صادقہ سے بڑا متاثر ہوا اور حیران ہوا کہ حضرت واقعی کوئی لاثانی اور فریدالعصر ہستی ہیں جنھوں نے اپنا دامن دنیاوی آسائشوں سے پاک کر رکھا ہے۔

حضرت میراں سرکار کو سرکارِ بغداد نے حکم دے رکھا تھا۔

"اے ابوالبرکات۔ زندگی بھر تبلیغ کرو۔ مساجد و مکاتب تعمیر کراؤ اور ان سب کاموں کے کرنے میں بالکل نہ گھبراؤ بلکہ ہر جگہ اور ہر کام میں اللہ جلِ جلالہٗ کو اپنا کارروا اور مشکل کشا جان لو۔ کیونکہ سب تعریفیں اُسی کے لیے ہیں۔

آپ سرکارِ بغداد کے اُسی حکم کے مطابق پشاور تشریف لاتے اور پشاور سے چند میل دُور قصبہ سلطان پور میں قیام فرمایا۔ اس قصبہ کو بگرام بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں پہنچتے ہی آپ نے تبلیغ کا سلسلہ جاری کر دیا۔ کہتے ہیں آپ نے فجر کی نماز کی اذان دی اور نماز پڑھی۔ ابھی اشراق نہ ہونے پاتی تھی کہ شہر کے چاروں اطراف و جوانب سے فوج در فوج لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور یقین و اعتقاد کے ساتھ آپ کی نیاز حاصل کی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے آپ اس علاقے میں سو سالوں سے آباد ہوں اور یہ لوگ آپ کے پُرانے خادم ہوں۔ آپ کی خدمت میں آنے والوں میں ارباب وقت بھی تھے اور سردار بھی مگر آپ بلا فرقِ امتیاز و مراتب مخلوقِ خُدا کے اژدھام پر نظرِ کرم فرماتے تھے اور جو شخص بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا وہ اپنی قسمت اور اہلیت کے مطابق معرفتِ الٰہی حاصل کرتا اور نجاتِ اُخروی

پاتا تھا۔ آپ کے درسِ اخوت اور مساوات نے مقامی اور دُور دراز سے آنے والے لوگوں کے دلوں کو اسلام کی حقانیت اور سچائی سے لبریز کر دیا۔ مرتبہ و مقام کی بلندی پستی کے تمام تصوّرات مٹ گئے۔ کروفر والے کمتر لوگوں کو اپنے ہم پلّہ اور ہم مرتبہ سمجھنے لگے۔ آپ کا مشن اسلام کی تبلیغ تھا۔ آپ نے اس مقصد کی بقاو دوام کے لیے اپنی زندگی کو وقف کیے رکھا۔

حضرت کی اہلیہ ثانی میں سے آپ کو خُدا تعالیٰ نے دو فرزند عنایت فرمائے جن میں ایک محدثِ اعظم عارف باللہ حضرت شاہ محمد غوث پشاوری لاہوری ہیں۔ غالباً یہ وہی شاہ محمد غوث ہیں جن کا مزار اقدس لاہور میں موجود ہے اور دوسرے صاحبزادے حضرت سیّد علی تھے۔

حضرت کو خُداوند کریم نے اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ ستودہ سے نوازا تھا۔ آپ غرباء کی دلجوئی، مسافروں کے ساتھ حُسنِ سلوک فرمایا کرتے تھے۔ امراء و حکام سے تحائف قطعاً قبول نہ کرتے تھے بلکہ اُن کو نہایت جرأت سے نصیحت فرمایا کرتے تھے اور غیر شرعی حرکات پر بغیر کسی خوف و حزن کے انھیں متنبہ فرماتے تھے۔ بیواؤں اور غریب کنواری لڑکیوں کی شادیاں کروانے کو آپ مسنون افعال قرار دیتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں اپنی خدمات سب سے اوّل پیش کرتے تھے۔ آپ کا فرمان تھا کہ قول و فعل میں تضاد ہو تو خُدا کی رضا اور اس کی دستگیری حاصل نہیں ہو سکتی۔ آپ کی عادات اور خصائل میں ایک مقناطیسی کشش تھی جو قلوبِ خاص و عام کو شرمندۂ احساس کرتی تھیں۔

محدثِ جلیل حضرت شاہ محمد غوثؒ فرماتے ہیں۔

"خدمتِ فقرا و مساکین بسیاری کردند بر عام خلائق
چناں شفقت می فرزند گویا عیال ایشاں بودند"

عفو و حلم، کرم و بردباری اور تواضع و انکساری کے ایسے عملی نمونے آپ کی زندگی میں ملتے ہیں گویا آپ مکمل طور پر حضرت رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کی عملی تصویر تھے اور یہی وہ اخلاقِ کریمانہ تھے جن کی بدولت ہزارہا گم گشتگاں بادیہ ضلالت کو نیک اعمال کی ہدایت ہوئی۔

حضرت کی زندگی اتنی مثالی تھی کہ بعد از وفات بھی آپ کی زندگی کے سنہرے ابواب

قابلِ تقلید و مطالعہ رہے ہیں۔ حضرت میراں سرکار سید حسن سے کچھ لوگوں نے قرضہ لینا تھا جب آپ پر مرضِ موت وارد ہوئی تو ان قرضہ خواہوں کو خیال ہوا کہ حضرت کے وصال ہونے پر کہیں ہمارا قرضہ نہ مارا جاتے۔ انھوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ باہمی مشورہ کیا کہ قرضہ حاصل کرنے کے لیے کیا سبیل اختیار کی جائے۔ طے یہ پایا کہ اگلے روز سب لوگ حضرت کے پاس جائیں اور اُن سے قرضہ کی بات کرلیں تاکہ حضرت کسی ایسے آدمی کو مقرر کردیں جو اُن کے وصال کے بعد قرضے کی ادائیگی کرے۔ مگر یہ لوگ ابھی مشورے اور فیصلے کر رہے تھے کہ مشعل برداروں کا ایک جلوس سروں پر اشرفیوں اور روپوں کے تھال رکھے اُن کے پاس پہنچا اور اُن کو رقم دے کر تمسکات لے لیے اور کہا "یہ وہ قرضہ ہے جو حضرت میراں سرکار حسن شاہ نے آپ لوگوں سے لیا ہے۔ یہ واقعہ حضرت کے وصال کے بعد اُن قرض خواہ نے ہی بذبانِ خود حضرت کے صاحبزادے شاہ محمد غوثؒ کو بتایا۔

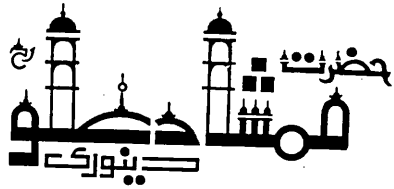
یہ واقعہ اہلِ محفل نے جب سُنا تو وہ زار و قطار رونا شروع ہوگئے اور حضرت شاہ محمد غوثؒ اس واقعے کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"کس قدر حیران کُن بات ہے کہ ایسا جلیل القدر شخص جو فقر اور درویشی میں یکتا تھا دُنیاوی جاہ ہمیشہ اُس کے ہمرکاب تھا۔ جس کے دربار میں ہر وقت شاہ و گدا ہاتھ باندھے کھڑے رہا کرتے تھے۔ وہ بھی قرض دار تھا اور اس کو قرض ادا کرنے کا کتنا خیال تھا کہ داعیِ اجل کو لبیک کہنے سے قبل اس نے قرض ادا کیا۔

حضرت قطب الاقطاب کو طویل سیاحت کے دوران مختلف علاقوں میں اتنا تعارف حاصل ہوا کہ آپ کا ذکر ہر زبان پر رہنے لگا۔ تاہم آپ مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ برِصغیر پاک و ہند میں آپ کو سید حسن کہا جاتا ہے جبکہ کشمیر و پونچھ میں ابوالحسن کے نام سے مشہور ہیں اور سرحد کے علاقے میں سید حسن بادشاہ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ مگر حضرت سید غوث الاعظمؒ کے ساتھ آپ کو جو تعلقِ خاطر تھا اس بنا پر آپ کو میراں سرکار کہا جاتا ہے۔ اور اہلِ پشاور تو آپ کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس مضمون میں بھی آپ کا ذکرِ خیر اسی نام کے حوالوں سے کیا گیا ہے۔

حضرت سید حسن المعروف میراںؒ سرکار ۲۱ ذی قعدہ ۱۱۱۰ھ بروز جمعۃ المبارک بوقت نمازِ عصر واصلِ حق ہوتے۔





بغداد کے ایک گھرانے میں غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ایک بچہ پیدا ہوا۔ والدین نے اس بچے کا نام ممشاد علو رکھ دیا۔ علو کے معنی بزرگی بڑائی اور بلندی کے ہیں۔ بچے کے باپ کا خیال تھا کہ اُس کا بیٹا سن بلوغت کو پہنچتے ہی عباسی دربار میں کوئی بلند اور اعلیٰ وارفع مقام حاصل کرے گا مگر باپ کو یہ جان کر بہت حیرانی ہوئی کہ اُس کا بیٹا زیادہ تر تنہائی اور گوشہ نشینی کی حالت میں رہتا ہے اور ہر وقت خالقِ خدا کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے۔ آخر ایک روز باپ سے رہا نہ گیا اُس نے بیٹے کو پاس بٹھا کر انتہائی شفقت سے پوچھا "جانِ پدر! آخر تم کیوں پریشان اور کھوئے کھوئے سے رہتے ہو اس عمر میں تو تمہارے جیسے نوعمر لڑکے ہنستے اور کھیلتے کودتے ہیں مگر ایک تم ہو کہ ہر وقت پریشان اور کھوئے کھوئے سے رہتے ہو آخر ماجرا کیا ہے۔

نوعمر ممشاد علو نے جواب دیا "اباجان اگر میں نے آپ کو اپنی اداسی کا سبب بتا دیا تو آپ شاید میری بات کا مذاق اُڑائیں گے۔"

باپ نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "میرے بچے ایسا مت سوچو مجھے اپنی بے کلی اور اُداسی کا سبب بتاؤ میں کوشش کروں گا کہ اس کا کوئی حل تلاش کر سکوں۔"

آپ نے کچھ دیر خاموشی اختیار کی پھر کہنے لگے۔ اباجان آپ نے ہمیں بہت آرام اور

آسائش کی زندگی فراہم کی ہے ہمیں ہر طرح کی نعمت اور سہولت میسر ہے مگر میں سوچتا کیا ہماری زندگی کا مقصد یہی ہے کہ ہم یوں ہی خواب غفلت میں پڑے پڑے اس دنیا سے کوچ کر جائیں۔

آپ کی باتیں سن کر آپ کا باپ بہت حیرت زدہ ہوا وہ بولا: بیٹے ہمیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ جس نے ہم سب کو یہ نعمتیں دیں مگر تم نے تو اس بات کو اپنی زندگی کا روگ بنا لیا ہے۔ پھر باپ نے بیٹے سے کہا۔ بیٹے رات کافی بیت گئی ہے اب تم سو جاؤ۔ انشاء اللہ اگلی صبح اس سلسلے میں تمہارے ساتھ تفصیلی گفتگو ہوگی۔

ممشاد علو باپ کے کہنے پر بستر پر تو چلے گئے مگر کرب اور اضطراب میں کوئی کمی نہیں آئی۔ رات کا بیشتر حصہ اضطراب اور اضطرار میں گزار کر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی انسان بیک وقت متضاد کیفیات میں زندگی نہیں گزار سکتا اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اس ماحول میں نہیں رہیں گے۔ اس فیصلے کے بعد وہ اپنے آرام دہ اور پُر آسائش گھر کو چھوڑ کر مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں آپ کو اشارہ ملا کہ جس دولت اور ثروت کو تم بغداد میں چھوڑ آئے ہو، وہ اب بھی تمہاری ہے اور تم اس کے مالک ہو۔ اس لیے پہلے اس سے نجات حاصل کرو۔ اس کے بعد اللہ سے لو لگاؤ۔

یہ بغداد واپس چلے گئے اور اسی ماحول میں اللہ اللہ کرنے لگے۔ ان کو دنیا سے نفرت ہو چکی تھی۔ حویلی نما مکان کے ایک گوشے کو حجرہ بنا لیا اور اس میں رہنے لگے۔ اس حجرے میں ایک لوٹا تھا۔ ایک پیالہ اور سونے کے لیے کھجور کی ایک چٹائی۔ جب وہ اس چٹائی پر سو کر اٹھتے تو ان کی پشت اور دونوں پہلوؤں پر چٹائی کی چھاپ لگ چکی ہوتی۔ کھانے میں بھی کوئی خاص اہتمام نہ ہوتا۔ جَو کے پسے ہوئے آٹے کو ستو کے طور پر استعمال کرتے۔ اکثر و بیشتر کئی کئی وقت بھوکے رہتے۔ اُن کا ذاتی تجربہ تھا کہ جب معدہ خالی ہوتا ہے تو انہیں اللہ کی بڑی یاد آتی۔ اسی حجرے میں نماز ادا کرتے، بعد ازاں جو وقت بچتا وہ درود و وظائف اور اللہ کے کلام کی تلاوت میں صرف ہو جاتا۔ پھر جب آپ نے دیکھا کہ آپ خود مختار ہو گئے ہیں اور درمیان میں کوئی حصے دار نہیں رہا تو آپ نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کر ڈالا۔

آپ اپنے حجرے میں مصلّے پر سجدے میں گر گئے اور رو رو کر اللہ سے استمداد و استعانت کی بھیک مانگتے رہے۔ آپ نے اللہ سے التجا کی۔

"اے میرے اللہ! تو عالم الغیب ہے اور دلوں کے حال خوب جانتا ہے۔ میں نے بہت پہلے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں اپنی آسائشیں، آرام اور سکھ چین سب کچھ تیرے لیے چھوڑ دوں گا، تیری

راہ میں لٹا دوں گا۔ میں ایک کمزور، بے بس، حریص اور خود غرض انسان ہوں۔ میرا نفس مجھے حرص و طمع پر راغب کر رہا ہے۔ وہ مجھے روک رہا ہے کہ میں ایسا نہ کروں۔ اس کا مشورہ ہے کہ میں بکھیچین سے دست بردار نہ ہوؤں۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ میں دولت اور ثروت سے بھی منہ نہ موڑوں اور اللہ کی طرف بھی راغب نہ رہوں۔ اب میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ دونوں کام بیک وقت کس طرح ممکن ہیں۔ میں نے دولت اور جائیداد کو تیری راہ میں دے دینے کا فیصلہ کیا ہے مگر میرے نفس، میری خود غرضی اور میری حرص و طمع نے مجھ کو شدت سے منع کرنا شروع کر دیا ہے کہ میں ایسا نہ کروں لیکن میں اپنے نفس کا کہنا نہیں مانوں گا۔ اور وہی کروں گا جو تجھ کو پسند ہے۔ میں اپنی جائیداد، دولت اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے تیری راہ میں خرچ کر دوں گا، میں یہ کام بعجلت کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ اگر میں تساہل کر گیا تو ڈر ہے کہ مبادا میرا نفس مجھ پر غالب آ جائے۔"

اس کے بعد آپ نے وہی کیا جس کا ارادہ کیا تھا۔ جائیداد فروخت کر دی اور اس سے جو رقم ہاتھ آئی وہ غربا اور اہلِ احتیاج میں تقسیم کر دی۔

جب آپ کے پاس کچھ نہ رہا تو آپ مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد اس عہد کے مشہور صوفی، بصیرۃ البصری وہاں تشریف لائے اور بڑی بے تکلفی سے پوچھا "وہ کہاں ہے؟ کہاں چلا گیا؟ اس کو میرے پاس لاؤ۔"

کسی نمازی نے پوچھا "یہ آپ کس کی باتیں کر رہے ہیں؟"

بصیرۃ البصری نے جواب دیا "وہ اس دور کا صوفی۔ وہ کہاں چلا گیا۔ اس کو میرے سامنے تو لاؤ۔"

لوگوں نے ان کو تلاش کیا اور پکڑ کے بصیرۃ البصری کی خدمت میں پہنچا دیا۔ ممشاد نے ان کو نہایت مؤدبانہ انداز میں سلام کیا اور اُن کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ بصیرۃ البصری نے پوچھا "تو نے سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دیا۔ گھر میں اپنے لیے کیا چھوڑا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "کچھ بھی نہیں۔ جب گھر ہی نہیں رہا تو اس میں میرے لیے کچھ رہنے کا سوال؟ براہِ کرم حضرت صدیقؓ سے مجھے نسبت نہ دیں کیونکہ میں اِن کی خاکِ پا بھی نہیں۔ وہ آفتاب تھے اور میں ایک ذرہ جو آفتاب ہی کی روشنی سے روشن ہے۔"

بصیرۃ البصری نے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے؟"

ممشاد نے جواب دیا "میں تو آپ کے قدموں میں بیٹھ چکا ہوں اور یہیں سے کچھ لے کر اٹھوں گا۔"

بصیرۃ البصری نے فرمایا "تجھ کو تیری ہمت اور حوصلے کے مطابق ملے گا۔"

اس کے بعد یہ بصیرۃ البصری کی خدمت میں رہنے لگے۔ یہ اس دور کا بغداد تھا جس میں سری سقطیؒ

جنید بغدادی، ابوالحسن نوری، خواجہ رویم اور حارث محاسبی جیسے باکمال لوگ موجود تھے اُنہی میں بصیرۃ البصری بھی تھے۔

لوگ ممشاد دینوری کو بصیرۃ البصری کی خدمت میں دیکھتے تو متضاد قسم کی باتیں کرتے رہتے۔ کوئی کہتا۔ "افسوس، کل تک یہ نوجوان کتنا خوش حال اور آسودہ تھا اور آج یہ دوسرے کے در پر پڑا ہوا ہے۔"

کسی اور نے کہا: "لیکن اب یہ زیادہ خوش ہے، کل تک بہت پریشان تھا۔"

کسی واقف کار نے بتایا: "میں تو یہاں تک جانتا ہوں کہ جب تک ممشاد خوش حال تھے، آرام دہ بستر پر چین سے سو بھی نہیں سکتے تھے۔ اور کہنے والے کہتے ہیں کہ ان کو راتوں کو اچھی طرح نیند تک نہیں آتی تھی۔ یہ بہت خوفزدہ رہتے تھے۔"

کسی نے پوچھا: "مگر ان میں اتنی بڑی تبدیلی آئی کس طرح؟"

جواب دیا گیا: "لوگ بتاتے ہیں کہ یہ سوچتے بہت زیادہ تھے۔ زندگی، دنیا، آخرت ان سب پر سوچتے بہت تھے اور اس خوف میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ان کی زندگی برباد ہو رہی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو کارآمد بنانا چاہتے تھے، چنانچہ اب وہ اپنے خیال کے مطابق سیدھی راہ پر چل رہے ہیں۔"

بصیرۃ البصری ان کی تعلیم و تربیت میں شب و روز مشغول رہے۔ آپ نے ممشاد علو کو بطورِ خاص ہدایت کی کہ وہ ہر وقت باوضو رہیں اور اللہ کے ذکر میں ہمہ وقت مشغول رہیں۔

اس طرح ایک مدت گزرنے کے بعد بصیرۃ البصری نے ان کو اپنے پاس بلوایا۔ اس وقت ممشاد علو اپنے حجرے میں بیٹھے اپنے ماضی پر غور کر رہے تھے۔ اطلاع دینے والے نے ان کو مطلع کیا کہ "اے ممشاد علو! آپ کو پیر و مرشد یاد فرما رہے ہیں۔"

ممشاد علو نے پوچھا: "ان کا مجھ سے کوئی خاص کام ہے یا بس یونہی یاد فرما رہے ہیں؟" جواب دیا گیا۔ "ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ آپ کو کیوں یاد فرمایا جا رہا ہے۔"

ممشاد اپنے پیر و مرشد کے پاس پہنچے اور نہایت ادب سے کہا: "آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا، میں آ گیا، میرے لائق کوئی خدمت؟ کوئی کام؟"

بصیرۃ البصری بہت خوش تھے فرمایا: "ممشاد! وضو کر کے میرے پاس آؤ۔"

ممشاد نے وضو کیا اور آپ کے پاس چلے گئے۔

شیخ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمانے لگے: "اے اللہ! علو کو درویشی کے اعلیٰ درجے تک پہنچا دے۔"

ممشاد کو اپنے دل پر ہلکا پن محسوس ہونے لگا اور وہ آہستہ آہستہ مدہوش ہوتے چلے گئے۔

شیخ نے کہا "علو، ہوش میں آؤ۔"

علو نے آنکھیں کھول دیں اور پوچھا: پیر و مرشد! یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟"

شیخ نے جواب دیا: "اللہ تیرے درجات میں اضافہ فرما رہا ہے۔"

لیکن ممشاد اپنے مرشد کی بات سن نہ سکے کیونکہ وہ ابھی تک پوری طرح ہوش میں نہیں آئے تھے۔ شیخ ان کے حق میں دعا کرتے رہے اور یہ کبھی ہوش میں آجاتے اور کبھی مدہوشی میں چلے جاتے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا۔ آخرکار ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔

شیخ نے اپنے لائق مرید کو بشارت دی "اب تو مستجاب الدعوات قرار پایا۔" یہ کہتے ہوئے ان کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور اپنے سجادے پر بٹھا دیا اور فرمایا "علو! اب تم کو میری ضرورت نہیں رہی، چاہو تو یہیں میرے پاس رہو، ورنہ جہاں چاہو چلے جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

ممشاد علو نے جواب دیا "میں آپ کے حکم کا تابعدار ہوں۔ آپ جو حکم دیں گے میں اس کی تعمیل کروں گا۔"

شیخ نے کہا "تو میرا حکم یہ ہے کہ اب تم یہاں سے چلے جاؤ اور جہاں چاہو، وہیں چلے جاؤ، میری طرف سے اجازت ہے۔"

ممشاد نے اپنے پیر و مرشد کی مرضی اور خواہش جاننے کے بعد مکہ معظمہ کا رُخ کیا اور وہاں کے جاروب کشی کو اپنے لیے وجہِ افتخار سمجھا۔ انہوں نے مکہ معظمہ میں تزکیۂ نفس اور عبادت و ریاضت میں کئی سال گزار دیے اور کندن ہوتے چلے گئے۔

اب آپ لوگوں کو ہدایتیں فرمانے لگے تھے۔ آپ کے پاس لوگ مرید ہونے کے لیے آنے لگے تھے۔

آپ نے اپنی خانقاہ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور ایسا بند کیا کہ ہر کس و ناکس داخلے سے محروم ہو گیا۔ آنے والے دروازے پر دستک دیتے، آپ اندر سے چند سوال کرتے اور ان سوالوں کے جوابات پر ہی دروازے کے کھلنے یا بند رہنے کا انحصار تھا۔

ظہر کے بعد کسی نے دروازے پر دستک دی۔ آپ نے اندر سے پوچھا "کون ہے؟"

باہر سے جواب دیا گیا "حق کا متلاشی اللہ کا ایک بندہ۔"

آپ نے پوچھا "تیرا مشغلہ؟ تو کیا کرتا ہے؟"

اُس نے جواب دیا "حداد ہوں۔ صبح سے شام تک مزدوری کرتا ہوں۔"

آپ نے پوچھا "پھر یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

حداد نے جواب دیا: "دنیا تے تھکا دیا ہے، اس لیے سکون کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔"

آپ نے فرمایا تیرا ذہن صاف نہیں ہے۔ اگر دنیا نہ تھکاتی تو تُو یہاں نہ آتا۔ ایسے آدمیوں کے لیے یہ خانقاہ نہیں کھلتی۔"

حداد نے درخواست کی: "حضرت! مایوس نہ کریں کیونکہ میں دنیا کی آسائشوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہاں آیا تھا۔ اب جب میں یہاں سے بے نیل و مرام واپس جاؤں گا تو گناہ کی طرف اُٹھنے والا ہر قدم آپ کو موردِ الزام ٹھہرائے گا۔ میرے ہر گناہ میں آپ کی ذات بھی شریک سمجھی جائے گی۔"

آپ نے جواب دیا: "اپنے اعمال کا ہر شخص خود ذمے دار ہوتا ہے۔ واپس جا اور اچھا انسان بننے کی کوشش کر۔"

حداد واپس چلا گیا مگر دروازہ نہیں کھلا۔

اِسی طرح ایک دن فجر کی نماز کے بعد کسی نے آپ کے در پر دستک دی اور آپ کے سوال پر آنے والے نے بتایا: "میں ایک طالب علم ہوں اور آپ سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے آیا ہوں۔"

آپ نے پوچھا: "کیا تُو تنہا ہے۔"

اُس نے جواب دیا: "ہاں، میں بالکل تنہا ہوں۔"

آپ نے پوچھا: "اور تیرے اعزا اور اقارب؛ وہ کہاں ہیں؟"

طالب علم نے جواب دیا: "میں بالکل تنہا ہوں۔ اِس دُنیا میں میرا کوئی نہیں ہے نہ ماں نہ باپ، نہ بھائی، نہ بہن۔"

آپ نے دریافت کیا: "کیا باہر کوئی درس گاہ نہیں ہے جہاں تو پڑھ سکے؟"

طالب علم نے جواب دیا: "درس گاہیں تو ہیں لیکن اِس درس گاہ جیسی کوئی درس گاہ نہیں۔"

آپ نے اس طالب علم کو اپنی خانقاہ میں بُلا لیا۔ خانقاہ کا در کھلا اور طالب علم اندر داخل ہو گیا۔ دوسرے شہریوں کو اس پر اعتراض ہوا اور انھوں نے آپ سے شکایتاً کہا: "حضرت! اس مسافر پردیسی کے لیے آپ کی خانقاہ کا در کیوں کھل گیا۔"

آپ نے جواب دیا: "یہ واپس جو چلا جائے گا۔ یہ میرے پاس رہنے کی نیّت سے نہیں آیا۔"

ایک مُرید نے عرض کیا: "حضرت، گستاخی معاف، آپ کا یہ امتیازی سلوک ہمیں بالکل پسند نہیں آیا۔"

آپ نے فرمایا: "میں کب یہ چاہتا ہوں کہ میرا ہر سلوک تجھے اچھا ہی لگے۔"

مرید نے کہا: "وہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ایسا کیوں؛ یہ امتیازی سلوک کیوں؟"

آپ نے جواب دیا: "اگر تو میرا جواب سُننا ہی چاہتا ہے تو سُن، جیسا کہ میں پہلے بھی کئی بار

کہہ چکا ہوں کہ میں اپنے کسی شہری سے رابطہ اور اُنس نہیں بڑھانا چاہتا کیونکہ جب وہ میرے پاس سے چلا جائے گا۔ تو ساتھ رہنے کا اُنس مجھے خانقاہ سے نکلنے پر مجبور کر دے گا۔ رہ گیا کوئی مسافر تو میں اس پردیسی کے لیے ہر وقت حاضر ہوں۔ جب وہ میرے پاس سے چلا جائے گا تو اُس کا اُنس مجھے خانقاہ سے باہر نہیں لے جائے گا۔"

مریدوں کی اس جواب سے تشفی تو ہو گئی لیکن ممشاد علو کا یہ فلسفہ انہیں بہت پریشان کُن لگا۔ یعنی ایک ایسی روش جس پر دوسرے نہیں چل سکتے۔

آپ کے ایک مرید ابو عامر نے ایک نوجوان کی سفارش کی کہ اسے مرید کر لیا جائے۔ ممشاد علو نے اس نوجوان سے پوچھا "تو کام کیا کرتا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا "میں خاندانی تعلق سے کپڑوں کا تاجر ہوں، لیکن میں ذاتی طور پر اس کام کو پسند نہیں کرتا۔" آپ نے دریافت کیا کیوں؟"

نوجوان نے جواب دیا "حضرت! سچی بات تو یہ ہے کہ میں جو کام کرتا ہوں، اس میں مسلسل خسارے سے دوچار ہوتا ہوں۔ اس لیے اب میں ایسا کاروبار کرنا چاہتا ہوں جس میں خسارے کا ڈر نہ ہو۔"

آپ نے فرمایا "تیرا خیال تو اچھا ہے لیکن تو اس راستے پر زیادہ دنوں تک نہیں چل سکے گا۔"

نوجوان خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ کہنے لگا "مجھ کو یہ بات پہلے سے معلوم تھی کہ آپ مشکل ہی سے کسی کو مُرید کرتے ہیں، اسی لیے میں نے آپ کے مریدِ خاص ابو عامر کا سہارا لیا اور آپ کی خدمت میں آ گیا۔"

آپ نے از راہِ تکلف اپنے مرید ابو عامر کی سفارش پر اُسے مرید تو کر لیا اور اسے چند اوراد و وظائف بھی بتا دیے مگر آپ کو یقین نہیں تھا کہ یہ نوجوان درویشی کی راہوں پر اپنا سفر جاری رکھ سکے گا۔

کئی سال بعد یہ نوجوان اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے ملنے گیا تو وہاں اُسے کافی دیر ہو گئی۔ کسی رشتے دار نے اُسے ملامت کی "یہ تو کہاں پھنس گیا؟"

نوجوان نے جواب دیا "میں پھنس نہیں گیا بلکہ آخرت کا سودا کر لیا ہے۔"

رشتے دار نے پوچھا "وہ کس طرح؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا؟"

نوجوان نے جواب دیا "اب میں ..... لیکن اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔ ایک رشتے دار نے نوجوان کے کان میں کہا "یہ تو کہاں چلا گیا۔ اب ذرا بازار کا مشاہدہ تو کر۔ ہر طرف ہن برس رہا ہے۔"

نوجوان نے حیرت سے سوال کیا "کیا سچ؟ لیکن میں تو اس میں بڑے نقصان اُٹھا چکا ہوں۔"

رشتے دار نے دلاسہ دیا "ہاں، کبھی نقصان اُٹھایا ہو گا لیکن آج کل تو مزے ہی مزے ہیں۔"

نوجوان کے مُنہ میں پانی بھر آیا، پوچھا "کیا میں بھی اس سے ....."
لیکن وہ بات پوری نہیں کر سکا۔ رشتے دار باتوں ہی باتوں میں سمال باندھتا رہا۔ نوجوان کی نیّت بدل چکی تھی۔ وہ اس روز تو خانقاہ میں گیا مگر دوسرے دن صبح ہی صبح وہ اپنے رشتے داروں میں پہنچ گیا اور ان سے خواہش کی کہ اس کے کپڑے کے کاروبار میں اس کی مدد کریں۔
رشتے داروں نے مدد کا وعدہ پورا کر کے اُسے اپنی دُکان میں بٹھا دیا۔ وہاں گاہکوں کی آمد کا سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ پلک جھپکنے کی بھی فرصت نہ ملی۔
شام کو دُکان بند کر کے جب اپنے گھر گیا تو وہ خاصی رقم کما چُکا تھا۔ دوسری طرف خانقاہ میں اس کا انتظار ہو رہا تھا۔
کئی دن بعد وہ خانقاہ کے وقت خانقاہ پہنچا تو ابو عامر نے پوچھا "یہ تو کہاں غائب ہو گیا تھا۔"
اس نے جواب دیا "بھائی! سیدھی سادی بات تو یہ ہے کہ میرے ذمّے اپنے والدین کی ذمّے داریاں بھی تو ہیں۔ اُن کے لیے رقم چاہیے۔"
ابو عامر نے کہا "کیا پہلے تیرے والدین نہیں تھے جو تو یہاں خانقاہ میں چلا آیا تھا؟"
نوجوان نے جواب دیا۔ "والدین پہلے بھی تھے لیکن پہلے والد صاحب کماتے تھے، لیکن اب وہ کچھ نہیں کرتے، اس لیے مجھے دُکان داری کرنا پڑ رہی ہے۔ ابو عامر شرمندہ تھے کہ پیر و مُرشد کا خیال درست نکلا۔ درویشی کی سنگلاخ راہوں پر چلنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔
حضرت ممشاد علو بڑے فلسفیانہ انداز میں اپنے شاگردوں کو درس دیا کرتے تھے۔
آپ کے ایک مُرید نے آپ سے پوچھا "حضرت! یہ بُت پرستی کیا ہوتی ہے؟ ماضی میں بڑے پیمانے پر بُت پرستی ہوا کرتی تھی۔ اب آپ یہ بتائیں کہ اس وقت کون کون سی اقوام بُت پرستی میں مُبتلا ہیں؟"
آپ کو اپنے مُرید کا یہ سوال بہت پسند آیا۔ فرمایا "بُت پرستی تو آج بھی موجود ہے اور تقریباً ہر قوم میں بُت پرست موجود ہیں۔"
مُرید نے پوچھا "حضرت! وہ کس طرح؟ میری سمجھ میں تو آپ کی یہ بات آئی نہیں۔"
آپ نے جواب دیا "ذرا آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش کا مشاہدہ کر۔ بُت پرستوں کا ایک بہت بڑا غول تیرے آس پاس موجود ہے اور یہ سب کے سب بُت پرستی میں مشغول ہیں۔"
مُرید نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

آپ نے فرمایا: "بُتوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جو نفس کو بُت بنا لیتے ہیں اور اس کی پرستش میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اُن کے برعکس دوسرے لوگ ہیں جو دولت کا بُت بنا لیتے ہیں۔ اور اس کی عبادت کرنے لگتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو بیوی بچّوں کو بُت بنا لیتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ بعض صنعت و تجارت کو بُت بنا لیتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں۔ ان سب سے قطع نظر اکثریت ایسوں کی ہے جو روزے، نماز کو بُت بنا لیتے ہیں اور اُن کے پُجاری بن جاتے ہیں۔"

مُرید تو آپ کے جواب سے پریشان ہو گیا اور کہنے لگا: "یہ تو بڑی بھیانک حقیقت ہے۔ آپ کے اس جواب سے آخر میں کیا سمجھوں؟"

آپ نے جواب دیا: "یہ کہ پوری مخلوق کسی نہ کسی بُت کی پرستش میں گرفتار ہے اور کسی کو بھی پرستش سے مَفر نہیں۔"

آپ سے پوچھا گیا: "آخر کوئی تو ایسا ہو گا جو اس سے محفوظ اور مبرّا ہو گا؟"

آپ نے جواب دیا: "ہاں، وہ شخص جو اپنے نفس کی نیکی اور بدی پر نفس کی موافقت نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ نفس کو ہدفِ ملامت بنائے رکھتا ہے۔"

آپ سے سوال کیا گیا: "آپ تو بذاتِ خود بہت لائق اور علم و فضل میں منفرد اور یکتا ہیں پھر جب آپ کسی بزرگ سے ملتے ہیں تو اس سے کس طرح فیض حاصل کرتے ہیں؟" آپ نے جواب دیا۔ "میں اُس وقت تک کسی بزرگ سے نہیں ملتا جب تک کہ اپنے تمام علوم اور حالات کو ترک نہیں کر دیتا اور جب میں ان چیزوں سے دست بردار ہو کر کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو اس کے اقوال کو غور سے سُن کر اس کی برکتوں سے فیوض حاصل کرتا ہوں۔"

آپ سے پوچھا گیا: "لیکن اگر آپ اپنی خودی اور انا کے ساتھ کسی بزرگ سے ملیں تو؟ تو کیا ہو؟"

جواب دیا: "اس طرح میں بزرگ کی کسی بات سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔"

آپ کے پاس ایک درویش بڑی عقیدت و ارادت سے حاضر ہُوا۔ آپ نے اس سے پوچھا: "تو کیا لینے آیا ہے میرے پاس؟"

درویش نے جواب دیا: "آپ سے میں بڑی ارادت رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ کے لیے حلوہ تیار کروں۔"

آپ کو ہنسی آ گئی اور فرمایا: "ارادت اور حلوہ۔ ان دونوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق؟"

آپ کی یہ بات درویش کے دل پر تیر کی طرح پیوست ہو گئی اور وہ وارفتگی کے عالم میں بار بار دہرانے لگا۔ "ارادت اور حلوہ، ان دونوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق؟" درویش کچھ دیر تو وہاں کھڑا اس فقرے کو ادا کرتا رہا۔ پھر وہ وہاں سے جنگل کی طرف نکل گیا اور اسی کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ "ارادت اور حلوہ، اِن دونوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق؟"

جب یہ آواز معدوم ہو گئی تو آپ نے اپنے مریدوں سے پوچھا۔ "وہ دیوانہ درویش کہاں چلا گیا؟"

مریدوں نے عرض کیا۔ "حضرت اُسے جنگل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "جاؤ دیکھو وہ جنگل میں کیا کر رہا ہے؟"

کئی مرید اس درویش کی تلاش میں جنگل کی طرف نکل گئے اور وہاں اُسے تلاش کرتے رہے۔ وہاں جنگل کے ایک گوشے میں ایک چھوٹا سا قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ مریدوں نے قافلے والوں سے پوچھا۔ "آپ لوگ یہاں کب سے ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

قافلے والوں نے جواب دیا۔ "کل سے۔ آج کوچ کر جائیں گے۔"

ایک مرید نے کہا۔ "کیا آپ میں سے کسی نے درویش کو اس جنگل میں آتے دیکھا ہے؟"

ایک شخص نے جواب دیا۔ "ہاں، دیکھا ہے۔ وہ درویش ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ ارادت اور حلوہ، اِن دونوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق؟" مریدوں نے بیک آواز کہا۔ "ہاں، ہم اسی درویش کی بابت پوچھ رہے ہیں۔"

قافلے والوں نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "اُدھر — اس طرف اُسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔"

مرید اس طرف روانہ ہو گئے اور اُسے ہر طرف تلاش کرنے لگے۔ کئی گھنٹوں کی جستجو کے بعد ایک جگہ سے سسکتے ہوئے درویش کی لاش مل گئی۔ وہ عالمِ نزع میں بھی وہی فقرا دہرا رہا تھا۔ "ارادت اور حلوہ۔ اِن دونوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق؟"

کچھ دیر کے بعد اس کی آواز نکلنا بند ہو گئی۔ ایک مرید نے اُس کے دل والے حصے پر اپنا داہنا کان رکھ دیا۔ وہ درویش کے دل کی دھڑکن سُننے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہاں کوئی بھی حرکت نہ تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے کان ہٹا لیا۔

مُرید کے ساتھیوں نے پوچھا۔ "کیا ہُوا؟ کیا یہ بے ہوش ہو چکا ہے؟"

مرید نے جواب دیا۔ "نہیں یہ بے ہوش نہیں ہوا، اس کا انتقال ہو چکا ہے یہ مر گیا ہے۔"

درویش کی موت کا سبھی کو بے حد دُکھ ہُوا۔ یہ لوگ واپس پہنچے اور آپ کو مطلع کیا کہ درویش

آپ کا فقرہ دہراتے دہراتے چل بسا۔"

آپ کو درویش کی موت کا بے حد دُکھ ہُوا۔ فرمایا: "معلوم نہیں وہ کون سی گھڑی تھی جب میری زبان سے وہ ہلاکت آفریں فقرہ نکل گیا۔" پھر آپ کئی دن تک خاصے پریشان رہے اور آئندہ گفتگو کرنے اور کوئی بات کہنے سے پہلے خاصی سوچ بچار کرتے تھے۔

اس واقعے کے کافی دنوں بعد آپ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا: "حضرت میں آپ کی دُعا کا طالب ہوں۔"

آپ نے جواب دیا: "میری دُعا سے تجھ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟"

اس شخص نے کہا: "میں فائدے نقصان کی بات تو سوچ بھی نہیں رہا۔ میں تو آپ کی دُعا کا طالب ہوں، بس۔"

آپ نے فرمایا: "تم خود بارگاہِ خداوندی میں پہنچ جاؤ۔ وہاں میری دُعا کی حاجت ہی نہیں رہے گی۔"

اس نے کہا: "مجھے تو بارگاہِ خداوندی کا کوئی علم نہیں۔ اگر آپ یہی مناسب سمجھتے ہیں تو پھر مجھے وہیں بھیج دیجئے۔"

آپ نے کہا: "پھر یہاں کیوں کھڑے ہو۔ وقت ضائع مت کرو۔ اسی وقت وہاں چلے جاؤ۔"

اس شخص نے عرض کیا: "میں آپ سے بارگاہِ خداوندی کا پتہ پوچھ رہا ہوں، وہ کہاں ہے۔ اس کا پتہ تو سمجھا دیں۔"

آپ نے جواب دیا: "جہاں تمہارا اپنا وجود باقی نہ رہے، وہیں پر بارگاہِ خداوندی واقع ہے۔"

وہ شخص آپ کے پاس سے چلا گیا اور گوشہ نشینی اختیار کر کے یادِ الٰہی میں مشغول ہو گیا۔

اس واقعے کے کافی دنوں بعد اس شخص مذکورہ کے علاقے میں زبردست سیلاب آیا۔ اس سیلاب نے پورا علاقہ تہ و بالا کر دیا۔ سیلاب نے آپ کے علاقے کو بھی نہیں چھوڑا اور یہاں بھی تباہ کاری مچادی۔ آپ کی خانقاہ بلندی پر تھی اس لیے سیلاب کا پانی اوپر نہیں چڑھ سکا۔ شیب والوں نے پناہ کے لیے آپ کی خانقاہ کا رُخ کیا۔ آپ نے اللہ کی اس مخلوق کو خوش آمدید کہا۔

اس دوران آپ کو وہ شخص یاد آیا جو بارگاہِ خداوندی کا پتہ پوچھ کر واپس چلا گیا تھا۔ ایک شخص نے جواب دیا: "حضرت! اس شخص کو ہم ایک چھوٹے سے حجرے میں قید دیکھ آئے ہیں۔ پتہ نہیں اس سیلاب نے اس کا کیا حال کیا ہو گا۔" آپ نے پوچھا: "کیا اس کا حجرہ میری خانقاہ کی طرح

کسی اونچی جگہ پر واقع ہے۔"

جواب ملا: "نہیں۔ وہ تو شہر کے بالکل نشیب میں واقع ہے۔"

آپ نے آنکھیں بند کرلیں اور مراقبے میں اُس شخص کو تلاش کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ نظر آگیا۔ اس حال میں کہ وہ شخص پانی کی سطح پر موجود تھا اور سیلاب کا پانی اُسے کسی قسم کا نقصان پہنچانے سے قاصر تھا۔ آپ نے آہستہ سے کہا: "اچھا تو تجھے بارگاہِ خداوندی حاصل ہوگئی۔"

دوسرے دن آپ نے اس شخص کو اس حال میں دیکھا کہ وہ پانی کی سطح پر بہتا آپ کی طرف چلا آرہا ہے۔ یہ حیرت انگیز منظر صرف آپ ہی نے نہیں دوسروں نے بھی دیکھا۔ آپ نے رشک آمیز نظروں سے اس شخص کو دیکھا اور دوسروں سے کہا: "پانی جو پوری آبادی کو برباد کر رہا ہے، اس شخص کو اپنے سینے پر بٹھائے میری طرف لیے چلا آرہا ہے۔ خوب!" جب یہ شخص آپ کی خانقاہ کے ٹیلے کے مقابل آگیا تو آپ نے اُسے آواز دی: "اب تو پانی کو چھوڑ دے۔"

اس شخص نے پانی کی سطح سے اس طرح چھلانگ لگا دی جس طرح لوگ کشتی سے چھلانگ لگا کر خشکی پر اُترتے ہیں۔ یہ شخص آپ کی خانقاہ کے پاس آیا تو شیخ نے چند قدم آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور پوچھا: "اے شخص! یہ میں نے کیا دیکھا؟"

اس شخص نے کہا: "آپ نے وہی دیکھا جو ہر کوئی دیکھ رہا تھا اور اس میں کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔"

آپ نے فرمایا: "میں نے جو کچھ دیکھا اس میں میرے لیے تو واقعی حیرت کی کوئی بات نہ تھی لیکن دوسرے واقعی حیرت زدہ ہیں اور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایسا کیونکر ممکن ہوا؟"

اس نے جواب دیا: "حضرت! آپ ہی نے مجھے بارگاہِ ایزدی میں پہنچنے کی دعا دی تھی اور پتہ سمجھایا تھا۔ بالآخر میں وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔"

آپ نے دوسرے پناہ لینے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ تجھ کو یہ مقام کس طرح حاصل ہوا۔ ذرا ان کو بھی بارگاہِ خداوندی میں پہنچنے کا راستہ بتا دے تاکہ ان کی حیرت میں کمی آئے۔"

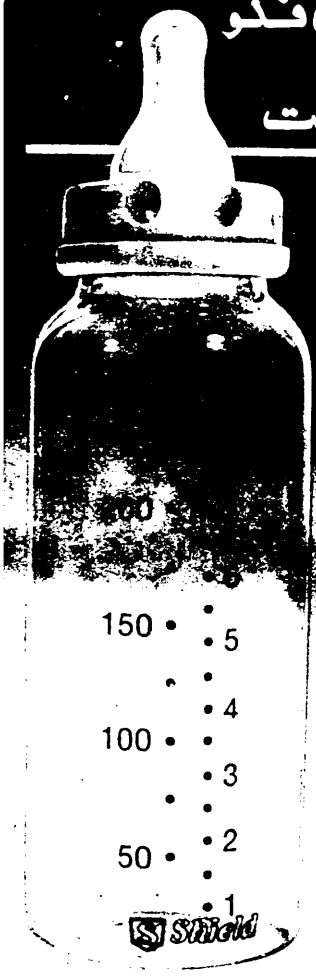
اس شخص نے واقعہ بیان کر دیا اور آخر کہا: "ایک دن شیخ ممشاد دینوری ہی نے مجھے بارگاہِ خداوندی کا پتہ بتایا تھا کہ جہاں تمہارا وجود باقی نہ رہے، وہیں بارگاہِ خداوندی ہے۔ میں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور یادِ الٰہی میں مشغول ہوا۔ اس طرح میں بارگاہِ خداوندی میں پہنچ گیا۔"

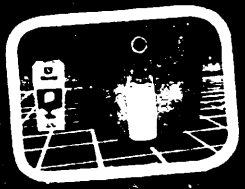
آپ نے یہ سب سننے کے بعد اعلان کیا: "لوگو! اس شخص نے جو کچھ بتایا اس سے تمہیں یہ بات

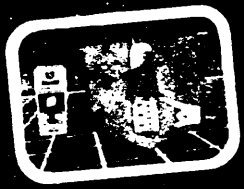
شیلڈ ایون فلو

فیڈر اور نپل

محافظِ صحت اور پُرسہولت



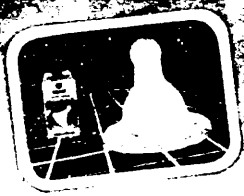


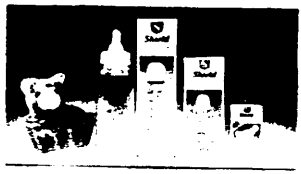


شیلڈ ایون فلو فیڈر
فوڈ گریڈ پولی کاربونیٹ
سے تیار کردہ
دودھ کا رواں بہاؤ

ہینڈل اسکیل ہموار سطح
مکمل صفائی نا مشکل آسان







Crescent Communications International

معلوم ہوئی کہ فقر کے لیے جدّ و جہد ضروری ہے۔"

آپ سے پوچھا گیا: "حضرت! توکّل کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ آپ کے نزدیک توکّل کا کیا مطلب ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "توکّل کا مطلب سیدھا سادا ہے جس شے پر نفس اور قلب راغب ہو، اس کو ترک کر دینا توکّل ہے۔"

آپ توکّل کی تعریف کرنے کے بعد فقر و فقیری پر باتیں کرنے لگے: "بھوک کی حالت میں نماز پڑھنا اور جب طاقت نہ رہے تو سو جانا، فقر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تین چیزوں سے درویش کو خالی نہیں رکھتا۔ اللہ یا تو درویش کو طاقت عطا کر دیتا ہے یا اس کو موت سے ہمکنار کر دیتا ہے تاکہ اُسے ہر شے سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔"

آپ سے کسی نے سوال کیا: "حضرت! ایک چیز ہے علائق۔ یعنی دنیا اور اہلِ دنیا سے تعلّق ہونا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ انسان علائق میں کیوں مبتلا ہو جاتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "علائق کے تین سبب ہوتے ہیں۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ انسان ان اشیاء کی طرف راغب ہو جائے جن کو ممنوع قرار دیا گیا ہو جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔" یعنی انسان اس شے کی حرص کرتا ہے جس سے اُسے منع کیا جائے۔ دوم یہ کہ سابقہ لوگوں کے حالات پر غور کرنا اور سوم یہ کہ فراغت کو زائل کر دینا۔"

آپ کا اصل نام ممشاد علو تھا چونکہ آپ کے خاندان کا تعلّق کسی زمانے میں کرمان شاہ کے ایک علاقے دینور سے تھا اس لیے آپ ممشاد علو دینوری کے نام سے مشہور ہوئے۔

آپ کے انتقال کے واقعہ کے بارے میں مختلف روایات موجود ہیں۔ ایک روایت یہ ہے۔ مشہور صوفی بزرگ شیخ محمد بن حنیفہ نے خواب میں دیکھا کہ ممشاد دینوری ان کے پاس کھڑے ہیں اور وہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر کہہ رہے ہیں کہ اے دلوں کا حال جاننے والے، اے دلوں کے مالک! ان کے ہر فقرے پر آسمان کچھ نیچے آجاتا ہے ان کی تکرار سے دلوں کے مالک جاری ہے اور آسمان کے نیچے آنے کا عمل بھی جاری ہے یہاں تک آسمان اُن کے سر پر آکر چپٹ گیا اور کسی نے اس میں سے ممشاد دینوری کو اُٹھا لیا اور یہ اُس میں روپوش ہو گئے۔ صوفی شیخ محمد بن حنیفہ جیسے ہی خواب دیکھ کر بیدار ہوئے تو انہوں نے لوگوں سے کہا۔ کہ آج ممشاد دینوری ہمارا ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھوڑ گئے ہیں۔ اِدھر یہ خواب دیکھا گیا اُدھر غالباً ۲۹۸ھ یا ۲۹۹ھ میں حضرت ممشاد علو دینوری سخت بیمار پڑ گئے اور کچھ دنوں بعد ہی اس دارِ فانی سے رُخصت ہو گئے۔

شیخ سیف الدین رحؒ

دو گوں کا ایک جمِ غفیر بازار میں جمع تھا۔ دو عالم دین کسی مسئلے پر آپس میں مناظرہ کر رہے تھے۔ دونوں علمیت میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔ دلائل و تماثیل سے حوالہ جات دیے جا رہے تھے۔ ان عالموں کو مناظرہ کرتے بلکہ لڑتا دیکھ کر ایک درویش نے جو پاس سے گزر رہے تھے پوچھا۔

"میرے عالم دوستو! مَیں آپ دونوں سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ دونوں کیوں اور کس بات پر اُلجھ رہے ہیں؟"

دونوں مولویوں میں سے ایک نے دُوسرے کی بات اُچک کر راہ گیر درویش کے سوال کا جواب دیا۔ وہ کہنے لگا "اے درویش! میں اپنے علم کے زور اور عقل کی بناء پر اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہوں مگر میرا مدِمقابل میری باتوں کو تسلیم کرنے کی بجائے میرے ساتھ اُلجھنے کو ہی اپنے علم کی حقیقت سمجھ رہا ہے۔"

درویش ابھی خاموش تھے کہ مدِمقابل عالم نے بھی لب کشائی کی اور کہا۔

"اے راہ گیر! یہ مولوی صاحب اپنے آپ کو برحق کہتے ہیں حالانکہ کوئی بھی انسان مکمل طور پر نیک اور پارسا نہیں ہو سکتا۔

دونوں عالموں کی ایک دُوسرے کے خلاف اشتعال انگیز باتیں اِس چیز کی غماز تھیں کہ

اگر ان کی زبان خاموش نہ ہوتی تو وہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیں گے۔ اور بات خون خرابے تک پہنچ جاتے گی۔ درویش لوگ اللہ کے سچے محب ہوتے ہیں۔ انھیں مخلوقِ خدا کی بھلائی کا بھی پورا پورا احساس ہوتا ہے اس لیے مذکورہ درویش نے بھی دونوں عالموں کو بحث و مباحثے سے روکنا چاہا اور فرمایا۔

"اے دین کے پاسبانو! آپس میں اس طرح مت لڑو اور اُلجھو۔ تمھارا یہ عمل نہ صرف اسلام کے اصولوں کے منافی ہے بلکہ باعثِ جگ ہنسائی بھی ہے۔" مگر دونوں مولویوں نے تو شاید ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی ٹھان رکھی تھی اُن پر کوئی نصیحت یا نرم بات تو اثر انداز ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اسی لیے ایک مولوی صاحب نے درویش کو جھڑک کر کہا۔

"ارے بھائی! تو جا اپنا راستہ ناپ تمھیں ہمارے معاملے سے کیا غرض۔

جن لوگوں کو اُمتِ مسلمہ کی بھلائی اور اچھائی مقصود ہوتی ہے وہ بڑی بڑی تکالیف برداشت کر جاتے ہیں۔ اسلام کے سچے شیدائی اور جانثار تو آگ میں کُودنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ یہ درویشِ موصوف بھی اسلام کے داعی اور شیدائی تھے۔ اِن کے دل میں مسلمانوں کے لیے درد اور اپنائیت تھی لہٰذا انھوں نے عالمِ دین کی سرزنش و مذمت کی پرواہ کیے بغیر اپنی کوشش جاری رکھی اور کہا۔

"اے میرے عالم دوستو! مَیں بھی آپ لوگوں جیسا مُسلمان ہوں۔ مسلمان کی یہ تعریف ہے کہ وہ ایک دُوسرے کا بہی خواہ اور خیر خواہ ہوتا ہے۔ مجھے بھی اسلام کی اور اسلام کے ماننے والوں کی بھلائی مقصود ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے دو عالم بھائی آپس میں لڑ کر اسلام کے وقار کو سبوتاژ کریں اور غیر مُسلموں میں اپنی مسلمانی کا مذاق اُڑوائیں۔"

دونوں عالمِ دین اپنی لڑائی بھول کر درویش کے پیچھے پڑ گئے اور کہنے لگے۔

"اے میاں ناصح! ذرا یہ بتا تو کیا جانتا ہے۔ کیا تو ہم لوگوں سے زیادہ عالم ہے۔ جو ہم دونوں کے درمیان آکر اپنا زورِ بیان دکھا رہا ہے۔"

درویش نے مسکرا کر کہا "بھائیو! تم لوگ تو ناراض ہونے لگے ہو۔ میں تو بالکل اَن پڑھ آدمی ہوں اور تم جیسے عالموں کو دیکھ کر خُدا کا شکر کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ایسا علم عطا نہیں فرمایا جس کے حصول کے بعد میں بھلائی کی بجائے بُرائی کی طرف متوجہ رہتا۔"

درویش نے اتنا کہا اور عالموں کو اُن کے حال پر چھوڑا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ جمِ غفیر جو عالموں کی لڑائی اور مناظرے کے مزے لے رہا تھا۔ درویش کو جاتے دیکھا تو لوگ اس کے

پیچھے دوڑے۔ ہر ایک کے دل میں خُدا نے یہ بات اور احساس ڈال دیا کہ ہو نہ ہو یہ ضرور کوئی اللہ کا کامل ولی ہے جس نے عالموں کو معرفت و حقیقت اور عرفان کی باتیں سمجھائیں لیکن جب عاقبت نااندیش عالموں نے اُن کی بات پر کان نہیں دھرا تو وہ چلے گئے۔ یہ سوچ کر ہجوم کے لوگوں نے مذکورہ درویش کے پیچھے جاکر اُن کو روکا۔ اُن سے دُعا تے خیر کی درخواست کی اور پھر درویش کی رسانیت، محبت اور دین سے تعلقِ خاطر دیکھ کر اُن کے ارادت مند بن گئے۔

یہ درویش کوئی غیر معمولی انسان نہیں تھے بلکہ جلیل القدر اہلِ اللہ تھے۔ آپ مشہورِ زمانہ عالمِ دین مولانا شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کے پدرِ بزرگوار تھے۔ آپ کا نام حضرت شیخ سیف الدّین تھا۔ آپ کی تاریخ ولادت کے بارے میں تو تذکرہ نگاروں نے کوئی متفقہ رائے نہیں دی۔ تاہم یہ ضرور لکھا ہے کہ آپ کے جدِ امجد "بخارا" کے رہنے والے تھے۔ یہ غالباً سُلطان علاؤالدین خلجی کے دور کا آغاز تھا کہ "بخارا" سے ایک قبیلہ نقل مکانی کرکے ہندوستان آیا اور یہاں دربارِ خلجی سے آکر وابستہ ہوگیا۔ سلطان خلجی نے بخارا کے آنے والوں کی نہ صرف پذیرائی کی بلکہ اُن کو اپنے دربار میں جاہ و مناصب سے بھی نوازا۔ اس قافلہ کے سردار آغا محمد ترک تھے۔ جب گجرات تسخیر ہوا تو سلطان خلجی نے آغا محمد ترک کو گجرات میں رہنے کا حکم دیا۔ مذکورہ آغا نے حکم شاہی پر عمل کیا اور گجرات میں رہائش پذیر ہوگئے۔ لیکن یہ ٹھکانہ عارضی ثابت ہوا۔ بخارا کے اس سردار سے دیگر امراء حسد کرنے لگے اس لیے آغا محمد ترک کو گجرات چھوڑ کر دہلی آنا پڑا۔ سلطان نے ترک سردار کو دہلی میں ٹھہرنے کا مشورہ دیا اور یہاں پہلے سے زیادہ ترک و احتشام عطا کیے۔

عروج و زوال تو اس عالم کا لازمہ ہے۔ سلطان خلجی جب تک زندہ رہا اس نے بڑی [illegible] حکومت کی۔ لیکن اس کی وفات کے بعد ہندوستان کی حکومت اس کی اولاد کے ہاتھوں [illegible] مختلف واسطوں سے خاندانِ تغلق میں منتقل ہوگئی۔ آغا محمد ترک کے مقام اور شان [illegible] کی تبدیلی سے تو کوئی فرق نہ پڑا۔ لیکن قدرت نے ترک سردار کے ساتھ نہایت سنگین [illegible] سوائے اُن کے بڑے بیٹے ملک معزالدّین کے علاوہ باقی سارے خاندان کے [illegible] وفات پاگئے۔ گھر والے نہ رہے تو دُنیا سے بھی اُن کا دل اُچاٹ ہوگیا۔ ترک سردار [illegible] ہوکر "شیخ صلاح الدین پسروری" کی خانقاہ میں معتکف ہوگئے اور عبادت و ریاضت [illegible] مگن ہوتے کہ اپنے آپ کو اور اپنے بیٹے کو بھی بھُول گئے۔ ایک روز مراقبہ میں غرق [illegible] خدا کی طرف سے حکم دیا گیا۔

"اے آغا محمد ترک! اپنے بیٹے کے پاس جاؤ اور مت گھبراؤ کہ وہاں تمہارا دل نہیں لگے گا۔ بلکہ خوش ہو جاؤ کہ تمہاری اولاد سے ایسا دینی سلسلہ چلنے والا ہے جو قیامت تک اپنے نام اور مقام کے اعتبار سے ہمیشہ نامور اور مشہور رہے گا۔"

آغا ترک واپس پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ آپ کا بیٹا ملک معز الدین آپ کا ہمسر بن چکا ہے اور یوں ملک موسیٰ بھی جوان ہو چکا ہے۔ قدرت نے شاید آغا ترک کو صرف بیٹے اور پوتے سے ملاقات کے لیے ہی واپس بھیجا تھا۔ اسی لیے ترک سردار معز الدین کے پاس جب پہنچا تو بیٹے اور پوتے کے ساتھ ایک آدھ روز ہی رہا کہ خدا کی طرف سے بلاوا آگیا اور اس نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد ملک معز الدین بھی باپ کے پیچھے چل پڑا اور وہ بھی خدا کو پیارے ہو گئے۔ دادا اور باپ کی یکے بعد دیگرے اموات نے ملک موسیٰ کو بہت غمگین اور بے چین کر دیا۔ اپنے دل کو بہلانے کے لیے ملک موسیٰ کے ذہن میں ماوراء النہر کی یاد آئی اور وہ عازم بخارا ہوئے۔

بخارا اور سمرقند اُن دنوں تیمور گورگان کے زیر تسلط تھا۔ تیمور کو ملک موسیٰ کی خاندانی عظمت سے پوری آگاہی حاصل تھی۔ اسی لیے اُس نے ملک موسیٰ کو بلوایا اور پوچھا۔

"ملک موسیٰ! ہندوستان سے یہاں کیوں چلے آتے ہو؟"

کہا گیا "وہاں کی سرزمین سے دل بھر گیا تھا۔ اس لیے سوچا کہ اپنے وطنِ مولوف کی طرف جاؤں اور اپنے بزرگوں کے وطن کو دیکھوں۔"

تیمور نے پوچھا۔

"وطن دیکھ لیا ہے یا کوئی چیز دیکھنی ابھی باقی ہے؟"

جواب دیا گیا "دیکھ لیا ہے۔"

تیمور نے تحکمانہ انداز میں کہا "تو پھر واپس چلے جاؤ۔"

ملک موسیٰ نے عرض کی "اے شہنشاہ! میں ہندوستان کو چھوڑ کر آیا ہوں۔ اب وہاں جا کر کیا کروں گا۔ وہاں نہ میری کوئی جائیداد ہے اور نہ ہی دربارِ شاہی میں مجھے کوئی مقام حاصل ہو گا۔"

تیمور نے حکمران دہلی کے نام ایک فرمان لکھا جس میں تحریر کیا ملک موسیٰ کی تمام جائیداد اُن کو دی جائے اور ان کے آباؤ اجداد کا جو منصب و وقار رہے وہ بھی انھیں لوٹا دیا جائے۔"

ملک موسیٰ کے پاس اب بخارا میں رہنے کا کوئی جواز نہ تھا چنانچہ تیمور کے احکام لے کر وہ آگئے۔ ملک موسیٰ ہندوستان میں ایسے آباد ہوئے کہ پھر انھوں نے بخارا کا نام تک نہ لیا۔

انہی ملک موسیٰ کی اولاد میں ایک شیخ کامل فیروز صاحب پیدا ہوتے ـــــ آپ علم و ادب
، دلیری، سخاوت، ظرافت، لطافت اور عشق و محبت میں فرد تھے۔ دولت و حشمت، عزت و
ہمیشہ اُن کے ہمرکاب رہتی تھی۔

شیخ فیروزؒ نے اپنے زمانے بہرائچ کی جنگ میں شرکت کرنے کا ارادہ فرمایا تو اُن کی اہلیہ
اُن کو جنگ پر جانے سے روکا اور کہا۔

"میں اُمید سے ہوں اور ایسے وقت میں مجھے آپ کی ضرورت ہے لہٰذا آپ جنگ پر نہ جائیں"

شیخ فیروزؒ خدا رسیدہ آدمی تھے۔ انھوں نے بیوی کو تشفی دے کر فرمایا۔

"نیک بخت! خدا پر بھروسہ رکھ۔ مَیں جنگ پر جا رہا ہوں اور ہو سکتا ہے مَیں واپس نہ آؤں
اور خدا کی راہ میں شہید ہو جاؤں۔ مگر تم نے کسی حال میں بھی گھبرانا نہیں۔ خدا تعالیٰ تمھیں ایک بیٹا عطا
فرمائے گا جس سے میرا سلسلہ روحانیت پھلے پھولے گا اور ہونے والے بچے کا نام شیخ سعد اللہ رکھنا"

ولی اللہ کے مُنہ سے نکلنے والا کلام درحقیقت خدا کی تائید ہوتی ہے۔ اور یہاں بھی یہی ہوا
کہ شیخ فیروزؒ جنگ بہرائچ میں شہید ہو گئے اور آپ کی شہادت کے بعد آپ کے گھر ۸۶۰ھ میں
ایک لڑکا پیدا ہوا۔ بچے کا نام شیخ سعد اللہؒ ہی رکھا گیا۔ اس بچے نے تصوف اور دینی تعلیم میں
ایک ممتاز مقام حاصل کیا اور ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی اور بڑے ہو کر اُس زمانے
کے مشہور صُوفی شیخ منگنؒ کے پاس گئے اور اُن کے مرید ہو گئے۔ شیخ منگنؒ خدا شناس بزرگ تھے
وہ پہچان گئے کہ صاحبزادہ نہ صرف ولی زادہ ہے بلکہ ایک شہید کا بیٹا ہے۔ اس لیے انھوں نے
شیخ سعد اللہؒ کو اپنا مرید کر لیا۔ اسی سعد اللہؒ نے اپنے مُرشد کے حکم کے مطابق شادی کی جس کے
نتیجے میں خدا تعالیٰ نے اُنھیں اولادِ نرینہ سے سرفراز فرمایا۔ آپ کے دو بیٹے ہوئے جن کے نام
رزق اللہ اور سیف الدین تھے۔ شیخ منگنؒ نے جہاں شیخ سعد اللہؒ کی تربیت کی تھی وہاں ان کی
اولاد کو بھی درسِ روحانیت دیا اور کم عمری میں شیخ رزق اللہ اور سیف الدین نے شیخ منگنؒ
بیعت کر لی۔

اللہ تعالیٰ جس پر مہربان ہو جاتے اُس پر جگ مہربان ہو جاتا ہے۔ شیخ سعد اللہ
بے پایاں مہربانیاں تھیں یہی وجہ ہے کہ اُن کی اولاد کو خُدا نے علم و عرفان کے خزانوں
دیا۔ شیخ سعدؒ کے بڑے بیٹے رزق اللہ تو آپ کی زندگی میں بڑے ہو گئے اور انھوں
فارسی پر عبور حاصل کر لیا مگر شیخ سیف الدین ابھی کمسن ہی تھے کہ شیخ سعد اللہ کو پیغام اجل
کے وصال کا احوال بھی بہت دلچسپ ہے۔ ایک شب شیخ سعدؒ اپنے کمسن بچے سیف

اپنے میں لے گئے اور خود تہجد پڑھنے لگے اور بیٹے کو اپنے قریب بٹھا دیا۔ جب تہجد ادا کر چکے تو بعد نے خدا سے عرض کی۔

اے میرے مولا کریم! تو خوب جانتا ہے میں نے اپنے بڑے بیٹے کو حتی الامکان تعلیم دی ہے نے اُس کے حقوق نہایت فراخدلی اور کشادگی سے ادا کیے ہیں لیکن اپنے چھوٹے بیٹے سیف الدین کی تعلیمی اور دیگر ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہوں۔ تو جانتا ہے میرا وقت قریب آگیا ہے اور میں وہ تمام حقوق جو سیف الدین کے سلسلہ میں میرے ذمہ ہیں تیرے سپرد کرتا ہوں اب ہی اس کا حامی و ناصر ہے۔"

کمسن سیف الدین باپ کی گریہ زاری سنتا رہا۔ کچھ زیادہ سمجھ نہ سکا۔ لیکن ولی زادہ تھا اس کے مُنہ میں بھی وہ زبان تھی جس کو خُدا نے طاقت بخشی تھی اپنے غمزدہ والد کو تسلی دی اور عرض کی۔

"باوا جان! آپ نے جب مجھے خُدا کے حوالے کر دیا ہے تو اب کیوں پریشان ہیں۔ اب مطمئن ہو جائیے۔"

شیخ سعدؒ خدا سے دُعا مانگ کر مطمئن ہو گئے اور پھر کچھ ہی روز بعد خُدا کو پیارے ہو گئے۔

شیخ سیف الدینؒ والد کی وفات کے بعد گو اپنے بھائی کی تحویل میں چلے گئے۔ مگر انھیں شدّت سے احساس تھا کہ انھیں بہت کچھ بننا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی پوری توجہ تعلیم پر اور اپنی والدہ کی خدمت پر صرف کی اور پھر ایک دن آیا کہ آپ چرخ روحانیت پر ماہِ کامل بن کر چمکے۔

شیخ سیف الدینؒ نے اپنی تعلیم کے ابتدائی سال مختلف اساتذہ کی زیرِ نگرانی گزارے۔ ذوق و شوق، لگن اور انہماک نے آپ کی شخصیت میں نکھار پیدا کر دیا۔ عاجزی، خوش کلامی اور فرمانبرداری نے آپ کو جاذبِ نظر کر دیا۔ استاد اور آپ کے ہم مکتب آپ کی دل و جان سے عزّت کرتے اور سنِ شعور تک ابھی آپ پہنچے ہی تھے کہ آپ کی خدمت میں شہر کے آسودہ حال اور فارغ البال لوگ آپ کی خدمت میں آنے لگے۔ سارا دن آپ لوگوں میں گھرے رہنے کے باوجود بھی خدا سے لَو لگائے رکھتے۔ رات کے وقت جب سارا عالم محوِ خواب ہوتا تھا آپ نہایت خشوع و خضوع سے عبادتِ الٰہی میں مصروف ہو جاتے تھے۔

آپ نے بچپن میں اپنے والد صاحب کے ہمراہ شیخ منگن کی بیعت کر لی تھی۔ لیکن اب اُن سے انیت کی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ جب موصوف بزرگ بقیدِ حیات تھے تب آپ بالکل کم سن رجب آپ شعور کی عُمر کو پہنچے تو حضرت وصال فرما گئے تھے۔ اس لیے رُوحانی تشنگی دُور

کرنے کے لیے آپ کو کسی صاحب حال بزرگ کی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں حضرت سیف الدینؒ دہلی شہر اور مضافات میں بہت بڑی بڑی روحانی شخصیات سے ملے۔ لیکن آپ کے دل کو کسی ایک سے بھی سکون میسّر نہ آیا۔ اس سلسلہ میں آپ بہت پریشان رہنے لگے۔ کسی کامل ہستی کی جستجو نے آپ کو بے چین کر رکھا تھا۔ آپ خُدا سے ہر وقت اس سلسلہ میں دُعاگو رہتے تھے۔ خُدا کو آخر آپ پر ترس آگیا اور یوں آپ کی ملاقات اُس عہد کے مشہور بزرگ شیخ امان اللہ پانی پتی سے ہوگئی۔

شیخ پانی پتی نے آپ کو دیکھا وہ گوہر یک دانہ پہچان گئے اور آپ کو حکم دیا کہ آپ میرے پاس رہنا شروع کر دیں۔ شیخ امان اللہ حضرت سیف الدین سے کوئی بات چیت نہیں کرتے تھے مگر ساتھ رہتے رہتے ہی حضرت شیخؒ کی شخصیت نے سیف الدینؒ کو اتنا متاثر کیا اور اس صحبت کی لذّت اور جذب نے آپ کو یہیں کا کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد دریائے روحانیت جوش میں آیا اور ایک روز حضرت نے سیف الدین پر تلطف فرمایا تو سیف الدین کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ صرف اتنا عرض کیا۔

"حضرت! میں بچپن میں شیخ منگن کا مرید ہو چکا ہوں۔"

حضرت نے رسان سے جواب دیا "بیٹے! پھر کیا ہوا۔ تم بالکل پریشان نہ ہو۔ تم اب میرے پاس آگئے ہو۔ اب میرا فرض ہے کہ میں تمھیں وہاں پہنچا دوں جہاں کے تم مستحق ہو۔"

سیف الدین کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور عرض کیا "حضرت! میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔"

حضرت امان اللہ پانی پتیؒ نے اُس دن سے سیف الدینؒ پر تلطف اور محبّت فرمانا شروع کر دیا اور پھر ایک روز سیف الدینؒ نے دیکھا کہ حضرت امان اللہ پانی پتی کاغذ پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ سیف الدین کافی دیر خاموش بیٹھے حضرت کو لکھتا دیکھتے رہے۔ جب حضرت لکھ چکے تو آپ نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

"حضرتؒ! آپ کیا تحریر فرما رہے تھے۔ کیا اس ناچیز کو نہیں بتائیں گے؟"

حضرتؒ نے وہ کاغذ جس پر کچھ لکھا تھا وہ سیف الدینؒ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سیف الدینؒ نے پڑھا تو حیران رہ گئے۔ لکھا تھا۔

"شیخ سیف الدین! اللہ تمھیں دُنیا اور آخرت میں یکساں طور پر کامیاب کرے۔ اس خط کے ساتھ وہ مسوّدہ خلافت منسلک ہے جو میں اپنے نامزد مریدوں کو دیا کرتا ہوں۔ اس لیے تم آج سے میرے نائب اور خلیفہ ہو۔"

نیابت و خلافت کے ملنے کی شیخ سیف الدینؒ کو بہت خوشی ہوئی۔ لیکن آپ نے ایک مرتبہ پھر حضرت سے عرض کی "حضرت! میں نے جو بیعت بچپن میں شیخ منگنؒ سے کی تھی اُس کا کیا کروں"۔

شیخ امان اللہ پانی پتیؒ نے جواب دیا "اے سیف الدینؒ! اللہ پاک حُسنِ نیت اور اعمال کا خبر گیر ہے۔ اس کے ہاں باتیں کرنے والوں کا کوئی مقام نہیں، مقام صرف اچھے اعمال کرنے والوں کو ملتا ہے۔ تمہارے لیے بس یہی ایک حکم ہے کہ تم عبادت و ریاضت کرو۔ توحید و رسالت پر ایمان راسخ رکھو اور اس کے ساتھ ساتھ شاعری کرو۔ کیونکہ درد و سوز تمہاری شاعری میں اس قدر ہوگا کہ تمہارا ہم پلّہ کوئی دوسرا نہیں ہوگا۔ اب تم چاہو تو میرے پاس رہو اور اگر چاہو تو اپنے گھر چلے جاؤ۔ مگر یاد رکھنا کوئی ایسی بات تمہاری زبان سے عمر بھر نہ نکلے جو کبر و نخوت آگیں ہو"۔

شیخ سیف الدین نے فیصلہ کیا کہ جب تک میں کسی منزل پر نہیں پہنچ جاتا مجھے اپنے مُرشد کی صحبتِ صالح میں ہی رہنا چاہیئے۔ اس لیے آپ ہر وقت اپنے مُرشد سے تعلیم روحانیت حاصل کرتے رہتے اور اُن کی دعاؤں سے فیض یاب ہوتے تھے۔

ایک دن شیخ امان اللہ نے آپ سے پوچھا۔

"سیف الدینؒ! ذرا یہ بتاؤ تم خیالات اور تصوّرات میں اب تک کیا دیکھتے رہے ہو"؟

عرض کی "حضرت! میرا کوئی حال ہی نہیں اس لیے میرے حالات اور تصوّرات کیا ہوں گے"۔

حضرت نے پھر پوچھا "میں تو تمہاری طبیعت کے میلان سے آگاہ ہونا چاہتا تھا"۔ اس پر سیف الدین نے عرض کی۔

"حضرت! کبھی کبھی میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ گویا زمین سے عرش تک سب کچھ میرے احاطے میں ہے اور میں ان پر محیط ہوں"۔ یہ سننا تھا کہ شیخ امان اللہ پانی پتی ہنس پڑے اور فرمایا۔

"اس کا یہ مطلب ہے کہ تمہارے اندر تخمِ توحید موجود ہے"۔

اس کے بعد شیخ کی توجہ سیف الدین پر زیادہ سے زیادہ ہوگئی۔ ایک رات حضرت نے آپ کو اپنے حُجرے میں طلب کیا اور فرمایا۔

"بابا سیف الدین دیکھو! ہم درویشوں کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک راستہ تو وہ ہے جو ہمیں دو قدم میں اللہ تک پہنچا دیتا ہے اور دوسرا راستہ وہ ہے جو ایک ہی قدم میں ہمیں اللہ کے قریب لے جاتا ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ وجود ہو یا عدم، یعنی ہمیں یہ جاننا ہے کہ ہم وجود سے اپنی راہ طے کریں گے یا عدم میں اس کو تلاش کریں گے۔ عدم کے بارے میں میری اپنی رائے

یہ ہے کہ اس کا کہیں وجود ہی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وجود ہے اور وجود ہی حق ہے۔ ہم اس راستے سے ایک قدم میں اللہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کو ہمارے تصوف کی زبان میں سجودِ قلب کہا جاتا ہے۔"

سیف الدین سُن رہے تھے لیکن گم صم تھے۔ شیخ امان کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا۔

"پانی پر چلنا، ہوا میں اُڑنا، آگ میں کُودنا یہ سب معمولی چیزیں ہیں اور بہ آسانی حاصل کی جا سکتی ہیں لیکن سجودِ قلب مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔

روحانیت کی تربیت کے دوران ہی شیخ سیف الدینؒ نے مسئلہ توحید پر غور کرنا شروع کر دیا۔ آپ سوچتے تھے کہ یہ توحید آخر کیا چیز ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ ہر شے میں موجود ہے تو یہ اکیلا و یکتا کیونکر ہوا؟ اس کے علاوہ یہ بھی خیال آپ کے ذہنِ نارسا میں گردش کرتا کہ اگر کوئی چیز اپنے وجود سے بہت سی چیزیں بنا رہی ہو تو وہ گویا خرچ ہو رہی ہے اور جو چیز مسلسل خرچ ہو رہی ہو اس کے اپنے وجود میں مسلسل کمی ہوتے رہنا یقینی ہے۔ پھر اللہ کی ذات کو اس قطعی، مطلق اور یقینی قانون سے کس طرح مبرّا قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ اس مسئلے پر ایک عرصہ تک غور و خوض کرتے رہے۔ مگر اس کا حل یا جواب نہ پا سکے۔ آخر کار آپ نے اس عقدے کو اپنے پیر و مرشد شیخ امان اللہ کے سامنے رکھا۔ حضرت نے محسوس کیا کہ میرا مرید اُلجھن کا شکار ہے۔ راہِ روحانیت میں اگر کوئی اُلجھن درپیش آجاتے تو اس کا حل صرف مُرشد اور صاحبانِ معرفت ہی بتایا کرتے ہیں شیخ امان اللہؒ نے بھی اپنے مرید کی کیفیت کو بھانپا اور فرمایا۔

"بابا سیف الدین! اللہ تعالیٰ اپنی وحدت اور اطلاق کے باوجود ہر ذرّے میں موجود اور کارفرما ہے۔ نور کا تقسیم کرنا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا محال ہے۔ اگر ایک چراغ سے ہزار چراغ روشن کرنا معمول کی بات ہے تو کیا ایک چراغ سے جلنے والے ہزاروں چراغ اپنی روشنی کھو بیٹھیں گے؟ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اسی طرح اللہ بھی تمام کا مصدر ہونے کے باوجود اپنی حالتِ تجرّد و اطلاق پر قائم اور برقرار ہے۔

اللہ کے سوا کوئی چیز کیسے ہو سکتی ہے۔ جو چیز عدم سے وجود میں آئی وہ اللہ تعالیٰ کی وجہ سے آئی۔ اللہ تعالیٰ جیسا تھا ویسا ہی رہا اور ویسا ہی اب بھی ہے یعنی وہ پہلے بھی اللہ تھا اور اب بھی اللہ ہی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی چیز شریک نہیں ہے۔

اہلِ اللہ طبعاً وحدت الوجود سے ہم آہنگی رکھتے تھے۔ جس کے مطابق نظریہ ہمہ اوست یا اندر ہمہ اوست

کارفرما رہتا ہے۔ ایسے لوگ سکون کی طرف مائل رہتے ہیں اور ان کا اس پر ایمان ہوتا ہے کہ وہ اور اللہ جدا نہیں۔ ایک دریا ہے تو دوسرا قطرہ۔ یہ وصل کے قائل ہوتے ہیں اور ان کا نعرہ ہوتا ہے انا الحق۔ لیکن شیخ سیف الدین وحدت الشہود کے قائل تھے۔ ان کا نظریہ تھا "ہمہ از اوست" تصوف میں جوش کے قائل تھے اور ان کا ایمان تھا کہ ان کے ساتھ وہ اور اس کے ساتھ یہ ہیں۔ عشق ان کا سب کچھ تھا اور ان کا اعتقاد تھا کہ میں کون؟ انا عبدہٗ۔ علماء اور مشائخ جب کہتے تھے کہ عالم اس سے ہے اور اس پر ہے بلکہ تمام اشیاء اسی سے ہیں تو آپ فرماتے تھے کہ اگر یہ بات یوں کہی جاتے کہ عالم اللہ سے ہے تو زیادہ بہتر ہے۔ اسی طرح حقیقت یہ ہے کہ یہ کام دل کا ہے اس کا زبان سے کیا تعلق اور زبان سے وہی کہنا چاہیے جو شریعت کے موافق اور مطابق ہو اور اگر بغور دیکھا جاتے تو معلوم ہو جاتے گا کہ عالم اس سے ہے اور یہاں جو کچھ ہے اسی سے ہے۔ آپ اپنے اس عقیدے کو ایک خوبصورت تشبیہ سے واضح کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ نے اپنے مریدوں کو درس دیتے ہوتے فرمایا۔

"دوستو! روحیں کیا چیز ہیں"۔ سب کے سب مرید خاموش تھے کسی کو اس کا جواب آتا ہوتا تو کوئی بولتا۔ آخر آپ نے اس کا جواب دینا شروع کیا۔

"یہ اللہ کی مہربانیوں اور اس واجب الوجود کے تعینات کے حصے ہیں جو مختلف ماہیتوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ یہ تقسیم اس قسم کی نہیں جسے عقل و شعور اپنے دوسرے متعلقات پر محمول کرے۔ تم لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ بچے ایک ہانڈی میں بہت سارے سوراخ کر کے اس کے اندر چراغ روشن کر دیتے ہیں اور اس چراغ کی روشنی ان بہت سے سوراخوں میں سے خارج ہوتی رہتی ہے لیکن چراغ کی اصل روشنی اپنی جگہ پر قائم اور برقرار رہتی ہے۔ اسی روشنی کو ہم تجزیہ تقسیم اور حصوں میں نہیں بانٹ سکتے۔ بالکل اسی طرح اللہ کا وجود ہے جو اپنے اطلاقِ حقیقی پر باقی اور قائم ہے اور وہ کائناتی ماہیتوں کے روزنوں اور دریچوں سے روشن اور درخشاں ہے۔

حضرت شیخ سیف الدینؒ اپنا زیادہ تر وقت ریاضت و مجاہدات میں بسر کرتے تھے۔ آپ کو اللہ کی یاد کے سوا کسی اور سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ آپ اپنے ان مجاہدوں کا اثر جب اپنی اندرونی کیفیات اور واردات میں تلاش کرتے تو آپ کو بڑی مایوسی ہوتی۔ آپ کے آس پاس صوفیاء اور اہل اللہ کی بے شمار تعداد تھی۔ مگر آپ ان میں بھی وہ چیزیں تلاش کرتے تھے جو خود آپ میں ابھی تک پیدا نہیں ہوتی تھیں اور پھر جب ان صوفیوں اور اللہ والوں کے پاس سادہ لوح لوگوں کا ہجوم دیکھتے جنھیں

ارادت مند یا مرید کہا جاتا ہے اور جو اپنے مُرشدوں کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہنے اور ہاں میں ہاں ملانا سعادت مندی سمجھتے ہیں تو آپ کو بہت افسوس ہوتا۔

اِسی طرح ایک ظاہر دار صوفی کا واقعہ آپ بیان فرماتے ہیں۔

"آپ نے ایک روز ایک صوفی کو دیکھا جو اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کے درمیان یوں کروفر اور اکڑ کر چل رہا تھا جیسے امراء اور وزراء اپنی رعایا اور غلاموں کے درمیان چل رہے ہوتے ہیں۔ ایسی باتیں صوفیاء کو کسی طرح بھی سزاوار نہیں ہوتیں۔

آپ نے اس صوفی سے پوچھا۔

"حضرت! یہ لوگ کون ہیں جو آپ کے اِرد گرد چل رہے ہیں"۔ صوفی نے طنزاً اور غُصّے سے فرمایا۔

اے شخص تم اتنے بھولے بھی نہیں۔ تم جانتے ہو کہ یہ لوگ کون ہیں لیکن اگر تم نے پوچھ ہی لیا ہے تو سُن لو۔ یہ میرے مرید ہیں۔ میں ان کا رہبر و رہنما ہوں۔ یہ میری عزّت کرتے ہیں میرے محب و جانثار ہیں۔ میں ان کا خیال رکھتا ہوں اور روحانی سفر میں ان کا میر کارواں ہوں"۔

شیخ سیف الدینؒ نے کہا "محترم صوفی صاحب! آپ کو کس قدر خوش فہمی ہے کہ آپ ان مریدوں سے افضل و برتر ہیں اور ان کی رہنمائی پر مامور ہیں"۔

یہ سُننا تھا کہ صوفی ظاہر دار کو سخت غُصّہ آیا اور اُس نے آپ سے کہا۔

"تو کون ہے اور کیسی باتیں کر رہا ہے"۔

آپ نے کہا۔ "جناب! میں ایک احقر العباد اور کمتر انسان ہوں اور میری باتیں بھی نہایت آسان ہیں جو آپ کی سمجھ آسکتی ہیں۔ اور رہی میری حیثیت کی بات میں کچھ بھی نہیں لیکن جس راہ پر چل رہا ہوں اس راہ کی منزل کا متلاشی ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ میں تائیدِ ایزدی کے بغیر کچھ نہیں پا سکتا"۔

مذکورہ صوفی کے ہمراہ اُس کے مرید جو پہلے شیخ سیف الدینؒ کی باتوں پر ناک بھوں چڑھا رہے تھے وہ آہستہ آہستہ آپ کی طرف متوجّہ ہوتے۔ صوفی کو اس بات کا خدشہ پیدا ہوا کہیں اس درویش کے ساتھ فضول بحث و مباحثہ میں مریدوں سے بھی نہ جاؤں اس لیے اُس نے حضرت سیف الدین سے کہا۔

"بھائی! تم اپنی راہ لو۔ ہمارے پاس تمہاری فضول باتیں سُننے کا کوئی وقت نہیں۔ ہم تو ایک مرید کے گھر ضیافت پر مدعو ہیں اور وہاں پہنچنے کا وقت ہو رہا ہے۔ اس لیے ہم جاتے ہیں"۔

حضرت سیف الدین بھلا کہاں جانے دیتے تھے فوراً فرمانے لگے۔

"صوفی صاحب! اللہ والے کے لیے یہ قطعاً مناسب نہیں کہ وہ مخلوقِ خدا کے پیچھے بھاگے بلکہ اُس کے لیے تو اللہ ہی کافی ہے۔ آپ ہیں کہ ایک ضیافت کے پیچھے خدا کی باتوں سے گلو خلاصی چاہتے ہیں۔"

اب موصوف صوفی صاحب کا غُصّہ دوچند ہوا وہ تو حضرت کو سخت بُرا بھلا کہنے لگے جس کے جواب میں حضرت خاموش رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صوفی کے سارے کے سارے مرید اپنے نام نہاد اور ظاہر دار بزرگ سے سخت بیزار ہوتے اور کہنے لگے۔ "اے ہمارے مُرشد ہمیں تو یہ کوئی کامل آدمی معلوم ہوتا ہے جس کو آپ بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ ہم لوگ تو خدا شناسی اور خُدا رسیدگی کے لیے آپ کا دامن تھام کر اور اُنگلی پکڑ کر آپ کے ساتھ چل رہے تھے۔ لیکن آپ خُدا کے ایک نیک بندے کو محض اس بناء پر بُرا بھلا کہہ رہے ہیں کہ وہ حق بات کر رہا ہے اور جو حق بات سُن کر بھی اپنے خیالات اور میلانات نہ بدلے اس کے ساتھ رہنا ہمیں پسند نہیں ہم آپ سے معذرت کے ساتھ علیٰحدہ ہوتے ہیں۔" یہ کہا اور سارے مرید حضرت سیف الدین کی طرف رجوع کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

حضرت سیف الدینؒ نے اُن سب لوگوں کو سمجھاتے ہوئے فرمایا۔

"اے بندگانِ خُدا! میں نے تمھیں مرید بنانے یا آپ کے مُرشد کو نیچا دکھانے کے لیے یہ بات چیت نہیں کی۔ میں تو صرف آپ کے مُرشد کی اصلاح چاہتا تھا اور اسی بناء پر میں نے حق آگیں باتیں اُن کے ساتھ کی ہیں۔ اور میری آپ کو بھی نصیحت ہے کہ آپ اپنے مُرشد کا دامن بالکل نہ چھوڑیں اور اگر یہ اچھے اور راستی کے کام کریں اور اسلام کی حقانیت کے پیروکار رہیں تو اِن کی اطاعت آپ پر واجب ہے ورنہ آپ کوئی اور راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔"

"پھر آپ نے اُسی مذکورہ ظاہر دار صوفی کو بھی نصیحت کی اور فرمایا۔

"اے اللہ کے بندے! اللہ تعالیٰ نے تجھے عزت بخشی ہے۔ مریدوں کی ایک فوج ظفر موج تیرے ساتھ ہے۔ تجھے خُدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے سیدھی راہ پر چلنا چاہیئے اور اپنے مریدوں کی بھی سیدھی راہ پر رہنمائی کرنی چاہیئے۔"

یہ باتیں سُن کر وہ صوفی صاحب حضرت سیف الدینؒ کے سامنے دست بستہ ہو کر بولے۔

"حضرت! میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ جیسے رہنما نے میری زندگی کے بند دریچے کھول دیے ہیں۔ مجھے اب ان مریدوں کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ مجھے تو آپ جیسے شیخ کی ضرورت ہے۔ آپ

اپنی تعلیم صالحہ کے ساتھ میری تربیت کیجئے۔"

مریدوں نے مُرشد کو حضرت کا دامن تھامتے دیکھا تو سب کے سب یعنی پیرو مرید حضرت کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلام کی حقیقی اور اصولی راہ پر گامزن ہو گئے۔

ایک مرتبہ آپ اپنے بڑے بھائی رزق اللہ کے ہمراہ "قلعہ تغلق آباد" گئے۔ وہاں آپ نے کافی سیر و سیاحت کی۔ جب آپ تھک گئے تو قلعہ کی دیوار پر بیٹھ گئے۔ حضرت سیف الدینؒ کا کیونکہ معمول ہی یہ تھا کہ وہ جہاں ہوتے، جہاں جاتے یا جہاں بیٹھتے اُن کا نقطۂ فکر توحید ہی ہوتا تھا۔ قلعہ کی دیوار پر بیٹھ کر بھی آپ توحید ہی کے بارے میں غور و خوض کر رہے تھے۔ جبکہ آپ کے بھائی رزق اللہ صاحبؒ، ویسے ہی یادِ الٰہی میں مشغول تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ قلعے کے ساتھ گزرنے والی سڑک پر آنے جانے والے لوگوں کو بھی دیکھ رہے تھے۔ اچانک آپ دونوں بھائیوں کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جو روحانیت و طریقت میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا اور اُس سے مخلوقِ خدا بیگانہ تھی اور وہ سب سے جُدا اور یگانہ لوگوں کے ہجوم میں چلا آ رہا تھا۔ حضرت سیف الدینؒ اور آپ کے بھائی نے جب اس بزرگ کو دیکھا تو آپ دونوں کے دلوں میں اس بُزرگ سے ملاقات اور بات چیت کا شوق اس قدر تیز ہوا کہ انتہائی بلند و بالا دیوار سے آپ دونوں نے چھلانگ لگا دی۔ سڑک پر آنے جانے والے لوگوں نے جب دو آدمیوں کو قلعہ کی دیوار سے گرتے دیکھا تو سب آپ کی طرف بھاگے اور آپ دونوں کو اٹھانا چاہا۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ اتنی اونچائی سے گرنے کے بعد یہ حضرات زندہ نہیں بچے ہوں گے۔ مگر لوگوں کے آپ تک پہنچنے سے پہلے وہ بزرگ جس کے اشتیاق میں آپ دونوں بھائیوں نے قلعے سے کُود کر جان کی پروا نہیں کی تھی آگے بڑھے اور آپ کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ دیکھنے والی آنکھیں حیران رہ گئیں کہ یہ دونوں حضرات اتنی بلندی سے گرنے کے باوجود بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ وہ یگانہ اوصاف بزرگ آپ دونوں کو محبت سے اپنے ساتھ لے گئے۔ آپ نے روحانی تالیف کی اور تلطف و مہربانی فرمائی اور خدا کے دربار میں ان دونوں بھائیوں کے لیے بلند مقام کے حصول کے لیے دعائیں دیں۔

آپ کی خدمت میں ایک دفعہ کسی شخص نے گلاب کے پھول پیش کیے۔ آپ نے پھول [illegible] لیے اور پھولوں کو سونگھ کر درودِ پاک پڑھا اور پھر فرمایا۔

"گلاب کے پھول اور درود شریف کا ثواب دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیتے گئے۔ جس طرح خود خدا کو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو درود پاک سے محبت ہے۔ اسی طرح گلاب بھی انھیں پسند ہے۔ اس لیے یہ ہدیہ بارگاہِ الٰہی اور بارگاہِ رسالت میں پیش کیے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ فقیر کا نذرانہ قبول فرمالیا ہے۔"

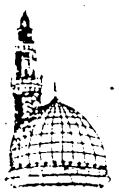
عمر کے آخری حصے میں آپ پر خشیتِ الٰہی اس حد تک غالب آگیا کہ آپ ہر وقت روتے رہتے تھے۔ اور بار بار آپ کی زبان پر یہی الفاظ آتے۔

"میں اپنی زندگی میں ایک چیز بھی نہیں دیکھتا جس پر فخر کر سکوں اور اسے دربارِ الٰہی میں پیش کر سکوں۔" یہ کہتے کہتے آپ اتنا روتے کہ آنسوؤں کا سیلاب آجاتا۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر آپ کے ایک دوست نے آپ کو تسلی دی اور کہا۔

"حضرت! خدا کے خوف سے اگر ایک آنسو بھی آنکھ سے نکل پڑے تو یہ دوسری عبادتوں سے افضل ہوتا ہے اور آپ تو خشیتِ الٰہی سے اتنا رو چکے ہیں کہ خدا را بس۔ اب اور نہ روئیے۔" آپ نے اپنے دوست کے جواب میں فرمایا۔

"اے دوست! میں حیران ہوں میری نگاہ جب اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور استغنا پر پڑتی ہے تو مجھے اپنی تمام عبادتیں اور اطاعتیں کمتر نظر آتی ہیں۔ یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ میرا انجام کیا ہوگا اسی خیال سے مجھے رونا آجاتا ہے۔"

پیراں سالی میں آپ مسلسل بیمار رہنے لگے۔ اور اس علالت کے دوران بھی آپ کا معمول یہ رہا یا تو آپ ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے یا پھر مولانا عبدالحق سے قرآن پاک سنتے رہتے۔ ایک دن آپ تلاوتِ قرآن پاک سن رہے تھے کہ سناٹا چھا گیا۔ آپ نے بلند آواز میں کلمہ طیبہ پڑھا اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ آپ کی تاریخ وصال ۲۷ شعبان ۹۹۰ھ مرقوم کی گئی ہے۔



میاں شوربائی رحمۃ اللہ علیہ

ایک عورت کو اللہ کے کسی نیک بندے سے گہری عقیدت تھی اُس عورت کا شوہر ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس عورت کا یہ معمول بن چکا تھا کہ وہ عموماً اس نیک بندے کی خدمت میں حلوہ پیش کرنے آیا کرتی تھی۔ ایک روز جب یہ عورت حلوہ لے کر آئی تو اس نیک صفت بزرگ نے کہا: "خاتون تو میری اس قدر خدمت کرتی ہے کبھی تو مجھے بھی کوئی کام بتا۔"

عورت نے کہا: "میری کوئی خواہش نہیں البتہ ایک خیال سے میں بے چین رہتی ہوں۔"

"کون سی بات ہے؟" بزرگ نے پوچھا۔

عورت کہنے لگی: "بات دراصل یہ ہے کہ میرا خاوند اور بیٹا دونوں ملک سے باہر روزی کی تلاش میں گئے ہوئے ہیں۔ ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے انھوں نے مجھے اپنی خیریت کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ واپس میرے پاس آجائیں تاکہ میرے دل کو اطمینان حاصل ہو۔"

یہ بات سُن کر اللہ کا نیک بندہ تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا: "خاتون تو اسی وقت گھر چلی جا' انشاء اللہ وہاں پر تیرا شوہر اور بیٹا دونوں موجود ہوں گے۔" پھر جب عورت اپنے گھر پہنچی تو اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہاں پر اُس کا شوہر اور بیٹا دونوں

موجود تھے۔ عورت خوشی سے پھولی نہ سمائی اور اُسی وقت حلوہ لے کر اللہ کے اس نیک بندے کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئی اور اُسے بھی اپنے پیاروں کی آمد کی بابت بتا کر تہِ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اس پر اللہ کے نیک بندے نے کہا۔" خاتون شکر تو اُس خدا کا ادا کر جو تیرے شوہر اور بیٹے کو گھر لایا۔"

اللہ کے یہ نیک اور پرہیز گار بندے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وہ قصور کے ولی کامل، صاحبِ علم وفضل میاں اخوند سعید شوربافیؒ تھے جو آج بھی عظیم روحانی ہستی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپ کے بارے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ آپ نے باقاعدہ کسی کی مُریدی اختیار نہیں کی۔ تاریخ تصوّف کی مشہور ترین شخصیت ابوالحسن خرقانی کے بعد اخوند سعید کو ثانی ابوالحسن خرقانی کا لقب دیا گیا۔

ان کے بارے میں ایک اور منفرد بات یہ ہے کہ عالمِ شباب کے دوران وہ زیادہ تر اپنے ہم عمر نوجوانوں کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے۔ گھڑسواری کا انھیں بے حد شوق تھا وہ اکثر تیر کمان اور تلوار و خنجر سے لیس ہو کر جنگل کی طرف نکل جایا کرتے تھے۔ بوڑھے اور عمر رسیدہ لوگ جب نوجوان سعید کو لہو ولعب میں مشغول پاتے تو انھیں خاصی ٹوک ٹوک کرتے اور نصیحت کرتے کہ وہ دنیا سے زیادہ دین کی طرف توجہ دے تاکہ اُس کی آخرت سنور سکے۔ سعید بزرگوں کی باتیں بڑی توجہ اور انہماک سے سنتے مگر کرتے وہی جو اُن کا دل چاہتا۔

ایک روز سعید شکار پر نکلے ہوئے تھے۔ دوسرے نوجوان بھی گھوڑے پر آپ کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے ایک دم آپ کو احساس ہوا کہ یہ بھی کس قدر فضول اور بے مقصد مشغلہ ہے کہ خوامخواہ بے زبانوں کی جان چلی جاتی ہے اور ہم اس پر خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس خیال کے آتے ہی آپ نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ آپ کی اس حرکت پر دوسرے ساتھی حیرت زدہ رہ گئے وہ سب بیک وقت بولے۔" کیا ہوا سعید بھائی خیریت تو ہے؟"

" کچھ نہیں ہوا۔" سعید نے کہا۔" دراصل جانوروں کو مارنا اُن کا شکار کرنا یہ سب چیزیں مجھے بے معنی سی لگتی ہیں۔" اتنا کہنے کے بعد سعید نے اپنے گھوڑے کا رُخ گھر کی جانب موڑ دیا۔ گھر پہنچ کر آپ کافی دیر تک تنہائی میں اس مسئلے پر غور کرتے رہے۔ اُن کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات جنم لینے لگے اس عالم میں اچانک انھیں شیخ بنّاک اور اُن

کے پیر و مُرشد شیخ وتو کا خیال آگیا۔ ان دونوں بزرگوں کے چرچے ان دِنوں زبانِ عام پر تھے اور لوگوں سے اُن کی روحانی طاقت اور علمیت وفضیلت کے چرچے بھی سُن چکے تھے۔ بہرکیف ایسی ہی باتیں سوچتے ہوئے سعید نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ خواب میں اُن کی ملاقات انہی دونوں بزرگوں سے ہوئی جو ایک ساتھ پلنگ پر تشریف فرما تھے۔

سعید نے دریافت کیا: "آپ دونوں کون ہیں اور یہاں پر آپ کی موجودگی کا کیا سبب ہے؟"

اُن میں سے ایک بزرگ نے جواب دیا: "میرا نام شیخ وتو ہے۔" اور پھر دوسرے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ میرا مرید اور خلیفہ شیخ بتک ہے۔"

اپنا تعارف کروانے کے بعد شیخ وتو نے پوچھا: "تم کون ہو اور یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہو؟"

انھوں نے جواب دیا: "مَیں اخوند سعید ہوں اور آپ دونوں کا عقیدت مند ہوں۔"

"ہم سے کیا چاہتے ہو؟" شیخ وتو نے پوچھا۔

سعید کہنے لگے: "گزارش یہ ہے کہ مَیں نے اپنی عمر کا ایک حصّہ سیر و سیاحت ایسے فضول مشغلے میں گزارہ ہے لیکن اب میری یہ خواہش ہے کہ مکتوبِ حقیقی سے ملوں۔"

سعید کی بات سن کر شیخ وتو نے پاس بیٹھے اپنے مُرید اور خلیفہ شیخ بتک سے کہا "اس کے لیے کچھ کرو۔"

مؤرخین روایت بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر شیخ بتک نے اپنی دو انگلیاں اخوند سعید کی پشت پر ٹکا دیں۔ اخوند سعید کو یوں محسوس ہوا جیسے اُن کے دماغ میں کوئی شے سرایت کر گئی ہو۔ ابھی یہ عمل جاری ہی تھا کہ اخوند سعید کی آنکھ کھُل گئی۔ انھوں نے اپنے اندر ایک غیر معمولی نوعیت کی روحانی تبدیلی محسوس کی۔ اُن کے دل میں ایک طرح کی روشنی پیدا ہوگئی۔

اس واقعہ کے بعد اخوند سعید تقریباً دنیا سے بیزار دکھائی دینے لگے۔ کسی بھی دنیاوی کام میں اُن کا جی نہیں لگتا تھا۔ دن رات یادِ الٰہی کو انھوں نے اپنی زندگی کا معمول بنا لیا۔ جیسے ہی آپ کی زندگی کا ڈھنگ بدلا آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگا۔ دُور دُور سے لوگ آکر آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ آپ کی گفتگو اس قدر پُرتاثیر اور سحر انگیز ہوتی تھی کہ پہلی ہی ملاقات میں آپ کے ملاقاتی آپ کے گرویدہ ہو جایا کرتے تھے۔

ایک روز آپ جب اپنے مُریدوں کے درمیان تشریف فرما تھے تو آپ نے اُن سے پوچھا۔ "کیا تم لوگ کبھی شیخ بتک کی گلی میں بھی گئے ہو؟"

مُریدوں میں سے ایک نے جواب دیا۔ "وہاں ہمارا جانا تو نہیں ہوا ویسے بھی وہاں شیخ بتک کی اولاد ہر طرف آباد ہے۔"

اس پر اخوند سعید نے کہا۔ "ہمیں اس سے کیا ہم تو شیخ بتک کے مزار پر حاضری دینا چاہتے ہیں۔" چنانچہ اس کے بعد مُرید بھی اُن کے ساتھ ہو لیے اور یہ سب شیخ بتک کی گلی کی جانب روانہ ہو گئے لیکن ابھی اُن کا مزار کچھ فاصلے پر تھا کہ اخوند سعید کے قدم ایک دم رُک گئے۔ اس پر مُرید حیران ہوئے اور دریافت کیا۔ "یہ آپ چلتے چلتے اچانک رُک کیوں گئے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "مجھے اُدھر جاتے ہوئے اس خیال سے شرم محسوس ہو رہی ہے کہ شیخ بتک کی اولاد نے تو دنیا کو ترک کر دیا ہے اور مال و زر کو مُنہ بھی نہیں لگایا لیکن ایک میں ہوں کہ اپنی زندگی کا ایک بڑا حصّہ سیر و سیاحت میں گزار کر اس کوچے میں قدم رکھ رہا ہوں۔ اب میں اس گلی کے بہادر مکینوں کے سامنے کیا مُنہ لے کر جاؤں؟"

چند ساتھیوں نے دریافت کیا۔ "آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

اخوند سعید نے کہا۔ "میری باتیں تمہاری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ تم جا کر مزار پر حاضری دے آؤ میں یہیں پر کھڑا تمہاری واپسی کا منتظر رہوں گا۔" اس موقع پر آپ نے ایک شخص سے بطورِ خاص کہا۔ "جب تُو مزار پر جائے تو میری جانب سے بطورِ خاص یہ کہہ دینا کہ حضرت! اخوند سعید کو جو کچھ بھی ملا ہے وہ اللہ کی کرم نوازی سے آپ کی بدولت ہی ملا ہے۔ یہ ایک ایسا احسان ہے جسے میں کسی طور بھی نہیں اُتار سکتا۔"

اس پر بھی کچھ عقیدت مندوں نے اصرار کیا کہ آپ کو پیر و مُرشد کے مزار پر ضرور جانا چاہیے مگر آپ کسی طور بھی رضامند نہ ہوئے۔ چنانچہ بہ امرِ مجبوری مُرید آپ کو وہیں چھوڑ کر شیخ بتک کے مزار پر چلے گئے اور وہاں مؤدب کھڑے ہو کر کہا۔

"حضرت پیر و مُرشد اخوند سعید آئے تھے مگر یہاں پر حاضری نہیں دے سکے۔ انھوں نے حاضری کیوں نہ دی اس کا سبب آپ کو معلوم ہو چکا ہو گا۔"

یہ پیغام دے کر جب مُرید مزار سے واپس آئے تو اخوند سعید نے دریافت کیا۔ "کیا تم نے شیخ بتک کو میرے بارے میں بتا دیا۔" مُریدوں نے اثبات میں جواب دیا۔ یہ سُن کر

آپ کا دل بھر آیا اور کہنے لگے اب میں کتنا دکھ اور کرب محسوس کر رہا ہوں شاید کوئی اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔

اس واقعہ کے بعد تو آپ کی ریاضت و عبادت اور مجاہدوں میں بہت زیادہ شدت آگئی۔ آپ کا جب کبھی شیخ بتک کی گلی سے گزر ہوتا تو یہی کہتے کہ یہاں سے تو مجھے بوئے عشق آرہی ہے لیکن اس کے برعکس جب آپ دوسری گلیوں سے گزرتے تو خود سے ہمکلام ہو کر کہتے کہ یہاں سے مجھے بوئے دنیا آرہی ہے۔

مشہور ہے کہ آپ کا ایک مرید گھوڑوں کی تجارت کیا کرتا تھا۔ اُس نے دکن جانے کا قصد کیا اور اس سلسلے میں آپ کے پاس جا کر اجازت طلب کی۔ آپ نے فرمایا "تم بے شک دکن چلے جاؤ مگر اس بار تمہیں کچھ پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"کیا راستے میں کوئی راہزنی کا اندیشہ ہے؟" تاجر نے پوچھا۔

حضرت اخوند سعید نے کہا "سودا تو ہو جائے گا۔" افغان تاجر اس بات سے قدرے مطمئن ہو گیا اور گھوڑے لے کر دکن روانہ ہو گیا۔ وہاں پر بڑے بڑے رئیس، نواب اور جاگیردار بھی گھوڑوں کی خرید کے لیے آئے ہوئے تھے مگر ان میں سے کسی نے بھی گھوڑوں کے اس افغان تاجر کی جانب رجوع نہیں کیا۔ اب تو افغان تاجر بہت مایوس ہوا۔ دو چار دن اسی عالم میں گزر گئے۔ اُس کی آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر چند روز تک کوئی گاہک نہ آیا تو نہ جانے میرا کیا حشر ہو گا۔ اس روز رات کو جب وہ بستر پر گیا تو کسی طور بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ اس دوران تاجر کو اپنے پیر و مرشد کا خیال آگیا۔ اُس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور وہ خیالوں ہی خیالوں میں میاں اخوند سعید سے گفتگو کرنے لگا۔ تاجر کہہ رہا تھا "میاں صاحب! اگر آپ نے مجھے یہ بتا دیا ہوتا کہ معاملہ مشکل قرار پائے گا۔ تو میں یہاں پر ہرگز نہ آتا۔" پھر وہ رو رو کر فریاد کرنے لگا۔ "حضرت میں کچھ نہیں جانتا آپ میری مشکل آسان کریں اگر تین روز تک میرا کام نہ ہوا تو میں کہیں کا بھی نہ رہوں گا۔" اس طرح شکوے شکایت کرتے کرتے تاجر کی آنکھ لگ گئی۔ رات کو میاں اخوند سعید کو تاجر نے خواب میں دیکھا جو اُسے تسلی و تشفی دے رہے تھے۔

تاجر نے کہا "میاں جی! اگر آپ مجھ کو یہ بتا دیتے کہ اس بار کاروبار نہیں ہو گا تو میں یہاں ہرگز نہ آتا۔ اب بتائیے میں کیا کروں؟"

آپ نے تاجر سے کہا "مایوسی گناہ ہے تو اللہ پر بھروسہ کر انشاء اللہ کل تیرے پاس

گاہک ضرور آئے گا۔"

اس پر افغان تاجر نے کہا" میاں جی خریدار تو میرے پاس بہت آئے ہیں مگر کسی سے سودا طے نہیں پاتا۔"

میاں اخوند سعید نے فرمایا" اب بے فکر ہو جاؤ کل ایک ایسا گاہک تیرے پاس آئے گا جس کے ہاتھ میں نیلی ہمیانی ہوگی تم اُس پر خاص توجہ دینا اُس کے ساتھ تمہارا سودا طے پا جائے گا۔"

اس کے ساتھ ہی تاجر کی آنکھ کھل گئی رات اُس نے جو خواب دیکھا تھا اُس کا تاجر پر بہت گہرا اثر تھا۔ اگلے روز صبح سویرے ہی تاجر کے پاس گاہکوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا مگر تاجر ان گاہکوں میں سے اُس خریدار کو تلاش کر رہا تھا جس کے بارے میں میاں اخوند سعید احمد نے خواب میں بتایا تھا کہ اُس کے ہاتھ میں نیلی ہمیانی ہوگی۔ صبح سے دوپہر ہوگئی تھی مگر ابھی تک مطلوبہ خریدار کی آمد نہ ہوئی تھی۔ دوپہر ڈھلنے کے بعد جب تاجر مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا تب ایک خریدار نے اُس کے پاس آکر پوچھا" بتا تیرے پاس کتنے گھوڑے ہیں؟"

" میرے پاس تقریباً دو سو گھوڑے ہیں۔" افغان تاجر نے بے تابی سے جواب دیا۔

خریدار کہنے لگا" میں تمہارے تمام گھوڑے خریدنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بولو کتنی رقم پیش کروں؟"

افغان تاجر نے اپنے دو سو گھوڑوں کی مجموعی قیمت بتا دی مگر پھر کہنے لگا" بھائی تم دو سو گھوڑوں کا سودا تو کرنے آگئے ہو مگر اس وقت تمہارے ہاتھ میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔"

اس پر خریدار بولا" قیمت ادا کرنا میرا کام ہے۔"

" اگر ایسا ہے تو قیمت میرے حوالے کرو۔ میں اپنا مال تمہارے حوالے کرتا ہوں۔"

افغان تاجر کے رویے سے خریدار غصے میں آگیا۔ کیونکہ وہ اُسے کنگال سمجھ رہا تھا۔ وہ اس قدر ناراضگی کے عالم میں تھا کہ اُس نے تاجر کے ساتھ تفصیلی بھاؤ بھی نہیں کیا اور فوراً اپنے ملازم کریم بخش کو بلوایا۔ کریم بخش کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جو اُس نے آتے ہی اپنے مالک کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر خریدار نے اُس تھیلے کے اندر سے ہمیانی نکالی۔ جسے دیکھتے ہی تاجر کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ کہنے لگا" اب مجھے یقین آگیا ہے

کہ آپ واقعی خریدار ہیں اور یقیناً آپ میرے تمام گھوڑے خرید لیں گے۔"

اب گاہک اپنی جگہ حیران تھا کہ اتنی جلدی افغان تاجر کے رویّے میں تبدیلی کیسے آگئی۔ بہرکیف خریدار نے گھوڑوں کی مجموعی قیمت ادا کر کے گھوڑے خرید لیے۔ پھر اُس نے افغان تاجر سے پوچھا۔ "اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ اچانک تم خوش اخلاق کس طرح بن گئے؟"

افغان تاجر کی میاں اخوند سعید سے خواب میں جو ملاقات ہوئی تھی اور اسی دوران جو باتیں ہوئی تھیں اُس کے بارے میں گھوڑوں کے خریدار کو تفصیلاً بتا دیا۔ اب تو خریدار کو بھی میاں اخوند سعید سے ملنے کا بہت اشتیاق ہوا۔ اُس نے کہا۔ "بھائی اگر میں قصور آؤں تو کیا میاں اخوند سعید سے میری ملاقات ہو سکے گی؟"

تاجر کہنے لگا۔ "میاں اخوند سعید تو بہت نیک، رحمدل اور بھلے آدمی ہیں، ہر کسی سے ملنا اور اُس کے کام آنا میاں صاحب کی فطرت میں شامل ہے۔" اس کے بعد خریدار تو گھوڑے لے کر چلا گیا اور اِدھر افغان تاجر نے قصور پہنچ کر سارا واقعہ میاں اخوند سعید کے گوش گزار کر دیا۔ اب تو وہ میاں صاحب کا پہلے سے زیادہ معتقد ہو چکا تھا۔ اسی زمانے میں قصور میں "پیر رحمت" نامی ایک اور بزرگ کا بھی بڑا چرچا تھا۔

اسی دوران ـــــ اللہ کا ایک برگزیدہ بندہ بزرگانِ قصور سے ملاقات کیلئے قصور تشریف لا ۔ سب سے پہلے وہ پیر رحمت کے پاس گئے اور کافی دیر تک اُن کی روحانی اور علمی گفتگو سے مستفید ہوتے رہے۔ کسی نے اس برگزیدہ ہستی سے پوچھا کہ آپ نے پیر رحمت کو کیسا پایا ہے؟

اس نیک بندے نے جواب دیا۔ "وہ تو صاحبِ ولایت و ریاضت ہیں اُن کی ذات سے مَیں بہت متاثر ہوا ہوں۔"

اس پر سوال کرنے والے شخص نے کہا۔ "اب آپ میاں اخوند سعید سے بھی ملاقات کریں۔"

اس کے کہنے پر یہ بزرگ درویش، میاں اخوند سعید سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں اُن کا دل ایسا لگا کہ وہ بہت دنوں تک میاں اخوند سعید ہی کے ساتھ رہے۔ جب وہ بزرگ یہاں سے رخصت ہوئے تو پھر اُس شخص نے پوچھا۔ "اب آپ یہ بتائیں کہ میاں اخوند سعید کو آپ نے کیسا پایا؟"

اس بزرگ نے جواب دیا۔ "مَیں اُن سے بہت مرعوب ہوا ہوں وہ ایک ایسے بحرِ ذخار ہیں کہ جس کا کوئی ساحل نہیں ہے۔"

میاں اخوند سعید کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ جو جس موضوع پر بھی بات کرتا آپ اُس کا ساتھ دیتے اور اس موضوع میں اپنی برتری کو ثابت کرتے۔

پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ لوگ بہت زیادہ آپ کے معتقد ہو گئے اور ہر وقت آپ کی خدمت میں حاضر رہنے لگے۔ مگر آپ ہر ممکن اُن سے بچنے کی کوشش کرتے مگر شہر کے وہ نوجوان جن پر جوانی کا بھوت سوار تھا آپ اُن کو اپنے پاس بٹھاتے اور اُن سے گھُل مل کر اس طرح باتیں کرتے کہ لوگوں کو آپ کے بارے میں غلط فہمی سی پیدا ہونے لگی۔

لوگ آپس میں حیرت سے پوچھتے آخر یہ میاں اخوند سعید کو کیا ہو گیا ہے یہ کس قسم کے لوگوں میں اُٹھ بیٹھ رہے ہیں؟

طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے کوئی کہتا کہ آدمی کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ ہم نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ ستّر سالہ عبادت لمحوں میں ضائع ہو گئی۔

انہی دنوں اللہ کا ایک نیک اور پرہیزگار بندہ آپ کی شہرت سن کر آیا۔ اُس وقت آپ چند نوجوانوں کے پاس بیٹھے شربت وغیرہ پی رہے تھے مگر دُور سے دیکھنے والے کو شُبہ ہوا کہ شاید آپ کوئی کیف آور شے پی رہے ہیں۔ لہٰذا یہ دیکھ کر پاس آنے کی بجائے وہ دُور ہی کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔

آپ نے اس شخص سے کہا۔ "بھائی دُور کیوں کھڑے ہو میرے پاس کیوں نہیں آتے؟"

اس پر اُس شخص نے اشارہ کر کے کہا۔ "آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"تم میرے پاس آؤ پھر بتاؤں گا۔" آپ نے جواب دیا۔

اُس شخص نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ "حضرت میں نے تو آپ کی بڑی تعریفیں سُنی تھیں لیکن میں اس وقت جو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اُس پر مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم جو کچھ دیکھ رہے ہو اُس پر یقین مت کرو۔"

چنانچہ اس پر وہ شخص آپ کے قریب آ گیا۔ میاں اخوند سعید نے اپنا مشروب اُس شخص کو دے کر فرمایا۔ "تم خود ہی دیکھ لو کہ کیا یہ کیف آور شے ہے؟" مشروب کی تیز خوشبو اُس متقی و پرہیزگار شخص کے نتھنوں سے گزر کر دماغ تک پہنچ گئی۔ یہ اعلیٰ درجے کا عرقِ گلاب تھا۔ اس پر آپ نے اُس شخص کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو ان دنیا والوں نے عاجز و پریشان کر رکھا ہے کسی وقت بھی یکسوئی میسّر نہیں آتی۔ آخر عاجز آ کر میں نے اپنے لیے یہی

طریقہ پسند کرکے اسے ہی اختیار کر لیا۔

اُس شخص نے نوجوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا' آخر ان کی صحبت سے آپ کو کیا فائدہ پہنچا ہے؟"

آپ نے جواب دیا' ان کی صحبت سے مجھے بھلا کیا فائدہ پہنچے گا البتہ ان کے پاس بیٹھنے سے ان نوجوانوں میں روحانی انقلاب ضرور آگیا ہے۔ اب یہ پہلے والے بھٹکے ہوئے گمراہ نوجوان نہیں رہے بلکہ اب ان کی مکمل اصلاح ہو چکی ہے۔" اس موقع پر وہاں بیٹھے ایک نوجوان نے بھی آپ کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے کہا' "یہ حقیقت ہے کہ میاں صاحب کی نظرِ کیمیا نے ہمیں کُندن بنا دیا ہے۔"

اُس پرہیزگار اور متقی شخص پر ان باتوں کا بہت اثر ہوا۔ اُس نے آپ سے یہ درخواست کی کہ حضرت! آپ ایسے طریقوں سے گریز کریں اس سے تو آپ کے مُریدوں پر بُرا اثر پڑے گا۔ اور اگر ان سب کی تقلید میں آپ نے یہی روش اختیار کی تو اس سے ہزاروں بُرائیاں پیدا ہوں گی۔ آپ نے اُس متقی شخص کی بات مان لی اور دوبارہ زندگی کا پہلے جیسا انداز اختیار کر لیا۔

آپ کے مُریدوں اور ارادت مندوں میں ایک افغان صالحہ بھی موجود تھیں۔ آپ اُس کے زہد و تقویٰ کے پیشِ نظر اُس کی بہت عزّت کیا کرتے تھے۔ ایک دن اسی صالحہ خاتون کے قبیلے کی کسی سے ان بن ہو گئی اور دوسرے فریق میں سے ایک افغان نے اپنے مخالف میں سے کسی ایک کو قتل کر دیا اور اُس نے آپ کے پاس پناہ لے لی۔ آپ نے اُسے بہت ڈانٹا کہ تو نے یہ بہت بُرا کام کیا ہے تجھ کو کسی کے قتل سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہیئے تھے۔

آپ کی بات سن کر قاتل بہت شرمندہ ہوا اور کہنے لگا۔ "میاں صاحب! میں اپنی تقصیر کا ہرجانہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ میرے دشمن مجھے معاف کر دیں۔"

ادھر مقتول کے لواحقین قاتل کو تلاش کرتے ہوئے آپ تک پہنچ گئے اور کہنے لگے۔ "میاں صاحب! آپ نے قاتل کو پناہ دے کر کوئی اچھا کام نہیں کیا۔"

اس پر آپ نے فرمایا۔ "اب تو میں نے اُسے پناہ دے ہی دی ہے اس لیے تم اس پر ایسا جرمانہ یا دیت عائد کر دو کہ وہ اُسے ادا کر دے اور معاشرے میں عزّت و آبرو کے ساتھ رہ سکے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتا۔"

مگر مقتول کے لواحقین پر میاں اخوند سعید کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے کہ قاتل کو ہر صورت میں اُن کے حوالے کیا جائے۔

میاں اخوند سعید کچھ دیر تک سوچ میں پڑ گئے۔ پھر کہنے لگے مقتول کا جو اصل وارث ہے اُسے میرے سامنے لایا جائے تاکہ میں اُس سے بات کر سکوں مگر وہ لوگ اس پر بھی رضامند نہ ہوئے۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ "یہ تو سراسر زیادتی ہے میں اصول کی بات کر رہا ہوں مگر تم لوگ بے اصولی پر اڑے ہوئے ہو۔" مسئلہ خاصا طول کھینچتا چلا گیا۔ اس دوران ایک افسوسناک واقعہ یہ ہو گیا کہ مقتول کے ورثا نے کسی نہ کسی طرح قاتل کو قابو میں کر کے قتل کر دیا۔ جب یہ خبر آپ تک پہنچی تو آپ سخت غصے میں آ گئے۔ آپ نے فرمایا۔ "میں اس افغان خاندان کو ایسی سخت سزا دوں گا کہ دوسرے لوگ بھی اس سے عبرت حاصل کریں گے۔"

آپ کے ارادت مندوں کے حلقہ میں جو صالحہ شامل تھیں انھوں نے آپ کے غصے کے بارے میں خبر سُنی تو بھاگی بھاگی آپ کے پاس آئیں کیونکہ اُس کا تعلق مقتول کے خاندان سے تھا۔ اُس نے آتے ہی ایک عجیب و غریب منظر یہ دیکھا کہ میاں اخوند سعید زمین سے پودے اکھاڑ رہے تھے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے جاتے تھے "یہ رہی فساد کی جڑ میں نے اسے اکھاڑ پھینکا۔ یہ رہی فساد کی جڑ میں نے اسے اکھاڑ پھینکا۔"

صالحہ خاتون چند لمحوں تک تو خاموش اور حیرت سے یہ سارا منظر دیکھتی رہیں اور پھر عرض کیا۔ "حضرت آپ جس خاندان کو برباد کر رہے ہیں میرا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی ایک ادنیٰ ارادت مند کی نسل بھی ہمیشہ کے لیے برباد ہو جائے۔"

میاں اخوند سعید نے فرمایا۔ "حقیقت یہ ہے کہ تیرے خاندان نے بڑی زیادتی کی ہے اُسے اس کی سزا ملنی چاہیئے۔"

خاتون نے کہا "مگر میاں صاحب! یہ ظلم اور زیادتی کرنے والوں میں میں یا میری نسل تو شامل نہیں۔"

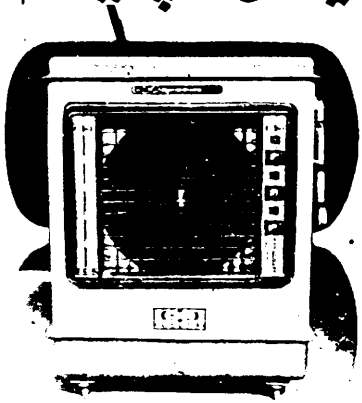
آپ نے کچھ دیر خاموشی اختیار کرنے کے بعد کہا۔ "اچھا چل یوں ہی سہی، میں نے تجھے اور تیری نسل کو محفوظ رکھا۔" اس کے بعد آپ نے ایک پودے پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ "جا میں نے تجھے معاف کیا۔" اس کے بعد آپ نے دوسرے پودوں پر اپنا عملِ تیخ کنی

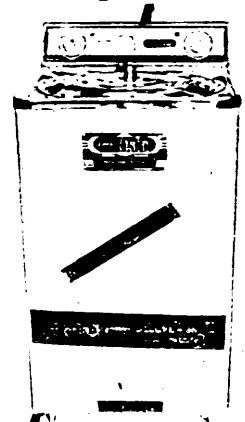
SUPER asia®

سُپر ایشیا

کا نام

سکون اور اطمینان کا پیغام





محمّد دین سنز

حافظ آباد روڈ۔ گوجرانوالہ، فون فیکٹری ۷۴۰۳۲-۷۵۲۹۶

جاری رکھا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ بعد میں مذکورہ خاندان تو برباد ہو گیا مگر اس صالحہ خاتون سے اس کی نسل برقرار رہی۔

میاں اخوند سعید نے زندگی بھر خلق خدا کی بھلائی کو اپنا مشن بنائے رکھا اور احکاماتِ خداوندی اور ارشادِ نبویؐ کی روشنی میں لوگوں کی رہنمائی کرتے رہے۔

ایک مرتبہ کوئی شخص آپ کے پاس آیا اور کوئی کیف آور شے آپ سے طلب کی آپ نے کہا۔ "بندۂ خدا! میں وہ چیز تو آپ کو دے سکتا ہوں مگر اس وقت نہیں کیونکہ اس وقت تو وہ چیز پیئے گا نہیں بلکہ پھینک دے گا۔"

وہ شخص ہنستے ہوئے بولا۔ "سبحان اللہ تو آپ کے خیال میں مجھے اس کی ضرورت کب پیش آسکتی ہے؟"

آپ نے کہا۔ "میں جو کہہ رہا ہوں ایسا ہو کر رہے گا۔"

وہ آدمی حیرت سے آپ کا منہ تکنے لگا۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اُس شخص کے پیٹ میں اچانک درد اُٹھا اُس نے ایک طبیب سے رجوع کیا اور اپنا علاج شروع کروا دیا۔ لیکن اس علاج سے کسی طور بھی افاقہ نہ ہوا جیسے جیسے وہ دوائیں استعمال کرتا مرض میں مزید اضافہ ہوتا جاتا۔ حتیٰ کہ طبیب نے بھی اُس شخص کو جواب دے دیا۔ اس حکیم نے مذکورہ شخص سے کہا۔ "میں نے سُنا ہے کہ کسی مشروب کے سلسلے میں میاں اخوند سعید سے آپ کی تلخ کلامی ہو گئی تھی۔"

اس شخص نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں ایسا ہوا تھا۔"

یہ سن کر طبیب نے جواب دیا۔ "اب میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ کا یہ مرض میاں اخوند سعید کے مشروب سے ہی دُور ہو گا۔"

یہ سُن کر وہ شخص کانپ اُٹھا کیونکہ اُس کی تکلیف میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر اسی حال میں وہ آپ کے پاس آیا اور انتہائی خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "حضرت میں اپنے رویے پر بہت نادم ہوں اور اپنے کیے کی بہت زیادہ سزا بھگت چکا ہوں۔ برائے مہربانی وہ مشروب مجھے مرحمت فرمایئے کیونکہ میں جس مرض میں مبتلا ہوا ہوں طبیب کے خیال میں مجھے اس مشروب سے افاقہ ہو گا۔" میاں اخوند سعید نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ مشروب اُسے دے دیا اور یہی اُس کے مرض کا تریاق ثابت ہوا اور اُس نے میاں صاحب کا در ایسا پکڑا کہ پھر وہ کبھی وہاں سے نہ گیا۔

ایک دن میاں اخوند سعید کی ملاقات شیخ جلا نامی ایک بزرگ سے ہوگئی جو کہ خود بھی ایک باکمال اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ شیخ جلا سے ملاقات کرنے کے بعد آپ نے کہا۔" اب ایک عرصہ کے بعد کسی باکمال سے ملاقات ہوئی ہے۔"

اس پر شیخ جلا نے جواب دیا۔" مَیں بھی اپنے ہم عصر اور باکمال صوفی سے محض اس خیال سے ملنے چلا آیا کہ ممکن ہے میری زندگی وفا کرے یا نہ کرے اس لیے کیوں نہ اپنے بھائی میاں اخوند سعید سے ہی مل لیا جائے۔"

میاں اخوند سعید نے انھیں بڑی محبّت اور خلوص سے اپنا مہمان ٹھہرایا۔ شیخ جلا کا تعلق ہندوستان سے تھا۔ اسی مہمان نوازی کے دوران ایک مرتبہ شیخ جلا نے میاں اخوند سعید کو کسی برتن میں پانی بھجوایا کہ پی لو۔ میاں اخوند سعید کو یہ پانی گدلا سا محسوس ہوا۔ آپ نے وہ پانی پھینک دیا۔ اس پر ایک مُرید نے آپ سے عرض کی۔" میاں صاحب آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

" مجھے ایسا کیوں نہیں کرنا چاہیئے تھا ؟" آپ نے پوچھا۔

اس پر مُرید نے عرض کیا۔" اعلیٰ حضرت آپ نے خود ہی تو فرمایا تھا کہ شیخ جلا بڑے باکمال ولی ہیں۔ اگر اُن کو آپ کا یہ طریقہ پسند نہ آیا اور آپ کے خلاف تصرّف کیا تو پھر کیا ہوگا ؟"

اُندلس کا حکمراں ہشام ایک نیک، عادل اور نفیس آدمی تھا۔ مسجدِ قرطبہ کا مشہور پُل اسی نے تعمیر کروایا تھا۔ پُل بننے کے بعد ایک دن اُس نے اپنے وزیر سے دریافت کیا کہ "لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں ؟"

وزیر نے دست بستہ جواب دیا۔" اعلیٰ حضرت! اگر گستاخی نہ ہو تو عرض کروں، چونکہ آپ شکار کھیلنے کے بے حد شوقین ہیں اس لیے لوگ کہتے ہیں، آپ نے یہ پُل صرف اس وجہ سے تعمیر کرایا ہے کہ آپ اس سے گزر کے شکار گاہ کی طرف جا سکیں۔" ہشام نے اُس انکشاف کا گہرا اثر قبول کیا اور اُس دن کے بعد کبھی شکار کھیلنے نہیں گیا۔ اسکی تمام توجہ قوم کی فلاح و بہبود اور فوجی طاقت بڑھانے پر صَرف ہونے لگی۔ اُن دنوں امام مالک مدینے میں رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔" کاش ہمارا خلیفہ بھی ہشام جیسا ہوتا۔"

میاں اخوند سعید کچھ دیر خاموش رہے اور پھر کہنے لگے: "میں نے دو سبب دیکھے تھے جن کی وجہ سے پانی پھینک دیا گیا۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ مجھے پانی کچھ گدلا محسوس ہوا دوسری وجہ یہ ہے کہ شیخ جلا نے کچھ سوچ کر ہی یہ پانی بھجوایا تھا اور پانی پھینک کر میں نے شیخ جلا کو یہ بتا دیا کہ جس پر وہ قادر ہیں اُس پر میں بھی قادر ہوں۔" اُدھر شیخ جلا کو جب یہ علم ہوا کہ میاں اخوند سعید نے پانی پینے کی بجائے پھینک دیا ہے تو وہ ان سے ملنے آئے اور ذرا ناخوشگوار لہجے میں بولے: "میاں اخوند سعید تم نے پانی پھینک کر اچھا نہیں کیا۔"

اس پر آپ نے کہا: "شیخ جلا آپ کو بھی اس طرح پانی نہیں بھجوانا چاہیے تھا۔"

شیخ جلا نے کہا: "چلو کوئی بات نہیں مگر کچھ دن تم گھر سے باہر نہ نکلنا کیونکہ میں نے تمہارے خلاف جو تصرف کیا ہے اس سے تم بستر پر گر جاؤ گے۔"

آپ نے فوراً جواب دیا۔ "شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ میں نے بھی تصرف سے کام لیا ہے تم کچھ دن مسجد میں رہو، وہیں بیمار پڑ جاؤ گے مگر پھر بعد میں صحت یاب بھی ہو جاؤ گے۔"

ان دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے کو جو کچھ کہا وہ بالکل درست ثابت ہوا۔

میاں اخوند سعید نے زندگی بھر اسلام کے فروغ اور خلقِ خدا کی بھلائی کو اپنی زندگی کا مشن بنائے رکھا۔ آپ کی محافل میں شریک ارادت مندوں کی ایک بڑی تعداد روحانیت کے عروج کو پہنچی اور انھوں نے آپ کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذشت نہ کیا۔ میاں اخوند سعید نے ۱۰۳۰ ہجری کو وفات پائی۔ آپ کا مزار قصور میں واقع ہے جہاں دُور دُور سے عقیدت مند چل کر حاضری کے لیے آتے ہیں اور من کی مُرادیں پا کر واپس لوٹتے ہیں۔

عنقریب ایسے لوگ تمہارے حاکم ہوں گے جن کے ہاتھ میں تمہاری روزی ہوگی۔ وہ تم سے بات کریں گے تو جھوٹ بولیں گے اور بُرے کام کریں گے۔ وہ تم سے اُس وقت تک راضی نہیں ہوں گے، جب تک تم اُن کی برائیوں کی تعریف اور اُن کے جھوٹ کی تصدیق نہیں کرو گے۔ لیکن تمہارا فرض ہے کہ تم اُن کے سامنے حق کا کلمہ بلند کرو۔ اگر وہ اسے گوارا کر لیں تو فبہا لیکن اگر وہ اسے گوارا نہ کریں اور حق گو کو قتل کر دیا جائے تو وہ شہید ہوگا۔



حضرت سید احمد شہید رح

بزرگ نے صاف پیش گوئی کر دی تھی کہ "اے محمد بن الیاس تمہارے ہاں جو بیٹا تولد ہوا ہے وہ اپنے وقت کا بڑا قطب اور ولی ثابت ہوگا اور میری تمہیں یہ نصیحت ہے کہ تم اُس کا نام "سید احمد" رکھنا اتنا کہنے کے بعد بزرگ تو چلے گئے مگر نومولود کا باپ محمد بن الیاس جو کہ ایک افغان قبیلے کا سردار تھا گہری سوچ میں پڑ گیا، چونکہ محمد بن الیاس نے خود بھی مسندِ خلافت بچھا رکھی تھی اور اُن کے بہت سے معتقد اور عقیدت مند موجود تھے اس لیے ایک اجنبی بزرگ کی بات ٹالنا بھی اُن کے بس میں نہ تھا۔ کافی دنوں تک وہ اس درویش قلندر کی بات پر غور کرتے رہے اور بالآخر انہوں نے اپنے بیٹے کا نام سید احمد رکھ دیا اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ اُس بزرگ کی بات حرف بحرف درست ثابت ہوئی اور سید احمد نامی یہ بچہ اپنے وقت کا بہت بڑا ولی اللہ ثابت ہوا۔

سید احمد کے والد محمد بن الیاس اگرچہ خود بھی درویش منش تھے مگر اُن کے خاندان کی روایات بہت شاہانہ تھیں اُن کے گھر میں وہ سب کچھ تھا جو بڑے بڑے بادشاہوں اور راجوں مہاراجوں کے محلوں میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے سید احمد کی تعلیم و تربیت کا ذمہ بھی اپنی سر لے لیا۔

اس ماحول میں سید احمد کی پرورش کسی شہزادے کی طرح ہو رہی تھی، لیکن سید احمد کو یہ

زندگی پسند نہیں تھی۔ یہ اس ماحول کو چھوڑ کر جنگلوں میں نکل جاتے اور پُرسوز دل لیے مارے مارے پھرتے رہتے۔ اپنے بیٹے کی یہ عادت شیخ محمدؒ کو گراں گزرتی مگر اسے روک بھی نہیں سکتے تھے۔

صبح سے شام تک شیخ محمدؒ کے ارادت مندوں کا تانتا لگا رہتا۔ مجلسِ وعظ میں ہزاروں کا مجمع لگ جاتا۔ سیّد احمد نے ایک دن اپنے باپ سے پوچھ ہی لیا۔ "باوا جان! کیا اس ہجوم سے آپ پریشان نہیں ہوتے؟"

شیخ محمدؒ نے جواب دیا: "بیٹے! ہم درویش ہیں۔ یہ لوگ میرے پاس طمانیت حاصل کرنے آتے ہیں، میں انہیں دھتکار تو نہیں سکتا۔"

سیّد احمد نے کہا: "باوا جان! اب میں آپ کو کیا سمجھاؤں، لیکن میں اپنے سکون کے لیے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ عزلت نشینی کیوں نہیں اختیار کرتے۔"

شیخ محمدؒ مسکرانے لگے۔ "اگر ہم عزلت نشین ہو جائیں گے تو انہیں دین کی باتیں کون بتائے گا۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اپنا فرض انجام دے رہے ہیں۔"

سیّد احمد بظاہر تو اس جواب سے مطمئن ہو گئے لیکن سینے کے اندر جو آگ روشن تھی وہ اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ سیّد احمد کسی آتش زیر پا کی طرح گھر سے نکل گئے اور جنگل میں اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔ گھومتے پھرتے وہ ایک ایسے جنگل میں پہنچ گئے جو درندوں کا مسکن تھا۔ یہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی درندہ بولتا ہی رہتا تھا، ایک شیر جو دھاڑا تو اس کی آواز سے پورا جنگل لرز گیا، لیکن سیّد احمد اس سے خوفزدہ ہونے کی بجائے حالتِ وجد میں مبتلا ہو گئے۔ دل سوزِ عشق کی لذّت سے کیف و سرور میں ڈوب گیا۔ وہ ایک درخت کے تنے سے پشت لگا کر بیٹھ گئے۔ درختوں کے سائے نے یہاں دن میں رات کا سماں پیدا کر دیا تھا پھر رات ہو گئی اور اتنا اندھیرا ہو گیا کہ سامنے کی چیز بھی نظر نہیں آتی تھی۔

رات کے پچھلے پہر سیّد احمد کو کسی کُتّے کے غرّانے کی آواز سنائی دی، یہ آواز پاس ہی سے آ رہی تھی، لیکن اندھیرے میں اس کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ دل میں خوف کا دُور دُور گزر نہ تھا کچھ دیر بعد سیّد احمد اپنی جگہ سے اُٹھے اور دوسرے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ یہاں مچھروں کی کثرت تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ مچھر ان کو بالکل نہیں ستا رہے تھے۔ سر کے اوپر سے چمگادڑ گزر جاتے اور کہیں قریب ہی سے تیار کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اسی کیفیت میں پوری رات گزر گئی۔ دن کی روشنی میں سیّد احمد نے چند بھیڑیوں کو سوئے

ہوئے دیکھا، یہ یہاں سے نکل کے دوسرے جنگل میں داخل ہو گئے، یہاں بھی پورا دن گزار دیا۔ بھوک نے پریشان کیا تو جنگل کے پھلوں کو کھا لیا۔ پیاس لگی تو ایسے پھل کھا لیے جن میں پانی زیادہ ہوتا ہے۔

ان کی گمشدگی نے شیخ محمدؒ کو بہت پریشان کر دیا تھا، انہوں نے اپنے مریدوں کو حکم دیا۔ "سید احمد جہاں بھی ہو، اس کو تلاش کر کے میرے پاس لایا جائے۔"

شیخ محمدؒ کے مریدوں نے اُن کی تلاش میں جنگلوں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ جنگلوں کے پاس کی آبادی کے لوگ اتنی بات ضرور بتا دیتے کہ سید احمد کو فلاں جگہ دیکھا گیا تھا۔

اس نشاندہی پر شیخ محمدؒ کے مرید سید احمد تک پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے ایک جگہ سید احمد کو سویا ہوا دیکھا تو بھاگ کر اُن کے پاس پہنچ گئے۔ سید احمد کو کچھ پتا نہ تھا کہ اُن کے باپ کے مُرید یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ لوگ سوئے ہوئے سید احمد کے پاس بیٹھ گئے اور ان کی بیداری کا انتظار کرنے لگے۔

آنکھ کھلنے پر سید احمد نے اپنے آس پاس لوگوں کو دیکھا تو اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اس پر ایک مُرید نے عرض کی "مرشد زادے! آپ کو کچھ پتا ہے کہ آپ کی وجہ سے آپ کے والدین کتنے پریشان ہیں؟"

سید احمد نے جواب دیا "مَیں خود بے حد پریشان ہوں، میرے اندر ایک آگ روشن ہے جو مجھے کسی ایک جگہ ٹھہرنے ہی نہیں دیتی۔ مَیں اس آگ کے ہاتھوں مجبور ہو گیا ہوں۔"

دوسرے مرید نے کہا "اب آپ گھر چلیں، ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔"

سید احمد نے انکار نہیں کیا اور مریدوں کے ساتھ گھر واپس آ گئے۔ باپ نے بیٹے کو گلے لگا لیا، پوچھا "تو کہاں چلا گیا تھا۔ ہم تو جیتے جی مر گئے؟"

سید احمد نے جواب دیا "باوا جان! مجھے اس ماحول میں سکون نہیں ملتا۔ مَیں کیا کروں مجبور ہو جاتا ہوں۔"

باپ نے کہا "بیٹے! میری زندگی چراغِ سحری ہے کچھ پتا نہیں، کب تک موجود ہوں، جب تک ہوں چاہتا ہوں تم بھی کچھ حاصل کر لو اور میری زندگی ہی میں میرے مریدوں سے واقف ہو جاؤ۔ یہ زندگی تمہاری اپنی نہیں۔ ان سب کے لیے ہے۔" سید احمد نے جواب دیا۔ "باوا جان! آپ بجا فرما رہے ہیں مگر ہجوم سے میرا جی گھبراتا ہے۔"

باپ نے بیٹے کا عذر قبول کر لیا اور اسے اپنے ساتھ بٹھانا شروع کر دیا۔ وہ ہر وقت سید احمد

کو اپنی نظروں میں رکھتے۔

ان دنوں لاہور کے شیخ الہ داد کا بھی بڑا مقام تھا اور تشنگانِ علوم ظاہری و باطنی لاہور پہنچ رہے تھے۔ سید احمد بھی باپ سے اجازت لے کر لاہور پہنچ گئے اور اُن سے درس لیتے رہے۔ ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء میں ان کے والد شیخ محمد وفات پا گئے۔ یہ لاہور سے بجواڑہ چلے گئے۔ وہاں مرحوم شیخ کے اعزا اور مُرید اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ چنانچہ انہیں شیخ محمد کا جانشین قرار دیا گیا۔

آگرے میں مغل فرماں روا اکبر کا انتقال ہو گیا اور حکومت جہانگیر کے ہاتھ آئی، یہ ۱۰۱۵ھ کی بات ہے۔ اس موقع پر جہانگیر کے بیٹے خسرو کو سازشیوں نے بغاوت پر آمادہ کر لیا۔ خسرو نے بغاوت کی اور جہانگیری سپاہ نے اس کا پنجاب تک تعاقب کیا۔ شہزادہ گرفتار ہوا اور اُسے آگرے بھیج دیا گیا۔ جہانگیر کے امراء میں سے ایک نے سوچا کہ جب یہاں تک آئے ہیں تو یہاں کے بزرگانِ دین سے بھی ملاقات کر لینی چاہیئے۔ یہ امیر مختلف درویشوں کے پاس گیا۔ اُن کی باتیں سنیں، اپنی سنائیں اور ان کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ کسی نے اس امیر سے کہا۔ "تو بجواڑہ کیوں نہیں گیا؟"

امیر نے پوچھا۔ "وہاں کیا رکھا ہے؟ اور وہاں ہم کیا لینے جائیں گے؟"

امیر کے ساتھی نے جواب دیا۔ "آپ لینے تو کہیں بھی نہیں جاتے، اس وقت اگر آپ نے یہ موقع ضائع کر دیا تو ہمیشہ پچھتائیں گے۔"

امیر کا ایک ساتھی اسے سید احمد کے پاس لے گیا، یہاں کی شان و شوکت اور ٹھاٹ بھاٹ نے امیر کو دنگ کر دیا۔ آہستہ سے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"یہ کسی درویش کی خانقاہ ہے یا کسی بادشاہ کا محل؛ میں مغل شہنشاہ کا امیر ہوں لیکن اس شان و شوکت سے تو میں بھی محروم ہوں۔"

امیر کے ساتھی نے جواب دیا۔ "میں ان باتوں پر غور نہیں کرتا میں تو سید احمد کو جانتا ہوں جو حد درجہ منکسر المزاج اور ظاہری و باطنی علوم کے جیّد عالم ہیں۔"

امیر نے سید احمد سے ملاقات کی۔ "حضرت! میں آگرے سے یہاں آیا تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کے بیٹے خسرو نے بغاوت کر دی تھی ہم اُس کو گرفتار کرنے آئے تھے۔"

سید احمد نے کہا۔ "پھر اُسے گرفتار کر لیا؟" امیر نے جواب دیا۔ "ہاں اُسے گرفتار کر لیا گیا اور وہ آگرے بھیج دیا گیا ہے۔"

سید احمد نے کہا: "یہ حکومت بڑی بُری چیز ہے، رشتوں کو ختم کر دیتی ہے۔ کہاں جہانگیر اور کہاں اُس کا بیٹا خسرو۔ دونوں کو لڑوا دیا۔"

امیر نے آپ پر طنز کیا: "حضرت! آپ بادشاہت کی بات کر رہے ہیں حالانکہ میں درویشی اور فقیری میں شاہی کروفر اور امیرانہ شان و شوکت دیکھ رہا ہوں۔"

آپ نے فرمایا: "بے شک، تو صحیح کہہ رہا ہے لیکن میں اپنے آبائی رسم و رواج سے مجبور ہوں۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جس شے کو میں پسند نہیں کرتا اللہ اس سے مجھے محروم کر دے گا اور تو اللہ کا بھیجا ہوا میرے پاس آیا ہے، اللہ تجھ سے وہ کام لے گا جو دوسرے نہیں کر سکے۔"

امیر نے پوچھا: "آپ کے حلقۂ ارادت میں کتنے لوگ ہوں گے؟" آپ نے جواب دیا۔ "ہزاروں کی تعداد میں۔"

امیر کی جستجو میں اضافہ ہوا۔ پوچھا۔ "کیا آپ کے سارے مُرید غیر فوجی اور معاشرے کے سیدھے سادھے لوگ ہیں۔"

آپ نے فرمایا: "نہیں، وہ سپاہی بھی ہیں۔ میں افغان قوم سے تعلق رکھتا ہوں۔ غرغشتی قبیلے سے اور افغان قوم مانی ہوئی جنگجو قوم ہے۔"

مغل امیر کافی دیر تک آپ سے باتیں کرتا رہا اور اس دوران آپ کے ارادت مندوں کو بھی آتے جاتے دیکھتا رہا۔ مغل امیر ان کو گن نہیں سکا، کیونکہ یہ بہت زیادہ تھے۔

امیر نے رخصت چاہی۔ آپ نے جواب دیا۔ "تو جا سکتا ہے۔"

جب یہ امیر چلا گیا تو آپ نے اپنے مریدوں سے کہا۔ "یہ مغل امیر جو ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے مجھے نقصان پہنچائے گا۔"

مریدوں نے پوچھا: "کس قسم کا نقصان پہنچائے گا یہ؟"

آپ نے فرمایا: "جتنا اس کے اختیار میں ہے اور شاید مشیت ایزدی بھی یہی ہے۔"

وہ امیر سیدھا آگرے گیا۔ شہزادہ خسرو، جہانگیر کے روبرو پیش کر دیا گیا، بادشاہ نے اسے قید کر دیا اور اپنے امراء کو ایک خصوصی مجلسِ مشاورت میں طلب کر لیا۔ اُن امراء میں وہ امیر بھی تھا جو سید احمد سے ملاقات کر کے آگرے پہنچا تھا۔

بادشاہ نے اپنے عمائدینِ سلطنت سے کہا: "صاحبان! یہ عجیب زمانہ ہے کہ بیٹا باپ کے خلاف بغاوت کر رہا ہے یہ ایک خطرناک شورش تھی جس پر قابو پا لیا گیا، اب ہمیں ان تمام محرکات، ترغیبات اور تحریصات پر غور کرنا ہے جو ملک میں بدامنی اور بغاوت کا سبب بن سکتی ہیں۔"

ایک امیر نے جواب دیا: "ہمیں جملہ شہزادگان پر نظر رکھنا ہوگی اور حضور والا کے پدر زادے، یہ بھائی بھی خطرناک ہوتے ہیں ہمیں ان سب کو نظر بند کر دینا چاہیئے۔"

جہانگیر نے اس سے اتفاق کیا: "میرا بھی یہی خیال ہے، میں خود بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔"

وہ امیر جو سید احمد سے ملاقات کر کے آیا تھا کھڑا ہو گیا۔ جہانگیر نے پوچھا: "کیا تو بھی کچھ کہنا چاہتا ہے؟"

امیر نے جواب دیا: "ہاں، مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔ ایک ایسی بات کہنا ہے جو اگر میں نہ کہوں تو حضورِ والا کا کبھی اس طرف دھیان ہی نہ جائے۔"

جہانگیر نے بے قراری سے پوچھا: "یعنی؟ میں بھی تو سنوں کہ وہ کون سی حیرت انگیز خبر ہے کہ اگر تو اُسے نہ بتائے تو میں اُن سے زندگی بھر لاعلم رہوں۔"

امیر نے عرض کیا: "حضورِ والا! آج کل درویشوں کی خانقاہیں بھی قلعہ بنی ہوئی ہیں، وہ ایک علیحدہ سلطنت ہیں جہاں کسی بادشاہ کا حکم نہیں چلتا، وہاں درویشوں کی حکومت ہے، شاید اصل بادشاہوں سے زیادہ صاحبِ اختیار ہوتے ہیں یہ لوگ۔"

جہانگیر درویشوں کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہتا تھا۔ بات کو ٹال گیا، بولا: "میں درویشوں سے نہیں اُلجھوں گا، میں اُن سے ڈرتا ہوں۔"

امیر نے حوصلہ بڑھایا: "آپ میری بات تو سُن لیں پوری طرح، پھر کچھ کہیں۔"

جہانگیر نے جواب دیا: "بھئی جب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں درویشوں کے معاملوں میں نہیں پڑوں گا، درویشوں میں مجذوب بھی ہوتے ہیں اور اگر خدا نے کسی مجذوب سے میری مڈبھیڑ کروا دی تو بس پھر اللہ ہی جانے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔"

امیر نے کہا: "حضورِ والا، ایران کے صفوی حکمران ابتداء میں شیخ تھے۔ انہوں نے اپنے اثرات کو اتنا بڑھایا کہ بعد میں یہ لوگ ایران کے بادشاہ بن گئے۔"

جہانگیر پریشان ہو گیا، گھبرا کے پوچھا: "کیا اپنے مُلک میں بھی ایسے درویش ہیں جو کبھی خطرہ بن سکتے ہیں؟"

امیر نے جواب دیا: "بالکل حضورِ والا! میں نے پنجاب کے قصبہ بجواڑہ میں غرغشتی قبیلے کے بزرگ سید احمد سے ملاقات کی اور اُن کی شان و شوکت اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ مجھے تو ان کا گھر شاہی محل لگ رہا تھا۔ ان کے سامان کو دیکھا اور آنے جانے والوں کو بھی دیکھا۔ یہ اُن کے مرید یا ارادت مند تھے جو ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ میں نے سید احمد سے ان کے مریدوں کی تعداد پوچھی تو بتایا

کہ یہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں مگر لاکھ سے کچھ کم ہیں۔ میں نے سید احمد سے یہ بھی پوچھا تھا کہ ان میں جنگجو بھی ہیں یا محض آخرت کی فکر کرنے والے لوگ۔ سید احمد نے اس کا جو جواب دیا، وہ خاصا خطرناک ہے۔ اُنہوں نے کہا، قوم افغان جیسی ہوتی ہے۔ ویسے ہی یہ مرید بھی ہیں۔ یعنی دنیادار اور جنگ جُو بھی ہیں اور آخرت کی فکر کرنے والے بھی۔"

جہانگیر کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوگئیں، اس نے حکم دیا۔ "یہ تو بڑے خطرے کی بات ہے، سید احمد کے نام آج ہی ایک فرمان جاری کر دیا جائے اور اس فرمان میں یہ لکھا جائے کہ سید احمد کو فوراً مجھ سے ملنا چاہیے۔ جب وہ میرے دربار میں آئے گا تو میں اس کی باتوں سے اس کے عزائم کا پتہ لگاؤں گا اور پھر اس کی روشنی میں کوئی قدم اُٹھاؤں گا۔" یہ شاہی فرمان فوراً جاری کر دیا گیا اور سید احمد کو بجواڑے سے آگرے طلب کر لیا گیا۔

جب وہ آگرے میں داخل ہو گئے تو جہانگیر کو اُن کی تشریف آوری کی خبر دے دی گئی۔ جہانگیر نے اپنے دربار میں کئی عالموں کو بلوا کے بٹھا دیا۔ اس کے بعد سید احمد کو دربار میں طلب کر لیا گیا۔ سید احمد سادگی سے دربار میں داخل ہوئے اور بادشاہ اور حاضرینِ دربار کو "السلام علیکم" کہہ کر سلام کیا۔

جہانگیر کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ اُس نے اپنے امراء سے کہا۔ "اس درویش سے کہو کہ یہ شاہی دربار ہے، ایک عظیم الشان مغل شہنشاہ جہانگیر کا دربار ہے۔"

ایک امیر نے کھڑے ہو کر سید احمد سے پوچھا۔ "یہ آپ نے دربار میں کون سا سلام کیا ہے؟"

سید احمد نے جواب دیا۔ "میں نے اس دنیا وی بادشاہ کے دربار میں وہی سلام کیا ہے، جو اس دنیا کے سب سے بڑے آدمی کے دربار میں کیا جاتا ہے، یعنی رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں۔"

امیر نے جہانگیر کی طرف دیکھا۔ وہ بہت ناراض نظر آرہا تھا، امیر نے کہا۔ "حضور والا! بندہ تو پہلے ہی اس شخص کی بابت بتا چکا ہے۔ اس کی نیت درست نہیں ہے۔ بادشاہت کے خواب دیکھ رہا ہے شاید۔"

ایک دوسرے امیر نے سید احمد سے کہا۔ "حضرت! آپ تو پڑھے لکھے انسان معلوم ہوتے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، اتنا ضرور پڑھ لکھ لیا ہے کہ دین اور دنیا کو سمجھ سکوں۔"

اُسی امیر نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بادشاہوں کو کس طرح سلام کیا جاتا ہے۔"

آپ نے فرمایا: "تُو نے میرا جواب نہیں سُنا شاید، دنیا کے سب سے بڑے دربار یعنی رسول اللہؐ کے دربار میں اسی طرح سلام کیا جاتا تھا۔ کیا یہ دربار اُس سے بڑا ہے؟"

جہانگیر نے حکم دیا: "اس شخص کو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں، اس لیے اسے گوالیار کے قلعے میں اس وقت تک قید رکھا جائے جب تک کہ اسے آدابِ شاہی کا علم حاصل ہو جائے۔"

آپ نے اس امیر کی طرف، جس سے آپ بجواڑہ میں مل چکے تھے، دیکھتے ہوئے کہا: "مجھے اپنی اس سزا کا اندازہ اسی وقت ہو گیا تھا جب تجھ سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی، مجھے خوشی ہے کہ تُو نے اپنا فرض انجام دیا اور میں اپنا فرض انجام دے رہا ہوں۔"

جہانگیر سیّد احمد کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنے دربار میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا، پھر حکم دیا۔ میں نے جو حکم دیا ہے اس کی فی الفور تعمیل ہونی چاہیے۔"

شاہی کارندے آگے بڑھے اور سیّد احمد کو دونوں شانوں سے پکڑ کر دربار سے باہر لے گئے اور پھر وہاں سے گوالیار کے قلعے میں بھیج دیا۔

سیّد احمد کو گوالیار کے قلعے میں بند کر دیا گیا۔ آپ نے یہ سزا بہ خندہ پیشانی قبول فرمالی۔ یہاں آپ اللہ سے ایسے رجوع ہوئے کہ اپنے آبائی قصبے بجواڑہ میں بھی ایسے منہمک نہ ہوئے تھے۔

قلعے کے محافظین نے اس عجیب و غریب شخص کو بالکل خاموش یا اللہ اللہ کرتے دیکھا تو بہت متاثر ہوئے۔ ان کی سزا کے بارے میں معلومات کی تو پتا چلا کہ انہوں نے جہانگیری دربار میں سلام مسنونہ ادا کیا تھا، اس کی پاداش میں یہاں بھیج دیے گئے قلعے کا نگران بہت سخت آدمی تھا لیکن وہ آپ سے اتنا متاثر ہُوا کہ آپ کی خدمت میں ایک جانماز، ایک تسبیح، قرآن پاک کا ایک نسخہ اور وضو کے لیے ایک لوٹا پیش کیا اور آخر میں عرض کیا: "حضرت میں نے آپ کی خدمت میں جو کچھ پیش کیا ہے، آپ اس سے زیادہ کے مستحق ہیں لیکن میں بھی کاروبارِ جہانگیری کا ایک ادنیٰ سا کارکن ہوں، یہاں کی ذرا ذرا سی غلطیاں بھی میرے لیے لائقِ تعزیر ہیں۔ ویسے میں کسی سے نہیں ڈرتا، آپ یہاں نڈر ہو کر رہیں اور میرے لائق جو خدمت ہو، اس سے آگاہ فرمائیں۔"

آپ نے جواب دیا: "تیری نوازشوں کا شکر گزار ہوں۔ یہاں پر جو کچھ ہو رہا ہے، اُس کی عین منشا کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس لیے مجھے کسی سے کوئی گلہ یا شکایت نہیں۔"

قلعہ گوالیار کے نگراں نے سر جھکا لیا اور جواب دیا: "ہاں سیّد صاحب! آپ یقیناً ایک خدا رسیدہ اور کامیاب انسان ہیں، بدنصیب تو ہم ہیں کہ آپ جیسے نیک انسان پر نگراں مقرر کیے گئے ہیں۔"

آپ نے قلعے کے نگراں کو بڑی تسلی دی اور اسے بار بار یہ باور کرایا کہ وہ کسی بات پر بھی شرمندہ نہ ہو۔ اور شاہی خدمت بجالاتا رہے۔

آپ نے بہت جلد پورے قلعے کو اپنے زیر اثر کر لیا، یہ باتیں باہر بھی ہونے لگیں کہ پنجاب کے بجواڑے کا سید احمد نامی ایک درویش پورے قلعے پر اثر انداز ہو چکا ہے اور اب وہ قلعے میں قیدی کی حیثیت سے ایک حاکم کی طرح رہ رہا ہے۔ قلعے کے وہ ملازم جن کا کام ـــــ قیدیوں پر ظلم و ستم کرنا ہے اب وہ سید احمد کے تابعدار بن کر رہ گئے ہیں۔

دوسری جانب نوبت یہاں تک آگئی کہ شاہی دربار کے امراء بھی چوری چھپے ان کی ملاقات کو پہنچنے لگے۔ ان سب کی آپ سے عقیدت اور محبت بڑھتی جارہی تھی۔

قلعے میں شاہی معتوب آزاد نہیں رہ سکتے تھے بلکہ اُن کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی جاتی تھیں تاکہ بھاگ نہ سکیں۔ ان کے پاؤں میں بھی بیڑیاں ڈال دی گئی تھیں۔ مگر قلعے دار آپ سے اتنا مرعوب اور متاثر ہوا کہ آپ کو بیڑیوں سے آزاد کر دیا۔ یہ آزادی بھی زیادہ دن نہیں رہی۔ چغل خوروں نے بادشاہ تک یہ خبر پہنچادی اور اوپر سے یہ فرمان آگیا کہ ایسا کس لیے حکم سے کیا جارہا ہے اور کیوں نہ حکم عدولی کے جرم میں قلعے دار کو بھی بیڑیاں ڈال کے قلعے میں قید کر دیا جائے۔

قلعے دار یہ عتاب نامہ ہاتھ میں لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

آپ نے اس کی شکل دیکھی تو نہایت نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا "تجھ کو شاہی فرمان کی تعمیل کرنا چاہیئے۔"

قلعے دار نے شاہی فرمان آپ کے سامنے رکھ دیا۔ آپ نے اس کو پڑھے بغیر اپنے دونوں پاؤں قلعے دار کی طرف بڑھا دیے اور کہا "اُس سے کہا۔ کہ تجھ کو شاہی فرمان کی تعمیل ہر حال میں کرنا چاہیے۔"

قلعے دار نے کہا "حضرت! میرا تو یہ جی چاہتا ہے کہ اپنے اس منصب سے مستعفی ہو جاؤں۔ میرے تو ہاتھ کانپ رہے ہیں، میں آپ کے پاؤں میں بیڑیاں کس طرح ڈالوں گا۔"

آپ نے فرمایا "بالکل اسی طرح، جس طرح میرے یہاں قلعے میں آنے پر ڈال دی تھیں۔"

قلعے دار نے یہ کام دوسرے خدمت گاروں کے سپرد کر دیا اور خود اُن کے سامنے سے ہٹ گیا۔

آپ نے اسی حال میں تین سال گزار دیے۔

دکن اور خاندیس میں شورشیں برپا تھیں۔ جہانگیر نے ان لوگوں کو خاں جہاں لودھی کے حوالے کر دیا۔ خان جہاں جس کا اصل نام پیر خان لودھی تھا، دکن کی صوبے داری کا فرمان لے کر روانہ ہوا تو گوالیار میں بھی دو دن کے لیے ٹھہر گیا۔ یہاں کسی نے اسے سیّد احمد کے بارے میں بتایا۔ خان جہاں سیدھا قلعے دار کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا "یہاں کوئی سیّد احمد بھی قید ہیں؟"

اس سوال نے قلعے دار کو خوف زدہ کر دیا۔ وہ سمجھا کہ شاید کسی شکایت پر خان جہاں کو قلعے دار کے پاس بھیجا گیا ہے اور اب وہ قید کر دیا جائے گا۔ قلعے دار نے پریشانی کے عالم میں کہا "جنابِ والا! سیّد احمد ایک روحانی انسان ہیں لیکن مَیں نے اس کے باوجود ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں؟"

خان جہاں نے اسے دلاسا دیا "یہ بات نہیں ہے جو تو سمجھ رہا ہے۔ مجھے سیّد احمد کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایک بے ضرر، خدا رسیدہ انسان ہیں اور بادشاہ نے اُمراء کے لگانے بجھانے پر اُنہیں قید کر دیا ہے۔"

قلعے دار نے اس کی تائید کی "آپ نے جو کچھ سُنا ہے، بالکل درست سُنا ہے۔"

خان جہاں نے کہا "اب مَیں اِن کو اپنے ساتھ دکن لے جانا چاہتا ہوں۔"

قلعے دار نے اپنی مجبوریوں کا ذکر کیا "لیکن مَیں اپنے طور پر ان کو آزاد نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر سے سے فرمانِ رہائی آجائے تو....."

خان جہاں نے کہا "تو فکر نہ کر، مَیں بادشاہ سے فرمانِ رہائی منگائے لیتا ہوں۔"

خان جہاں نے اسی روز بادشاہ کو درخواست بھیج دی، اس میں اس نے لکھا تھا۔

"بندے کا گزر گوالیار سے ہُوا تو اسے یہاں کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ قلعے میں شاہی حکم سے ایک مردِ خود آگاہ اور خدا رسیدہ کو قید کر دیا گیا ہے، میری مراد سیّد احمد افغان بخواڑوی سے ہے۔ تین سال سے یہ بزرگ قید کاٹ رہے ہیں اور ان کے بارے میں ایک بھی ایسی گواہی نہیں ملتی جس سے ان کے باغیانہ خیالات کی تصدیق ہوتی ہو، یہ ایک شریف النفس بزرگ ہیں۔ مَیں انہیں اپنے ساتھ دکن لے جانا چاہتا ہوں، اس لیے ان کی رہائی کا حکم صادر فرمایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ ان بزرگ کی ہم نشینی سے ہمارے بہت سے کام بن جائیں گے اور حضورِ والا کا مرتبہ اللہ کے ہاں بلند ہو گا۔"

جہانگیر خان جہاں کا بہت خیال کرتا تھا، جواب میں اُس نے فرمانِ رہائی جاری کر دیا،

خان جہاں اس فرمان کے ساتھ قلعے میں پہنچ گئے۔ قلعے دار بہت خوش ہوا اور خان جہاں کو لیے ہوئے آپ کے پاس پہنچ گیا۔ قلعے دار نے خان جہاں کا تعارف کرایا۔ آپ نے بڑی خندہ پیشانی سے خان جہاں سے ملاقات کی اور پوچھا "تم میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟"

خان جہاں نے جواب دیا "میں یہاں جو کچھ لینے آیا تھا، حاصل کر چکا ہوں۔ اب آپ میرے ساتھ رہیں گے۔"

آپ نے حیرت سے پوچھا "وہ کیوں؟ وہ کس طرح؟"

خان جہاں نے کہا "میں نے کہہ جو دیا کہ میں آپ کو یہاں سے لے جانے کے لیے آیا ہوں، آپ میرے ساتھ دکن چلیں۔"

آپ نے قلعہ کے نگران سے پوچھا "یہ مغل حکومت کا امیر کیا کہہ رہا ہے؟"

قلعے دار نے جواب دیا "حضرت! یہ آپ کو اپنے ساتھ دکن لے جانا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے آگرے سے آپ کے لیے فرمانِ رہائی بھی حاصل کر لیا ہے۔"

آپ نے فرمایا "چلو یہی سہی، مرضی مولا از ہمہ اولیٰ" پھر قدرے تامل کے بعد قلعے دار سے کہا "کیا تو میری ایک بات مان لے گا؟"

قلعے دار نے جواب دیا "بسر و چشم، آپ ارشاد فرمائیں۔"

آپ نے فرمایا "تیرے قید خانے میں مجھے بیڑیاں ڈال کے رکھا گیا۔"

قلعے دار نے شرمندگی سے جواب دیا "بے شک، مگر میں شاہی احکام کا پابند تھا۔"

آپ نے کہا "میں اس کی شکایت نہیں کر رہا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تو قید خانے کی بیڑیاں مجھے دے دے۔ میں ان کو اپنے پاس اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔"

قلعے دار نے دریافت کیا "کیوں؟ اب ان کو اپنے پاس رکھ کر کیا کریں گے؟"

آپ نے فرمایا "ان بیڑیوں سے میں نے زندگی کے آداب سیکھے ہیں۔ وہ نشہ اور وہ خاندانی کروفر، جس نے مجھے کسی نواب یا امیر کا ہم پلہ کر دیا تھا۔ ان بیڑیوں نے اُسے ختم کر دیا ہے۔"

قلعے دار نے مذکورہ بیڑیاں آپ کے حوالے کر دیں لیکن اس کو بہت دُکھ ہوا بہت افسوس ہوا۔

آپ خان جہاں کے ساتھ دکن چلے گئے۔ دکن میں خان جہاں کو جن مہمات میں اُلجھنا تھا، وہ نہایت آسان ہوتی چلی گئیں۔ اُس نے آپ کو راتوں میں عبادت میں مشغول دیکھا۔ آپ بہت کم باتیں کیا کرتے تھے۔ فرصت کے اوقات میں خان جہاں تحصیلِ علم کی خاطر مختلف مسائل پر باتیں کرتا اور آپ ان تمام مسائل پر سیر حاصل تبصرے کرتے۔ خان جہاں آپ سے باتیں کر کے حیران

ہو جاتا تھا، یہ تو ہر معاملے میں بحرِ زخّار تھے۔

❦

خان جہاں کو دکن میں جنگیں بھی لڑنا پڑیں۔ ان جنگوں میں آپ بھی شریک ہوئے۔ یہ وہاں کے ہندوؤں کے خلاف جنگیں تھیں۔ آپ کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ سب سے آگے رہیں۔ خان جہاں آپ کو منع کرتا کہ "آپ ایسا نہ کریں۔ آپ کا سب سے آگے رہنا کیا ضروری ہے؟"

آپ جواب دیتے "مَیں آگے اس لیے رہتا ہوں کہ میرے دوسرے بھائیوں کے حوصلے بڑھیں"۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ آپ خیمے میں اپنے بستر پر لیٹے کچھ سوچ رہے تھے۔ پھر سوچتے سوچتے اُٹھے اور اپنے سرہانے سے بیڑی نکال کر بوسہ دیا، بولے "اے بیڑی! تُو نے مجھے آرام طلبی سے نکال لیا اور مَیں اس لائق ہو گیا کہ آج جہاد میں حصّہ لے رہا ہوں۔"

خان جہاں آپ کی باتیں سن رہا تھا، آپ کہتے رہے "اللہ جانتا ہے مَیں نے عیش و عشرت کو کبھی پسند نہیں کیا، لیکن خاندانی وجاہت نے اسے ٹھکرانے بھی نہیں دیا۔ اور مَیں اسی میں مبتلا ہوتا چلا گیا، پھر مجھ پر ہلکا سا عتاب نازل ہوا اور مَیں بیڑیوں کے قبضے میں دے کر قلعے میں قید کر دیا گیا۔ مَیں وہاں تین سال تک قید رہا اور اس سے رہے سہے کس بل بھی نکل گئے۔"

خان جہاں آپ کے سامنے پہنچ گیا اور آپ سے درخواست کی "آپ تخلیے میں بھی اس قسم کی باتیں نہ کریں تو بہتر ہے کیونکہ جو بھی آپ کی باتیں سُنتا ہے، پریشان ہو جاتا ہے۔ اللہ نے آپ کی زبان میں بڑا اثر دیا ہے۔"

آپ نے جواب دیا "نواب! تم مجھے اس سے نہیں روکو گے کیونکہ مَیں اس میں عاجزی اور انکساری کا درس لیتا ہوں۔"

جب دکن کی مشکلات پر قابو پا لیا گیا تو آگرے سے خان جہان کا بلاوا آ گیا۔

خاں جہاں آپ کو اپنے ساتھ لے کر آگرے واپس ہوا، راستے میں مانڈو نامی جگہ پر قیام کیا۔ یہ جگہ صوفیوں کی وجہ سے بڑی مشہور تھی۔ اذکارِ ابرار کے مصنّف محمّد غوثی شطاری کا وطن ہے جو آپ کا ہم عصر ہے۔ اس کو جب یہ معلوم ہُوا کہ سیّد احمد افغان، خان جہاں کے ساتھ تشریف فرما ہیں تو آپ کی ملاقات کو حاضر ہوا۔ آپ اس سے بہت اچھی طرح پیش آئے۔

اِن دنوں علمی اور دینی حلقوں میں محی الدّین ابنِ عربی اپنی کتاب فصوص الحکم کی وجہ سے نزاعی مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ ابنِ عربی کی تحریروں میں گستاخی کا عنصر پایا جاتا تھا۔ اس چیز نے صوفیوں کو بدظن کر دیا تھا لیکن بعض وہ صوفی بھی تھے جو ابنِ عربی سے متفق بھی تھے اور انہیں صوفیوں

کافلسفی قرار دیتے تھے۔ ابن عربی کی وہ تحریریں جن سے ابن عربی پر کفر کا فتویٰ عائد کیا جاسکتا تھا۔ دینی، علمی مجلسوں میں گرما گرم بحث کا موضوع بنی ہوئی تھیں۔

خان جہاں آپ کے خیمے میں داخل ہوا اس وقت ان کے ہاتھ میں ایک ایسی کتاب تھی جس میں ابن عربی کی تصنیف فصوص الحکم اور اس کے مضامین پر بحث کی گئی تھی۔ آپ نے پوچھا۔ "نواب صاحب! کیا آپ نے یہ کتاب پڑھی ہے؟"

خان جہاں نے جواب دیا "ہاں، میں نے یہ کتاب پڑھی ہے، اگر اس کے مضامین اور ابن عربی کے خیالات عام ہو جائیں تو ابھی قیامت اُٹھ کھڑی ہو۔"

آپ نے پوچھا "وہ خاص بات جو باعثِ نزاع ہے، کیا ہے؟ شاید میں اس کی کوئی معقول توجیہ پیش کر سکوں۔"

خان جہاں نے کتاب کو کھول کر ایک خاص حصہ اُن کے سامنے رکھ دیا۔

"ترجمہ" میں نے اپنے رب کو دیکھا کہ کرسی پر بیٹھا ہے (مجھ کو دیکھ کر) میرے سامنے اُٹھ کھڑا ہوا اور مجھ کو بٹھایا اور کہا تو میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں۔"

خان جہاں، سید احمد کے چہرے پر نظریں جمائے اُن کے اندر کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا، جب آپ مذکورہ عبارت پڑھ چکے تو اس نے آپ کا دامن پکڑ لیا اور کہنے لگا "حضرت! اب آپ یہ بتائیں کہ اس کا کیا مطلب ہے اور ابن عربی کا اس سے کیا مطلب ہے؟"

آپ نے خان جہاں کو سمجھایا "جہاں تک میں اس کا مفہوم سمجھا ہوں، یہ ہے کہ سرکش نفس تو نفسِ اُمّارہ ہے، جب یہ عالم کالبد پر قبضہ پالیتا ہے اور حواس واعضا اور جوارح سب اس کے زیرِ حکم آجاتے ہیں تو یہ دل کی کرسی پر تشریف فرما ہو جاتا ہے حالانکہ یہ روح کی جگہ ہوتی ہے۔ ان حالات میں نفس امارہ علی الاعلان ربوبیت کا دعویٰ کرتا ہے اور عنصری اقلیم کے دوسرے باشندوں کی طرح روح کو بھی اپنی عبودیت میں لینا چاہتا ہے، لیکن جب صوفی ریاضت اور مجاہدے کی بدولت نفس امارہ پر قابو پالیتا ہے تو ناچار کرسی نشینی روح کی طرف عود کر آتی ہے اور نفس اطاعت اور پرستش کے مقام پر کھڑے ہو کر انت ربی وانا عبدک کہہ کر آدابِ بندگی بجالاتا ہے۔"

خان جہاں آپ کی تشریح اور توضیح سے بہت متاثر ہوا اور کہا "لیکن جو ذہن اس تشریح تک نہیں پہنچ سکتے وہ تو اس سے گمراہ ہو جائیں گے اور ابن عربی کے بارے میں نہایت تکلیف دہ رائے قائم کریں گے۔"

انہی دنوں خان جہاں آگرہ جانے کا ارادہ رکھتا تھا، لیکن آپ آگرہ نہیں جانا چاہتے تھے۔

اس لیے خان جہاں سے بجواڑہ جانے کی اجازت لی۔

خان جہاں نے عرض کیا: "حضرت! آپ کو بادشاہ نے غیر معینہ مدت کے لیے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا تھا۔ پھر وہاں سے آپ کو میں نے رہا کرایا اور اپنے ساتھ دکن لے گیا، اب آپ اپنے وطن بجواڑہ جانا چاہتے ہیں۔ اس کی اجازت میں کس طرح دے سکتا ہوں، یہ تو آگرے سے بادشاہ اجازت دے سکتا ہے۔"

آپ نے فرمایا: "اگر یہ بات ہے تو میں یہاں مانڈوے میں ٹھہرا ہوا ہوں، تم آگرے سے میرے وطن جانے کا اجازت نامہ حاصل کر کے بھیج دو۔"

خان جہاں آپ کو جدا نہیں کرنا چاہتا تھا، اس نے پوچھا: "کیا آپ آگرے نہیں چلیں گے؟"

آپ نے جواب دیا: "آگرے میں میرے لیے کیا ہے، میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔"

خان جہاں نے کہا: "وہاں آپ کو بہت کچھ ملے گا، وہاں آپ چلیں تو سہی۔"

آپ نے جواب دیا: "فقیر کو شاہی دربار سے دور ہی رہنا چاہیے، اسی میں اسکی عافیت ہے۔"

خان جہاں نے کہا: "جہاں تک میں جانتا ہوں، اب آپ جہاں بھی جائیں گے، عافیت ہی عافیت ملے گی۔"

لیکن آپ آگرہ جانے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

خان جہاں آگرے چلا گیا۔ وہاں وہ جہانگیر سے ملا اور دکن اور خاندیس کی مہمات کے بارے میں بادشاہ کو ذرا ذرا سی جزئیات تک بتا دیں۔

بادشاہ کو اچانک سید احمد کا خیال آ گیا۔ پوچھا: "اور وہ سرکش درویش، جو گوالیار میں قید تھا۔ اب کہاں ہے؟"

خان بہادر نے سید احمد کی بڑی تعریفیں کیں۔ بادشاہ نے پوچھا: "کیا وہ واقعی ایسا ہے جیسا تو بیان کر رہا ہے؟"

خان جہاں نے اور زیادہ تعریف کر دی اور کہا: "حضورِ والا! میں نے سید احمد کی اتنی ہی تعریف کی ہے، جتنی کے وہ مستحق ہیں۔ ایسے آدمی روز روز نہیں پیدا ہوتے۔"

بادشاہ نے کہا: "اور وہ جو اُن کی بابت یہ مشہور کیا گیا کہ وہ ایران کے صفوی خاندان کی طرح اقتدار پر قبضے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

خان جہاں نے جواب دیا: "میں یہ بات اس لیے نہیں مانوں گا کہ وہ اس قسم کے آدمی ہی نہیں ہیں۔ ہم دونوں کافی دن ایک ساتھ رہے اور اس دوران میں نے اُن پر کڑی نظر رکھی ہے۔

اُن میں تو ایک بات بھی ایسی نہیں کہ کوئی یہ کہے کہ وہ بادشاہت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "کمال ہے، اس نیک شخص کو لوگوں نے خواہ مخواہ بدنام کر دیا۔" پھر پوچھا۔ "خان جہاں تو تو یہاں آ گیا۔ میں پوچھتا ہوں کہ تو اس درویش کو کہاں چھوڑ آیا؟ کہاں رہ گیا وہ اور اب جہاں بھی ہے، وہاں کیا کر رہا ہے؟"

خان جہاں نے جواب دیا۔ "وہ مانڈوے میں تشریف فرما ہیں اور اپنے وطن واپس جانا چاہتے ہیں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں، وہ بجواڑے جانا چاہتے ہیں تو ضرور جائیں لیکن خیال رہے کہ وہ وہاں کوئی لشکر نہ تیار کریں۔"

خان جہاں نے عرض کیا۔ "حضور والا! آپ بادشاہ ہیں اور آپ خوب جانتے ہیں کہ بعض بڑے صوفی اپنے بے پناہ مریدوں میں مقبول اور ہر دل عزیز ہوتے ہیں، اُن کا بھی یہی حال ہے، ہر ایک کے کام آجاتے ہیں۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "پھر کیا خیال ہے، ان کو بجواڑے جانے کی اجازت دے دی جائے۔"

خان جہاں نے جواب دیا۔ "بالکل، وہ وہاں بھی ہمارے حق میں دعائیں کرتے رہیں گے۔"

بادشاہ نے ایک تحریری فرمان جاری کر دیا جس کی رو سے سیّد احمد اپنے وطن بجواڑہ جا سکتے تھے۔

خان جہاں نے سیّد احمد کو اس فرمانِ شاہی کے ساتھ ایک خط اپنی طرف سے لکھا۔ اس میں اُن سے اپنے اور جہانگیر کے لیے دُعا کی استدعا کی گئی تھی۔ آپ بجواڑے روانہ ہو گئے، وہ مدّتوں بعد اپنے گھر جا رہے تھے۔ راہ میں جگہ جگہ اُن کی شاندار پذیرائی ہوئی۔ بجواڑے پہنچنے سے پہلے آپ کی خبر پہنچ چکی تھی۔ آپ کے مدّاحوں اور مریدوں نے میلوں آگے بڑھ کے آپ کا استقبال کیا۔ آپ کے عزیزوں نے آپ کو دیکھ کر آنسو بہائے، لیکن آپ نے اُنہیں رونے سے روک دیا اور کہا۔ "کیا تم لوگ ایک ایسے امر پر آنسو بہاؤ گے جو منجانب اللہ تھا۔"

آپ سے پوچھا گیا۔ "یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، وہ منجانب اللہ تھا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں شاہوں کی طرح حویلی میں رہتا تھا، لیکن شاہ نہیں تھا۔ مجھے شاہی فرمان جاری کرا کے یہ بتایا گیا کہ میں بادشاہ نہیں، فقیر ہوں۔" اس کے بعد آپ نے وہ بیڑیاں دکھائیں جو گوالیار میں قید کے دوران آپ کے پاؤں میں ڈال دی گئی تھیں۔ "ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور سیکھ رہا ہوں۔"

آپ نے بہت سادہ زندگی اختیار کی اور اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو راہِ حق دکھانے لگے۔

آپ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو سمجھاتے کہ اللہ کے سوا کسی سے مت ڈرو، انسان کے دُکھ درد میں شریک رہو، دُنیا میں اس طرح رہو جس طرح کوئی لاتعلق رہ سکتا ہے۔ اپنے دل و دماغ کو کبر و غرور سے پاک رکھو۔ کیونکہ اللہ کو یہ چیز بالکل پسند نہیں۔

کسی نے پوچھا "یہ وحدت الوجود کیا شے ہے؟"

آپ نے جواب دیا "ابن عربی کا قول ہے کہ کائنات کا وجود خالق سے الگ نہیں۔ سمندر کی لہریں سمندر سے الگ نظر آتی ہیں لیکن یہ فریبِ نظر ہے۔ اللہ زندگی کا ایک سمندر ہے جس سے یہ کائنات لہروں کی طرح اُبھری۔ نام جُدا سہی لیکن حقیقت ایک ہے۔ شعاعیں آفتاب اور لہریں سمندر الگ نہیں ہوتیں۔ جس طرح پھُول کے مُرجھانے اور لفنے کے ختم ہونے کے بعد بھی خوشبو اور موسیقی کی لہریں کائنات میں باقی رہتی ہیں، اسی طرح موت کے بعد انسان کُل میں جذب ہو کر ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ یہ کائنات بظاہر کثرت ہے لیکن واقعتاً وحدت ہے اور اللہ بظاہر وحدت لیکن حقیقتاً کثرت ہے۔"

ایک مرید نے آپ سے پوچھا "کیا اس نظریے کی مخالفت بھی کی گئی؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں امام ابن کثیر علامہ سُبکی اور علامہ ذہبی نے اس نظریے کی مخالفت کی ہے۔"

سوال کیا گیا "یہ مخالف لوگ کیا کہتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "کائنات اللہ کا تخیّل ہے جس نے مظاہر کا لباس پہن لیا ہے یا اس کی تجلّی ہے جو اُس سے جُدا نہیں۔"

جب آپ بالکل بُوڑھے ہو گئے اور عمر اسّی سال سے تجاوز کر گئی تو طبیعت میں ذرا تیزی آگئی، ایسا معلوم ہوتا گویا قوّتِ برداشت میں کمی واقع ہو گئی ہو۔

آپ کے کئی خادم تھے اور خادم آپس میں جھگڑتے بھی رہتے تھے۔ آپ اُنہیں سمجھاتے کہ یہ بڑی بُری بات ہے، ایسا مت کیا کرو۔

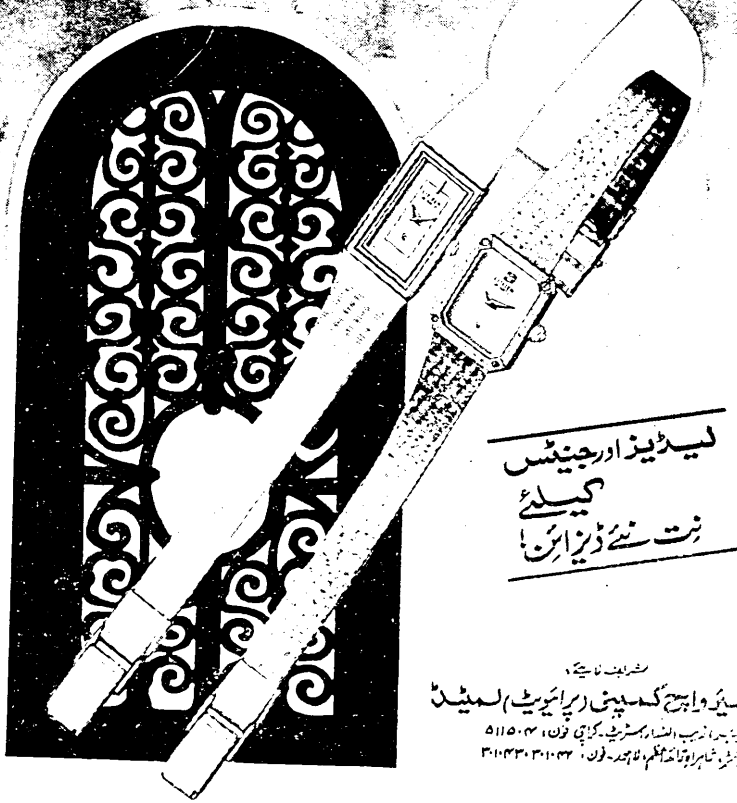
لیکن وہ اپنی بات سے باز نہ آتے۔ آپ اُن سے آزردہ رہنے لگے۔ آپ کا ایک خادم کچھ زیادہ ہی تنک مزاج اور فسادی تھا۔ آپ اُسے خوب خوب ڈانٹتے رہتے۔ آپ نے اس سے کہا "یہ لڑائی جھگڑا مجھے ذرا بھی پسند نہیں۔"

CITIZEN

CITIZEN IS A REGISTERED TRADEMARK OF CITIZEN WATCH CO. JAPAN

سٹیزن

کوارٹز گھڑیاں



لیڈیز اور جینٹس
کیلئے
نت نئے ڈیزائن!

تشریف لائیے،

ایم۔ ایچ کمپنی (پرائیویٹ) لمیٹڈ

[illegible] ۵۱۱۵۰۴ کراچی فون:

[illegible] ۳۰۱۴۳۰۳۰۱۰۴۲ فون:

EXC-25-11-86

ایک خادم نے جواب دیا "لڑائی جھگڑا کس کو پسند ہے؟ کسی کو بھی نہیں" اس کے بعد اس نے جھگڑالو خادم کی طرف اشارہ کیا "بس یہ خوامخواہ جھگڑتا رہتا ہے۔"

وہ شخص غصے میں کھڑا ہو گیا "میں جھگڑالو ہوں، میں جھگڑے کرتا ہوں، اللہ سے ڈرو، کیوں تہمت لگاتا ہے مجھ پر؟"

یہ شخص غصے کی حالت میں باہر نکل گیا اور گلی میں کھڑا بڑبڑاتا رہا۔ کسی راہ گیر نے پوچھا۔ "بھائی کیا ہو گیا؟ یہاں کھڑے کیا بڑبڑا رہے ہو؟"

خادم کو غصہ آ گیا "تجھے کیا، میں کہیں بھی بڑبڑاؤں۔ کیا تیرے گھر چل کے بڑبڑاؤں؟"

اس شخص کو اور زیادہ ہنسی آ گئی۔ وہ ایک طرف چل دیا اور کہنے لگا "پاگل آسمان سے تھوڑی اترتے ہیں، وہ سب تیرے ہی جیسے ہوتے ہیں۔"

خادم نے ضبط و برداشت کا دامن چھوڑ دیا اور اس شخص کی پٹائی کر دی۔ وہ پریشان ہو کر آپ کی خانقاہ میں داخل ہو گیا۔

آپ نے اس سے پوچھا "کیا بات ہے؟ تو کیوں رو رہا ہے؟ اور یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں آپ کے پاس کچھ لینے نہیں آیا۔ میں تو آپ کے خادم کے ہاتھوں پٹ جانے کے بعد عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے آیا ہوں۔"

آپ نے غصے میں خادم کو آواز دی کہ ذرا میرے پاس تو آ۔ خادم آپ کے پاس آ گیا۔ آپ نے پوچھا "یہ تیری شکایت کر رہا ہے تو کیا کہے گا؟"

خادم نے اس شخص کو ڈانٹا "تو میری شکایت کر رہا ہے، شرم نہیں آتی۔"

آپ نے کہا "یہ تیری شکایت کر رہا ہے، جواب طلب یہ بات نہیں بلکہ یہ بات ہے کہ تو نے اسے مارا کیوں؟"

خادم نے جواب دیا "جناب! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، اس نے میرے ساتھ شرارت کی، میں نے اس کی پٹائی کر دی۔"

آپ کو کچھ غصہ آ گیا "تجھ کو پٹائی کا حق کس نے دیا؟"

خادم نے اور زیادہ جسارت سے کام لیا "پٹائی کا حق کون دیتا ہے مجھے، میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔" آپ کے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا "اچھا تو تو اپنی مرضی کا مالک بھی ہو گیا۔"

خادم نے اسی طرح اکڑ کر جواب دیا "جی۔ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں، مجھ سے جو بھی جھگڑے گا میں اس کو پیٹ دوں گا۔"

آپ کے غصّے میں اور اضافہ ہو گیا۔ "مَیں تیری گستاخی کو زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

خادم نے جواب دیا: "جب آپ ضبط و برداشت سے کام نہیں لے سکتے تو مجھ سے ایسی اُمید کیوں کرتے ہیں۔"

جو شخص خادم سے پٹا تھا، وہ دونوں کی باتوں کو بڑے مزے میں کھڑا سُن رہا تھا۔ آپ نے اس میں بھی اپنی سُبکی محسوس کی۔ آپ نے خادم سے کہا: "اس سے معافی مانگ"۔ خادم نے جواب دیا: "لیکن مَیں اس سے معافی نہیں مانگوں گا۔"

آپ اشتعال میں کھڑے ہو گئے: "تو اس سے معافی نہیں مانگے گا؟"

خادم نے جواب دیا: "ہاں، مَیں اس سے معافی نہیں مانگوں گا۔"

آپ نے زیادہ جوش اور ولولے میں کہا: "لیکن مَیں کہتا ہوں کہ تو اس سے معافی ضرور مانگے گا۔"

خادم نے آپ کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ آپ بات نہ بڑھائیں۔ مَیں نے ایک بار جو بات کہہ دی، کہہ دی، اب اس میں یہ جرح، بحث کیوں؟"

آپ نے غصّے میں بید اُٹھا لیا: "مَیں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ تو اس سے معافی مانگ لے۔"

خادم آپ کے پاس سے جانے لگا: "مَیں آپ کا یہ حکم نہیں مانوں گا۔" پٹنے والا شخص آپ کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ اب آپ کیا کریں گے؟

آپ نے خادم کو گدّی سے پکڑ لیا: "کہاں جا رہا ہے، پہلے میرے حکم کی تعمیل کر، بعد میں یہاں سے روانگی۔"

خادم بھی اپنی ضد پر اڑا رہا: "مَیں آپ کا یہ حکم نہیں مانوں گا۔"

آپ نے پوچھا: "تو میرا یہ حکم کیوں نہیں مانے گا؟" خادم نے جواب دیا: "حضرت! مجھے بھی ضد سی ہو گئی ہے، اس لیے آپ کا یہ حکم نہیں مانوں گا۔"

آپ نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا اور پھر اس کا چہرہ اپنے سامنے کر لیا اور کہا: "دیکھ، مَیں تجھے آخری بار کہہ رہا ہوں کہ میرا حکم مان لے اور اس سے معافی مانگ لے۔"

خادم نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا اور معافی مانگنے سے انکار کر دیا۔ مَیں نے ایک بار جو بات کہہ دی، کہہ دی، مَیں اس سے معافی نہیں مانگوں گا۔"

آپ نے اس کی پُشت پر ایک بید رسید کر دیا: "اس سے معافی مانگ، ورنہ مَیں تیری کھال کھینچ دوں گا، تیری کھال اُدھیڑ دوں گا۔"

خادم نے جواب دیا: "آپ مجھے جان سے ماردیں مگر مَیں اس سے معافی نہیں مانگوں گا۔"

آپ نے دوسری بار اور زور سے بید رسید کر دیا اور کہا "معافی مانگ" خادم نے تڑپ کر کہا۔ "مگر میں معافی نہیں مانگوں گا"

آپ نے تیسری بار ضرب لگائی "معافی مانگ لو ورنہ میں کھال ادھیڑ دوں گا"

خادم نے جواب دیا "آپ مجھے جان سے مار دیں مگر میں معافی نہیں مانگوں گا"

آپ غصے سے بے قابو ہو چکے تھے آپ نے خادم کی بید سے اسقدر پٹائی کی کہ وہ چیخنے چلانے لگا مگر اسی دوران اچانک خادم نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ حضرت اسلام نے غصے کو حرام قرار دیا ہے۔ جبکہ آپ غصے سے مجھے پیٹ رہے ہیں۔ میں تو ایک گناہگار اور معمولی آدمی ہوں جبکہ آپ ایک درویش ولی ہیں جب آپ اپنے نفس کو قابو میں نہیں رکھ سکتے تو پھر میرا کیا ہے میں تو گناہ کا پتلا ہوں۔ خادم کی ان باتوں نے آپ کے دل میں اس قدر اثر کیا کہ آپ پر خوف اور کپکپی طاری ہو گئی آپکے دل میں زبردست تھیس اُٹھی۔ خادم اور ارادت مند فوراً معالج کی طرف دوڑے مگر سید احمد نے انہیں منع کر دیا اور کہا طبیب کو طلب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بہتر یہ ہو گا کہ آپ اُس خادم کو بلوائیں جسے ابھی میں نے پیٹا ہے۔ چنانچہ خادم کو بلوایا گیا اور جب آپ نے اُس کی جانب معافی طلب نگاہوں سے دیکھا تو اُس نے کہا۔ حضرت یہ تو سب خدائی کرشمے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ نہ میں آپ سے پٹ سکتا تھا نہ آپ مجھے پیٹ سکتے تھے۔ مجھ سے تو یہ کہا گیا تھا میں آپ کو بتا دوں کہ غصہ حرام ہے اتنا کہنے کے بعد خادم چلا گیا اور اُس کے فوراً بعد آپ اپنے خالق حقیقی کو جا ملے۔

حضرت سید احمد سون ایک ایسے درویش اور ولی تھے جو زندگی بھر اللہ اور اُس کے رسولؐ کا پیغام دنیا والوں تک پہنچاتے رہے آپ علم کا سمندر تھے بڑے بڑے بزرگان دین نے آپ کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ آپ کی طبیعت میں بلا کی گرمی بھی تھی اور پھول جیسی نرمی بھی ہر قسم کا عیش و آرام میسر ہونے کے باوجود آپ نے فقیرانہ زندگی کو ترجیح دی۔ آپ کے مزاج میں تصوف دل و دماغ میں فلسفہ تھا مگر یہ فلسفہ کبھی بھی اُن کو گمراہ نہ کر سکا۔ کیونکہ اس فلسفے میں ربوبیت کو شامل کر لیا گیا تھا۔ آپ بڑے بڑے علمی اور دینی مسائل کو حیرت انگیز طریقے سے نپٹا دیا کرتے تھے۔ حضرت سید احمد سون کی صحیح تاریخ وفات کتابوں میں درج نہیں آپ کا مزار پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کے ایک قصبے "بجواڑے" میں واقع ہے یہی وہ مقام ہے جہاں آپ پیدا ہوئے تھے۔ آج بھی بندگانِ خدا آپ کے مزار پر جوق در جوق حاضری دیتے ہیں اور من کی مرادیں پاتے ہیں۔

خواجہ نور محمد مہاروی

حضرت مولانا فخر الدین فخرِ جہاںؒ کی خدمت میں کسی شخص نے عرض کی "حضرت! آپ نے کھرل قوم کے جس پنجابی مرید کو اپنی بیعت میں لیا ہے وہ تو ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہے جس کے ایک فرد مرزا نے سیال قوم کی خوبصورت لڑکی صاحباں کو اپنے جالِ محبت میں پھنسا لیا تھا جس کی پاداش میں سیالوں نے جوشِ غیرت میں آکر مرزا کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس لیے بہتر ہے آپ اس کھرل قومیت کے پنجابی مرید کو اپنے پاس رکھنے سے گریز کریں۔"

حضرت نے اپنے بہی خواہ سے اپنے پنجابی کھرل مرید اور اس کی قوم کے بارے میں باتیں سُنیں تو متبسم ہو کر فرمانے لگے۔

"مرزا کھرل نے تو صرف سیالوں کی ایک خاتون کو اپنا والا و شیدا بنایا تھا۔ انشاءاللہ ہمارا یہ پنجابی کھرل نور محمد ایک دنیا کو اپنا گرویدا بنا دے گا اور لوگ اس کے پیچھے دیوانہ وار پھریں گے۔"

یہ پنجابی اور کھرل مرید حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ تھے۔ آپ ۱۶ رمضان المبارک ۱۱۴۲ھ میں کھرل قوم کے ایک غریب گھرانے میں مولود ہوئے۔ آپ کے والد ہندوال جو محمود کھرل کے پڑپوتے تھے اور شہر فرید کے علاقے کی ایک بستی "چوٹالہ" میں رہائش رکھتے تھے۔ کھرل

قوم راجپوتوں کی ایک شاخ ہے جس کا سلسلۂ نسب چندر بنسی خاندان کے مشہور راجہ کرم چند سے ملتا ہے۔ جو ہنا پور کا حکمران تھا۔ خواجہ نور محمدؒ صاحب کے والد زراعت پیشہ تھے۔ اس کے علاوہ مویشی چراتے تھے، جانوروں کا دودھ دوہتے تھے اور ان کے جانوروں کی رکھوالی بھی کیا کرتے تھے۔ آپ چھٹی پشت کے بعد آپ کے بزرگ نام کے اعتبار سے ہندوانہ ذہن آتے ہیں۔ حضرت کا اپنا نام بھی "بھیل" تھا جس کو آپ کے مرشد نے نور محمدؒ سے بدل دیا تھا۔ حضرت نور محمدؒ کی والدہ محترمہ کا نام نامی "عاقل بی بی" تھا جو چھڈ قوم کے ایک کمال نامی زمین دار کی صاحبزادی تھیں اور قصبہ "پھولڑہ" میں رہتی تھیں جو مہار سے جنوب کی جانب تقریباً چالیس کوس کے فاصلے پر ہے۔

حضرت خواجہ نور محمدؒ مادرزاد ولی تھے۔ آپ کی پیدائش سے پہلے کی بات ہے کہ ایک مشہور بزرگ خواجہ فتح دریاؒ نے حضرت کی والدہ عاقل بی بی کو دیکھ کر پیش گوئی کی تھی کہ میں اس بچی کے پہلو میں ایک ایسا لعل بے بہا کا دیدار کر رہا ہوں جو اپنے زمانے کا قطب ہوگا۔ اسی طرح حضرت کے ولی اللہ ہونے کے بارے میں ایک اور بزرگ جن کا نام شیخ احمد تھا، نے بھی پیش گوئی کی تھی۔ یہ صاحب ساوے چیرے والے (سبز پگڑی) کے نام سے بھی مشہور تھے۔ ایک مرتبہ جب یہ "چوٹا" آتے ہوتے تھے ان کی بزرگی اور کمالات کی وجہ سے پورے قصبے کے مرد و زن اُن سے فیض و برکات حاصل کر رہے تھے۔ اسی ہجوم میں حضرت نور احمد مہارویؒ کی والدہ ماجدہ بھی تشریف فرما تھیں جن کی شادی کو ابھی چند ہفتے ہی گزرے تھے حضرت شیخ احمدؒ کی نظر جب مادرِ ولی پر پڑی تو وہ ادب و تعظیم بجا لاتے۔ لوگوں نے استفسار کیا تو فرمایا۔

"لوگو! میں تعظیم اس بی بی کی نہیں کر رہا بلکہ تکریم اُس ہستی کی کر رہا ہوں جو اس کے بطن میں پوشیدہ ہے اور جس کے ظہور سے ایک عالم منور اور درخشاں ہوگا۔"

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے کامل بندے کی باتوں کو سچا ثابت کیا اور حضرت عاقل بی بی کے گھر اپنا ولی پیدا کیا جس نے کشورِ ولایت و طریقت میں خواجہ نور محمد مہارویؒ کے نام سے شہرتِ دوام حاصل کی۔

خواجہ صاحبؒ جب چار سال کے ہوتے تو انھیں دستور کے مطابق بستی کے استاد مولوی میاں مسعودؒ کے پاس قرآن شریف پڑھانے کے لیے بھیجا گیا۔ حضرت نے اپنی استعداد سے بڑھ کر چند ہی ہفتوں میں علمِ قرآن حاصل کر لیا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ حضرت شیخ احمدؒ جن کا

ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے جو حضرت خواجہ کی پیدائش اور ولایت کے پیشین گو بھی تھے میاں مسعودؒ کی مسجد میں آتے اور حضرت خواجہ کو جو اُس وقت ننھے مُنے طالب علم تھے دیکھ کر فرمایا۔

"یہ بچہ غیر معمولی صلاحیت و حیثیت کا مالک ہے۔ اس کی پیشانی سے سعادت و انوار کے آثار نظر آ رہے ہیں جو اسے بہت جلد مرتبۂ ولایت پر پہنچا دیں گے اور بڑے بڑے سلاطین اِس کے آستانے پر اپنی جبین سائی کیا کریں گے۔"

میاں مسعودؒ ایک عالم و فاضل انسان تھے مگر روحانیت و معرفت سے نابلد تھے چنانچہ اُن کے نزدیک شیخ احمدؒ کی بات محض ایک لاف زنی تھی چنانچہ میاں صاحب موصوف نے حضرت شیخ احمدؒ کا خوب مذاق اڑایا اور کہا۔

"سُبحان اللہ۔ اب ایسے اولیاء اللہ ہی پیدا ہوں گے۔ یہ "ہندوال جٹ" جو سرے گنجا ہے اُس کے بیٹے کے سامنے بادشاہ سر جھکائیں گے۔"

پھر میاں مسعود نے وہ وقت بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ہندوال جٹ جو سرے گنجے تھے انھیں کے بیٹے نور محمد مہارویؒ نے میدانِ طریقت و حقیقت میں ایسی معرکہ آرائی کی کہ وہ زہد و رکوع، علم و عرفان اور احادیث و قرآن کے نابغۂ عصر بزرگ بن گئے۔

حضرت خواجہؒ نے دس سال کی عُمر میں قرآن پاک حفظ کیا اور تحصیل علم کے لیے "چوٹالہ" سے مُہار تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے کچھ عرصہ قیام کیا۔ یہیں سے علم کا شوق اور تجسّس کا جنون آپ کو ڈیرہ غازی خان لایا مگر آپ کی تشفی پھر بھی نہ ہوئی۔ آپ کے گہرے دوست خواجہ محکم الدین سیرانیؒ بھی آپ کی طرح ہی علم معرفت اور راہِ طریقت کے داعی اور شیدائی تھے۔ چنانچہ وہ بھی آپ کے ہمسفر تھے۔

ڈیرہ غازی خان کے بعد آپ نے لاہور کا رُخ کیا۔ لاہور جو ہمیشہ علم و حکمت کا مرکز رہا ہے۔ یہاں آپ دونوں حضرات نے ایک مشہور مُدرس کے درس سے استفادہ حاصل کیا۔ آپ علم کے حصول کے لیے گھر سے نکل تو پڑے تھے مگر مالی طور پر آپ کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ آپ اس قدر تہی دست تھے کہ آخر وقتِ حیات کو پورا کرنا بھی آپ کے لیے محال تھا۔ ایسی کیفیت میں علم کی طلب اور معرفت کی تلاش جاری رکھنا کسی مردِ مجاہد اور مردِ حق کا ہی کام ہے۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اِن مصائب سے گلو خلاصی کر لیتا۔ مگر یہ بات تو عین حقیقت ہے کہ منزل پر پہنچنے کا شوق رکھنے والوں اور علم کی سچی لگن اور تلاش کرنے والوں کو تکالیف، مصائب اور پریشانیوں سے دوچار رہنا ہی پڑتا ہے۔ آپ کو علم کا ایسا شوق تھا کہ اس کے لیے آپ نے

کچھ عرصہ گداگری بھی کی۔ اگرچہ اہل اللہ میں گداگری کرنا سخت ناپسندیدہ سا عمل ہے۔ مگر یہ تو آپ کی منشا نہ تھی بلکہ یہ تو خدا کی طرف سے ایک امتحان اور آزمائش تھی جس میں آپ پورے اترے۔ گداگری کی کیفیت میں ہی آپ ایک مرتبہ ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ آپ کو اندھیری رات میں کیچڑ زدہ گلیوں اور شدید بارش میں چلنا دوبھر ہوگیا۔ اس دوران آپ خدا کے آگے گڑگڑائے اور عرض کی۔

"اے باری خدا۔ مجھے علم و معرفت کی کامل منزل تک پہنچا جس کے لیے میں گداگری جیسی لعنت میں مبتلا ہوا ہوں اس سے مجھے نجات عطا فرما۔"

اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد آپ لاہور سے دہلی تشریف لے گئے۔ دہلی تو علماء و صلحا کا بڑا مرکز تھا۔ اس گئے گزرے دور میں بھی یہاں علم کی تشنگی دور کرنے کے لیے بے شمار ایسی درس گاہیں تھیں جو تشنگان علم کی پیاس بجھانے کے لیے اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ انہی درس گاہوں میں نواب غازی الدین کا مدرسہ بھی شامل تھا جو قابل اساتذہ کی وجہ سے بہت مقبول تھا۔ حضرت خواجہ نور محمدؒ نے اسی مدرسہ میں قدم رکھا اور یہاں کے استاد معظم خواجہ حافظ برخوردار جی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ حضرت حافظ برخوردارؒ نہ صرف صاحب نسبت بزرگ تھے بلکہ آپ خانوادہ چشتیہ سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ آپ طلباء کو تعلیم و رہائش کے علاوہ خوراک بھی دیا کرتے تھے۔ اسی لیے حضرت خواجہ نور محمدؒ جب مدرسہ نواب غازی الدین میں پہنچے تو آپ کی جملہ ضروریات اکل و شرب پوری ہوگئیں۔ یہاں ہی حضرت خواجہ کی ملاقات میاں فتح محمد صاحب سے ہوئی۔ جو دربار دہلی سے وابستہ تھے اور اپنے ہاں ہر جمعرات کو درود شریف کا ختم کروایا کرتے تھے۔ ختم کی تقریبات کی ساری ذمہ داریاں حضرت خواجہ کے سپرد تھیں مگر دہلی میں بھی آپ زیادہ دیر خوش نہ رہ سکے۔ آپ کے مونس و ہمدم استاد میاں فتح محمد صاحب دہلی سے اپنے وطن چلے گئے یوں آپ کی تحصیل و تعلیم کا سلسلہ ایک مرتبہ منقطع ہوگیا جس کی وجہ سے آپ بہت پریشان ہوئے۔ اسی پریشانی میں ایک روز جب آپ محو استراحت تھے آپ نے خواب میں دیکھا کہ حافظ محمد اصلح ساکن بھیرہ نے آپ سے پوچھا "کہو نور محمد تم کیوں اندوہگین ہو۔"

عرض کی "اے بزرگ محترم! میرے استاد اپنے وطن روانہ ہوگئے اور اس طرح میری تعلیم ادھوری رہ گئی ہے۔"

حافظ صاحب نے خواب ہی میں آپ کی رہنمائی فرمائی اور بتایا "ایک عالم دکن سے

تشریف لائے ہیں اور وہ لوگوں کو علم سکھانے کے خواہش مند ہیں۔ چنانچہ اُن سے آپ بھی علم سیکھیں

حضرت خواجہ نے اپنے ایک دوست قلندر بخش جو ہمیشہ آپ کے پاس آکر کتاب فیہ کی تکرار کرتا تھا۔ اُس نے آپ کو بتایا "اے دوست آپ گھبرانا چھوڑ دیں۔ فاضل پیرزادہ دکن نے جہاں اسلام کی تبلیغ کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے وہاں وہ اپنے شاگردوں اور مریدوں کے طعام قیام کے بھی ذمہ دار ہیں۔"

خواجہ نور محمدؒ کے دل میں پیرزادہ دکن سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا اور آپ ان کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے چل پڑے۔ دکن کے یہ پیرزادے ہی درحقیقت محبّ نبیؐ مولانا فخرالدین فخرِ جہاںؒ تھے جو فقر و درویشی میں بے مثل تھے۔ بادشاہ دہلی اکبر شاہ ثانی اور ابوظفر بہادر شاہ آپ کے مریدوں میں شامل تھے۔ حضرت مولانا فخرالدین المعروف پیرزادہ دکن سے ہی سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی ایک شاخ فخریہ جاری ہوئی۔

خواجہ نور محمد صاحب حضرت مولانا کی خدمت میں پہنچے اُس وقت آپ اپنے دولت کدے پر موجود نہیں تھے چنانچہ پہلے دن ملاقات سے محروم رہے۔ اگلے دن جب آپ دوبارہ درِ مرشد پر پہنچے تو اس وقت ظہر کا وقت تھا۔ حویلی کے دروازے پر دربان بیٹھے تھے انھیں دیکھ کر خواجہ نور محمدؒ ڈر گئے اور اندر جانے کی ہمت نہ کی لیکن کچھ دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد آپ نے محسوس کیا کہ حویلی کے اندر عام لوگ بلا اجازت آجا رہے ہیں۔ لہذا آپ بھی حوصلہ کر کے حویلی کے اندر چلے گئے۔ آپ کو اچانک یہ خیال آیا کہ میری تو مسافرت میں ایسی حالت ہو گئی ہے کہ نہ لباس ڈھنگ کا ہے اور نہ ہی حُلیہ درست ہے۔ شاید حضرت مجھے قابلِ اعتنا ہی نہ سمجھیں۔ مگر جب آپ حویلی کے اندر اس مقام پر جا پہنچے جہاں حضرت تشریف فرما تھے تو آپ کے دل کے اندر آنے والے خیالات غلط نکلے۔ اور حضرت فخرالدین نے جونہی آپ کو دیکھا اپنے تخت سے اُتر کر آپ کی پذیرائی کے لیے آگے بڑھے اور نہایت محبت و تلطف کے ساتھ آپ کو گلے لگا لیا۔ اور ایسا برتاؤ کیا جیسا ایک محبِ مشفق اور دیرینہ بچھڑا ہوا دوست کرتا ہے۔ پھر حضرت نے خواجہ صاحب سے پوچھا۔

"نور محمد! آپ کہاں کے رہنے والے ہیں"۔ عرض کی "حضرت! میں پاکپتن کا باسی ہوں"۔ فرمایا "کیا آپ بابا کی اولاد ہیں"۔ عرض کی گئی "نہیں حضرت"

حضرت فخرالدینؒ کو پاک پتن کا نام سُن کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ نے خواجہ نور محمد سے پھر پوچھا۔

"بھئی! آپ تو بڑی اعلیٰ وارفع سرزمین سے تشریف لائے کیا میرے لائق کوئی خدمت ہے تو بتاؤ گے ہمیں تو بابا کی نگری سے آنے والوں سے بہت محبت کرتا ہوں۔"

خواجہ نور محمدؒ نے عرض کی "حضرت! میں علم و عرفان کا طالب و متلاشی ہوں۔ میں نے سُنا ہے آپ صاحبِ علم ہیں اور لوگوں کو درس و تدریس سے نوازتے ہیں۔ میری بھی یہی تمنا ہے اور پُرامید ہوں کہ آپ میری علمی تشنگی کو دُور فرمادیں گے۔"

حضرت مولانا فخرالدینؒ نے سوال کیا "نور محمد! پہلے کہاں پڑھتے رہے ہو۔" جواب دیا گیا "حضور! پہلے مولوی برخوردار صاحب سے پڑھتا تھا مگر کافی عرصہ سے پڑھائی موقوف کر رکھی ہے۔"

حضرت نے فرمایا "نہیں نور محمد نہیں پڑھائی ترک کرنا غلط بات ہے آپ پھر سے مولانا برخوردار صاحب سے پڑھنا شروع کر دیں اور جو سبق وہ دیں اس کا اعادہ آپ روزانہ ہمارے پاس آکر کر لیا کریں۔"

خواجہ نور محمدؒ نے عرض کی "حضور! مولوی برخوردار صاحب کے مکان اور آپ کے گھر کے درمیان کافی فاصلہ ہے اس لیے ناچیز کے آنے جانے میں بہت سا وقت ضائع ہو گا۔ اس لیے اس کمترین کو آپ اپنی شاگردی میں ہی لے لیں۔"

مولانا خواجہ نور محمد کی خواہش کی حقیقت سمجھ گئے۔ اور متبسم ہو کر یہ شعر بیان فرمایا۔

ما برائے وصل کردن آمدیم
نے برائے فصل کردن آمدیم

مجھے بس یہ کہنا تھا کہ خواجہ نور محمد کو حضرت کے درس میں علم حاصل کرنے کی اجازت مل گئی حضرت مولانا نے خواجہ کو دینی اور دنیاوی علوم سے سرفراز فرمایا۔ پھر اچانک ایک روز فرمایا۔

"نور محمد! تم اپنا وقت علم ظاہری میں مت ضائع کرو۔ جتنا علم تم نے سیکھ لیا ہے یہی کافی ہے۔ اب تم جس علم کے لائق ہو وہ حاصل کرنے میں مشغول ہو جاؤ۔"

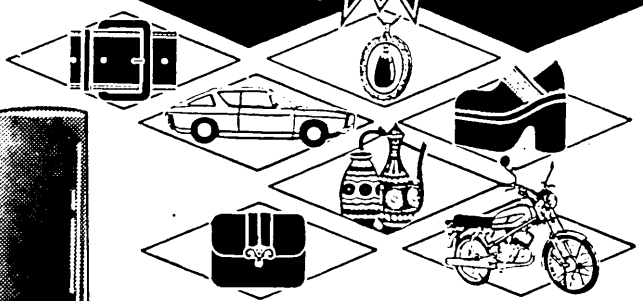
یہ بات سُن کر خواجہ نور محمدؒ نے عرض کی حضرت "اگر میرے مقدر میں بالا بلندی لکھی ہے تو پھر دیر کاہے کی آپ مجھے اپنا مرید بنا لیجئے۔" حضرت نے فرمایا "ایسے نہیں نور محمد! ہمارا قاعدہ ہے کہ بیعت کے لیے پہلے خُدا سے اجازت لینا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے پہلے تم خدا سے استخارہ کر کے بیعت کی اجازت لو پھر اس کے مطابق اگر اجازت مل گئی تو ہم تمہیں بیعت کر لیں گے۔"

خواجہ نور محمد صاحبؒ نے استخارہ کیا اور خداوند کریم نے آپ کو حضرت کی بیعت کی اجازت

جاپان کا بنا ہوا

ایلفی

ہر چیز کو **سیکنڈوں** میں جوڑتا ہے۔





ایلفی کے استعمالات بے شمار ہیں

زیورات ۔ ریڈیو ، ٹیلی وژن ، ریفریجریٹر ، کھلونے ، کرکٹ کا سامان ، فٹبال ۔
گلدان ، عام گھریلو اشیاء ۔ نائلون کے جوتے ، کاروں ۔ اسکوٹروں ، سائیکلوں
کے ٹائر ۔ ناب ، ڈیش بورڈ ، وینائل ٹرم ۔ تھرمس ۔ چشمے
کے فریم ، قلم ، پرس ، سوٹ کیس ، بریف کیس ۔ جوتے ،
بیلٹ ، سینڈل ، مچھلی پکڑنے کی ڈوری ، ہینگر ،
کیمرہ وغیرہ وغیرہ کو بآسانی جوڑا جا سکتا
ہے۔

ہر جگہ آسانی سے دستیاب

ایلفی کے جوڑ ہزاروں پونڈ سے زائد قوت برداشت کر لیتے ہیں

مرحمت فرمادی۔ اور پھر حضرت فخرالدینؒ آپ کو دہلی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر لے گئے اور بیعت کیا اور خلعت سے سرفراز فرمایا۔ اس طرح حضرت خواجہ نور محمد حضرت مولانا فخرالدین سے دہلی میں بیعت ہونے والے پہلے مرید تھے۔

بیعت کے بعد مرشد کی خواجہ صاحب پر ایسی توجہ ہوئی کہ دیگر مرید رشک کرنے لگے مناقب فخریہ میں مرقوم ہے کہ خواجہ صاحب کو حضرت اپنا انیس روز وشبانہ اور ہمدم وہم راز کہا کرتے تھے۔ سفر ہو یا حضر مولانا ہمیشہ خواجہ صاحب کو اپنے ہمراہ رکھتے تھے۔ اسی سفر میں خواجہ صاحب ایک مرتبہ اپنے مرشد عالی مقام کے ہمراہ پاک پتن شریف لائے جہاں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے مزار پر دونوں نے حاضری دی۔ بعدازاں مولانا فخرالدین نے خواجہ نور محمدؒ کو نصیحت کی۔

"دیکھو نور محمد! آپ ایک عرصے سے اپنی والدہ سے دُور ہو۔ اور ایسا کرنا کسی طور پر بھی مستحسن نہیں اس لیے میں تمھیں حکم دیتا ہوں اب فوراً یہیں سے اپنی والدہ کی خدمت میں چلے جاؤ۔"

حضرت خواجہ نے مرشد کے حکم کی تعمیل کی اور پورے سولہ سال کے بعد آپ اپنے وطن پہنچے۔ سولہ سال کا عرصہ ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اس لمبے عرصے نے آپ کی شکل وصورت اور حلیے کو تبدیل کر دیا تھا۔ اور تو اور آپ کی والدہ بھی آپ کو پہچان نہ سکیں۔ مگر آپ نے انھیں پہچان لیا اور ان کی قدم بوسی کی۔ آپ کی آمد سے آپ کے گاؤں میں یہ مشہور ہو گیا کہ دہلی سے کوئی بزرگ آئے ہیں۔ آنے والوں میں آپ کے پُرانے استاد میاں حافظ مسعود بھی تھے۔ جب انھیں پتہ چلا کہ یہ ولی اللہ تو اُن کا شاگرد ہے تو انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔

"نور محمد! دہلی میں جا کر تم نے کچھ سیکھا بھی ہے یا یونہی وقت ضائع کر کے واپس لوٹ آئے ہو۔"

خواجہ صاحب نے اپنے استاد سے عرض کی "استاد محترم! دہلی میں ایک دکن کے پیرزادے تشریف لائے ہوئے ہیں میں تو بس اُن کی خدمت کرتا ہوں اور دیگچیاں چاٹ لیتا ہوں۔"

استاد نے تاسف کے ساتھ کہا "افسوس تم نے اپنا سارا وقت فضول کاموں میں گزار دیا۔ حالانکہ دُوسرے لوگ جو بھی دہلی گئے ہیں وہاں سے عالم بن کر واپس آئے ہیں۔"

خواجہ نور محمد خاموش رہے اور کوئی جواب دیے بغیر اپنے گھر آ گئے۔ اپنی والدہ کے پاس آٹھ یوم قیام کرنے کے بعد آپ اپنے مرشد کی خدمت میں پاک پتن پہنچ گئے۔ واپسی پر آپ

کو مرشد نے برج نظامی میں عبادت کرنے کا حکم دیا۔ اُس دوران آپ کی خدمت میں بہت سے لوگ آنے لگے لیکن آپ سب کو حضرت مولانا فخرالدینؒ کی خدمت میں بھیج دیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ پھر حضرت مولانا خواجہ نور محمد کو پاک پتن لاتے اور دوسری مرتبہ بھی آپ کو آپ کی والدہ صاحبہ کے پاس مہار شریف جانے کا حکم دیا۔ خواجہ صاحب دو ماہ تک مہار میں رہے اور اپنی والدہ کی خدمت کرتے رہے۔ اس قیام کے دوران اہل مہار کے دل پر آپ کی بزرگی اور خدا رسیدگی کا بہت گہرا اثر ہوا اور جب آپ نے مہار سے کوچ کر کے پاک پتن جانے کا ارادہ فرمایا تو آپ کے ہمراہ بہت سارے افراد چلنے کو تیار ہو گئے۔ جن میں آپ کے بھائی ملک سلطان برہان، آپ کے چچا لکھیر اور آپ کے بچپن کے استاد حافظ محمد مسعود بھی شامل تھے۔ ان تمام حضرات کو حضرت مولوی فخرالدینؒ نے خواجہ صاحب کی سفارش پر بیعت کیا۔

اس کے بعد آپ کا معمول بن گیا کہ آپ چھ ماہ مرشد کی خدمت میں دہلی میں گزارتے اور چھ ماہ مہار میں اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت میں گزارا کرتے تھے۔ حضرت مولانا فخرالدین کو خواجہ صاحب سے بے حد تعلق خاطر تھا۔ ایک دن مولانا خواجہ صاحب کا بازو پکڑ کر فرمانے لگے۔

"اے نور محمد! سبحان اللہ! کجا دکن کجا پاک۔ قدرت پروردگار دیکھو کہ وہ مجھے دکن سے اور تمھیں پاک پتن سے لایا اور یہ سنجوگ جوڑا ہے۔"

خواجہ نور محمدؒ نے اپنے مرشد کی بہت خدمت کی۔ اُن کے قدموں میں حاضر رہنا اور خدمت کرنا اُنھیں بہت محبوب اور پسند تھا۔ آپ اپنے مرشد کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا کرتے تھے۔

پھر ایک روز حضرت مولانا نے خواجہ نور محمد سے فرمایا۔

"اے نور محمد! خدا کی مخلوق کو تم سے بہت کام پڑنے والے ہیں۔" یہ سُننا تھا خواجہ صاحب بہت متعجب ہوتے اور سوچنے لگے کہ میں کسی کے کیا کام آسکوں گا۔ مگر آپ کی سوچوں کی پرواہ کیے بغیر آپ کے مرشد نے آپ کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور حکم دیا کہ مہار شریف جاؤ اور رشد و ہدایت کے چراغ روشن کرو۔ چنانچہ آپ بلا تامل مہار شریف پہنچ گئے۔

آپ کے مرشد آپ کو رخصت تو کر بیٹھے مگر یہ جدائی ان کو بہت شاق گزری۔ چنانچہ جس طرح خواجہ نور محمد ہر وقت اپنے مرشد کے لیے بے چین و بے قرار رہتے تھے اسی طرح آپ کے مرشد کے دل میں آپ کے لیے ہر وقت بے چینی سی رہتی تھی۔

مہار شریف میں حضرت خواجہ نے رشد و ہدایت کے وہ پرچم بلند کیے کہ مخلوقِ خدا دُور دُور

سے جویانِ حق اس شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہونے لگی اور ہزاروں کے حساب سے لوگ آپ کی بیعت کرنے لگے۔ یہ کیفیت کسی نے حضرت مولانا فخرالدینؒ کی خدمت میں بیان کی۔ حضرت بہت خوش ہوتے اور فرمایا۔

"میاں نور محمد خوب آدمی ہیں اور انھوں نے ہم سے بہت اچھی نسبت بہم پہنچائی۔ اگر یہ پنجابی میرے پاس نہ آتا تو میں دل میں یہ حسرت لے کر اس دُنیا سے رخصت ہو جاتا۔"

یہ زمانہ ہندوستان کے لیے بالعموم اور پنجاب کے لیے بالخصوص بڑی کش مکش اور افراتفری کا تھا۔ ہندوستان میں مرہٹوں نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ پنجاب سکھاشاہی کی زد میں تھا۔ سکھوں کے دانت ریاست بہاول پور پر بھی تھے۔ وہ کئی ایک بار سرحد پر بھی حملے کر چکے تھے۔ ان بیرونی خطرات کے علاوہ اندرونی طور پر بھی ریاست بعض شرپسندوں کے ہاتھوں خلفشار میں مبتلا تھی۔ نواب کے ہی بعض قرابت دار اُن کی حکومت کا تختہ الٹنے کی فکر میں تھے۔ ادھر والیٔ کابل تیمور شاہ اور شاہ شجاع الملک ریاست کو تخت و تاراج کرنے پر تُلے ہوتے تھے۔ ان گوناگوں مصائب اور چند در چند پریشانیوں سے بچنے کے لیے محض حُسنِ تدبیر اور لیاقت و شجاعت ہی کافی نہ تھی۔ اس موقع پر انھیں روحانی دستگیری اور رہنمائی کی بھی ضرورت تھی چنانچہ خواجہ نور محمد جیسے کامل پیر کے دامن سے وابستگی نے بھی ان کی قوّت و صلاحیت میں بے پناہ اضافہ کیا اور ہر مشکل میں عہدہ برآ ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

ایک مرتبہ خواجہ مہارویؒ اس قدر مغموم تھے کہ آپ نے سارا دن کھانے کا ایک نوالہ بھی نہ کھایا۔ کسی نے آپ سے اس مغمومیت اور افسردگی کا سبب دریافت کیا تو آپ نے نہایت رنجیدہ ہو کر فرمایا۔

"آج رات سے تیرھویں صدی شروع ہو گئی ہے۔ اس آنے والے زمانے میں بہت سے حادثات رونما ہوں گے۔ کئی ایک باطل فرقے ظہور میں آئیں گے۔ اکثر لوگ ذلیل و خوار اور ہلاک ہوں گے۔ مامون و محفوظ تو صرف وہی حضرات رہیں گے جو بزرگانِ دین سے اپنی عقیدت اور وابستگی رکھتے ہیں اور اُن کی صحبت میں بیٹھ کر درودِ پاک پڑھتے ہیں۔

***

ایک دن آپ حضرت شیخ تاج الدین کے مزار پر تشریف فرما تھے کہ کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور درخواست کی کہ مینہ کے لیے دُعا فرمائیں۔ سخت خشک سالی کی بدولت انسان، حیوان تڑپ رہے تھے، فصلیں برباد ہو رہی تھیں۔ حضرت نور محمدؒ نے اُسی وقت خُدا

کے حضور سجدہ ریز ہو کر گڑگڑا کر دُعا مانگی۔ خُدا نے آپ کی دُعا قبول فرمائی اور آن کی آن میں آسمان سیاہ بادلوں سے بھر گیا۔ اور لوگوں کو تسلّی خاطر ہوئی۔

***

حضرت خواجہ کی تعلیمات وہی تعلیمات تھیں جن کو اسلام کی رُوح کہا جاتا ہے۔ آپ فرماتے تھے کامل انسان عالم کی جان ہوتا ہے اس کے مرجانے سے دُنیا علم کے ایک حصّے سے محروم ہو جاتی ہے۔ جس شخص کے اخلاق سے انسان خوش ہوں اس سے خدا بھی خوش ہو جاتا ہے۔ فقر کا کام ہر ایک کے لیے دُعا کرتے رہنا ہے۔

علماء وقت کی آپ بہت سرزنش کیا کرتے تھے۔ آپ کا فرمان ہے کہ ان لوگوں کے قول و فعل میں بہت تضاد ہوتا ہے۔ حلال کھانے کی یہ لوگ کوشش تو بہت کرتے ہیں لیکن جونہی کوئی مال اِن کے ہاتھ آئے لینے سے گریز نہیں کرتے اور اس کے حلال و حرام کی تفریق تک بھول جاتے ہیں۔

***

خواجہ نور محمدؒ کا سالہا سال یہ معمول رہا کہ وہ ہر جمعہ کو چالیس میل کی مسافت طے کر کے پاپیادہ مہار شریف سے پاک پتن تشریف لے جایا کرتے تھے اور وہاں جا کر بابا فرید گنج شکرؒ کے مزار پر مجاہدے اور چلہ کشی کیا کرتے تھے۔

***

حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ نور محمدؒ صاحب کی زبان میں غضب کی تاثیر تھی۔ قدرت نے آپ کو ایسی طاقت عطا کی تھی جو کوئی آپ کا ہاتھ پکڑتا وہ کامیاب ہو کر جاتا۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنی محفل میں فرمایا۔

"جو کوئی کسی سے ناراض ہو اُسے اپنے دشمن کو راضی کر لینا چاہیئے"۔ بظاہر یہ عام سے الفاظ آپ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہی تھے کہ آپ کی محفل میں بیٹھے ہوئے ایک شخص حافظ محمد جمالؒ اُٹھے اور اپنے دُشمن کے قدموں کو پکڑ کر اس کو راضی کر لیا۔

***

ایک دفعہ دہلی میں حضرت فخر الدینؒ کی محفل میں یہ ذکر ہو رہا تھا کہ ملتان میں تصرف کسی ولی کا بہ عظمت حضرت بہاؤالدین ذکریاؒ ملتانی پیش نہیں کیا جاتا اور کوئی شخص وہاں بیعت نہیں کرتا۔ مولانا نے خواجہ نور محمدؒ سے فرمایا۔

"اب تک ولایت ملتان میں بہاء الحقؒ صاحب کی تھی لیکن اب ملتان ہمارے حوالے کر دیا گیا ہے اس لیے وہاں اپنے کسی مرید کو بھیجو کہ وہ حضرت بہاؤالدینؒ کی خانقاہ کے عین سامنے لوگوں کو بیعت کرے اور اپنا تصرف کرے۔"

خواجہ نور محمدؒ نے مرشد کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے مرید حضرت حافظ محمد جمالؒ ملتانی کو بسمت ملتان روانہ کیا جنھوں نے سب سے پہلے حضرت خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ کو خانقاہ حضرت بہاؤالحق میں مرید کیا جو آپ کے خلفائے نامدار میں ممتاز تھے۔

***

آخری عمر میں حضرت قبلہ نور محمدؒ صاحب کو دو صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلا صدمہ حضرت مولانا فخرالدینؒ جو آپ کے مرشد تھے اُن کے وصال سے پہنچا جس نے آپ کو انتہائی مضمحل اور کمزور کر دیا اور کچھ عرصہ بعد آپ کے مرید حضرت نور محمدؒ ثانی جن کے ساتھ آپ کو بیحد تعلق خاطر تھا، داغ مفارقت دے گئے۔ ان صدمات کے بعد آپ کا بیشتر وقت خاموشی سے یادِ الٰہی میں گزرنے لگا۔ لوگوں میں آپ بہت کم بیٹھتے تھے۔ پھر آپ مرض نقرس میں مبتلا ہو گئے اور آپ کو مسلسل بخار رہنے لگا اور اسی بیماری میں ۶۳ سال کی عمر میں بتاریخ ۳ ذوالحجہ ۱۲۰۵ھ کو واصل بحق ہو گئے۔

آپ کا مزار مبارک چشتیاں ریلوے اسٹیشن سے پون میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ چشتیاں کی بستی آپ کے چشتی ہونے کے باعث ہی اس نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ مزار کے ساتھ نواب بہاول پور نے ایک سرائے بھی بنوائی تھی جو آج بھی زائرین کے رہنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

۳ ذوالحجہ کو آپ کا عرس ہر سال نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہوتا ہے جس میں بے شمار معتقدین دُور دراز سے حاضر ہوتے ہیں۔



حضرت خیر النساج رح

بغداد کی سرزمین پر جنم لینے والے اس عظیم بزرگ کے ابتدائی واقعات بھی بڑے عجیب و غریب ہیں آپ کا اصل نام محمد اسماعیل اور رکنیت ابوالحسن تھی، لیکن دنیا انہیں اصل نام کے بجائے شیخ خیر نساج کے نام سے جانتی ہے۔ خیر نساج نے زندگی کا ابتدائی حصہ بغداد کے بزرگوں کی صحبت میں گزارا جن میں معروف ولی اللہ سری سقطیٰ اور حمزہ بغدادی بھی شامل ہیں۔ آپ کی زندگی کے بارے میں بہت عجیب و غریب واقعات درج ہیں۔ آپ معمولی سی بدعہدی اور وعدہ خلافی کو گناہ عظیم سمجھتے تھے۔ آپ عاجزی اور انکساری کے پیکر تھے۔ زندگی بھر آپ نے محنت مزدوری کر کے رزق حلال کمایا اور زمانے کی آسائشوں کو شانِ بے نیازی سے ٹھکرا دیا۔ جن دنوں آپ مشہور بزرگ سری سقطیٰ کی صحبت میں زندگی گزار رہے تھے۔ اُسی دوران ایک روز آپ کو معلوم ہوا کہ کسی مالدار شخص نے ایک مکان خرید لیا ہے مگر اب وہ اس مکان کو حویلی میں تبدیلی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس خبر نے آپ کو پریشانی میں مبتلا کر دیا اور فوراً سری سقطیٰ کے پاس تشریف لے گئے۔ جب انہوں نے آپ کی آمد کا سبب دریافت فرمایا تو آپ نے کہا "حضرت میرے پڑوس میں ایک امیر شخص آن بسا ہے۔ وہ اپنے پرانے مکان کو حویلی میں تبدیل کرنا چاہتا ہے اب بتائیے، مجھے کیا کرنا چاہیئے۔"

سری سقطیؒ نے فرمایا۔ "مال دار پڑوس تیرے پڑوس میں خود آیا ہے تو اُس کے پڑوس میں نہیں گیا، اب آگیا ہے تو اُسے رہنے دے؟"

انہوں نے کہا۔ "پھر آپ دُعا فرمائیں کہ اللہ میرے قلب کو استقامت اور تیقن عطا فرمائے اور میں مالدار کے شر سے محفوظ رہوں۔"

سری سقطیؒ نے جواب دیا۔ "اے ابنِ اسماعیل! تیرا قلب ایسا ہے کہ اس پر کسی دولت مند کا اثر انداز ہونا ناممکن ہے۔ جانتے ہو قلب کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟"

انہوں نے عرض کیا۔ "حضرت! میں تو یہی سب جاننے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

سری سقطیؒ نے جواب دیا۔ "تو سنو! قلب کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ اول وہ قلب ہوتا ہے جو کوہِ گراں کی طرح اپنی جگہ اٹل رہتا ہے۔ دوم وہ قلب جو تناور درخت کی طرح مستحکم اور مضبوط ہوتا ہے مگر اس درخت کو بادِ تند کے جھونکے ہلا کے رکھ دیتے ہیں اور کبھی کبھی اُن کو اُکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں اور سوم وہ قلب ہوتا ہے جو پرندوں کی طرح پرواز کرتا رہتا ہے۔ تیرا قلب بلندی پر محوِ پرواز رہتا ہے۔ اس لیے تجھ کو کسی کے خوف اور مایوسی کی پروا بھی نہیں کرنی چاہیے۔"

انہیں سری سقطیؒ سے جو کچھ معلوم ہو رہا تھا، وہ قیمتی خزانے سے کم نہیں تھا۔ اُنہوں نے پوچھا۔ "زندگی کے لیے کتنی چیزیں ضروری ہیں؟"

سری سقطیؒ نے جواب دیا۔ "پانچ چیزیں، ان پانچ کے علاوہ جو کچھ ہے فضول ہے۔ بے سُود ہے۔"

آپ نے پوچھا۔ "کون کون سی؟"

سری سقطیؒ نے جواب دیا۔ "اوّل کھانا، مگر بقائے زندگی کی حد تک، دوم پانی، صرف رفعِ تشنگی کے لیے، سوم لباس، صرف ستر پوشی کی حد تک، چہارم مکان، صرف سکونت کے لیے۔ پنجم، علم، عمل کی حد تک۔"

یہ سری سقطیؒ کے پاس دیر تک بیٹھے سوالات کرتے رہے اور ان کے جوابات سے نشہ اور بے خودی سی محسوس کرتے رہے۔

***

آپ اپنے حُجرے میں تشریف فرما تھے، اُن کے اردگرد اُن کے نامی گرامی صوفی مُرید بیٹھے تھے، نوری اور ابنِ عطا وغیرہ۔ اتنے میں آپ کو مطلع کیا گیا کہ ایک شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

آپ نے پوچھا: "وہ کون ہے؟ کہاں سے اور کیوں آیا ہے؟ اُس کا نام؟"
مُرید نے عرض کیا: "حضرت! وہ اپنا نام جعفر بن یونس بتاتا ہے اور دربارِ خلافت سے آیا ہے اور یہ نہیں بتاتا کہ یہاں آپ کے پاس کیوں آیا ہے؟"
آپ نے فرمایا: "بلاؤ اس کو۔ میرے پاس لاؤ۔"
مرید اُنہیں آپ کے سامنے لے آیا۔ آپ نے اس جوان کو دیکھا جو تنک مزاج معلوم ہوتا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا: "تیرا نام کیا ہے؟"
جوان نے جواب دیا: "جعفر، باپ کا نام یونس اور وہ دربارِ خلافت میں صاحب الحجاب رہ چکے ہیں۔"
آپ نے پوچھا: "مگر تو کیا ہے؟ کیا کرتا ہے؟"
جعفر نے جواب دیا: "یہاں آنے سے پہلے میں نہاوند کا سردار تھا۔ اب کچھ بھی نہیں۔"
آپ نے کہا: "یہ کیا بات ہوئی؟ نہاوند کا سردار تھا؟ اب کیوں نہیں ہے؟"
جعفر نے جواب دیا: "یہ بھی بڑی عجیب داستان ہے۔ اگر اجازت ہو تو عرض کر دوں، بیان کر دوں۔"
آپ نے اجازت دے دی۔ جعفر نے کہنا شروع کیا: "پیر مُرشد!....."
آپ نے ٹوک دیا: "میں تیرا پیر و مرشد کب سے ہو گیا؟"
جعفر نے جواب دیا: "میں نے آپ کو دل سے پیر و مرشد مان لیا ہے، آپ کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"
آپ نے فرمایا: "اچھا یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی، پہلے اپنی روداد سُنا، کیا واقعہ پیش آیا جو تو یہاں میرے پاس چلا آیا؟"
جعفر نے اپنی رُوداد بیان کرنا شروع کر دی: "میں نہاوند کا سردار تھا۔ زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی اور میں اس خوش فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ میں دنیا کا اہم ترین انسان ہوں اور مجھ سے بڑا دوسرا کوئی سردار نہیں۔"
آپ نے فرمایا: "پھر، پھر؟ اصل واقعہ بیان کر۔"
جعفر نے پھر بیان کرنا شروع کر دیا: "میں نے اسی خوش فہمی میں کئی سال گزار دیے، مجھے علم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ دورانِ سرداری میرا یہ شوق بھی پورا ہوتا رہا۔ ایک دن میں نے اپنے ایک ہمعصر سردار کو کسی بات پر بہت بُرا بھلا کہا اور صاف صاف کہہ دیا: "میرے مقابلے

پر تیری حیثیت ہی کیا ہے۔ میں نہاوند کا سردار اور تو کیا ہے! چند چھوٹے چھوٹے مواضع کا سردار، والی۔"

سردار نے جواب دیا: "جعفر! زیادہ مت اکڑو۔ اللہ کو یہ باتیں پسند نہیں ہیں، وہ انسانی تکبر کو بالکل پسند نہیں کرتا۔"

اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک دن دربارِ خلافت سے میرا بُلاوا آگیا، جب میں دربار میں پہنچا تو وہاں دوسرے بہت سے سرداروں کو بھی دیکھا۔ ان سب کو بھی میری ہی طرح دربار میں طلب کیا گیا تھا۔

امیر المومنین نے ہم سب سے مختلف امور پر باتیں کیں اور یہاں مجھے یہ معلوم ہوا کہ نہاوند کے سردار کی کیا حیثیت ہے۔"

باتوں کے بعد خلیفہ نے ہمیں خلعتِ فاخرہ سے نوازا اور ہمیں حکم دیا کہ اگلے دن کی حاضری میں یہ خلعتیں جسم پر ہونی چاہئیں۔ چنانچہ ہم سب نے حکم کی تعمیل کی اور خلیفہ کی عطا کردہ خلعتوں میں دربار پہنچے۔ خلیفہ ہم سے بہت خوش ہوا۔

دربار میں جو سردار حاضر تھے اُن میں سے ایک کو نزلہ کی شکایت تھی اور وہ بہت پریشان تھا۔ گلے کی خراش نے اس کو بے حد پریشان کر رکھا تھا۔ اس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا: "جعفر اس وقت میں بہت پریشان ہوں۔ ناک ریزش کی شکار ہے اور گلے میں تراوش ہو رہی ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں۔"

میں نے اس سے کہا: "صبر سے کام لے، یہ دربار ہے، یہاں ایسی ویسی باتیں قابلِ سموع نہیں ہوتیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ واقعی پریشان تھا اور مارے خوف اور شرم کے اس نے گردن جھکا لی تھی۔

اتنے میں اُس نے چھینکیں لینا شروع کر دیں۔ پے در پے چھ چھینکوں نے سب کی توجہ اس کی طرف منعطف کر دی۔ خلیفہ کو اس کی چھینکیں بے حد گراں گزریں، لیکن اس نے چشم پوشی سے کام لیا۔ چھینکوں نے ناک سے تُلی جاری کر دی اور اُس نے بے اختیار اپنی خلعت کی آستین سے ناک پونچھ لی۔ خلیفہ کو اس کی یہ بات بے حد ناگوار گزری اور اُس نے ڈانٹ کر پوچھا: "او ذلیل انسان! یہ تو نے کیا کر دیا؟"

سردار کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا، وہ خاموش رہا۔

خلیفہ نے پھر وہی سوال کیا "تو نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"
سردار نے جواب دیا "حضورِ والا! رحم غلطی ہوئی، گناہگار ہوں لیکن میرا یہ گناہ، میری یہ غلطی غیر اختیاری اور اضطراری تھی۔ اس لیے مجھے معاف کر دیا جائے۔"
خلیفہ نے دربانوں کو حکم دیا "اس سے میری خلعت واپس لے لی جائے۔"
حکم کی من وعن تعمیل ہوئی اور سردار سے خلعت واپس لے لی گئی۔ میرے دل پر اس کا گہرا اثر ہوا۔
خلیفہ نے سب سے کہا "اب تم لوگ جا سکتے ہو۔"
جب دوسرے سردار وہاں سے چلے گئے تو میں نے خلیفہ سے عرض کیا "حضورِ والا! آپ انصاف سے کام لیں تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔"
خلیفہ نے تعجب سے پوچھا "کون سا مسئلہ؟ مسئلہ تو میں نے طے کر دیا۔"
میں نے خلیفہ کو یاد دلایا "امیر المومنین! مسئلہ یہ ہے کہ اب مجھے آپ کے دربار کی حاضری اور خلعت فاخرہ کی وصولیابی پر شرم محسوس ہو رہی ہے۔"
خلیفہ نے برہمی ظاہر کی "میرے دربار کا تو دوسرا خطا کار ہے، تو ہوش میں تو ہے۔ کیا تو جانتا ہے کہ کیا کہہ رہا ہے؟"
میں نے جواب دیا "یہاں آنے سے پہلے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے تک میں بے خبر اور غافل تھا۔ لیکن اب میں ہوش میں آ چکا ہوں اور اس وقت میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اپنے ہوش و حواس میں کہہ رہا ہوں۔"
خلیفہ نے پوچھا "آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے۔"
میں نے جواب دیا "صرف یہ کہ میں نے نہاوند کی سرداری پر فائز رہ کے اور آپ سے خلعتِ فاخرہ وصول کر کے اپنی زندگی کی بدترین غلطیاں کی ہیں۔ براہِ کرم آپ اپنی خلعتِ فاخرہ واپس لے لیں۔"
خلیفہ ایک دم مشتعل ہو گیا "یہ تو کیا بک رہا ہے؟"
میں نے نہایت نرمی اور خوش اخلاقی سے عرض کیا "جنابِ والا! میں نے جو کچھ کہا ہے اپنے ہوش و حواس میں کہا ہے۔"
خلیفہ نے کہا "اگر تو اپنے ہوش و حواس میں ہے تو تجھے یہ بات بھی معلوم ہو گی کہ جو کچھ تو نے کہا ہے اس کا انجام کیا ہو گا؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں اپنے اس انجام سے زیادہ اس انجام سے واقف ہوں جو مجھے میرے مالکِ حقیقی کی طرف سے مل سکتا ہے۔"

خلیفہ نے کہا: "بات صاف صاف کرتا کہ میں بھی سمجھ سکوں۔"

میں نے خلیفہ کو سمجھایا: "امیرالمومنین! آج جب آپ نے ایک سردار کو محض اس وجہ سے خطاکار قرار دیدیا کہ اس نے غلطی سے آپ کی عطا کردہ خلعت سے ناک پونچھ لی تھی تو میں نے سوچا کہ میرے مالکِ حقیقی نے بھی ہمیں ایک مستقل خلعت عطا کر رکھی ہے اور ہم اس خلعت سے کیسا نازیبا اور ناروا سلوک کرتے ہیں۔ کیا ہمیں ہماری اس گستاخی کی سزا نہیں دی جائے گی؟ ضرور دی جائے گی۔ امیرالمومنین! آپ مخلوق ہیں اور یہ ناپسند کرتے ہیں کہ کوئی آپ کی عطا کردہ خلعت سے بے ادبی نہ کرے تو وہ جو ہم سب کا مالک و آقا ہے، یہ بات کیوں کر گوارا کرے گا کہ ہم اس کی عطا کردہ خلعت کو اس کی مخلوق کے سامنے کثیف کریں۔"

خلیفہ کو چکر سا آگیا۔ آہستہ سے کہا: "ابن یونس! تو جا سکتا ہے۔"

"میں وہاں سے نکلا تو راستے میں کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اب میں کہاں جاؤں؟ نہاوند کی سرداری میرے نزدیک بے کار شے تھی۔ کچھ دیر بعد آپ کا خیال آیا اور میں یہاں آگیا۔"

ابن اسماعیل نے پوچھا: "تو کیا چاہتا ہے؟"

جعفر بن یونس نے جواب دیا: "میں آپ کے دستِ مبارک پر توبہ کرنا چاہتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا: "بسم اللہ۔ لا، ہاتھ بڑھا لیکن پہلے یہ سوچ لے کہ اس توبہ کے بعد کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔"

جعفر بن یونس نے جواب دیا: "میں خوب سمجھ کر یہاں آیا ہوں۔"

آپ نے فرمایا: "توبہ کے بعد تیری سرداری کا کیا ہو گا؟ نہاوند کی سرداری کا کیا بنے گا؟"

جعفر نے جواب دیا: "مجھے سرداری کی ہوس نہیں۔ میں اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ آیا۔"

آپ نے جعفر بن یونس سے اُسی وقت توبہ کروائی اور دستِ دُعا دراز کر دیا: "الٰہ العالمین! یہ تیرا بندہ جعفر مجھے کچھ سمجھ کر ہی میرے پاس آیا ہے، اس کی لاج رکھ لے اور مجھے شرمندگی سے بچا لے۔ اس کے مقام اور مرتبے میں اضافہ فرما۔"

حاضرین نے آمین کہی۔

بعد میں اس جوان سردار کو جنید بغدادیؒ کے سپرد کر دیا گیا اور آج دنیا اس کو ابوبکر شبلی کے نام سے جانتی ہے۔

آپ نے فیصلہ کیا کہ حج کے لیے مکہ معظمہ جائیں گے۔ آپ کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور جو بھی آپ سے پہلی بار ملتا تھا۔ آپ سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔ آپ حج کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ وہاں حجاج کرام کی بھیڑ بھاڑ میں نعمتوں کی فراوانی دیکھی۔ دنیا بھر کے لوگوں نے یہاں کھانے پینے میں جس کشادہ دلی اور فراخ شکمی کا مظاہرہ کیا، اُس نے آپ کو دُکھ پہنچایا۔ آپ نے فرمایا: "لوگو! کیا تم اپنے نفس کو قابو میں نہیں رکھ سکتے اور خود کو اپنے نفس کے اختیار میں دے دیا؟ اچھے اچھے کھانوں سے پیٹ کے جہنم کو بھر کے تم کس طرح فلاح کی اُمید کرو گے؟"

یہاں کھجوروں کی کئی قسمیں نظر آئیں اور ان کی کئی اعلیٰ قسموں نے آپ کو ورغلایا اور آپ کے دل میں اُن کے لیے خواہش پیدا ہو گئی پھر جیسے اچانک اس کو ہوش آ گیا اور آپ نے اپنے دل میں عہد کیا کہ دیارِ حرم میں کھجور ہرگز نہیں کھاؤں گا۔

اس عہد کو کئی دن گزر گئے اور آپ اس پر قائم رہے۔ پھر ایک دن معلوم نہیں کیا ہوا کہ آپ کا عہد ٹوٹ گیا اور آپ نے بھولے سے کئی کھجوریں کھا لیں۔ کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ آپ سے زبردست بھول ہو چکی ہے۔ آپ کو بہت دُکھ ہوا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

کسی شخص نے آپ کو روتے ہوئے دیکھا تو اسے بڑی تشویش ہوئی، اُس نے قریب آ کر دریافت کیا: "کیا تو غلام ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "ہاں میں غلام ہوں۔"

اُس نے دوسرا سوال کیا: "کیا تو نے اپنے مالک سے راہِ فرار اختیار کر لی ہے؟"

آپ نے فرمایا: "ہاں اور اس وقت میں اپنی اسی بھول پر آنسو بہا رہا ہوں۔"

اس شخص نے کہا: "اگر یہ بات ہے تو میرے ساتھ چل تاکہ میں تجھے تیرے مالک سے ملوا دوں۔"

آپ نے جواب دیا: "میں خود بھی ایک عرصے سے اس کا خواہش مند ہوں کہ کوئی مجھے میرے مالک سے ملوا دے۔"

وہ شخص آپ کو اپنے گھر لے گیا اور کہنے لگا: "میں نے تمہارا نام خیر رکھ دیا ہے، میں تجھ کو کپڑا بُننا سکھاؤں گا۔ میں تیرے آقا کو تلاش کروں گا، جب وہ مل جائے گا تو تجھ کو اس کے حوالے کر دوں گا لیکن جب تک وہ نہیں ملتا تو کپڑا بُنتا رہ۔ اس طرح تو مجھ پر بار نہیں ہو گا۔"

آپ نے اُس سے کپڑا بُننا سیکھ لیا اور اسی کے پاس رہنے اور کپڑا بُننے لگے۔ وہ شخص آپ سے بہت خوش تھا کہ دولت خرچ کیے بغیر اس کو ایک غلام مل گیا تھا اور غلام بھی ایسا کہ اس کا ہر حکم بے چون و چرا مان لیتا تھا۔

کچھ عرصے بعد آپ یہ سوچنے لگے کہ مَیں نے اپنا عہد توڑ کر اچھا نہیں کیا تھا اور جو کچھ بھی میرے ساتھ ہو رہا ہے، گویا اُس گناہ کا کفّارہ ادا ہو رہا ہے۔ آپ نے اپنے آپ سے سوال کیا "اے ابنِ اسماعیل! اب تو تُو ابوالحسن محمد بن اسماعیل بھی نہیں رہا۔ تیرا اصل نام بھی تجھ سے چھین لیا گیا۔ اور یہاں کا ہر شخص تجھے خیر کہہ کر پکارتا ہے اور چونکہ تُو کپڑا بُنتا ہے اس لیے نساج بھی تیرے نام کا جزو ہو چکا ہے۔ یعنی اب تو مخلوق کی نظر میں خیر نساج (خیر بُلاہا) ہے، بول اب اور کیا ہونا ہے تیرے ساتھ؟"

آپ کو اس حال میں رہتے ہوئے کچھ ہی زمانہ گزرا تھا کہ ایک دن آپ کہیں تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے ایک شخص کو مجنونانہ انداز میں اِدھر اُدھر دوڑتے بھاگتے دیکھا جیسے اس کو کسی کی تلاش ہو۔ آپ نے اس کو روک کر دریافت کیا "بھائی! تُو کس کو تلاش کرتا پھر رہا ہے؟"

اس شخص نے آپ کو غور سے دیکھا اور چونک کر لپٹ گیا "ارے خیر تُو! مَیں تجھ کو کہاں کہاں تلاش کر آیا اور تُو یہاں ہے؟"

آپ اس شخص کو بالکل نہیں پہچانتے تھے، بولے "لیکن مَیں تو تجھے بالکل نہیں جانتا۔"

اس شخص نے دو ہتڑ رسید کیا، غصّے میں بولا "یعنی تُو مجھے نہیں جانتا؟ کیا تُو خیر نہیں ہے؟ کیا تو نساجی کا کام نہیں کرتا؟ بول؟"

آپ نے جواب دیا "مَیں واقعی خیر نساج ہوں لیکن مَیں تجھ سے واقف نہیں ہوں۔"

اُس شخص نے پھر ایک ہاتھ رسید کر دیا، بولا "جب تو خیر نساج بھی ہے اور مَیں تجھ کو تیرے اصل نام سے مخاطب بھی کر رہا ہوں تو پھر تُو یہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ مَیں تجھ سے واقف نہیں۔"

آپ نے جواب دیا "مَیں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ آپ مجھے کس طرح جانتے ہیں، بہرحال اگر کچھ وضاحت ہو جائے تو بہتر ہے۔"

اُس شخص نے آپ کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا "بھگوڑے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تُو مجھ سے اس ڈھٹائی سے باتیں کیوں کر رہا ہے۔ تُو میرا غلام ہے اور مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ مَیں نے تجھے کہاں کہاں تلاش کیا۔ تیری جستجو میں مَیں نے کہاں کہاں کے دھکّے کھائے ہیں۔ کیا بتاؤں، اب جو پا لیا ہے تو تُو مجھے پہچان نہیں رہا۔"

آپ نے سمجھ لیا کہ میں نے جو بدعہدی کی تھی اس کی سزا کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، آپ نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے اور آپ کو یقین ہے کہ میں ہی آپ کا مفرور غلام ہوں تو میں حاضر ہوں، آپ مجھے اپنے گھر لے چلیں۔ میں آپ کی خدمت کروں گا۔"

اُس شخص نے مشتعل ہو کر پھر ایک بار آپ کو مارا اور کہنے لگا "پھر وہی ہٹ دھرمی۔ یعنی تو میری خدمت کر کے گویا مجھ پر احسان کرے گا۔"

آپ پٹتے رہے، کسی قسم کی مزاحمت بھی نہیں کی۔ اُس نے آپ کے گلے میں چادر کا پھندا ڈال دیا اور مویشی کی طرح کھینچتا ہوا گھر لے گیا۔

اپنے شہر میں پہنچ کر اُس نے آپ کو قاضی کی عدالت میں کھڑا کر دیا اور دہائیاں دینے لگا۔ "قاضی جی! دُہائی ہے، یہ میرا غلام خیر لنساج چوری سے بھاگ گیا تھا۔ میں نے اسے تلاش اور جُستجو کے بعد بمشکل پایا ہے، اب یہ انکار کرتا ہے کہ میں خیر لنساج نہیں ہوں، اب آپ ہی انصاف فرمائیں کہ میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں؟"

قاضی نے کہا "کیا تو چند گواہ پیش کر سکتا ہے جو یہ گواہی دیں کہ یہی تیرا خیر لنساج ہے۔"

اس نے جواب دیا "آپ چند گواہوں کی بات کرتے ہیں اور میں اپنے دعوے کی تائید میں سینکڑوں گواہ پیش کر سکتا ہوں۔ میرے اس غلام کو شہر کے ہزاروں آدمی جانتے ہیں۔"

قاضی نے کہا "کل اُن ہزاروں میں سے دس بیس گواہ پیش کر دے۔"

آپ نے قاضی سے کہا "جب یہ شخص مُصر اور بضد ہے کہ میں ہی اس کا خیر لنساج ہوں تو مزید گواہوں کی کیا ضرورت ہے؟ میں اس کے ساتھ رہوں گا اور زندگی بھر خدمت کرتا رہوں گا۔"

لیکن قاضی نے گواہوں پر اصرار کیا "گواہ بہت ضروری ہیں کیونکہ میں یہ نہیں چاہتا کہ تیرے ساتھ کسی قسم کی زیادتی ہو۔"

دوسرے دن اس شخص نے قاضی کی عدالت میں گواہوں کی ایک فوج کھڑی کر دی۔ یہ پچاس ساٹھ گواہ تھے۔ اس شخص نے قاضی سے کہا "میں یہ چند گواہ لے آیا ہوں۔ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔"

قاضی نے ایک گواہ سے پوچھا "کیا تو اس شخص سے واقف ہے؟"

گواہ نے جواب دیا "خوب اچھی طرح۔ جناب والا! یہ اِسی صنعت کار کا غلام ہے جو کچھ عرصہ پہلے فرار ہو گیا تھا۔"

قاضی نے دوسرے گواہ سے پوچھا "اور تو اس شخص کے بارے میں کیا جانتا ہے؟"

دوسرے گواہ نے جواب دیا: "خوب اچھی طرح۔ جنابِ والا! وہی سب کچھ میں بھی جانتا ہوں جو پہلا گواہ جانتا ہے، یہ اس کاروباری کا غلام ہے اور کچھ دن پہلے یہ چوری سے بھاگ گیا تھا۔"

قاضی نے تیسرے گواہ سے دریافت کیا: "اور تو۔ تو کیا کہتا ہے اس شخص کے بارے میں؟"

تیسرے گواہ نے جواب دیا: "جنابِ والا! میں اس کاروباری کا خریدار ہوں، میں اس سے اس کا مال خرید کر اپنی دُکانداری چلاتا ہوں۔ میں یہاں اکثر آتا رہتا ہوں اور میں جب بھی یہاں آیا، خیر نساج کو کھڈی پر کام کرتے دیکھا۔ کچھ عرصہ پہلے جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے اس کاروباری کو پریشان بیٹھے دیکھا۔ میں نے اس سے پوچھا: "تو پریشان کیوں ہے؟ کوئی خاص بات ہے؟" کاروباری نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا کہ میرا غلام خیر نساج کہیں چلا گیا ہے اور اس کی وجہ سے ہمارا سارا کاروبار متاثر ہو رہا ہے اس لیے اس کی تلاش بہت ضروری ہے۔"

قاضی نے پوچھا: "مگر یہ غائب کیونکر ہُوا؟"

گواہ نے جواب دیا: "جب میں نے خیر نساج کو کام کرتے دیکھا تھا تو یہ کبھی کبھی حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہونے کے لیے چلے جایا کرتے تھے۔ جب ایک دن میں نے خیر نساج کو کام کرتے نہیں دیکھا تو میں نے اِن کے بارے میں دریافت کیا کہ یہ کہاں چلے گئے؟ جواب میں مجھے بتایا گیا کہ اُن کی طبیعت کچھ خراب ہے اور وہ کسی طبیب کے پاس گئے ہوئے ہیں پھر بعد میں اُن کی تلاش شروع ہو گئی۔ معلوم ہوا، یہ فرار ہو چکے اور اب، جب کہ انہیں پکڑ لیا گیا ہے تو یہ معلوم نہیں کیوں انکار کر رہے ہیں۔"

قاضی نے اِس کے بعد کسی گواہ کو زحمت نہیں دی اور خیر نساج کو حکم دیا کہ تو اپنے آقا کے ساتھ رہ اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ تو بھی جھوٹ نہیں بول رہا۔ تیرا حافظہ کسی وجہ سے تیرا ساتھ نہیں دے رہا۔ جب تیرا حافظہ دُرست ہو جائے گا تو تو خود ہی اقرار کرلے گا کہ تو غلطی سے جھوٹ بول رہا تھا۔"

آپ اپنے نئے آقا کے ساتھ اس کے گھر چلے گئے۔ اُس نے انہیں کھڈی پر بٹھا دیا اور آپ کپڑا بُننے لگے۔

کام سے جو وقت ملتا، اِس میں آپ عبادت کرتے رہتے۔ کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ اُن کا مالک کئی دن تک تو اس وہم میں رہا کہ شاید خیر نساج خوش نہیں ہیں اس لیے کسی سے بات چیت نہیں کرتے، لیکن جب اسی طرح کئی ماہ گزر گئے تو مالک کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ اُس نے آپ کو عبادت و ریاضت میں حد درجہ مشغول دیکھا تو یہ بات بھی اس

کی سمجھ میں نہیں آئی۔ کیونکہ اس کے علم اور یقین کے مطابق خیر لنساج پہلے اتنی عبادت نہیں کرتے تھے۔"

ایک رات پچھلے پہر، اُس نے آپ کو چھپ کر دیکھا۔ آپ سجدے میں گرے ہوئے گڑگڑا رہے تھے "اے اللہ! تُو نے مجھے جس حال میں بھی رکھا، مَیں خوش رہا تُو نے مجھے یکے بعد دیگرے دو آقاؤں کے حوالے کر دیا، مَیں نے کوئی شکایت نہیں کی اور تیری رضا پر راضی رہا۔ مَیں نے جو بدعہدی کی تھی، کیا یہ اس کی سزا ہے؟ مَیں یہ سزا زندگی بھر بھگت سکتا ہوں بشرطیکہ تو مجھے معاف کر دے۔"

آپ کے آقا کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ وہ اچانک آپ کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ آپ نے آہٹ محسوس کی تو سر اُٹھا کے اپنے آقا کو دیکھا۔ آپ گھبرا کے کھڑے ہو گئے، آقا نے پوچھا "خیر، یہ کیا ہو رہا ہے؟"

خیر نے جواب دیا "اپنے رب کے آگے سربسجود تھا۔ کیوں؟ کوئی کام ہے مجھ سے؟"

مالک نے کہا "کام تو نہیں ہے لیکن تُو یہ کیا کہہ رہا تھا کہ تجھے دو آقاؤں کے حوالے کر دیا گیا۔ مَیں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"آپ نے جواب دیا" جو کچھ آپ نے سُنا، اُسے ذہن سے نکال دیجئے۔ اگر کوئی ہو تو مجھے بتائیے مَیں انجام دوں گا۔"

مالک نے کہا "تیرے حافظے کی بحالی کا منتظر ہوں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مَیں کیا دیکھ رہا ہوں اور حقیقت کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "اللہ نے تجھ کو میری ذات پر تعینات کر دیا ہے، جو ہو رہا ہے، عین مشیت ایزدی کے مطابق ہو رہا ہے۔"

مالک نے دل میں سوچا۔ کہ یہ کیسا آدمی ہے جس کے دل میں حُبِّ دنیا کا کہیں کوئی وجود ہی نہیں۔"

آپ نے فرمایا "وجود ہر چیز کا — اگر چیز موجود ہے تو وجود بھی ہے لیکن انسان چاہے تو فضول چیزوں سے نجات حاصل کر لے۔ میری بھی یہی کوشش ہے۔"

مالک سہم گیا۔ جو بات اس کے دل میں تھی، وہ خیر لنساج کی زبان پر تھی۔ یہ کیا معاملہ ہے؟"

آپ نے اسے دلاسا دیا "زیادہ مت سوچو۔ یہاں بہت سی باتیں اتفاقیہ سرزد ہو جاتی ہیں مَیں تمہارا غلام ہوں اور تم میرے آقا ہو، ہم دونوں کو یہی یاد رکھنا ہے اور بس۔ آپ حکم دیتے رہیئے مَیں اس کی تعمیل کرتا رہوں گا۔"

مالک آپ کو چھوڑ کے چلا گیا، لیکن اب وہ پریشان ہو گیا تھا۔ جس خیر لنساج کو وہ جانتا تھا،

اس کی آواز، شکل وصورت، پیشہ، سب کچھ یہی تھا لیکن اُس کی عادات ایسی نہیں تھیں۔ اس کی باتوں میں مٹھاس ایسی نہیں تھی۔

ایک دن مالک نے آپ سے کہا۔ تو پسند کرے تو مَیں تجھ کو آزاد کر سکتا ہوں۔"

آپ نے جواب دیا "مَیں ایسی آزادی نہیں چاہتا جس پر میرا حق نہ بنتا ہو۔"

مالک نے پوچھا "تیرا حق کیونکر بنے گا یہ بھی تو معلوم ہو۔"

آپ نے فرمایا "تُو نے مجھے رقم دے کر حاصل کیا تھا اور مَیں ایک بار تجھ کو دھوکا دے کر فرار بھی ہو گیا تھا۔ قاضی نے مجھے سزا نہیں دی اور تُو نے بھی مجھے زدوکوب نہیں کیا۔ جتنے دن غائب رہا اُتنے دن کپڑا بھی نہیں بُنا۔ تُو نے مجھ سے حساب نہیں مانگا۔ اِن دُکھوں کی موجودگی میں تُو نے مجھے کس طرح آزاد کرے گا سوائے اس کے کہ تُو نے مجھے عبادت کرتے دیکھا ہے اور شاید اسی تاثر نے تیرے دل میں میرے لیے رحم پیدا کر دیا ہے اور اسی رحم کے زیرِ اثر تُو ایسی باتیں کر رہا ہے۔"

مالک نے جواب دیا "مَیں تجھ سے بے حد خوش ہوں اور چاہتا ہوں کہ تُو بھی خوش رہے۔"

آپ نے فرمایا "اور مَیں اس وقت خوشی محسوس کروں گا جب مَیں اپنی آزادی کو جائز اور اپنا حق سمجھوں گا۔"

مالک لاجواب ہو کر چپ ہو گیا۔

آپ نے کھڈی پر بیٹھ کر گھوڑی میں پاؤں لٹکا دیے اور کپڑا بُننے لگے۔ اتنے میں باہر شور بلند ہوا۔ لوگ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے "تیرا خیر پکڑا گیا۔"

کھڈیوں کا مالک شور سُن کر باہر گیا اور پوچھا "یہ کیسا شور مچا رکھا ہے تم لوگوں نے؟ کون سا خیر پکڑا گیا؟ خیر تو اندر کپڑا بُن رہا ہے!"

آدمیوں کے ہجوم میں ایک شخص اِس طرح کھڑا تھا کہ اُس کا سر جُھکا ہوا تھا اور دو آدمیوں نے مضبوطی سے اس کی کلائیاں پکڑ رکھی تھیں۔

مالک نے پوچھا "کیا بات ہے۔ تم لوگ شور کیوں کر رہے ہو؟"

جن دو آدمیوں نے ایک آدمی کو کلائیوں سے پکڑ رکھا تھا، اُن میں سے ایک نے پوچھا۔ "کیا تُو اس کو پہچانتا ہے؟"

چونکہ اس شخص کا سر جُھکا ہوا تھا اس لیے مالک اس کی شکل نہیں دیکھ سکا، پوچھا "یہ شخص کون ہے؟"

کسی نے جواب دیا "تیرا غلام خیر نساج۔"
مالک نے کہا "خیر نساج تو اندر کھڈی پر کپڑا بن رہا ہے۔"
ہجوم میں سے ایک نے کہا "آپ اندر والے خیر نساج کو باہر تو لائیے، ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوا جاتا ہے۔"
مالک کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں اور کیا چاہتے ہیں، اس نے ایک بار پھر دریافت کیا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے اور آپ لوگ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟"
ایک لمبا تڑنگا آدمی آگے بڑھا اور کہنے لگا "اے شخص تو نے آج سے کئی ماہ پہلے ایک خیر نساج کو قاضی کے سامنے پیش کر کے ہم سے یہ گواہی دلوائی تھی کہ وہ جو خیر نساج ہونے سے انکار کر رہا ہے، دراصل تیرا بھاگا ہوا خیر نساج ہے، لیکن آج ہم نے تیرے اصلی خیر نساج کو پکڑ لیا ہے، لے دیکھ، اسے اور اس کو پہچان کہ یہ کون ہے؟"
مالک نے حیرت سے پوچھا "کہاں ہے تمہارا خیر نساج، ذرا میں بھی تو دیکھوں اسے؟"
لوگوں نے ایک شخص کو مالک کے سامنے کر دیا۔ وہ شخص اس کے قدموں میں گر گیا اور رو رو کر کہنے لگا "میرے آقا! میں شرمندہ ہوں اور میں نے بھاگ جانے کی جو غلطی کی تھی اس کی معافی چاہتا ہوں، مجھے معاف کر دیجئے۔"
مالک حیران اور پریشان خیر نساج کی صورت دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ دوسرا خیر نساج کہاں سے آگیا، پوچھا "کیا تو خیر نساج ہے؟"
اس نے جواب دیا "ہاں۔ میں ہی خیر نساج ہوں، آپ شبہ کیوں کر رہے ہیں؟"
مالک نے کہا "میں اس لیے شبہ کر رہا ہوں کہ تیری ہی شکل و صورت کا ایک اور خیر نساج میرے پاس پہلے سے موجود ہے؟"
دوسرے خیر نساج نے جواب دیا "جناب! میں کسی دوسرے خیر نساج پر یقین نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میرے علاوہ کوئی اور خیر نساج ہے ہی نہیں۔"
مالک کئی دوسرے آدمیوں کے ساتھ اس خیر نساج کو ساتھ لیے ہوئے اصل خیر نساج کے روبرو اندر پہنچ گیا۔ وہاں دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو دوسرے خیر نساج نے پہلے سے پوچھا "تو تم ہو وہ خیر نساج جس نے میری جگہ لے رکھی ہے۔"
آپ نے جواب دیا "ہاں میں ہی وہ خیر نساج ہوں جو اپنے رب کے عتاب میں دن گزار

رہا تھا۔"

مالک اور دوسرے لوگ حیران تھے کہ دونوں خیر نساج ہم شکل بھی نہیں تھے حالانکہ جب خیر نساج کو یہاں لایا گیا تھا تو ان کی شکل بھی دوسرے خیر نساج ہی جیسی تھی۔ مالک معافی چاہنے لگا "حضرت! میں آپ کا گناہگار ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہوا، آپ کی تو شکل ہی مختلف ہے۔"

کئی آدمیوں نے یکے بعد دیگرے کہا "لیکن اس وقت تو شکل ملتی تھی، آج یہ کیوں بدل گئی۔"

کسی نے اس عجیب و غریب واقعے کی خبر قاضی کو کر دی۔ وہ بھی یہاں آ گئے اور مالک سے پوچھا "یہ کیا معاملہ ہے، کچھ میں بھی تو سنوں۔"

مالک نے جواب دیا "قاضی محترم! اب میں کیا بتاؤں۔ جس خیر نساج کا مقدمہ آپ کی عدالت میں چلا تھا، وہ میرے خیر نساج نہیں تھے۔ میرا خیر نساج یہ ہے۔" اور مالک نے دوسرے خیر نساج کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا۔

قاضی نے کہا "لیکن اس وقت تو بہتوں نے یہ گواہی دی تھی کہ یہی تیرا خیر نساج ہے۔ کیا وہ سب جھوٹے تھے؟ جھوٹی گواہیاں دی تھیں؟"

مالک نے جواب دیا "میں انہیں بھی جھوٹا نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ انہوں نے جس خیر نساج کو دیکھا تھا اس کی شکل و صورت آپ جیسی نہیں تھی۔ اگر آپ کو وہ شکل یاد ہو تو اس وقت کی شکل کو اس سے ملا کر دیکھیے، دونوں شکلوں میں زمین آسمان کا واضح فرق نظر آئے گا۔"

قاضی نے آپ کی شکل غور سے دیکھی اور پچھلی شکل سے موازنہ کیا تو زمین آسمان کا واضح فرق نظر آیا۔ قاضی نے آپ سے پوچھا۔ "اے خدا کے نیک بندے! کچھ ہماری راہنمائی کر۔ یہ ماجرا کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "میرا نام محمد ابوالحسن بن اسماعیل ہے۔ میں سامرہ کا رہنے والا ہوں۔"

اس کے بعد آپ نے اپنی پوری روداد سنائی اور آخر میں کہا "میں نے بدعہدی کی جس کی یہ سزا دی گئی کہ میں غلام بنا لیا گیا اور خیر نساج کے نام سے چرچا ہونے لگا، اب میں بھی خود کو خیر نساج ہی سمجھتا اور کہتا ہوں۔"

مالک نے کہا "حضرت! میں نے جو زیادتی کی ہے اس کی معافی چاہتا ہوں اور جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گے میں آپ کو یہاں سے جانے بھی نہیں دوں گا۔"

آپ نے جواب دیا "اللہ کے نیک بندے! تو کیوں خوفزدہ ہے؟ اللہ نے تجھ سے ایک کام

لیا تھا پھر جو کام خدا نے لیا ہو، اُس کی کسی بندے سے شکایت کرنا حماقت ہی نہیں گستاخی بھی ہے اور مَیں اس گستاخی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔"

مالک نے خوشامد جاری رکھی "آپ نے مجھے معاف کیا کہ نہیں؟"

آپ نے فرمایا "مَیں نے کہہ جو دیا کہ تو نے جو کچھ کیا۔ اللہ کے حکم کی تعمیل میں کیا ہے پھر معافی کس بات کی؟"

مالک نے عرض کیا "حضرت! میرے دل پر اس وقت تک بوجھ رہے گا جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گے۔"

آپ نے فرمایا "اگر یہ بات ہے تو جا مَیں نے معاف کر دیا تجھے۔"

مالک نے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔

آپ کئی دن تک آپ کے مالک کے مہمان رہے۔ اس دوران آپ کو آپ کے اصلی نام سے بھی مخاطب کیا گیا۔ آپ نے ان سب سے بھی یہی درخواست کی کہ مجھے خیر لنساج ہی کے نام سے مخاطب کیا جائے کیونکہ مجھ کو یہ نام بہت اچھا لگتا ہے۔

مالک نے کہا "حضرت! آج مَیں کفِ افسوس مل رہا ہوں، محض اس لیے کہ مجھے آپ کا غلام کیوں نہیں بنایا گیا۔ آپ آقا ہوتے اور مَیں غلام ہوتا۔"

آپ نے جواب دیا "اللہ سے لو لگا۔ حرص و ہوس سے پیچھا چھڑا پھر دیکھ تجھے کتنا بلند مقام حاصل ہوتا ہے۔"

آپ یہاں سے خانہ کعبہ اور وہاں کچھ وقت گزار کر سامرہ واپس چلے گئے۔ سامرہ میں لوگ آپ کا انتظار کر رہے تھے اور تشویش میں پاگل ہو رہے تھے۔ وہ آپ سے پوچھتے تھے۔ "حضرت آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

آپ ان لوگوں سے بس یہی کہتے تھے کہ مَیں نے اللہ سے ایک عہد کیا تھا اور جب اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکا تو مَیں سزا کا مستوجب قرار پایا اور اب سزا کاٹ کے واپس آ رہا ہوں۔"

جب آپ کو لوگوں نے آپ کے اصلی نام سے مخاطب کیا تو آپ نے انہیں بتایا کہ اب مَیں خیر لنساج ہوں اور مجھے اپنا یہ نام بہت پسند ہے۔"

ایک ارادت مند نے کہا "لیکن آپ لنساج (جُلاہے) تو نہیں ہیں۔ کپڑا بُننا آپ کا آبائی پیشہ تو نہیں۔"

آپ نے جواب دیا "مَیں اپنے آبائی پیشے سے لنساج نہیں ہوں، مَیں اپنی ذات کی حد تک

نساج ہوں اور میں نے اپنے لیے اسی پیشے کو پسند کر لیا ہے۔"

اب آپ نے اپنے گھر میں کھڈی لگا لی اور کپڑا بننے کا کام کرنے لگے۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد آپ دریا کے کنارے چلے جاتے، وہاں بے شمار مچھلیاں پانی کی تہ سے اوپر آتیں اور واپس چلی جاتیں۔ آپ اُن کے لیے مختلف قسم کا چُورا لاتے اور دریا میں پھینک دیتے۔ مچھلیاں اس چورے کو شوق سے کھاتیں۔

آپ سے لوگ کپڑا بنواتے اور مزدوری ادا کر کے اپنے گھر لے جاتے۔ اِن گاہکوں میں ایک بڑی بی سرِ فہرست تھیں۔ وہ آپ کو خالی نہیں بیٹھنے دیتی تھیں۔ آپ بڑی بی کا کپڑا بُن کر ایک طرف رکھ دیتے تھے اور اِدھر اُدھر نکل جاتے۔ بڑی بی کو اس جگہ سے کپڑا مل جاتا، وہ لے کر واپس چلی جاتیں، لیکن اُجرت کی ادائیگی کے لیے انہیں آپ کے پاس دوبارہ آنا پڑتا۔ اور یہ دوہری مشقت اُن کے لیے بڑی تکلیف دہ ہوتی۔

ایک دن بڑی بی اُجرت دینے آئیں تو آپ سے شکایتاً کہا: "خیر! تم کچھ ایسا انتظام کرو کہ مجھے اُجرت دینے کے لیے دوبارہ نہ آنا پڑے۔"

آپ نے فرمایا۔ "تمہارا گھر کہاں ہے؟ شاید دریا کے قریب ہے کہیں؟"

بڑی بی نے جواب دیا: "ہاں میں دریا کے قریب ہی رہتی ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ آئندہ جب آپ کپڑے لے کر جایا کریں تو اُن کی اُجرت دریا میں پھینک دیا کریں۔"

بڑی بی چونک کر کھڑی ہو گئیں اور بولیں: "کیا کہا، دریا میں پھینک دیا کروں تمہاری اُجرت؟"

آپ نے جواب دیا: "ہاں میں نے یہی کہا ہے جو آپ نے بالکل صحیح سُنا ہے۔"

بڑی بی نے پوچھا۔ "تمہاری اُجرت جب دریا میں پھینک دی جائے گی تو وہ تمہیں کس طرح ملے گی؟"

آپ نے فرمایا: "یہ سوچنا آپ کا کام نہیں ہے، میرا روزی رساں سوچے گا کہ تمہاری اُجرت میری پاس کس طرح پہنچے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی اُجرت مجھے مل جایا کرے گی۔"

بڑی بی کو آپ کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، لیکن جب آپ نے بڑی بی کو مجبور ہی کر دیا تو وہ یہ کہہ کر چلی گئیں: "تم کہتے ہو تو میں ایسا ہی کروں گی، لیکن مجھے اب بھی تمہاری اس بات پر یقین نہیں آ رہا کہ دریا میں پھینکی ہوئی اُجرت تمہیں مل جایا کرے گی۔"

آپ نے جواب دیا: "وہ میرا مسئلہ ہے، آپ میری اُجرت دریا میں پھینک دیں، وہ مجھے

ملے یا نہ ملے۔"

بڑی بی سوچتی ہوئی چلی گئیں کہ یہ کیا بات ہوئی۔

کئی دن بعد وہ آپ کے پاس بُنا ہوا کپڑا لینے آئیں۔ آپ موجود نہیں تھے۔ بڑی بی کپڑا لے کر چلی گئیں اور واپسی میں آپ کی اُجرت دریا میں پھینک دی۔

آپ حسبِ دستور دریا کے کنارے پہنچے تو مچھلیاں اسی طرح اچھل اچھل کر سطح آب پر آنے لگیں۔ آپ نے اپنے ساتھ لایا ہوا چورا دریا میں پھینک دیا اور پھر یہ عجیب و غریب منظر بھی دیکھنے میں آیا کہ آنے والی مچھلیوں میں سے کئی کے مُنہ میں بڑی بی کی پھینکی ہوئی اُجرت دبی ہوئی تھی اور وہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہی تھیں، آپ نے وہ اُجرت لی اور گھر چلے آئے۔

کئی دن بعد بڑی بی نے آپ کو بتایا کہ تمہاری اُجرت حسبِ ہدایت مَیں نے دریا میں ڈال دی تھی کیا وہ تمہیں مل گئی؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں وہ مجھے مل گئی۔"

بڑی بی کا مُنہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ شاید انہیں یقین نہیں آرہا تھا لیکن جب کئی دیکھنے والوں نے اس کی تصدیق کر دی تو بڑی بی آپ کی بے حد عزّت کرنے لگیں اور اب وہ آپ سے کام لینے میں شرم سی محسوس کرنے لگی تھیں۔

آپ اندر بیٹھے ہوئے تھے، آنکھیں بند تھیں اور کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یکایک تصور میں جنید بغدادیؒ اُبھرے اور آپ کو ایسا لگا جیسے وہ دروازے پر کھڑے ہیں۔ آپ نے اپنے ارادت مند سے کہا۔ "دروازے پر جنیدؒ میرا انتظار کر رہے ہیں۔"

ارادت مند کھڑا ہو گیا بولا "مَیں نے تو کوئی دستک نہیں سُنی۔"

آپ نے جواب دیا "وہ دستک نہیں دے رہے اور نہ دستک دیں گے، وہ دروازے پر کھڑے میرے جذب و مراقبے کا امتحان لے رہے ہیں۔"

ارادت مند نے عرض کیا "اگر آپ اجازت دیں تو مَیں باہر جا کے دیکھوں، اگر وہ موجود ہوں تو مَیں انہیں آپ کے پاس لاتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا "نہیں، مَیں دروازے پر خود جاؤں گا۔ جنیدؒ کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔"

آپ دروازے پر گئے، دروازہ کھولا، سامنے جنید بغدادیؒ کھڑے تھے وہ مُسکرائے اور پوچھا۔ "خیر، مَیں نے تو دستک بھی نہیں دی، پھر آپ کو کس طرح معلوم ہُوا کہ مَیں آیا ہوا ہوں؟"

آپ نے جواب دیا "میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا کہ میں نے دیکھا، آپ دروازے پر خواجش کھڑے ہیں۔

جنید بغدادی نے آپ کو گلے لگا لیا "خیر خیر ما (خیر ہمارے بہترین افراد میں ہیں)"

آپ سے کسی نے دریافت کیا "حضرت! آپ کے نزدیک فقیر کون ہے؟"

آپ نے جواب دیا "وہ شخص جو دولت کو مصیبت اور عزت کو راحت تصور کرے۔"

آپ سے پوچھا گیا "اللہ کا تازیانہ سے صوفیوں کی کیا مراد ہوتی ہے؟"

آپ نے فرمایا "خوفِ الٰہی۔ بندوں کے لیے ایک ایسا تازیانہ ہے جو بڑے بڑے گستاخوں کو راہِ راست پر لے آتا ہیں۔"

آپ نے کچھ لوگوں کو اس حال میں دیکھا کہ وہ اپنے اعمال کے اعتبار سے بہترین ہیں۔ مگر انہیں اپنے اعمال پر کوئی فخر نہیں ہے۔ ان میں سے ایک کی آپ سے ملاقات ہوگئی۔ لوگوں نے آپ کو بتایا کہ حضرت! یہ وہ شخص ہے جو بہترین اعمال رکھتا ہے، لیکن کبھی ان پر فخر نہیں کرتا۔"

آپ نے جواب دیا "ہاں بھلے انسان ایسے ہی ہوتے ہیں عامل کا اپنے عمل کو بے وقت سمجھنا ہی کمالِ عمل ہے۔"

آپ کے بارے میں کتابیں بتاتی ہیں کہ ایک سو بیس سال زندہ رہے اور آپ کا وصال ۳۲۲ھ میں ہوا۔ اس طرح آپ کا سن ولادت ۲۰۲ھ قرار پاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب آپ کا آخری وقت قریب آیا تو آپ کے کئی ارادت مند آپ کے قریب ہی موجود تھے۔ ان میں مشہور صوفی شیخ ابوالحسن مالکی بھی شامل تھے۔ شام کا وقت تھا شیخ ابوالحسن مالکی نے آپ سے پوچھا۔ "حضرت کیا حال ہے آپ کا؟"

آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔

آپ ایک بلند پایہ صوفی اور اعلیٰ انسان تھے اور ایک زمانے نے آپ کی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کی۔

حضرت سید جلال الدین حسین شاہ رح

خاندان میں بیٹا کیا پیدا ہوا گویا ہر طرف خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی گھر کا کوئی بھی فرد ایسا نہ تھا جو اس موقعہ پر شاداں فرماں نہ ہو۔ نومولود کے دادا سید قطب عالم کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ پوتے کی پیدائش کا سنتے ہی وہ دیوانہ وار گھر میں داخل ہوئے۔ ننھی جان کو اٹھا کر گلے سے لگایا اُس کی چاند سی جبیں پر بوسہ ثبت کیا اور خود ہی نومولود کے کان میں اذان دی۔

سید قطب عالم کے بیٹے محمود شاہ جو کہ نومولود کے والد تھے انھیں تو گویا بچّے کی صورت میں دونوں جہاں کی دولت میسر آگئی تھی۔ قطب عالم نے محمود شاہ کو تھپکی دیتے ہوئے کہا "بیٹے اللہ نے تمہیں جو فرزند عطا کیا ہے میں اُس میں اپنے خاندان کے بزرگ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی شبیہ دیکھ رہا ہوں، مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے مخدوم جہانیاں جہاں گشت دوبارہ اس دنیا میں تشریف لے آئے ہیں۔ یہ سُن کر شاہ محمود تو اور بھی خوشی سے نہال ہوگئے اور دل میں دُعا کی کہ اے اللہ میرے والد کی یہ پیش کوئی دُرست ثابت فرما۔

بہرکیف اس موقع پر نومولود کے دادا قطب عالم نے اپنی چادر اتاری اور اپنے فرزند شاہ محمود کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ اس سے تم اپنے بیٹے کا لباس تیار کراؤ کیونکہ اس دن کے لیے میں نے اس چادر کو سنبھال کر رکھ چھوڑا تھا۔ قطب عالم نے محمود شاہ سے یہ بھی کہا کہ وہ

اپنے پوتے کا نام جلال الدین حسین رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا نام بھی جلال الدین تھا ــــ اس تجویز پر بچے کا باپ بہت خوش ہوا۔

اُن کی پرورش نہایت ناز و نعم سے ہونے لگی۔ دادا قطب عالم کی طرح چچا شاہ عالم بھی ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ وہ اُن کی انگلی پکڑ کر اِدھر اُدھر ٹہلا کرتے تھے اور گود میں لے کر بہلایا کرتے تھے۔

ایک دن شاہ عالم نے انھیں اپنے سینے پر لٹا لیا اور انھیں بھینچ کر کہنے لگے: "جلال الدین! تُو ابھی بچہ ہے اور تجھے نہیں معلوم کہ میں نے اپنے سینے سے لگا کر تجھے کیا کچھ دے دیا ہے۔"

شاہ محمود بھی ایک طرف کھڑے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے، پوچھا: "بھائی شاہ عالم! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو؟"

شاہ عالم نے جواب دیا: "بھائی شاہ محمود! میں نے جو کچھ کہا وہ پیچیدہ نہیں ہے ذرا سا غور کر تو تیری سمجھ میں سب کچھ آجائے گا۔" اس کے بعد جلال الدین کو مخاطب کیا اور پوچھا: "جلال الدین! کیا بات ہے تم خوش تو ہو۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ اس گھر میں ہر ذی روح کی تسکین اور ....."

شاہ عالم باتیں کرتے کرتے ایک دم رُک گئے۔ اُن کے کان کسی آواز کو سننے اور سمجھنے کی کوشش میں مشغول تھے۔ پھر کچھ دیر بعد بچے سے کہا: "خوش ہو جاؤ جلال! جو کچھ مجھے ملا ہے وہ آج میں نے تمہیں بخش دیا۔"

بعد میں "خوش ہو جاؤ" "جیو" رہ گیا اور یہ لفظ نام کا لقب بن کر شیخ جیو بن گیا اور آپ شیخ جیو کہلانے لگے۔

آپ کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری حضرت قطب عالم، شاہ محمود اور شاہ عالم نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ علوم ظاہری کے ساتھ ہی علوم باطنی بھی اُن میں منتقل کیے جانے لگے۔

باہر بیل گاڑی تیار کھڑی تھی۔ شاہ محمود اور شاہ عالم کو کسی ضروری کام سے رسول آباد جانا تھا رسول آباد ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، کچھ دیر بعد دونوں بھائی گھر سے نکل کر بیل گاڑی میں بیٹھ گئے۔

گاڑی بان نے پوچھا: "حضرت! اندر سے کچھ اور آئے گا یا میں گاڑی ہانکوں؟"

شاہ عالم نے جواب دیا: "اندر سے کچھ بھی نہیں لینا۔ گاڑی ہانکو۔" گاڑی بان نے گاڑی ہانکی اور بیل گاڑی کو کھینچنے لگا۔

ننھے شاہ جلال ایک درخت کے تنے کے پیچھے چھپے کھڑے تھے۔ جب یہ گاڑی اُن کے پاس

سے گزری تو یہ تنے کی آڑ سے نکل کر گاڑی کے ساتھ دوڑنے لگے۔ گاڑی بان، شاہ عالم اور شاہ محمود کو اس بات کا علم کافی دیر تک نہیں ہو سکا۔ آخر گاڑی بان کو اس بات کا احساس ہوا کہ کوئی گاڑی کے ساتھ بھاگ رہا ہے، اس نے گاڑی روک دی۔

شاہ عالم نے پوچھا: "کیا بات ہے گاڑی بان! تو نے گاڑی کیوں روک دی؟"

گاڑی بان نے جواب دیا: "میاں جی! مجھے ایسا لگا جیسے کوئی گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا ہے۔"

شاہ عالم نے جواب میں کہا: "تب پھر نیچے اتر کر دیکھتے کیوں نہیں، کون بھاگ رہا ہے گاڑی کے ساتھ ساتھ۔"

گاڑی بان نیچے جو اترا تو محسن شاہ جلال کو دیکھ کر سہم گیا، پوچھا: "شیخ جیو جی! یہ آپ کو کیا سوجھی؟ کیا کہیں جا رہے ہیں؟"

شیخ جیو نے جواب دیا: "میں بھی وہیں جا رہا ہوں جہاں آپ جا رہے ہیں۔"

گاڑی بان نے کہا: "شیخ جیو جی! آپ کو کچھ پتا ہے کہ وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

شیخ جیو نے جواب دیا: "مجھے پتا نہیں کہ وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے۔ بس میرا کام تو یہ ہے کہ آپ کی گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہوں اور بس۔" گاڑی بان نے اپنا ہاتھ شیخ جیو کی طرف بڑھا دیا اور انھیں اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ گاڑی بان انھیں باپ اور چچا کے سامنے لے گیا تو دونوں ہی بے چین اور بے قرار ہو گئے۔

باپ نے پوچھا: "شیخ جیو! یہاں تم کہاں؟"

شاہ عالم نے کہا: "بھتیجے! یہ تم کیا کر رہے تھے؟ اگر کوئی اور تمہیں اس حال میں دیکھ لیتا تو کیا سوچتا تمہارے بارے میں۔"

شیخ جیو نے نہایت معصومیت سے جواب دیا: "وہ مجھ سے پوچھتا کہ ان دونوں کا کیا لگتا ہوں میں جواب دیتا ایک کا بیٹا، دوسرے کا بھتیجا۔"

شاہ عالم کو بھتیجے کی یہ بات بہت اچھی لگی، بولے: "شاباش بیٹے! تو نے بہت اچھا جواب دیا ہے مجھے، اس وقت میں بہت خوش ہوں۔"

گاڑی بان اپنی جگہ پر واپس جا چکا تھا، اس کو جلدی تھی، بولا: "صاحبان! ہمیں اور کتنی دیر یہاں رکنا ہے یا میں گاڑی چلا دوں؟"

شاہ عالم نے بھتیجے سے پوچھا: "شاہ جیو! آپ کا کیا خیال ہے۔ گاڑی رکواؤ گے یا پھر چلانے

کا حکم دو گے۔"

شاہ جیو نے جواب دیا: "میں آپ دونوں کے ساتھ چلوں گا۔"

باپ کو اُن سے اختلاف ہوا: "میں اتنی گندی حالت میں تمہیں ہرگز نہیں لے جاؤں گا۔"

لیکن چچا شاہ عالم نے بھتیجے کا ساتھ دیا: "بھائی صاحب! یہ کہاں گندا ہے ——— ——— میں اسے ضرور لے چلوں گا اپنے ساتھ۔" اس کے بعد گاڑی بان کو حکم دیا: "گاڑی بان! تجھ کو کس کا انتظار ہے؟ اپنا کام کر، گاڑی چلا۔"

شاہ عالم نے بھتیجے کو اپنی گود میں بٹھا لیا اور گاڑی دوبارہ چلنے لگی۔

راہ میں شاہ محمود نے اپنے بھائی سے پوچھا: "بھائی شاہ عالم! کیا یہ تمہیں بہت اچھا لگتا ہے؟"

شاہ عالم نے بھتیجے کو سینے سے چمٹا لیا۔ بولے: "ہاں بہت اچھا لگتا ہے۔"

شاہ محمود اپنی خوش قسمتی پر فخر سا محسوس کر رہے ہیں۔ پوچھا: "مگر کیوں؛ آخر اس میں کیا خاص بات ہے؟"

شاہ عالم نے جواب دیا: "بھائی! مجھے اپنا یہ بھتیجا بہت عزیز ہے جب تک یہ پیدا نہیں ہوا تھا، میں سوچا کرتا تھا کہ میرے بھائی کے گھر میں، بھائی کے بعد معرفت کی روشنی نہیں رہے گی۔ یہ احساس، یہ خیال مجھے بے حد افسردہ رکھتا تھا مگر جب سے میرا یہ بھتیجا، شاہ جلال پیدا ہوا ہے میں بے حد خوش ہوں۔ انشاء اللہ میرے والد اور میرے بھائی کے گھر میں اس ایک چراغ کی وجہ سے کئی چراغ روشن ہو جائیں گے اور ہمارے قبیلے میں تو معرفت کا چراغاں ہو جائے گا۔ اس چراغاں کی روشنی میں مخلوق کی کامیابی اور کامرانی کی راہ متعین ہو سکے گی۔"

شاہ محمود ان باتوں سے پھولے نہ سماتے تھے۔

شاہ جلال ان حالات اور پیارے پیارے خیالات میں پرورش پاتے رہے۔

جب آپ کی عمر تیس برس ہوئی تو آپ کو حضرت قطبِ عالم کی درگاہ کا سجادہ نشین مقرر کیا گیا۔ دادا کا وصال ہو چکا تھا۔ آپ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے بے تعلق تھے۔ ہر وقت یہی احساس انھیں آزردہ اور دل گرفتہ رکھتا کہ وہ اس دنیا میں چند سالوں کے لیے آئے ہیں۔ وہ کسی کا دل دکھانے میں بڑا دکھ محسوس کرتے تھے۔ اُن کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ وہ جس سے بھی ملیں اور جس کا بھی ان سے کوئی کام پڑے وہ اُن سے خوش ہو کر ہی جائے۔

آپ کا چرچا اور شہرہ اتنا زیادہ ہو چکا تھا کہ لوگ جوق در جوق آپ کی ملاقات کو آیا کرتے تھے۔

ایک روایتی خوشبو
دورِ جدید کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ!



بنارس ٹوبیکو کمپنی
پوسٹ بکس نمبر ۱۰۶۷ کراچی ۱۶
فون: 612622

marksman

بادشاہ کے دربار کے دو آدمی آپ کی شہرت سے متاثر ہو کر آپ کے پاس پہنچے۔ اُس وقت آپ اپنے گھر کی صفائی ستھرائی میں بُری طرح مشغول تھے۔ دونوں درباری آپ کے سامنے پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ آپ نے اُن کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔

دونوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: "جناب! یہ تو دنیاوی کاموں میں اتنا منہمک دکھائی دے رہے ہیں کہ....."

دوسرے نے بات کاٹ دی' بولا۔ "یار آہستہ بول۔ کہیں یہ سن نہ لیں ہماری بات۔"

پہلے نے اور زیادہ سرگوشی اختیار کی' بولا' بھائی! اپنی سمجھ میں تو یہ آئے نہیں۔"

دوسرے نے جواب دیا: "بھائی! کسی فقیر کے بارے میں ایسی بدگمانی مناسب نہیں ہے' یہ روشن ضمیر ہوتے ہیں اور کسی وقت بھی ہمارا بھانڈا پھوڑ سکتے ہیں۔"

پہلے نے کہا: "تم ڈرتے ہو تو ڈرو' لیکن میں ان سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں۔"

دوسرے نے جواب دیا: "بیشک جیسی تمہاری اپنی رائے ہو تم اس کے مطابق عمل کر سکتے ہو لیکن میں خود اس میں تمہارا ساتھی نہیں بن سکتا۔"

پہلے نے کہا: "اب تو خود ہی دیکھ لے' یہ کیسے صوفی اور کیسے روشن ضمیر ہیں کہ انھیں ہمارے آنے تک کی خبر نہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنے گھر کی صفائی ستھرائی میں یہ اتنے مشغول ہیں کہ ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کہ یہ خدا سے کس طرح رجوع ہوتے ہوں گے۔ یہ تو مجھے پکے دُنیا دار معلوم ہوتے ہیں۔"

یہ باتیں اس طرح کان میں کہی گئی تھیں کہ دوسرا کوئی سن ہی نہیں سکتا تھا مگر یہ شخص جیسے ہی اپنی بات پوری کر کے چُپ ہوا' آپ اُن دونوں سے مخاطب ہو گئے۔ آپ نے اُن سے پوچھا "ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے ابھی کچھ دیر پہلے۔ بھائی! میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ میں دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے دُور رہتا ہوں۔ میری ذمہ داری کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ مجھے اپنی ذمہ داریاں چاہے وہ دنیاوی ہوں یا دینی' پوری ذمہ دار اور دیانت سے انجام دینا پڑتی ہیں۔ یہ فقیر کسی وقت بھی یادِ الٰہی سے غافل نہیں رہتا۔ حالانکہ دنیا والے یہ سمجھتے ہیں کہ میں دنیا کے کام میں مشغول ہوں کہ مجھے کسی اور بات کا دھیان ہی نہیں رہتا۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ میں دنیا کے کاموں میں مشغول رہ کر بھی اپنے ربّ کی یاد میں ڈوبا رہتا ہوں۔ فقیر کو تجارت' کاروبار اور دنیا کے دیگر اُمور کسی صورت اور کسی حالت میں بھی یادِ الٰہی سے غافل نہیں رکھ سکتے۔"

وہ دونوں آپ کی باتیں سن کر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔

جو منکر تھا اس نے پوچھا: "حضرت! آپ نے جو کچھ فرمایا' چلیے میں اس کا یقین کر لوں گا

لیکن مَیں اپنے ضمیر کو کس طرح مطمئن کروں ؟"

آپ نے جواب دیا۔ "پوری دنیا کو مَیں مطمئن کر کے پاؤں گا کیا ؟ یہی : کیسی واہ واہ اور سبحان اللہ! مجھے اب ان دونوں کی حاجت نہیں۔"

پھر اچانک ہوا اور خلا میں ان دونوں نے دیکھا کہ وہاں آپ کا نام لکھا ہوا ہے۔ یہ نام دیر تک اپنی حالت میں قائم رہا۔ آپ نے فرمایا "اللہ اپنے بندوں کے نام اور ذکر کو بلند فرماتا ہے اور وہ جس کو چاہے سماعت، بصارت، عقل و شعور اور جذب و سوز عطا فرما دے اور جس سے چاہے سلب فرما لے۔ اُس دن سے ڈرو جب تم ان نعمتوں سے محروم کر دیے جاؤ۔ کیونکہ یہ بڑی محرومی اور سب سے زیادہ بدنصیبی ہے۔"

آپ کی ذرا سی تقریر نے اُن دونوں کی حالت متغیر کر دی، وہ آپ کے قدموں میں گر کر رونے لگے۔ جو منکر تھا اُس نے پاؤں پکڑ لیے اور روتے ہوئے کہا: حضرت! مَیں سوءِ ظن کا شکار ہو گیا تھا، خدارا مجھے معاف فرما دیں۔"

آپ نے فرمایا۔ "مَیں تجھے کیا معاف کروں گا۔ جب مَیں نے تیری کسی بات کا بُرا ہی نہیں مانا تو مَیں تجھے معافی کس بات کی دوں ؟"

لیکن وہ بضد رہا بولا۔ "نہیں، اس طرح نہیں بس، آپ ایک بار اپنی زبان سے فرما دیں کہ مَیں نے تجھے معاف کیا۔ مجھے قرار آجائے گا۔"

آپ نے اسے اپنے قدموں سے اُٹھا کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "جا مَیں نے تجھے معاف کیا آئندہ خیال رکھنا۔" وہ شخص کافی دیر تک آپ کے سامنے کھڑا آنسو بہاتا رہا۔

اُن دنوں گجرات پر مظفر شاہ دوم حکومت کر رہا تھا۔ اُسے آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ جب بھی اُدھر سے گزرتا، آپ کے پاس ضرور جاتا۔ احمد آباد کے جنوب مشرق میں بڑوہ نامی بستی میں آپ کا قیام تھا۔ بادشاہ مظفر شاہ، احمد آباد جا رہا تھا جب وہ بڑوہ سے گزرا تو اسے حضرت قطب عالم یاد آ گئے اس نے بڑوہ میں اپنا گھوڑا روک لیا۔ حضرت قطبِ عالم کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور آگے بڑھ گیا۔ آپ کو بادشاہ کی آمد اور واپسی کا علم ہوا مگر آپ نے جب یہ دیکھا کہ بادشاہ نے آپ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا ہے تو آپ نے بھی اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔

کچھ دنوں کے بعد بادشاہ بیمار پڑ گیا۔ بیماری نے طول کھینچا اور اطبا کی کوششیں بار آور نہ

ہو میں تو وہ سر کھیچ چلا گیا اور وہاں شیخ احمد کھٹو کے مزار پر حاضری دی۔ فاتحہ پڑھ کر صحت یابی کی دعائیں مانگتا رہا۔ رات یہیں مزار پر گزاری، معلوم نہیں اس نے اپنے بارے میں کس طرح اور کیا سوچا کہ اسی عالم میں اُسے نیند آگئی اور اس نے خواب میں حضرت قطب عالم کو خفا خفا اور کھنچا کھنچا محسوس کیا۔

خواب ہی میں بادشاہ نے حضرت قطب عالم کی خدمت میں ہدیۂ فاتحہ پیش کیا۔ بادشاہ نے پوچھا: "حضرت! آپ مجھ سے کشیدہ کشیدہ کیوں ہیں؟"

حضرت قطب عالم نے جواب دیا: "اے مظفر! کیا بات ہے تو نے اپنے باپ دادا کے قانون کو کیوں توڑ دیا؟ تو ہمارے گھر کیوں نہیں آتا؟"

بادشاہ نے کہا: "مجھے آپ کے جس گھر کا علم ہے وہاں میں حاضر تو ہو جاؤں گا یعنی بڑوہ میں آپ کے مزار پر۔"

حضرت قطب عالم نے جواب دیا: "نہیں میرا گھر وہ نہیں ہے۔ میرا گھر تو شیخ جیو کا گھر ہے بڑوہ میں۔ جو شیخ جیو کے گھر جائے گا وہ گویا میرے گھر جائے گا۔ شیخ جیو میرا پوتا ہی نہیں، میرا سجادہ نشین، میرا سب کچھ ہے۔"

بادشاہ نے جواب دیا: "اب میں ضرور حاضری دوں گا اور اس سلسلے میں مجھ سے جو بھول چوک ہوگئی ہے میں اُس کی معافی چاہتا ہوں، امید ہے آپ مجھے ضرور معاف فرما دیں گے۔"

قطب عالم نے فرمایا: "جا تجھے مژدہ ہو کہ تو جلد ہی صحت یاب ہو جائے گا۔"

بادشاہ نے بیدار ہونے کے بعد ایک بار پھر فاتحہ پڑھی اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔

دوسری طرف بڑوہ میں شیخ جیو کو خواب میں حضرت قطب عالم نے مطلع فرمایا: "جیو بیٹے! میں نے بادشاہ مظفر شاہ کو تیرے پاس بھیج دیا ہے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر صحت یابی کی دعا کر دینا، اللہ نے چاہا تو بادشاہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

بادشاہ بڑوہ پہنچا اور وہاں قطب عالم کے مزار پر حاضری دی۔ فاتحہ پڑھی اور پالکی کھڑے ہو کر عرض کیا: "حضرت! میں بڑوہ میں آگیا ہوں اور اب یہاں سے آپ کے گھر جاؤں گا یعنی شیخ جیو کے گھر۔"

بادشاہ یہاں سے سیدھا شیخ جیو کے گھر پہنچا۔ شیخ جیو باہر نکل کر بادشاہ کا استقبال کرنے لگے۔ بادشاہ آپ کے گلے لگ گیا۔ شیخ جیو نے بادشاہ کے سیدھے کاندھے پر سر رکھ کر کہا: "حضرت قطب عالم نے جس طرح بادشاہ کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ مجھ سے ملے اسی طرح مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سلطان

آرہا ہے میں اس سے ملوں۔"

شیخ جیو نے بادشاہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا۔ "بادشاہ تو بہت جلد صحت یاب ہو جائے گا۔"

بادشاہ آپ کے پاس کچھ دیر بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ شیخ جیو نے اُسے ہدایتیں کیں کہ مخلوق کو زبردستوں کے ظلم و ستم سے بچائے اور یہ کہ حکومتیں، عدل و انصاف کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہیں۔ بادشاہ نے وعدہ کیا کہ وہ آپ کی ہدایت پر پوری مستعدی اور دیانت داری سے عمل کرے گا۔ مملکت میں عدل و انصاف کو فروغ دے گا۔

سلطان مظفر اچھا تو ہو گیا مگر ایک وہم کا شکار ہو گیا۔ وہ وضو کرنے بیٹھا تو بس وضو کیے چلا گیا۔ بالٹیاں خالی ہوتی چلی گئیں، لیکن بادشاہ کا وضو ختم نہیں ہوا۔ وزرا اور دوسرے اعلیٰ عہدیدار بادشاہ کے اس وہم سے عاجز آئے ہوئے تھے۔ جب وہ بادشاہ کو اُس سے روکتے تو وہ کہتا۔ "یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ میں غلط کر رہا ہوں۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ دورانِ وضو مجھ سے کسی قسم کا سہو ہو گیا ہے تو میں دوبارہ وضو شروع کر دیتا ہوں۔"

وزیر نے عرض کیا۔ "حضورِ والا، پانی کا زیاں مناسب نہیں ہے، کہتے ہیں روزِ قیامت اس کا بھی حساب کتاب ہو گا۔"

بادشاہ نے جواب دیا: "وہ تو ٹھیک ہے لیکن وضو کے بغیر نماز بھی تو نہیں ہوتی۔"

وزیر نے کہا۔ "حضورِ والا! مذہبی امور اور اس قسم کے معاملات میں میرے ذاتی خیال کے مطابق علمائے کرام سے مشورہ لینا زیادہ مناسب ہے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "تب پھر تمہیں علمائے کرام کو بلوا لینا چاہیے تاکہ میں اُن سے مشورہ کر لوں۔"

وزیر نے گجرات کے نامی گرامی علما کو دربار میں طلب کر لیا۔ بادشاہ نے ان سب کو مخاطب کر کے پوچھا۔ "حضرات! کچھ عرصے سے میں بڑی پریشانی میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ میں وضو کرتا ہوں تو بس پانی بہائے چلا جاتا ہوں اور مطمئن نہیں ہوتا کہ میرا وضو ہوا بھی نہیں۔"

علما نے متفقہ فیصلہ کر دیا۔ "وضو میں زیادہ پانی بہانا پانی کا زیاں ہے۔"

سلطان نے پوچھا: "کم پانی سے وضو کر کے میں خود شک و شبے میں رہتا ہوں اس کا کیا کروں؟"

ایک عالم نے جواب دیا۔ "آپ اپنے شک و شبے پر قابو پائیں۔ بس یہی حل ہے اس کا۔"

سلطان نے اصرار کیا۔ "مگر میں اس پر قابو پاؤں کس طرح؟ یہ تو بتائیں آپ حضرات۔"

دوسرے عالم نے کہا۔ "اپنے ارادے کی قوت کو کام میں لائیں۔"

سلطان کو غصہ آ رہا تھا، وہ زیادہ تند و تیز لہجے میں بولا۔ "وہی تو میں پوچھتا ہوں کہ کس طرح؟"

علماُ عاجز آچکے تھے، کسی تیسرے نے جواب دیا۔ "حضور والا! کس طرح کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے بس آپ خود ہی کوشش کریں۔ شاید کامیاب ہو جائیں۔"

سلطان نے علماء کو رخصت کر دیا اور اس بار ایک بار پھر شیخ جیو کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔

جب سلطان شیخ جیو کے در پر پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شیخ جیو سلطان کے استقبال کے لیے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ شیخ جیو نے سلطان کو سینے سے لگا لیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "خدایا! یہ سلطان مظفر شاہ تیرے اس ناچیز بندے کے پاس بڑی امیدیں لے کر آتا ہے اس پر رحم فرما۔ جو کچھ اس میں زیادہ ہے اسے دُور فرما دے اور اس کے مزاج، عقل اور شعور میں اعتدال پیدا فرما دے۔"

سلطان کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز اس سے چھینی جا رہی ہے۔

آپ نے سلطان سے پوچھا: "مظفر شاہ! میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ تُو خود کو میزان میں رکھ۔"

سلطان کا دل بھر آیا بولا: "قبلہ! میں سلطان ہوں، گجرات کا بادشاہ ہوں۔ اس وقت میرے آس پاس میرے ملازمین اور خدمت گزاروں کی فوج تعینات ہے۔ آپ اُن کے سامنے مجھے مظفر شاہ کہہ کر مخاطب فرما رہے ہیں۔ اس طرح میں ان کی نظروں میں ہلکا ہو جاؤں گا۔"

شیخ جیو نے جواب دیا۔ "مظفر شاہ! یہاں تُو سلطان کی حیثیت سے نہیں آیا۔ اگر تجھے اپنی سلطانی کا زعم یا خیال ہوتا تو تُو یہاں ہرگز نہ آتا۔ اور اگر میں تجھ کو تیرے نام سے مخاطب کر رہا ہوں تو تجھے یقین ہونا چاہیے کہ اس کے مضر اثرات نہیں ہوں گے۔"

سلطان لاجواب ہو کر چپ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اسے خیال آیا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ اُس نے آپ سے کہا: "حضور! آپ تو واقف ہی ہیں، میں آپ کے پاس کیوں آیا ہوں۔ آپ خدا سے دعا کیجیے کہ وہ مجھے اس عذاب سے نجات دلا دے۔"

شیخ جیو نے فرمایا: "کون کہتا ہے کہ تجھ کو وہم ہو گیا ہے؟"

شیخ جیو نے اپنے خادم کو حکم دیا "جا، بادشاہ کے وضو کے لیے پانی لے آ تاکہ میں بھی دیکھوں کہ بادشاہ کس وہم کا شکار ہو گیا ہے۔"

خادم مٹی کے بدھنے میں پانی لے آیا۔ آپ نے سلطان کو حکم دیا: "پانی موجود ہے، وضو کر لیں۔"

سلطان وضو کرنے لگا اور اسی بدھنے کے پانی سے وضو کرنے کے بعد بادشاہ نے پوچھا: "حضور! نماز کے لیے یہیں جماعت کھڑی ہو گی یا مسجد چلیں؟"

شیخ جیو نے جواب دیا: "ہم سب مسجد چلیں گے۔" پھر پوچھا "مظفر شاہ! تیرا وضو ہو گیا یا اور پانی

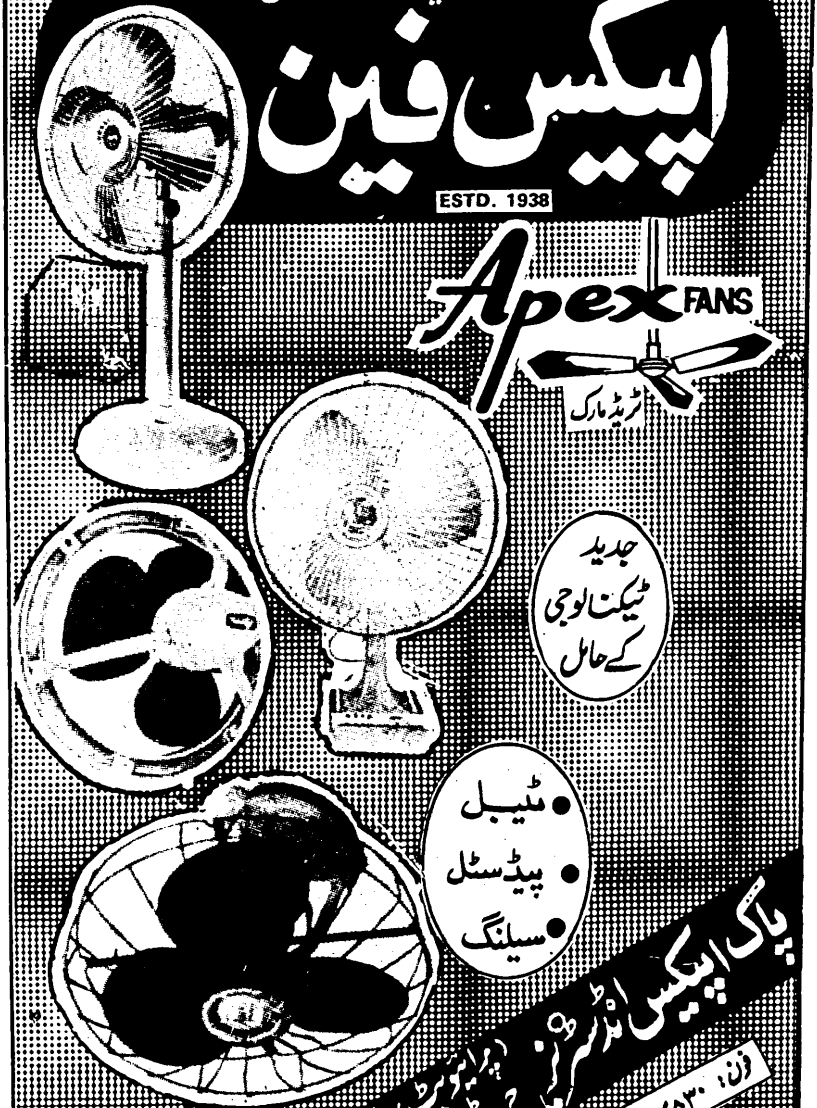
اعلیٰ معیار کے حامل

اپیکس فین

ESTD. 1938

Apex FANS

ٹریڈ مارک



جدید
ٹیکنالوجی
کے حامل

- ٹیبل
- پیڈسٹل
- سیلنگ

پاک اپیکس انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

کراچی ڈویلپمنٹ ایکسپورٹ ٹریڈنگ

فون: ۴۸۳۰ - ۴۸۰۳

منگوایا جائے؟"

سلطان نے کہا: "بس اتنا ہی کافی تھا۔ مزید کی ضرورت نہیں۔"

آپ نے پوچھا: "وہ وہم کہاں چلا گیا نیرا؟"

سلطان حیران تھا کہ واقعی اس کا وہم دُور ہو چکا ہے۔ اس نے جواب دیا: "میں خود حیران ہوں کہ میرا وہم کہاں چلا گیا۔ اب تو میں کچھ بھی نہیں محسوس کر رہا۔"

آپ نے سلطان کو مسجد میں لے جا کر ظہر پڑھوائی اور دعائیں دے کر اسے رخصت کر دیا۔

بادشاہ اکثر کہا کرتا: "دوائیں یا نفسی کیفیات کو بدلنے کے حکیمانہ طریقے بیکار ہیں۔ بس کسی بزرگ کی نظر ہی کافی ہوتی ہے۔"

سلطان مظفر کے ساتھ دو بار جو واقعہ پیش آیا تھا، اس کا محل بھر میں بڑا چرچا تھا۔ سلطان کی دو بیویاں زیادہ چہیتی اور با اختیار تھیں۔ پہلی بیوی کا ایک لڑکا تھا جس کا نام سکندر تھا اور دوسری بیوی سے جو لڑکا تھا اس کا نام بہادر خان تھا۔ بہادر خان شیخ جیو کی خدمت میں رہا کرتا تھا۔

دونوں بیویاں ہر وقت اس چکر میں رہتیں کہ کسی طرح اُن کا بیٹا برسرِ اقتدار آجائے۔

ایک دن سلطان کی پہلی بیوی نے سلطان سے پوچھا: "کیا یہ درست ہے کہ شیخ جیو جو کچھ فرماتے ہیں وہ ہو جاتا ہے؟"

سلطان نے جواب دیا: "نہیں، میں نے یہ بات تو کبھی بھی نہیں کہی۔ ہاں میں نے یہ ضرور کہا ہے کہ وہ مستجاب الدعوات ہیں۔ اُن کی دعائیں بہت جلد قبول ہو جاتی ہیں۔"

بیوی نے کہا: "چلو یہی سہی تو آپ یوں کیجئے کہ ایک بار میرے کہنے سے شیخ جیو کی خدمت میں چلے جائیے، اپنے ساتھ سکندر کو بھی لیتے جائیے اور شیخ جیو سے کہیے کہ وہ سکندر کے حق میں دعا فرمائیں کہ یہ مستقبل میں گجرات کا بادشاہ ہو جائے۔"

سلطان نے جواب دیا: "تم کہتی ہو تو میں چلا جاؤں گا ورنہ یہ کھیل مقدرات کے ہیں۔ اگر سکندر کی قسمت میں بادشاہ ہونا لکھ دیا گیا ہے تو یہ بادشاہ ہو کر رہے گا اسے کوئی روک نہیں سکتا اور اگر قسامِ ازل نے اسے بادشاہ نہیں بنایا ہے تو یہ کسی بھی طرح بادشاہ نہیں بن سکتا۔"

سلطان کی پہلی بیوی نے اصرار کیا: "آپ میری بات تو مانتے ہی نہیں۔ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں، آپ اس پر عمل تو کریں۔"

سلطان مجبور ہو گیا اس نے کہا۔ "اچھا نیک بخت! تیری مرضی۔ تُو جو کچھ کہہ رہی ہے میں اسی پر عمل کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔"

سلطان اپنے بیٹے سکندر کو ساتھ لے کر آپ کے پاس پہنچا۔ اس بار آپ سلطان کے استقبال کو باہر نہیں نکلے، اندر ہی بیٹھے رہے۔ سلطان نے آپ کو اپنی آمد کی اطلاع دی تو آپ نے حکم دیا "سلطان کو اندر لایا جائے۔"

سلطان اندر گیا، سکندر اُس کے ساتھ تھا۔

آپ نے پوچھا: "مظفر شاہ! خیریت تو ہے، فقیر سے کوئی کام؟"

سلطان نے اپنی بیوی کی خواہش کا اظہار کیا اور سکندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "حضور اس کے حق میں دُعا فرما دیں کہ میرے بعد گجرات کا یہ بادشاہ بن جائے۔"

آپ نے فرمایا: "اس میں دُعا کی کیا ضرورت، تُو بادشاہ ہے جس کو چاہے نامزد کر دے۔"

سلطان نے جواب دیا: "بجا ارشاد لیکن حضورِ والا! محض میرا نامزد کر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ سلاطین اور ملوک کی تاریخیں ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں کہ انھوں نے نامزد تو کسی کو کیا تھا اور [illegible] کسی اور کو مل گئی۔"

شیخ جیو نے سکندر کی طرف دیکھ کر فرمایا: "ادھر میرے بائیں طرف بیٹھ جا" اور بادشاہ سے پوچھا: "تیری دوسری بیوی کا بیٹا کہاں ہے؟ وہ بہادر خاں۔ ذرا اس کو بھی بلوانا میرے پاس۔"

سلطان نے جواب دیا: "حضورِ والا! میرا خیال ہے کہ میرا بیٹا بہادر خان آپ کا وفادار اور معتقد ہے آپ تو اس سے بے حد خوش رہتے ہیں۔"

شیخ جیو نے کوئی جواب نہ دیا۔

اسی دوران بادشاہ کا دوسرا بیٹا بہادر خان بھی آ گیا۔ آپ نے اس کو دیکھتے ہی آواز دی۔ "سلطان بہادر! تم کہاں چلے گئے تھے۔ دیکھو تمہارے پدرِ بزرگوار آئے ہیں۔"

بہادر خان آپ کے داہنی طرف بیٹھ گیا۔

بادشاہ نے پوچھا: "حضور اگر اجازت دیں تو میں ایک سوال کروں؟"

آپ نے اجازت دے دی۔

سلطان نے پوچھا: "میرے دوسرے بیٹے کا نام بہادر خان ہے مگر میں نے بغور سنا، آپ نے اسے سلطان بہادر کہہ کر مخاطب فرمایا ہے۔ کیا یہ دُعا ہے بہادر خان کے حق میں؟"

آپ نے جواب دیا: "تُو اگر پسند کرے تو۔ ورنہ ہو گا وہی جو مشیتِ ایزدی کو منظور ہو گا۔"

سلطان نے پوچھا۔ "مشیتِ ایزدی کو کیا منظور ہے، کچھ آپ بتا سکتے ہیں؟"
آپ نے جواب دیا: "میں کیا بتاؤں گا؟ میں کوئی خدا ہوں، توبہ نعوذ باللہ۔"
سلطان نے خوشامد شروع کر دی۔ "حضور والا! میں محل میں کیا منہ دکھاؤں گا کچھ تو رحم فرمائیں۔"
آپ نے جواب دیا: "فضول باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔"
جب سلطان نے یہ دیکھا کہ اس کی ہر بات خالی جا رہی ہے تو وہ سکندر کے ساتھ محل واپس چلا گیا۔
سلطان کی بیوی بڑی بے چینی سے بادشاہ اور اُس کے بیٹے کا انتظار کر رہی تھی۔ بادشاہ جیسے ہی محل میں داخل ہوا سلطان کی پہلی بیوی نے اس کا راستہ روک کر پوچھا: "آپ کیا خبر لائے ہیں؟"
سلطان نے پوری روداد سنا دی اور کہا: "بس میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ شیخ جیو نے بہادر خان کو سلطان بہادر کہہ کر کیوں بلایا؟"
بیوی نے کہا: "کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ میں کہتی ہوں آپ شیخ جیو کے پاس ایک بار اور جائیں۔"
سلطان نے جواب دیا: "وہاں دوبارہ جانے میں ہرج تو کوئی نہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ ناراض ہو کر کوئی ایسی بات نہ کہہ گزریں جو سکندر کے خلاف ہو۔"
بیوی نے اصرار کیا: "جب آپ شیخ جیو کو سکندر کے حق میں دُعا کرنے پر مجبور کر دیں گے تو وہ سکندر کے خلاف کوئی بات کیوں کریں گے؟"
سلطان اپنی بیوی کے اصرار سے عاجز آیا ہوا تھا، اس نے کہا: "ملکہ تم نہیں جانتیں، بہادر خان، شیخ جیو کی خدمت میں حاضر رہتا ہے اور سکندر کو مجھے اپنے ساتھ لے جانا پڑتا ہے کیا یہ کوئی بات ہی نہیں؟"
ملکہ نے اپنی ضد جاری رکھی۔ بولی: "آخر آپ بھی تو سلطان ہیں کیا شیخ، سلطان سے زیادہ اُس کے بیٹے بہادر خان کا خیال کریں گے؟ آپ دوبارہ انھیں مجبور تو کریں۔"
ملکہ کے دباؤ میں آکر سلطان دوبارہ شیخ جیو کی خدمت میں پہنچا۔ آپ نے اپنے کسی مرید سے کہا: "جاؤ سلطان بہادر کو بلا لاؤ۔ کہو تمہارے والد آئے ہوئے ہیں۔"
سلطان نے عرض کیا: "حضور! میں اپنے بیٹے سکندر کی خاطر حاضر ہوا ہوں، آپ اس کے حق میں دُعا فرمائیے کہ میرے بعد یہ گجرات کا بادشاہ ہو جائے۔"
آپ نے جواب دیا: "مظفر شاہ! بادشاہ تو تم بناؤ گے، میں کیا دُعا کروں۔ میرے پاس تو سلطان

بہادر موجود ہے۔ میں اگر دُعا ہی کروں گا تو اُس کے حق میں کروں گا جو اس کا ہر طرح اہل اور مستحق ہو گا۔"

سلطان اپنا سا منہ لے کر واپس آگیا اور ملکہ سے کہا۔ "تُو نے یہ دوسری بار مجھے شرمندہ کروایا ہے۔"

ملکہ نے جزبز ہو کر کہا۔ "یہ شیخ جیو کو آخر ہو کیا گیا ہے جو وہ سلطان کی حیثیت کو نظر انداز کر کے ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ انھیں یہ تو معلوم ہو گا کہ بادشاہ کے اختیارات بھی تو کوئی چیز ہیں۔"

سلطان نے ملکہ کی ایما پر یہ اعلان کر دیا کہ اس کے بعد اس کا بیٹا سکندر اس کا جانشین ہو گا۔

جب اس اعلان کی خبر حضرت شیخ جیو کے پاس پہنچی تو انھوں نے بہادر خان کو بلوایا اور اپنے مُریدوں کے سامنے اُسے کھڑا کر دیا۔ پوچھا۔ "لوگو! اس نوجوان کو دیکھو اور بتاؤ یہ کون ہے؟"

مریدوں نے جواب دیا۔ "یہ بہادر خان ہے مظفر شاہ کا بیٹا بہادر خاں۔"

آپ نے فرمایا۔ "نہیں۔ یہ تو اس کا معمولی تعارف ہے۔ یہ گجرات کا بادشاہ بہادر شاہ ہے۔"

مُریدوں نے بہادر خان کے احترام میں اپنے سر جھکا دیے۔

شیخ جیو کے دربار میں جو کچھ ہوا تھا اس نے شہرت پائی اور یہ خبر ملکہ کے کانوں تک پہنچی تو وہ بہت پریشان ہوئی اور اس نے ایک بار پھر سلطان مظفر کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔

بادشاہ نے کہا۔ "شیخ جیو جو کچھ کہتے ہیں میں انھیں اس سے کس طرح روک سکتا ہوں؟"

ملکہ نے کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتی آپ ایک بار پھر وہاں جائیں اور سکندر کا ہاتھ شیخ جیو کے ہاتھ میں دے کر انھیں مجبور کریں کہ وہ سکندر کی بادشاہت کا اعلان کر دیں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "اتنا بڑا قدم میں کس طرح اُٹھا سکتا ہوں۔ میں شیخ جیو کو کس طرح مجبور کرونگا۔"

ملکہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ "آپ کو یہ کام تو کرنا ہی پڑے گا، میں کچھ نہیں جانتی۔"

بادشاہ ایک بار پھر مجبور ہو گیا۔ اس نے سکندر کو ساتھ لیا اور شیخ جیو کی خدمت میں پہنچ گیا۔

اس دن وہاں بہت زیادہ بھیڑ تھی۔ بادشاہ بھی اس ہجوم میں شامل ہو گیا۔ بادشاہ کو جو جگہ بیٹھنے کے لیے دی گئی تھی، وہاں بھی شیخ جیو کے مُرید اور ارادت مند بیٹھے ہوئے تھے۔

سکندر بادشاہ کے داہنی طرف بیٹھا تھا مگر معلوم نہیں اسے کیا خیال آیا کہ وہ اُٹھ کر کسی اور طرف چلا گیا اور اس کی جگہ بہادر خان بیٹھ گیا لیکن سکندر کے اٹھنے اور بہادر خان کے بیٹھنے

کی خبر بادشاہ کو ذرا بھی نہ ہوئی۔

یہ رات کا وقت تھا اس وقت خانقاہ میں کم کم روشنی ہو رہی تھی۔

شیخ جیو، ہجوم کو چیرتے ہوئے بادشاہ کے پاس پہنچے اور پوچھا: "مظفر شاہ! اب تُو کیوں آیا ہے؟"

بادشاہ نے بے خبری میں بہادر خان کا ہاتھ شیخ جیو کے ہاتھ میں دے دیا اور درخواست کی: "حضور! اس شہزادے کے حق میں دُعا کر دیجئے کہ میرے بعد یہ بادشاہ ہو جائے۔"

شیخ جیو نے دُعا کی۔ "خداوندا! میرے ہاتھ میں جس کا ہاتھ ہے تو اسے مظفر شاہ کے بعد تاج و تخت کا مالک بنا دے۔"

بادشاہ اس اعلان سے بے حد خوش ہوا۔

شہزادہ بہادر خان نے قدرے جھک کر بادشاہ کا شکریہ ادا کیا، بولا: "باوا جان! مَیں کس زبان سے آپ کی اس نوازش کا شکریہ ادا کروں۔"

بادشاہ اس آواز سے پریشان ہو گیا۔ پوچھا: "بہادر خان! یہ تُو ہے؟ یہ سکندر کہاں چلا گیا؟ اور تُو کدھر سے آ گیا؟"

اسی وقت سکندر واپس آ گیا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: "یہ تو بغیر بتائے کہاں چلا گیا تھا؟"

سکندر نے جواب دیا: "یہاں چند شناسا چہرے نظر آ گئے تھے، ان کے پاس چلا گیا تھا۔"

بادشاہ نے افسوس کرتے ہوئے کہا: "افسوس کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔ جو چیز کسی کی قسمت ہی میں نہ ہو، وہ اسے کس طرح دی جا سکتی ہے۔ مَیں نے تو بہت کوشش کی کہ اپنا تاج اور تخت تجھے دے دوں لیکن مَیں ہار گیا۔"

شیخ جیو نے پوچھا: "سلطان پریشان کیوں ہے؟"

بادشاہ نے کہا: "حضرت! مَیں یہاں سکندر کی بادشاہت کے لیے آیا تھا لیکن غلطی سے بہادر خان کا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے دیا۔"

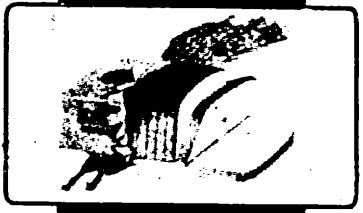
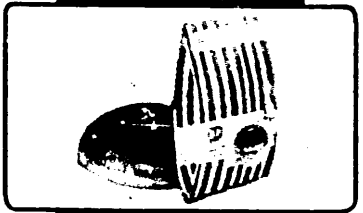
شیخ جیو نے فرمایا: "تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ سکندر بھی بادشاہ بن جائے گا۔ گو چند ماہ کے لیے ہی سہی۔"

بادشاہ، سکندر کو لے کر محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں سکندر نے باپ سے کہا: "باوا جان! یہ شیخ جیو کیسے آدمی ہیں جو آپ کی بات مانتے ہی نہیں۔ مَیں نے تو یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر مَیں بادشاہ بن گیا تو شیخ جیو کو وہ سزا دوں گا کہ وہ

عازمینِ حج و
عمرہ کیلئے
احرام کے تولئے
اور
تحفہ میں دینے کیلئے
خوشنما
جاءِ نماز
ریشمی ۔ مخملی ۔ سُوتی
حاضر اسٹاک سے
دستیاب ہے۔
شفیق سنز
کلفٹن روڈ
نزد PBS پمپ
101 بوہری بازار
صدر، کراچی
فون: 53 91 01-51 23 45-51 51 01
marksman

بی ۔ پی


کھانے میں عمدہ

صحّت کے لیے مفید

A MARK OF QUALITY
B.P

زندگی بھر یاد رکھیں گے۔"

بادشاہ نے اسے منع کیا۔" نہیں ایسی بات تو تم سوچنا بھی نہیں۔ وہ عارفِ کامل اور خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ وہ وہی کہتے ہیں جو مشیّتِ ایزدی ہوتی ہے۔"

شہزادہ سکندر نے جواب دیا۔" جب یہ بات طے ہو چکی ہے کہ آپ مجھے نامزد کریں گے اور مَیں بادشاہ بن جاؤں گا تو شیخ جیو فضول باتیں کیوں کرتے ہیں؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔" بیٹے! شیخ کی باتوں کو فضول نہ کہو، وہ ناراض ہو جائیں گے اور اس کا نقصان تجھی کو اٹھانا پڑے گا۔"

محل میں داخل ہوتے ہی ملکہ کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ بادشاہ نے ملکہ کو اصل بات نہیں بتائی، بس یہ کہا۔" مَیں کسی کی دعا نہیں چاہتا مَیں بادشاہ ہوں، جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ مَیں سکندر کو بادشاہ بنا سکتا ہوں اس لیے مَیں آج ہی اعلان کیے دیتا ہوں کہ سکندر میرا جانشین اور مستقبل کا بادشاہ ہے۔ مَیں سکندر کو اپنا ولی عہد بناتا ہوں۔

درباردار اور خوشامدی امرا نے فرطِ خوشی میں تالیاں بجائیں۔

جب بہادر خان کو یہ خبر ملی تو وہ بہت پریشان ہوا۔ وہ بولا تو کچھ نہیں مگر اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ گجرات میں نہیں رہے گا۔

بہادر خان کو بادشاہ کی طرف سے جو کچھ مل رہا تھا وہ ناکافی تھا۔ ایک دن اُس نے بادشاہ سے درخواست کی۔" باوا جان! مجھے آپ کی طرف سے جو کچھ ملتا ہے، اب وہ ناکافی محسوس ہوتا ہے اس لیے میری یہ مؤدبانہ درخواست ہے کہ اس میں کچھ اضافہ فرما دیا جائے۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔" سردست ایسا نہیں ہو سکتا یہ ناممکن ہے۔"

بہادر خان کو اس جواب نے ہلا کر رکھ دیا، وہ بولا تو کچھ بھی نہیں مگر فیصلہ کر لیا کہ اب وہ دہلی چلا جائے گا۔

چنانچہ وہ دہلی چلا گیا۔ بادشاہ کو جب یہ خبر ملی تو وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ لیکن بیٹا دہلی جا چکا تھا اور سلطان مظفر اسے واپس لانے پر قادر نہیں تھا۔

شیخ جیو کو جب یہ بتایا گیا کہ بادشاہ نے سکندر کو اپنا جانشین قرار دیا ہے اور بہادر خان دہلی چلا گیا ہے تو آپ نے جواب دیا۔" بادشاہ جو کچھ کر سکتا ہے کرے گا لیکن مشیّت ایزدی پر وہ قادر نہیں۔"

اب بادشاہ بیالیس سال کا ہو چکا تھا۔ بادشاہ بیمار پڑ گیا۔ شاہی اطبا نے علاج شروع کر دیا۔

لیکن مرض اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ان حالات میں ــــــــــ مظفر شاہ کو بہادر خان بہت یاد آیا۔

کسی امیر نے پوچھا: "حضور کو ان حالات میں کوئی خاص ہدایت فرمانی ہے؟"

بادشاہ نے کراہتے ہوئے پوچھا: "بہادر خان کی کوئی خبر ملی؟"

امراء نے جواب دیا: "نہیں۔"

بادشاہ نے شیخ جیو کے پاس درخواست بھیجی: "آج بہادر خان میرے پاس نہیں ہے تو مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میں اُس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ آپ اس کے حق میں دُعا فرمائیں کہ خدا اُسے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔"

شیخ جیو نے جواب میں کہلا دیا۔ بادشاہ! انسان ہے طاقت کے زعم اور خواتین کے اصرار نے اسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔ بارے خوشی ہوئی کہ بیماری اور مجبوری نے بادشاہ میں عاجزی پیدا کر دی ہے۔ بہادر خان کی بابت صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ مشیتِ ایزدی پوری ہو کر رہے گی۔"

بادشاہ، بیٹے کے غم میں لاغر ہوتا چلا گیا اور اسی عالم میں انتقال ہو گیا۔

بادشاہ کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا سکندر، گجرات کا بادشاہ بن گیا۔ تاج و تخت سنبھالتے ہی سکندر نے پہلا کام یہ کیا کہ بڑوہ کا سفر اختیار کیا اور حضرت قطب عالم کے مزار پر حاضری دی۔ یہاں کسی نے بتایا کہ شیخ جیو حسبِ سابق یہی کہہ رہے ہیں کہ گجرات کی بادشاہت بہادر خان کا مقدر ہے۔"

سکندر کو بے حد غصہ آیا اور اس نے شیخ جیو کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا: "کوئی شیخ جیو کے پاس جائے اور اس سے کہہ دے کہ کہاں گئی آپ کی وہ پیشن گوئی اور کہاں ہے آپ کا منظورِ نظر بہادر خان، میں گجرات کا بادشاہ ہوں اور بہادر خان، دہلی کے بابر لودھیوں کی طرف سے مغلوں سے جنگ کرتا پھر رہا ہے، خوار و زبوں۔ کیا اسی کو بادشاہت کہتے ہیں؟"

آپ نے جواب میں کہلوا دیا: "سکندر سے کہہ دو کہ میں رہوں یا نہ رہوں لیکن مشیتِ ایزدی پوری ہو کر رہے گی۔"

آپ نے جو کچھ کہلوایا تھا اس سے سکندر نے اندازہ لگا لیا تھا کہ شاید شیخ جیو اب زیادہ دن نہیں جئیں گے چنانچہ آپ ۹۳۱ھ میں بعمر ۷۵ سال واصل بحق ہو گئے۔

آپ کے وصال سے سکندر کو بڑی خوشی ہوئی۔ اس نے آپ کا مذاق اڑایا اور اپنے امراء سے کہا: "کہاں گیا وہ شخص جو بہادر خان کو تاج و تخت کی بشارت دیا کرتا تھا؟"

عماد الملک حبشی، جو سلطان مظفر مرحوم کا لے پالک اور بادشاہ کی ماں کا غلام تھا۔ اس نے سکندر کو متنبہ کیا کہ بزرگوں کا مذاق نہ اڑائیں کیونکہ موت کے بعد بھی اُن کے اثرات باقی رہتے ہیں کہیں شیخ جیو ناراض نہ ہو جائیں۔

سکندر نے جواب دیا: جو شخص اپنی زندگی میں میرے باپ کا فیصلہ نہیں بدلوا سکا، وہ اب مرنے کے بعد میرا کیا بگاڑ لے گا۔"

اُس نے انعام واکرام سے اپنے امراء کو مطیع وہمنوا کرنا شروع کر دیا۔

ایک دن سلطان سکندر سیر و تفریح کی غرض سے نکلا۔ راستے میں ایک جگہ بادشاہ کے ایک نمک خوار نے تخلیہ میں اس سے کہا: "حضورِ والا! اس وقت میں حضور کے پاس ایک انتہائی اہم خبر لے کر آیا ہوں۔"

سلطان نے پوچھا: "کون سی اہم خبر؟"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا: "حضور! یہاں کوئی ایسا شخص تو نہیں ہے جو حضور کے دشمنوں کے لیے جاسوسی کے فرائض دے رہا ہو؟"

سلطان نے جواب دیا: "نہیں میرے خیال میں یہاں ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے جو ہمارے خلاف مخبری کے فرائض انجام دے رہا ہو۔"

اس شخص نے کہا: "حضورِ والا! عماد الملک کی نیت خراب ہو چکی ہے اور وہ حضور کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔"

سلطان اس شخص سے ناراض ہو گیا بولا: "تو عماد الملک کی بابت ایسی باتیں کر رہا جب کہ وہ میرے باپ کا نمک خوار اور وفادار رہ چکا ہے۔ وہ میری ماں کا غلام ہے۔"

اس شخص نے اپنی بات پر اصرار کیا بولا: "حضورِ والا! مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا آپ کے گوش گزار کر دیا۔"

سلطان سکندر نے پوچھا: "تو نے یہ خبر کس سے سُنی؟"

اس نے جواب دیا: "عماد الملک کے آدمیوں سے۔ وہ بادشاہ تک نہیں پہنچ سکتے اور یہ کام میرے سپرد کر دیا۔"

سلطان سکندر نے کہا: "یہ افواہ ہے اور ضرور اُن لوگوں نے اُڑائی ہوئی ہے جو مجھے میرے وفاداروں سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان افواہوں پر یقین نہیں کر سکتا۔"

بادشاہ سیر و تفریح سے واپس آگیا، وہ بہت پریشان تھا۔ اس نے وقائع نویسوں کے پرچوں

سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ شہزادہ بہادر خان دہلی سے واپس آرہا ہے یا نہیں! لیکن ایسی کوئی خبر پرچوں میں نہیں تھی۔ اس نے اپنے ایک مقرّب سے کہا: "میں صرف اس بات سے پریشان ہوسکتا ہوں کہ شہزادہ بہادر خان گجرات کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے لیکن اگر ایسی کوئی افواہ نہیں ہے تو میں کیوں پریشان ہوں؟"

اس رات سلطان سکندر نے خواب میں دیکھا۔ شیخ جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشت شاہ قطب عالم، شاہ عالم، شاہ محمود اور شیخ جیو محل سرا میں بیٹھے کسی مسئلے پر غور کررہے ہیں۔ حضرت جہانیاں جہاں گشت نے پوچھا: "یہ مظفر شاہ کدھر چلا گیا؟ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، اسے بلوایا جائے تاکہ ہم اسی کے ہاتھوں نیا فرمان جاری کرادیں۔

اسی وقت ایک طرف سے سلطان مظفر نمودار ہوا۔

حضرت قطب عالم نے سلطان مظفر سے کہا: "تو بادشاہ رہ چکا ہے ہم چاہتے ہیں کہ یہاں جو کچھ بھی ہو تیرے ہی فرمان سے ہو۔"

سلطان مظفر نے اپنے بیٹے سکندر کو گھور کر دیکھا اور کہا: "میں اپنے بیٹے سکندر کو معزول کرتا ہوں اور اس کی جگہ بہادر خان کو نامزد کرتا ہوں۔

شیخ جیو ابھی تک خاموش بیٹھے تھے، اب وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور سلطان سکندر سے کہا: "یہ تیری جگہ نہیں ہے اُٹھ جا اور بہادر خان کے لیے جگہ خالی کردے۔"

انھوں نے سکندر کو تاج و تخت سے محروم کرکے شہزادہ بہادر خان کو تاج پہنا کر تخت پر بٹھا دیا۔

سلطان سکندر کی آنکھ کھل گئی، وہ پریشان ہوکر ٹہلنے لگا۔

سلطان نے اپنے اس خواب کا ذکر بعض مقرّبین سے کر دیا۔ انھوں نے کہا: "یہ خواب سچا نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے آپ دن رات جو کچھ سوچتے رہے ہیں، وہی خواب بن گیا ہو۔"

سلطان نے چوتھائی دن پریشانی میں گزار دیا۔ اس کے بعد کھانا کھایا اور محل سرا میں آرام کرنے چلا گیا۔

اس وقت بادشاہ کی خواب گاہ سے باہر نصرت الملک اور ابراہیم بن جوہر پہرہ دے رہے تھے اور اندر بادشاہ کے پلنگ پر سید علیم الدین، خنجر ہاتھ میں لیے بادشاہ کی حفاظت کررہا تھا۔

اچانک عماد الملک اپنے ساتھیوں کو لیے ہوئے محل میں داخل ہوا اور نصرت الملک اور ابراہیم بن جوہر کو قتل کرکے بادشاہ کی خواب گاہ میں گھس گیا۔ سید علیم الدین نے ان پر حملہ کر دیا۔ نتیجے

میں دو آدمی زخمی ہو گئے مگر عماد الملک نے ان کا کام تمام کر دیا۔ اب بادشاہ کی باری تھی۔
عماد الملک نے پے در پے وار کر کے سلطان کو تین جگہ سے زخمی کر دیا۔ زخمی سلطان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور عماد الملک کو دیکھتے ہی للکار کر کہا۔ "او غدار! میں نے تجھے پہچان لیا۔ افسوس کہ میں نے تیرے بارے میں جو افواہ سُنی تھی اُس کی تصدیق نہیں کی ورنہ شاید آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔"
سلطان نے پوچھا۔ "او نمک حرام تو نمک حرامی پر کیوں آمادہ ہوا؟"
عماد الملک نے جواب دیا۔ "تجھ میں حکمرانوں کی خو بُو ہی نہیں۔ میں سلطنتِ گجرات پر یہ احسان کر رہا ہوں کہ اسے تجھ جیسے نا اہل سے نجات دلا رہا ہوں۔"
بادشاہ بہت زخمی ہو چکا تھا۔ وہ تڑپ کر نیچے گرا اور عماد الملک کے ایک ساتھی نے اس کا کام تمام کر دیا۔
سکندر نے کل تین ماہ سترہ دن حکومت کی۔ اس کے بعد شہزادہ بہادر خان گجرات میں داخل ہوا اور نہایت تزک و احتشام سے گجرات کے تاج و تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور پندرہ سولہ سال تک حکومت کرتا رہا۔ شیخ جیو کی عنایات اور محبتوں کا ذکر پھر سے ہونے لگا۔ سلطان بہادر نے اقتدار سنبھالتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بٹوہ میں آپ کے مزار پر حاضری دی اور رو رو کر اعانت و استعانت کی درخواست کرتا رہا۔ کیونکہ اسے اس حقیقت پر یقین تھا کہ شیخ جیو کے اثرات اور قوت اُن کی موت کے بعد بھی جاری و ساری ہیں۔

جلال الدین حسین شاہ المعروف شیخ جیو میں بزرگوں اور ولیوں کے اوصاف کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ آپ انتہائی حلیم طبع اور رحمدل شخصیت کے مالک تھے۔ آپ میں وہی اوصاف پائے جاتے تھے۔ جو کہ جہانیاں جہاں گشت میں موجود تھے۔ شاہ جیو میں تحمل اور بُردباری حد درجہ تک موجود تھی۔ آپ بلاشبہ ایک ایسے بزرگ تھے کہ جنہوں نے اپنی وفات کے بعد بھی اپنے فیض سے شہزادہ بہادر خان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ شیخ جیو کا مزار گجرات میں ہے جہاں آج بھی لوگ والہانہ عقیدت کے تحت دور دور سے حاضری دینے آتے ہیں اور مُرادوں سے جھولیاں بھر بھر لے جاتے ہیں۔





خواجہ ضیاء الدین نخشبیؒ

نوجوان

ایک امیر و کبیر شخص کی بیٹی کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ امیرزادی تک رسائی حاصل کرنا اُس کی فکر و مزدے بھی بالا تھی۔ امیر آدمی اس قدر سخت گیر اور تُند خُو تھا کہ براہِ راست اُس کے ساتھ بات کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ عشق تھا کہ اُس نوجوان کو بے کل کیے دے رہا تھا۔ پیہم کوشش سے مسلسل ناکامی کے بعد اس نوجوان نے سوچا اس مشکل کا صرف ایک ہی حل ہو سکتا ہے کیوں نہ حضرت خواجہ ضیاء الدین نخشبیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر چارہ گری تلاش کی جائے۔ یہ خیال آتے ہی وہ سیدھا حضرت صاحبؒ کی محفل پاک میں پہنچ گیا۔

محفل گرم تھی۔ درس سننے والوں کا ہجوم تھا۔ لوگ ہاتھوں کی لکیروں کی طرح جمے ہوئے حضرت خواجہ صاحب کا درس سُن رہے تھے۔ ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیان بھی بہت عمدہ۔ ایک تو حضرت کی تقریر تھی دوسرے ذکرِ حبیبِ خدا کا تھا۔ موضوعِ سخن آنحضرتؐ کی دشوار گزار اور جاں گداز زندگی کے متعلق تھا۔ لوگ حضرت خواجہ سے رسولِ مقبولؐ کی زندگی کے کٹھن واقعات سُن رہے تھے اور سر دھن رہے تھے۔ مذکور بالا نوجوان بھی محفل میں جا کر بیٹھ گیا اور تقریر سُننے لگا۔ عشقِ حقیقی کی پُرخار راہ میں آنحضرتؐ کی مشکلات کا بیان سُن کر اُس کو اپنے عشقِ مجازی کے مصائب اور بے بسی کا خیال آ گیا اور وہ

زار زار رونے لگ گیا۔

درس ختم ہوا۔ لوگ اُٹھ کر جانے لگے۔ حتیٰ کہ مسجد خالی ہو گئی۔ مگر نوجوان اپنی جگہ پر بیٹھا رہا اور آہ زاری کرتا رہا۔ حضرت خواجہ صاحب کا دھیان تقریر کے دوران بھی اس نوجوان کی طرف تھا اور تقریر کے بعد بھی آپ کافی دیر اُس نوجوان کی طرف متوجہ رہے۔ آخر آپ سے نہ رہا گیا اور آپ نے اس کو اپنے پاس بُلایا اور پوچھا۔

"عزیزِ من! کیا بات ہے، تم اس قدر کیوں رنجیدہ ہو۔ میری تقریر سُن کر تمہیں اپنا کون سا دُکھ یاد آ گیا ہے جس کے لیے تم اس قدر رو رہے ہو؟"

نوجوان پہلے تو خاموش رہا پھر ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ حضرت نے اُس پر کافی نظرِ عنایت کی اور دستِ شفقت اس کے سر پر پھیرا اور اُس سے اُس کی مشکل دوبارہ پوچھی تو پھر اُس نے اپنی رودادِ الفت مکمل طور پر حضرت کو سُنا دی۔

حضرت کو خدا نے عرفان و ولایت جیسی نعمتوں سے نواز رکھا تھا۔ آپ نے نوجوان کی پوری بات سُنی اور اُس کو برملا فرما دیا۔

"اے نوجوان! سچی بات تو یہ ہے تجھے اس لڑکی سے زیادہ اس کی دولت اور جاہ و ثروت کے ساتھ عشق ہو گیا ہے۔ بس اِس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں۔"

نوجوان نے بُرا سا منہ بنایا اور عرض کی "حضرت! آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔ مجھے اس لڑکی کی دولت کی کوئی پرواہ نہیں۔ مَیں بلاشُبہ بے زر ہوں مگر اتنا گیا گزرا بھی نہیں۔ مَیں تو آپ کی خدمت میں اپنا مسئلہ حل کروانے آیا تھا۔ آپ مستجاب الدعوات ہیں۔ آپ میرے حق میں دعا فرمائیں گے تو خدا تعالیٰ ضرور قبول فرمائے گا۔"

حضرت خواجہ صاحب! کچھ دیر مراقبے میں چلے گئے اور پھر فرمایا "نوجوان مَیں نے تمہارا معاملہ خدا کے آگے پیش کیا ہے۔ مجھے یہ ہدایت ملی ہے کہ تمہیں لڑکی کے باپ کے پاس بھیج دیا جائے وہاں تمہارا کام بن جائے گا۔"

نوجوان خوش تو بہت ہوا خواجہ صاحب کی حوصلہ افزائی کی بات سُن کر مگر پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

"حضرت! کیا یہ ممکن نہیں کہ لڑکی کا باپ خود چل کر میرے پاس آئے۔"

حضرت نے فرمایا۔ "اگر تم ایسا چاہتے ہو تو یونہی سہی۔ لڑکی کا باپ تمہارے گھر پہنچ جائے گا مگر اس میں وقت کی کوئی قید نہیں ہو گی۔ تمہیں اس معاملے میں انتظار کرنا پڑے گا۔ اور

ایک اور بات بھی یاد رکھنا کہ جو میں دوبارہ کہے دیتا ہوں کہ تمہارا عشق ہے جھوٹا۔"

نوجوان نے عرض کی۔ "حضرت! میرا عشق سچا ہے۔ اب میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میرا عشق حقیقی ہے۔"

حضرت خاموش رہے اور اُس کو جانے کا حکم دے دیا۔

نوجوان اپنے گھر پہنچا۔ اُس کا گھر شہر کے نہایت پسماندہ علاقے میں تھا۔ جہاں غریب طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ اُس کے گھر میں صرف ایک کمرہ تھا۔ سیلن زدہ گھر تھا۔ جس میں تعفن ایسا تھا کہ لمحہ بھر کے لیے وہاں بیٹھنا محال تھا۔ نوجوان نے گھر پہنچ کر اپنے گھر کے دروازے کھول دیے اور اپنی محبوبہ کے والد کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ اُس کے والد نے کئی مرتبہ دروازہ بند کرنے کی کوشش کی مگر نوجوان نے باپ کو روک دیا اور کہا۔

"ابا جان! خوش قسمتی میرے گھر پر دستک دینے والی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے دروازے بند دیکھ کر خوش قسمتی مجھے نوازے بغیر ہی چلی جائے۔ اس لیے میں دروازے کھلے رکھوں گا۔" نوجوان کے والد جو بیٹے کے عشق سے خوب واقف تھے انہوں نے اُسے بہت سمجھایا کہ اپنی اس بے معنی خواہش کو دل سے نکال دو۔ ایک امیر زادی کہاں تمہارے ساتھ شادی کرے گی جبکہ تمہاری حالت یہ ہے کہ دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے رہتے ہیں۔

نوجوان نے باپ کی بات سُنی اَن سنی کر دی اور دن رات دروازہ کھلا چھوڑ کے اپنی محبوبہ کے والد کا انتظار کرنے لگا۔ کئی دن اس انتظار میں گزر گئے۔ انتظار کی شدت ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ تاہم دل والے اپنے محبوبوں کا انتظار کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جاتے ہیں۔

کئی روز کے مسلسل انتظار کے بعد آخر کار نوجوان کی اُمنگ بار آور ہوئی ایک روز اُس کی محبوبہ کا باپ اپنے دو نوکروں کے ہمراہ آ گیا۔ اُس کو دیکھ کر لڑکے پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُس کو یوں معلوم ہوا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ مگر یقین اُس کو اس وقت آیا جب اُس کے اوسان اس بات کی وجہ سے خطا ہو گئے کہ اتنے امیر و کبیر انسان کو بٹھائے کس جگہ۔ گھر میں ایک کمرہ تھا وہ بھی سیلن و تعفن زدہ۔ ناچار اپنے مہمان کو اُس نے اُسی کمرے میں بٹھایا۔ امیر آدمی اور لڑکی کے باپ نے نوجوان سے سوال کیا۔

"کیوں میاں صاحب زادے! کیا تم ہی میری بیٹی سے شادی کرنے کے تمنائی ہو؟"

کہا ہاں! میں ہی وہ شخص ہوں۔"

امیر آدمی بمشکل اس کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ بُو کے مارے اُس کا بُرا حال تھا۔ وہ مسلسل

ناک پر رومال رکھ کر بیٹھا رہا اُس نے نوجوان سے کہا۔

"اگر میں اپنی بیٹی کی شادی تمہارے ساتھ کر دوں تو تم اس کو رکھو گے کہاں؟ اس سیل زدہ بدبودار گھر میں تو میری بیٹی ایک ساعت بھی نہ رہ سکے گی۔"

نوجوان خاموشی سے امیر آدمی کا منہ تکتا رہا۔

دولت مند انسان نے پھر کہا۔ "میاں صاحب زادے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ اُس کا جواب مجھے خوب غور کر کے دو۔"

نوجوان کیا جواب دیتا کہنے لگا۔ "جناب! اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔"

امیر آدمی نے کہا۔ "تو ٹھیک ہے اگر تمہارے پاس اس بات کا کوئی حل نہیں تو میرے پاس ہے مگر اس میں میری دو تجاویز ہوں گی جن میں سے ایک پر عمل کر کے ہی تم میری لڑکی سے شادی کر سکتے ہو۔"

نوجوان نے لپک کر کہا۔ "جناب فوراً بتائیے مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہو گی۔"

امیر آدمی نے کہا۔ "میری پہلی تجویز تو یہ ہے کہ تم میری بیٹی کے ساتھ شادی کر کے اپنا یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو گے اور میرے ساتھ رہو گے۔"

نوجوان نے کہا۔ "جناب مجھے آپ کی اس تجویز سے اتفاق ہے مگر مجھے بڑی سی حویلی درکار ہو گی۔ کیونکہ وہاں میرے دس بہن بھائی اور ماں باپ بھی رہیں گے۔"

لڑکی کے باپ نے کہا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تمہارے ماں باپ میری حویلی میں نہیں رہ سکتے۔ میں نے اپنی بیٹی تمہیں دینی ہے اس لیے میرا تمہارا واسطہ تو رہ سکتا ہے مگر مجھے تمہارے ماں باپ یا بہن بھائیوں سے کوئی سروکار نہیں۔"

مایوسانہ لہجے میں نوجوان نے امیر آدمی سے دست بستہ ہو کر دوسری تجویز پوچھی۔

لڑکی کے باپ نے کہا۔ "دیکھو! تم نے نہ تو اپنی ذاتی حویلی بنوا رکھی ہے اور نہ ہی اپنے ماں باپ کو چھوڑ سکتے ہو۔ اس لیے یوں کرو۔ میری بڑی بیٹی کا خیال چھوڑ دو۔ تم میری ایک دوسری بیٹی جو میری ایک اور بیوی سے ہے اور وہ شکل وصورت کی بھی بہت کم تر ہے۔ اُس کے ساتھ شادی کر لو۔ تمہاری پوری زندگی کے اخراجات بھی میرے ذمے ہوں گے اور میں تمہیں ایک حویلی بھی بنوا دوں گا جس میں تمہیں اپنے والدین کے ہمراہ رہنے کی اجازت ہو گی۔"

نوجوان سوچ میں پڑ گیا، کچھ دیر کے بعد بولا۔ "لیکن میں تو شادی آپ کی اُس بیٹی سے کرنا چاہتا ہوں جس کے عشق میں گرفتار ہوں اور جس بیٹی کے ساتھ آپ شادی کی پیش کش

کر رہے ہیں اُس کو تو مَیں نے دیکھا بھی نہیں۔"

امیر آدمی نے نہایت ترش لہجے میں کہا۔" دیکھو میاں! تم میری بیٹیوں کا ذکر اتنی بے تکلفی سے کیے جا رہے ہو۔ حالانکہ یہ بات غیرت کے منافی ہے۔ تم میری بات ماننا چاہتے ہو تو مانو لیکن اب تمہاری زبان پر میری بیٹیوں کا ذکر نہ آئے۔"

نوجوان نے امیر آدمی کے تیور دیکھے تو ڈر گیا اور کہنے لگا" ٹھیک ہے جناب! آپ کی دوسری تجویز پر مَیں غور کر کے کل بتاؤں گا۔"

امیر آدمی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔" مگر یاد رکھنا اگر تم نے کل تک مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ نہ کیا تو مَیں اپنی دوسری پیش کش بھی واپس لے لوں گا۔"

یہ سُن کر نوجوان چپ ہو گیا۔ امیر آدمی چلا گیا۔ نوجوان کش مکش کا شکار رات بھر سوچتا رہا آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ امیر آدمی کی پیش کش مان لینی چاہیے تھی اور یہ فیصلہ کر کے وہ امیر آدمی کے گھر جا پہنچا۔ حویلی کے اندر اُس نے اطلاع بھجوائی۔ اُس کو اندر بُلوایا گیا۔ امیر آدمی کے پاس اُس کے بے شمار غلام بیٹھے تھے اُن سب کے درمیان کھڑے نوجوان سے پوچھا گیا۔

"ہاں تو میاں صاحب زادے! بتاؤ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

نوجوان نے کہا۔" جناب! مَیں نہایت مشکل سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے آپ کی تجویز مان لینی چاہیئے۔ بشرطیکہ آپ ایک حویلی میرے نام کر دیں اور زندگی بھر کی میری ذمہ داری قبول فرمائیں۔"

امیر آدمی مسکرایا اور کہنے لگا۔" سُبحان اللہ حویلی کی خواہش نے ترے عشق کے دعویٰ کو باطل کر دیا۔ جب تک تو عاشق تھا، تو میری نظر میں تو ایک خاص نوجوان تھا، لیکن اب تو ایک معمولی نوجوان رہ گیا ہے۔ کیونکہ تو میری بیٹی کے عشق میں میری دولت کے حصول کے چکر میں مبتلا ہے۔" یہ کہہ کر امیر آدمی نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ اس ناہنجار، لالچی انسان کو مار مار کر اس کا بھرکس نکال دو اور جب یہ بے ہوش ہو جائے تو اس کو گندے نالے میں پھینک دیا جائے۔"

بس پھر کیا تھا پٹائی شروع ہوئی۔ غلاموں نے مار مار کر اُس جھوٹے اور لالچی عاشق کی ساری عاشقی نکال کر رکھ دی۔ جب نوجوان بے ہوش ہو گیا۔ تو غلاموں کو اُس پر پھر ترس آ گیا۔ انہوں نے اُسے گندے نالے میں پھینکنے کی بجائے اُس کو خواجہ ضیاء النخشبیؒ کے

در پر ڈال دیا۔ جب خواجہ صاحب کو خبر ہوئی کہ اُن کا زخمی عقیدت مند اُن کے در پر پڑا ہے تو انہوں نے اُس کو مریدوں کے ذریعے حجرے میں منگوایا۔ اُس کی مرہم پٹی اور تیمارداری کی۔ پھر فرمایا۔

"اللہ تم پر رحم کرے۔ مَیں نے تو تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تُو عاشق نہیں ہے۔ عاشق تو بہت بہادر اور غیرت مند ہوتا ہے۔ اپنی محبّت اور عشق کے معاملے میں تو پورا کاروباری نکلا۔"

نوجوان نے روتے ہوئے عرض کی "حضرت! مجھے اپنے خادموں میں شامل کر لیجئے۔ آئندہ مَیں دنیاداری کی طرف اپنا خیال بھی نہیں لے جاؤں گا۔"

حضرت نے محبّت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اُسکو اپنے مریدوں میں شامل کر لیا۔

حضرت خواجہ ضیاءالدین نخشبیؒ ہندوستان کے مشہور شہر بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سنِ پیدائش غالباً ۶۵۲ھ تھا۔ اُس زمانے میں پورے مُلک میں تصوف کا دور دورہ تھا۔ بس دو دربار ہی تھے یا بادشاہوں کے دربار یا اہلِ حق کے آستانے۔ ملوکیت نے انسانوں کو یا تو پکا دین دار بنا دیا تھا یا پھر دنیا سے نفور اور بیزار کر دیا تھا۔ دنیا بھر کے ستائے ہوئے لوگ آستانوں اور خانقاہوں میں سکون حاصل کیا کرتے تھے۔

خواجہ ضیاءالدین نے ہوش سنبھالا تو قاعدے اور رواج کے مطابق مروّجہ علوم کی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ آپ بچپن سے ہی اس مزاج کے انسان تھے کہ جو کچھ آپ پڑھتے تھے اُس سے کوئی نہ کوئی سبق نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ نے کم عمر میں ہی علوم ظاہری و باطنی میں دسترس حاصل کر لی۔ آپ کے درس کے دُور دُور تک چرچے ہونے لگے۔

آپ کے نام کے ساتھ لفظ نخشبی کی تشریح تاریخ دانوں نے یوں کی ہے کہ عباسی عہد میں ابن مقنع نے مصنوعی چاند بنا کے طلوع کیا تھا اس واقعے کو شعرا نے ماہِ نخشب اور چاہ نخشب کے عنوان سے اپنے اشعار میں محفوظ کر لیا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ اُس قصبے میں ابن مقنع رہتا تھا اُس کا نام نخشب پڑ گیا۔ حضرت خواجہ ضیاء کے بزرگوں کا تعلق بھی اسی قصبے سے تھا آپ جب علم حاصل کر چکے تو آپ کے اندر آہستہ آہستہ لطیف احساسات پیدا ہونے لگے۔ اور پھر شدّتِ احساس سے وہ لطیف خیالات اشعار میں ڈھلنے لگے۔ آپ نے شاعری شروع کر دی تو اپنا تخلّص نخشبی رکھ لیا۔

خواجہ ضیاء نہایت خاموش طبع انسان تھے۔ آپ کے شہر والوں نے آپ میں وہی گہرائی دیکھی جو اہل علم اور صوفیاء میں پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے کم عمر میں آپ کے زہد و رکوع اور علم و عرفان کی وجہ سے ایک خلقت آپکی مرید اور معتقد ہو گئی۔

حضرت خواجہ صاحب کی باتوں میں بڑی گہرائی اور معنویت ہوتی تھی۔ آپ واقعات اور حکایات سے اپنی بات کو واضح کرتے تھے۔ اس تمثیلاتی انداز سے آپ کا طرزِ بیان اور زیادہ دل کش ہو جایا کرتا تھا۔ ایک روز انسان کی سرکشی اور تکبّر کے متعلق آپ وعظ فرما رہے تھے کہ آپ سے ایک عقیدت مند نے سوال عرض کیا۔

"حضرت یوں تو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بہتیری مخلوق آباد ہے مگر آپ اس میں سے سرکش و منکر مخلوق کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیں۔"

حضرت خواجہ صاحب نے جواب دیا "صدیاں گزریں اس نوع کا سوال ایران کے بادشاہ نوشیرواں نے اپنے وزیر بزرجمہر سے کیا تھا۔ وزیر سے بادشاہ نے پوچھا۔

"کیا تو بتا سکتا ہے کہ دنیا میں کون سا جانور سب سے زیادہ سرکش اور مغرور ہے۔"

وزیر بزرجمہر نے جواب دیا "انسان۔"

نوشیرواں نے کہا "کیا انسان جانور ہے؟"

وزیر نے عرض کی "حضور! انسان بھی جانور ہے اور جانوروں کی دو اقسام ہوتی ہیں۔ ایک تو حیوانِ مطلق اور دوسری حیوانِ ناطق کہلاتی ہے۔"

انسان حیوانِ ناطق ہے۔ جو بول سکتا ہے۔ بات کر سکتا ہے۔ اللہ نے اُس کو علم و عقل سے نوازا ہے اور دوسرے حیوان یہ چوپائے وغیرہ ہیں جو حیوانِ مطلق ہیں۔ جو قوّت مُمیّز سے محروم ہوتے ہیں اور باتیں نہیں کر سکتے۔"

بادشاہ کو وزیر کی باتیں پسند نہ آئیں اور اُس نے اُسے سختی سے ڈانٹا اور کہا "اپنے اس بیان کی صداقت کی وضاحت کرو۔"

وزیر ڈر گیا، لیکن اُس نے تفصیل سے اپنے جواب کی وضاحت کرنا شروع کی۔

"اللہ تعالیٰ نے انسان کو کتنے ہی طریقوں سے راہِ مستقیم کی ہدایت کی ہے۔ کبھی جنّت کا وعدہ کر کے، انبیاء بھیج کر ہدایت دی، آسمانی کتابوں سے انسان کو سیدھا راستہ دکھایا مگر انسان پر ان سب چیزوں کا اثر بہت کم ہوا۔ اور ازل سے لے کر آج تک انسان کے غرور اور سرکشی میں فرق نہیں آیا۔

وزیر کی اس توضیح سے نوشیرواں تو مطمئن ہو گیا، لیکن حضرت خواجہ کے ایک مرید نے اپنے مرشد سے عرض کی۔

"بزرگِ محترم! یہ تو انسان کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ حالانکہ انسان تو ایسے بھی ہیں جن کی نیکی اور شرافت کی قسمیں کھائی جا سکتی ہیں۔ اُن کو آپ سرکشوں اور متکبّروں کے زمرے میں کیسے ڈال سکتے ہیں؟"

حضرت خواجہ نے مُرید کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقع سُنا کر اُس کی تشفّی کی اور فرمایا۔

ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ خدا سے ہم کلام ہونے کوہِ طور پر تشریف لے گئے۔ اللہ نے آپکو حکم دیا۔ "اے موسیٰؑ! مَیں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اپنی قوم کے نیک بندوں کو بدوں سے الگ کر دے۔"

موسیٰؑ طور سے واپس اپنی قوم میں تشریف لائے اور اپنی قوم کے لوگوں کو آپ نے گھروں سے باہر آنے کا حکم دیا۔ جب سب لوگ باہر آ گئے تو آپ نے انہیں صفیں بنانے کا حکم دیا۔ اور بڑے گہرے مطالعے سے آپ نے نیکوں اور بدوں کی پہچان کی اور ستّر لوگوں کو نیک سمجھ کر سب لوگوں میں سے علیحدہ کیا اور پھر خدا سے عرض کی "اے باری تعالیٰ! مَیں نے تیرے حکم کی تعمیل کر دی ہے اور ستّر نیک آدمی مَیں نے علیحدہ کر دیے ہیں۔"

اللہ نے پھر سے حکم دیا "اے موسیٰ! اب اُن ستّر نیک آدمیوں میں سے صرف تین ایسے لوگ علیحدہ کر دے جن کو تو ان تمام نیکوں میں افضل ترین سمجھتا ہے۔"

حضرت موسیٰؑ نے گہری بصیرت سے کام لیا اور مزید چھان پھٹک کر کے تین آدمی ایسے چُن لیے جو اُن کی دانست کے مطابق نیک ترین تھے اور پھر خدا کے حضور عرض کی "اے مالک الملک! مَیں نے نیکوں میں سے افضل ترین تین آدمی چُن لیے ہیں۔"

اللہ پاک نے فرمایا "اے موسیٰؑ! جن تین آدمیوں کو تو نے اپنی سمجھ اور فکر کے مطابق نیک۔ اچھا اور افضل سمجھ کر علیحدہ کیا ہے، میری نظر میں تیری قوم کے سب سے بُرے آدمی ہیں۔" موسیٰؑ علیہ السلام نے خدا کا فیصلہ سُنا تو بہت شرمندہ ہوئے۔ اللہ نے موسیٰؑ کو معجوب ہوتے دیکھا تو فرمایا "اے نبیؑ! ایسے نیک انسان درحقیقت مکر و ریا کے بُت ہوتے ہیں اور اپنے جھوٹے لبادے سے دوسرے انسانوں کو دھوکہ دے دیتے ہیں۔"

حضرت خواجہ نے یہ واقعہ اپنے مریدوں کو سُنایا اور فرمایا "خدا کے نزدیک انسانوں میں

خوشبوؤں کی شہزادی



شہزادی

اگربتّی

دلنواز خوشبو
اور دیرپا مہک کے لئے
بے مثال



منارسس ٹوبیکو کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۰۶۷۰ - کراچی ۱۲

PHONE: 612622

marksman

وہی بہتر ہے اور برتر ہو سکتا ہے جو ہمیشہ توبہ و استغفار کا عمل جاری رکھے اور اس عمل کی بنا پر خدا کی پناہ میں رہے۔

ایک مرتبہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "اے خواجہ ضیاء النخشبی! ذرا یہ تو بتائیں۔ انسان اپنے آقا کو کس طرح خوش رکھ سکتا ہے؟"

آپ نے فرمایا۔ یہ کون سی مشکل بات ہے۔ وہ ایسے کام کرے جس سے اس کا آقا راضی ہو یا راضی رہے۔"

راضی رکھنے کے بارے میں آپ نے ایک حکایت پیش کرتے ہوئے فرمایا "شیخ ناگوریؒ نے ایک لونڈی خریدی۔ جس سے آپ گھر کا کام لیتے تھے اور آپکی عدم موجودگی میں وہ آپ کے گھر کی رکھوالی کیا کرتی تھی۔ ایک روز شیخ ناگوریؒ دن بھر کے تھکے ہارے گھر واپس آئے اور لونڈی سے پوچھا "تو کیا کر رہی ہے"۔"

لونڈی نے جواب دیا آپ کا انتظار۔"

شیخ ناگوریؒ نے پوچھا۔ "میرا انتظار کس لیے؟"

لونڈی نے عرض کی "اس لیے کہ آپ میرے آقا ہیں اور میں آپ کی نوکرانی۔ آپ کا انتظار، آپ کی خدمت اور آپ کی نوکری کرنا مجھ پر واجب ہے۔"

اس جواب پر شیخ ناگوری بہت خوش ہوئے اور کہا "تم سچ کہتی ہو۔ تم واقعی بڑی خدمت گزار ہو، اب اس طرح کرو۔ میرے لیے بستر لگا دو میں تھکا ماندہ ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

لونڈی نے بجائے شیخ ناگوری کے حکم کی تعمیل کرنے کے اُلٹا اُن پر سوال کر دیا۔ "اے شیخ! ذرا یہ تو بتائیں آپ کا بھی کوئی آقا ہے؟"

یہ سوال سُن کر شیخ کو سخت غصہ آیا مگر اُنہوں نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہے ایک آقا ہمارا بھی۔ مگر تمہیں اس سے کیا؟ تم نے یہ سوال کیوں پوچھا ہے؟"

لونڈی نے بصد ادب جواب دیا۔ "اے میرے آقا! میں نے آپ کو اپنا آقا مانا اور آپ کے حکم کی تعمیل کو اپنا جزو ایمان سمجھا۔ آپ مجھ سے کہیں زیادہ باشعور انسان ہیں اس لیے آپ کو مجھ سے زیادہ اپنے آقا کا تابعدار ہونا چاہیے۔"

لونڈی کے جواب نے شیخ ناگوریؒ کی آنکھیں کھول دیں۔ آپ نے اُس سے کہا۔ "اے لونڈی تو کہتی تو ٹھیک ہے مگر اپنا مطلب واضح کر تو چاہتی کیا ہے؟"

لونڈی نے عرض کی: "اے میرے آقا! کیا آپ کا آقا بھی رات بھر آپ کی طرح سوتا ہے؟"
شیخ نے جواب دیا "بالکل نہیں، میرا آقا تو نہیں سوتا۔"
لونڈی نے تاسف سے کہا "تب تو بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ کا آقا تو بیدار ہو اور آپ سو جائیں۔ اگر میں سو جاؤں اور آپ بیدار رہیں تو کیا آپ یہ پسند کریں گے، ہرگز نہیں۔"
شیخ کے پاس لونڈی کی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ چپ ہو گئے تاہم اس بات نے انہیں لرزا کر رکھ دیا اور وہ کافی دیر تک سکتے کی حالت میں مبتلا رہے جب ذرا ہوش آیا تو آپ نے اپنے نفس کو ملامت کرتے ہوئے کہا "تو جو خود کو خوش قسمت سمجھتا رہا، سخت گرفت میں آچکا ہے۔"
اس کے بعد شیخ نے اس لونڈی کو آزاد کر دیا اور رات کو آرام کرنے کی عادت ترک کر دی۔ حضرت خواجہ ضیاالدین نخشبیؒ نے یہ واقعہ سنا کر آنے والے شخص کے استفسار کی تشفی فرما دی۔

ایک روز آپ کے مریدوں میں یہ بحث ہو رہی تھی کہ جب انسان ارادہ کر لے کہ وہ سچا، کھرا اور ایمان دار رہے گا۔ تو اسے کوئی طاقت عہد شکنی پر مجبور نہیں کر سکتی۔ مریدوں کی ایک بڑی تعداد اس خیال کی مخالف تھی اور کچھ لوگ اس نقطۂ نظر کے حق میں تھے جب اپنے طور پر مرید اس عقدے کو حل نہ کر سکے تو یہ مسئلہ خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔
آپ نے فرمایا۔ انسان نہ تو سرتاپا مختار ہے اور نہ ہی بالکل مجبور۔ اگر اس کو سرتاپا مختار مان لیا جائے تو اللہ کے بارے میں یہ سوال پیدا ہو گا کہ اس نے اپنے اختیارات اپنی مخلوق میں کیوں منتقل کر دیے اور اس کے برعکس اگر آدمی کو بالکل مجبور سمجھ لیا جائے تو بھی اللہ پر یہ اعتراض وارد ہو جائے گا کہ اس نے انسان کو سرتاپا مجبور بنا کر میدانِ حشر میں حساب و کتاب کا چکر کیوں چلا دیا اور اپنی ہی بنائی ہوئی ایک مجبور چیز سے حساب و کتاب لینا کیا معنی رکھتا ہے۔"
خواجہ صاحب کی اس وضاحت پر آپ کے مریدوں میں سے ایک نے عرض کی۔
"میں آپ کی بات کا قائل نہیں۔ آپ کا فرمانا بجا ہے، لیکن یہ بھی تو سوچیں کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں، اس سے اچھی طرح باخبر ہوتے ہیں کہ ہم نے کتنے نیک کام کیے ہیں اور کتنے بد کام۔

ہر انسان اپنے اعمال سے اچھی طرح واقف اور باخبر ہوتا ہے۔ اس لیے جب انسان اچھے بُرے اعمال سے خود ہی واقف ہو تو اسے اپنی عاقبت کے بارے میں بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گی کہ وہ جنّت میں جائے گا یا جہنّم میں۔"

خواجہ صاحب کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے مریدوں کے سوالات کے جواب بڑی محبّت اور نرمی سے دیتے تھے۔ بار بار سوال پوچھنے پر بھی آپ کی پیشانی شکن آلود نہیں ہوتی تھی۔ آپ نے مذکورہ سوال کنندہ سے فرمایا۔

"میرے عزیز! تُو جو عمل کرتا ہے، کیا تُو اس بارے میں یقین سے کہہ سکتا ہے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں مقبول یا مسترد ہو جائے گا۔"

وہ شخص بولا۔ "کیوں نہیں۔ ہر شخص کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ کیسا ہے؟ اچھا یا بُرا۔"

حضرت خواجہ نے فرمایا۔ "تیری بات غلط ہے۔ یہ تیری خوش فہمی ہے کوئی بھی شخص اپنے کسی عمل کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ کی بارگاہ میں مقبول یا مسترد کر دیا جائے گا۔"

وہ شخص بڑا ضدی اور کج فہم تھا۔ اُس نے آپ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ سوئے اتّفاق ایک روز اُسے کچھ رقم کی ضرورت آن پڑی۔ جس کے حصول کے لیے اُس نے اپنے تمام ذرائع آزمائے۔ مگر کوئی انتظام کہیں سے نہ ہو سکا۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔ "حضرت مجھے کچھ رقم چاہیئے۔" آپ نے فرمایا۔

"دوست فقراء کے پاس رقم کہاں ہوتی ہے۔ کیا تمہارے گھر میں کوئی سونا چاندی بھی نہیں جس کو بیچ کر تم اپنی ضرورت پوری کر سکو۔"

اُس شخص نے عرض کی حضرت! "میں تو یہ بھول ہی گیا تھا سونا تو میرے گھر میں ہے۔"

آپ کے دل میں خدا نے یہ بات منکشف کر دی کہ اس حالت میں اس شخص کو اُس دن کی ضد اور کجی والی بات کی وضاحت بھی کی جا سکتی ہے۔ اس لیے آپ نے اسکو کہا۔

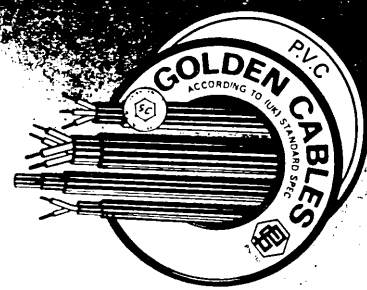
"ایسے کرو، تم اپنے گھر میں رکھا ہوا سونا یہاں لے آؤ۔ اُس شخص نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور سونا لے آیا۔ سونے کا وزن وہ گھر سے کر کے لایا تھا جو اسّی مثقال تھا۔ آپ اُس شخص کو ساتھ لے کر بازار چل پڑے۔ بازار میں داخل ہوتے ہی سُنار کی ایک دُکان تھی۔ اُس کے پاس آپ گئے اور اُس کو کہا۔ یہ میرا مرید ہے اس کے پاس کچھ سونا ہے۔ یہ اپنی ضرورت کے پیش نظر اپنا سونا فروخت کرنا چاہتا ہے۔ سُنار سونا خریدنے پر رضامند تو ہو گیا لیکن جب اُس نے یہ سُنا کہ سونا اسّی مثقال ہے تو اُس نے کہا۔ اتنا سونا تو مَیں فی الفور نہ خرید

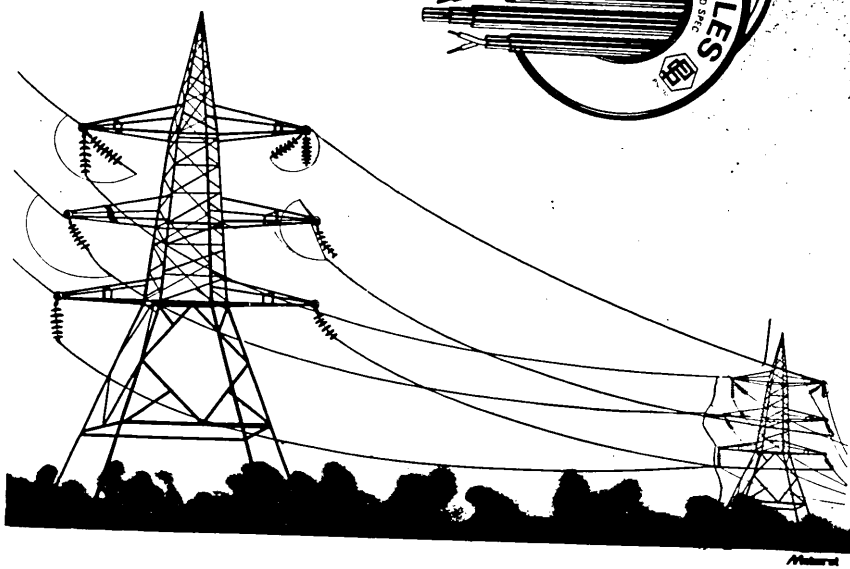
Efficient electrical energy transmission is

GOLDEN CABLES

mission

ARMOURED AND UNARMOURED POWER CABLES
PVC-INSULATED CABLES
ALIMINIUM CONDUCTORS
COPPER CONDUCTORS
CONTROL CABLES





کی پوزیشن میں نہیں ہوں اور اگر آپ نے لازمی بیچنا ہے تو میں آپ کی قیمت یک مشت نہیں دوں گا بلکہ دو تین اقساط میں رقم کی ادائیگی کروں گا۔ پھر اُس کو خیال آیا کہ سونے کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اس لیے رقم تو اِدھر اُدھر سے پکڑ کر بھی ادا کی جاسکتی ہے اس لیے سونا خرید لینے میں کوئی حرج نہیں۔

سُنار سونا خریدنے پر رضامند ہوگیا، اُس نے سونے کا وزن کیا لیکن سونا اسّی مثقال کی بجائے چھہتر مثقال نکلا۔ سنار نے کہا۔ "آپ لوگ تو کہہ رہے تھے کہ سونا اسّی مثقال ہے مگر یہ تو پورے چار مثقال کم ہے۔ اب اگر آپ نے بیچنا ہی ہے تو میں چھہتر مثقال کی قیمت دینے کو تیار ہوں۔"

حضرت خواجہ صاحب نے اپنے ساتھی سے پوچھا "کہو تم تو کہتے تھے یہ اسّی مثقال سونا ہے مگر یہ چھہتر مثقال کیسے نکلا۔"

وہ شخص بولا "حضرت! اس سُنار کے باٹ ٹھیک نہیں۔ میں نے خود گھر میں وزن کیا تھا سونا پورے اسّی مثقال تھا۔"

سنار نے کہا "اے دوست! اس میں جھگڑنے کی کیا بات ہے تو کسی اور سُنار کے پاس چلا جا اور وزن کروالے۔ مجھے اپنے باٹوں پر اعتبار ہے میں اسّی مثقال کی قیمت دے کر چھہتر مثقال سونا کیوں لوں۔"

حضرت خواجہ اور اُن کا ساتھی دوسری دُکان پر گئے مگر وہاں جاکر اور بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا وہاں سونا ایک مثقال اور کم ہوگیا اور پچھہتر مثقال رہ گیا۔ اب وہ شخص جو حضرت کے ساتھ تھا اور سونے کا مالک بھی تھا رونے لگ گیا اور کہنے لگا حضرت واپس گھر چلتے ہیں۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اسّی مثقال سونا تولا ہے اب یہ بلاوجہ گھٹتا چلا جا رہا ہے میں اتنے نقصان میں سونا کیوں بیچوں۔"

حضرت نے فرمایا "تو پھر اپنی اُس ضرورت کا کیا کروگے جس نے تمہیں مجبور کردیا ہوا ہے۔"

اُس شخص نے کوئی جواب نہ دیا اور مسلسل روتا رہا۔ آپؒ اس کو تسلی دیتے ہوئے واپس لائے اور فرمایا "دیکھو! گھبراؤ مت اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہاری ضرورت بھی پوری ہوجائے گی اور تمہارا سونا بھی نہیں بکے گا۔"

وہ شخص روتے ہوئے بولا "یہ دُعا تو آپ مجھے پہلے بھی دے سکتے تھے۔ اتنا پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

آپ نے فرمایا: "تو اس روز اپنے اعمال پر اترا رہا تھا۔ خدا نے اس حوالے سے تیرا امتحان کرنا چاہا۔ اب ذرا یہ تو بتاؤ تیری اپنے اعمال کے بارے میں اب کیا رائے ہے؟"

اُس شخص نے کہا: "حضرت! اب میری رائے بدل گئی ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اپنے اعمال کے بارے میں میری رائے کی کوئی اہمیت نہیں۔ رائے اور فیصلہ تو اللہ کا اٹل اور کھرا ہوتا ہے۔ معمولی سی بات ہے کہ میں گھر سے سونا وزن کرکے بازار گیا۔ بازار کا ایک سُنار میرے وزن کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جب گھر سے بازار تک میرے فیصلے کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی تو میدانِ حشر میں میرے اعمال کو وہ مقام کون دے گا جو میں اپنے دل میں لے کر جاؤں گا۔ آج تو میری دنیا ہی بدل گئی۔ حضرت آپ جیت گئے اور میں ہار گیا۔"

آپ نے فرمایا: "اے عزیز! آدمی کا زعمِ باطل ہی اسکو کہیں کا نہیں رہنے دیتا ہمیں ہمیشہ غرور اور تکبر سے بچے رہنا چاہیے۔ اب تو گھر جا کر اپنا سونا سنبھال کر رکھ دے اور یہ لے رقم اس سے اپنی ضرورت پوری کر اور خدا سے استغفار کر کہ آئندہ تو غرور نہیں کرے گا۔"

ایک مرتبہ درویش کا قصہ خواجہ صاحبؒ کے مریدوں نے اُن سے بیان کیا۔ وہ درویش چالیس سال تک ریاضت و عبادت میں مگن رہا۔ اُس کو اپنی چہل سالہ عبادت پر بڑا ناز تھا۔ اور اُس کے پاس جب بھی کوئی عقیدت مند ملنے کے لیے جاتا وہ بڑے تفاخر سے اُسے اپنی ریاضت کی باتیں سناتا کہ اُس نے کڑکڑاتی سردی میں تہ بند باندھ کر خدا کی عبادت کی۔ اور اپنی زندگی کا سُکھ چین یادِ الٰہی پر قربان کر دیا۔"

خواجہ صاحب نے یہ باتیں سنی تو نہایت افسوس سے فرمایا۔ "مجھے ڈر ہے کہ اِس تکبر اور خود نمائی کی بنا پر یہ درویش اپنا حاصل کیا ہوا مقام کہیں کھو نہ بیٹھے۔"

ایک روز مذکورہ بالا درویش چلتا پھرتا حضرت خواجہ نخشبیؒ کی خانقاہ کی طرف آ گیا اور خانقاہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے ایک خادم سے کہا۔

"خواجہ ضیاء الدین نخشبیؒ کو کہو آپ کو وہ درویش ملنے کے لیے آیا ہے جس نے چالیس سال عبادت و ریاضت میں گزارے ہیں۔"

خواجہ صاحبؒ نے اپنے مرید سے کہا: "اُس سے کہو کہ اللہ کے لیے اب مزید اپنے شب و روز ضائع نہ کرے کیوں کہ اللہ تعالیٰ احسان جتلانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

درویش نے یہ بات سُنی تو اُس کے دل پر بڑا اثر ہوا وہ خواجہ صاحب کی خدمت میں جا پہنچا۔ خواجہ صاحب نے اُسکو ایک واقع سُنایا جسکی توضیح سے اُس کی دنیا روشن ہو گئی۔

"بشر حافی دنیائے تصوّف کے ایک بہت بڑے صوفی تھے۔ اُن کو حافی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ ننگے پاؤں پھرا کرتے تھے۔ حافی ننگے پاؤں رہنے والے کو کہا جاتا ہے وہ ایک روز خواجہ حسن بصریؒ کے گھر گئے۔ خواجہ حسن بصریؒ اُس وقت گھر میں موجود نہ تھے دروازہ کھٹکھٹانے کے جواب میں آپ کی بیٹی دروازے کے قریب آئی اور پوچھا۔

"کون ہے جو میرے باپ کی عدم موجودگی میں آیا ہے؟"

بشر حافی نے فخریہ انداز میں کہا۔ "بیٹی! مَیں بشر حافی ہوں۔ بغداد میں ننگے پاؤں پھرنے والا۔"

اندر سے لڑکی نے جواب دیا۔ "اے بزرگ محترم! آپ بخدا بازار چلے جائیں اور وہاں سے جوتے خرید کر پہن لیں، اس کے بعد یہاں آئیں۔ ہم آئندہ آپ کی یہ بات نہیں سنیں گے۔"

بشر حافی شرمندہ ہوئے اور واپس چلے گئے۔"

چہل سالہ ریاضت کرنے والے درویش نے یہ واقعہ سنا تو وہ بھی سخت شرمندہ ہوا اور حضرت خواجہ نخشبیؒ کے سامنے توبہ کی کہ وہ آئندہ اپنی بڑائی نہیں بیان کرے گا اور نہ ہی کوئی ایسی بات کرے گا جس سے کبر و نخوت کی بُو آتی ہو۔

ایک بنیا کم تولنے میں مشہور تھا۔ اُس کے بارے میں اکثر لوگ شاکی رہتے تھے۔ حضرت خواجہ نخشبی کے پاس بھی کئی مرتبہ اُس بنیے کی شکایت بھی کی گئی۔ ایک روز حضرت خواجہ اُس بنیے کی دُکان پر گئے اور فرمایا۔

"اے تاجر تو کیا اپنے مقام سے واقف ہے۔ ایمان دار تاجر کا شمار حشر کے روز شہیدوں کے ساتھ ہو گا۔"

بنیا بولا۔ "میاں جی! مَیں اپنے مقام اور مرتبے سے بس اتنا واقف ہوں کہ مَیں ضروریاتِ زندگی کی چیزیں فروخت کرتا ہوں اور آپ جیسے حضرات میرے گاہک ہیں۔ رہی بات حشر کی، تو یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا ہو گا اور کیا نہیں ہو گا۔"

حضرت نے مُسکرا کر فرمایا۔ "تو اگر اتنا مطمئن ہے تو یقیناً تُو نے اپنے باٹ وزن

میں درست رکھے ہوں گے، کیونکہ ناپ تول میں بے ایمانی کرنے والے کی قیامت کے روز سخت پرسش ہوگی۔"

بنیے نے آپ کی بات سمجھتے ہوئے کہا "حضرت! آپ پتہ نہیں کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی میں تو اتنا جانتا ہوں جو کرے گا وہ بھرے گا۔ آپ خواہ مخواہ زمانے بھر کے لیے پریشان ہو رہے ہیں۔ جائیے اپنا کام کیجئے۔"

حضرت چلے گئے۔ خدا کا کرنا کیا ہوا اُسی روز شام کے وقت بنیے کے کم تولنے کی شکایت کسی نے کوتوالِ شہر سے کر دی۔ جس نے بے ایمانی کی پاداش میں بنیے کو دھر لیا اور گرفتار کر کے تھانے لے گیا۔ جب بنیا تھانے جا رہا تھا۔ اتفاق سے راستے میں اُسکی ملاقات حضرت خواجہ نخشبیؒ سے ہو گئی۔

حضرت نے فرمایا "اے بے وقوف انسان! آخر وہی ہوا نا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میں تمہیں سمجھاتا تھا، لیکن تم نے میری نصیحت پر کان نہیں دھرا۔"

بنیا خاموش رہا۔ کچھ عرصہ کے لیے اُس کو سزا ہوئی۔ اس دوران اُس کی دُکان بند رہی جب سزا کاٹ کر وہ واپس آیا اور دوبارہ دُکان کھولی تو حضرت کو اس کی اطلاع دی گئی۔ آپ بنفسِ نفیس اُس کی دُکان پر تشریف لائے۔

بنیے کو ایما نداری سے ناپ تول کی نصیحت کی اور سمجھایا "دیکھو! پہلے تم اپنی بے عملی کی سزا کاٹ چکے ہو۔ اچھا انسان وہ ہوتا ہے جو اپنی غلطی سے سبق سیکھے۔"

مگر بنیے نے شاید سبق نہیں سیکھا تھا۔ اُس نے نہایت ترشی سے کہا "حضرت! میں نے جُرم کیا تھا سو سزا کاٹ لی۔ آئندہ بھی جُرم کروں گا تو سزا مل جائے گی۔ آپ میری فکر چھوڑیں۔ میں آپ کے کہے سُنے میں نہیں آنے کا۔"

خواجہ صاحب کا دل اُس بنیے پر مہربان ہو چکا تھا۔ اس لیے آپ نے اُس کی بدتمیزی پر کوئی توجہ نہ دی اور اُس کو برابر سمجھاتے رہے۔ بار بار سمجھانے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اُس بنیے نے آپ کے سامنے اقرار کر لیا۔

"حضرت! میں دنیا کا ہر مشکل سے مشکل کام کر سکتا ہوں مگر اپنے بالوں اور پلڑوں کو درست رکھنا میرے لیے بہت دشوار ہے۔ میں ناپ تول میں بے ایمانی نہیں چھوڑ سکتا چاہے لاکھ بار کوتوال مجھے پکڑ کر لے جائیں۔"

خواجہ نخشبیؒ کے ہاتھ بے اختیار خدا کے سامنے دُعا کے لیے اُٹھ گئے انہوں نے بنیے

کی دُکان پر کھڑے کھڑے ہی خدا سے التجا کی۔

"اے خالق کائنات تُو نے اس کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے تو مقلب القلوب ہے ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ بنیا تیرا ہی بندہ ہے اس نے اپنے دل کی سیاہی اور سچائی کا اقرار کر دیا ہے۔ یہ بے بس ہے اُس کو ہدایت دے اور اس کو راہِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔"

حضرت دعا مانگ رہے تھے۔ بنیا دُعا سُن رہا تھا اور پگھل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اُس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ خدا نے اس بنیے پر ایسا کرم کیا کہ وہ ایمان دار اور سچا بن گیا۔ اُس نے اپنے باٹ صحیح کر لیے اور ترازو کے دونوں پلڑے بھی ہم وزن اور برابر کرا لیے۔ یوں ایک کامل انسان نے ایک گمراہ کو راہِ ہدایت پر چلنے کی رہنمائی کی۔

ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ "حضرت مَیں نے دنیا چھوڑ دی ہے اور اب دنیا میں واپس جانے کی بجائے آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "تم شوق سے میرے ساتھ رہو۔ مگر کب تک میرے ساتھ رہو گے ایک روز مجھے بھی مرنا ہے پھر تم کیا کرو گے۔"

اُس شخص نے کہا۔ "جب ایسا وقت آئے گا تو مَیں اللہ کا سہارا پکڑ لوں گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "بے وقوف جب بعد میں تم نے خدا کا سہارا اختیار کرنا ہے تو ابھی سے تُو اُس سے وابستہ ہو جا۔ تاکہ تمہیں کسی غیر اللہ کے سہارے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔"

وہ شخص رنجیدہ ہو کر بولا۔ "حضرت! کیا آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔"

آپ نے فرمایا۔ "تم مجھے معصوم سمجھ لو اور کسی معصوم شے کا سہارا کیا ہوتا ہے۔" آخر اُس شخص کو آپ کی بات ماننا پڑی اور اُس نے خدا کے ساتھ سچی لو لگا لی۔

حضرت خواجہ ضیاء الدین نخشبیؒ نے عمر بھر زمانے کو دینی خدمات سے متاثر کیا۔ اپنی ساری زندگی تالیف و تصنیف میں گزار دی۔ اور جب آپ کی عمر ننانوے سال کی ہوئی تو خدا نے آپ کو اپنے پاس بُلا لیا۔ یوں آپ نے ۷۵۱ھ اور ۱۳۵۰ء میں وصالِ خداوندی حاصل کیا۔

حضرت خواجہ عبید احرار رحؒ

مولانا شیخ ابوسعید مجلدؒ، مرزا شاہ رُخ کے زمانے میں بالکل نوجوان اور خوب رُو انسان تھے۔ علم و دانش نے آپ کے حُسنِ ظاہری میں ایک نکھار پیدا کر رکھا تھا۔ لیکن آپ اچانک اور اتفاقاً ایک ایسی آزمائش میں پھنس گئے۔ جس میں سے کسی نوجوان آدمی کا بظاہر نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ کو ایک نہایت خوبصورت عورت سے عشق ہو گیا۔ وصال کی خواہش اور قربِ محبوب نے آپ کو بے حال کر کے رکھ دیا۔ ایک روز تصوّرِ جاناں میں مستغرق تھے کہ اچانک آپ کی اُمید بَر آئی۔ آپ کی محبوبہ آپ کے گھر آگئی۔ گھر میں آپ اکیلے تھے۔ آپ نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور قربِ محبوب سے مُتمع ہونا چاہا۔ ابھی آپ محبوب سے چند قدموں کے فاصلے پر تھے کہ اچانک آپ کو آپ کے مرشد حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ "کی" آوازِ غیبی" سنائی دی۔

" ابوسعید! کارے کُنی"

یہ سُننا تھا کہ مولانا کی حالت غیر ہو گئی۔ آپ کے دل پر ایک ہیبت طاری ہو گئی اور آپ کے اعضا پر رعشہ سا طاری ہو گیا۔ آپ نے فی الفور اُس عورت کو اپنے دل اور گھر سے باہر نکالا اور فوراً باوضو ہو کر سربسجود ہوئے اور خدا سے استغفار کی۔

کچھ عرصہ بعد مولانا کی ملاقات خواجہ عبید اللہ احرارؒ سے ہوئی تو انھوں نے مسکرا کر

فرمایا۔

"ابوسعید! اگر اُس روز خدا تعالیٰ کو تیری دستگیری منظور نہ ہوتی تو شیطان تجھے برباد کر کے رکھ دیتا۔ اس لیے تیرے لیے لازم ہے کہ تو خدا کا شکر ادا کر اور آئندہ اپنے آپ کو ایسی لغویات سے دور رکھ ورنہ روحانیت و عرفان میں جو کچھ تو نے حاصل کیا ہے سب چھن جائے گا۔"

مولانا نے اُس روز اپنے مُرشد کے سامنے خدا سے استغفار و استقامت کا وعدہ کیا اور پھر عُمر بھر اپنے عہد پر قائم رہے۔

حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ "تاشقند" کے ایک دیہات "یاغستان" میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت باسعادت ماہ رمضان ۸۰۶ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد صاحب کا نام خواجہ محمود بن شہاب الدّین" تھا۔ آپ کے والد بھی نیک نہاد اور کامل انسان تھے۔ آپ کو ناصرالدّین احرار کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ آپ کے جدّامجد کا شمار عالی قدر بزرگانِ دین میں ہوتا ہے۔

مشہور بزرگ حضرت خواجہ مولانا یعقوب چرخی آپ کے پیرو مُرشد تھے۔ اسی وجہ سے آپ سلسلہ احراریہ کے سرکردہ بزرگ کہلاتے ہیں۔ طریقت و حقیقت میں آپ قائد و ہادی تھے۔ آپ کو اللہ پاک نے اتنی شان و شوکت عطا فرمائی تھی۔ ماوراالنہر اور فراسان کے باشندے آپ کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔

مشہور بزرگ حضرت مولانا عبدالرحمان جامیؒ، حضرت خواجہ احرار کے عقیدت کیش اور ارادت مند تھے۔ بلکہ مولانا موصوف نے تو اپنی بعض تصانیف کو بھی آپ کے نام سے ہی معنون کیا ہوا تھا۔ خواجہ احرارؒ کو بھی مولانا جامیؒ سے بڑی محبّت تھی ایک مرتبہ خواجہ صاحبؒ نے مسکرا کر مولانا جامی سے فرمایا۔

"مولانا! آپ نے تو اس علم و عرفان اور تصنیف و تالیف کے کام میں اپنے تمام بال سفید کر لیے ہیں۔"

مولانا نے یہ بات سُنی تو فی البدیہ یہ شعر پڑھا۔

پیرانہ سر کشیدم سر در رہِ سگانت
موئے سفید کردم جاروب آستانت

مولانا کو خواجہ احرارؒ نے گلے لگا لیا۔

خواجہ احرارؒ نہایت صاحبِ ثروت انسان تھے۔ آپ کو خدا نے نہایت متمول بنایا تھا۔ آپ کی زمینداری کا سلسلہ بہت پھیلا ہوا تھا۔ آپ بلا کے فیاض بھی تھے۔ جود وسخا کا یہ عالم تھا کہ آپ اپنا مال راہِ خدا میں صرف کر دیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود جب مال ختم ہونیکے قریب ہوتا تو خدا آپ کو انبار کے انبار عطا فرما دیتا۔

خواجہ احرار کو اوائل عمری میں القا ہوا کہ آپ کی مدد سے شریعت کو تقویت پہنچے گی۔ آپ کے دل میں اس بات کا یہ حل پیدا ہوا" شریعت کو پھیلانے کے لیے میں سلاطینِ وقت سے کوئی مدد لوں" اس مقصد کے لیے آپ مرزا عبداللہ حاکم سمرقند کے پاس گئے۔ آپ کے ہمراہ مولانا ناصرالدین احراری بھی تھے۔ سمرقند پہنچ کر جب آپ نے مرزا عبداللہ سے ملاقات کرنی چاہی تو اُس کے ایک معزور امیر نے آپ سے آپ کی آمد کی غایت پوچھی۔ آپ نے اُس کو اپنے آنے کا سبب بتایا۔

امیر بہت بدتمیز آدمی تھا اُس نے آپ کے مرتبے کا لحاظ کیے بغیر کہا۔

" دیکھیں حضرت! ہمارا حاکم مرزا عبداللہ بڑا بے پرور اور جوانِ رعنا ہے۔ وہ دین کے معاملات اور درویشوں سے ملاقات میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ واپس چلے جائیں۔"

آپ نے فرمایا" اے امیر! ہم جیسے درویشوں کا سلاطین سے کیا کام۔ ہم خدا کے حکم سے یہاں آئے ہیں۔ اگر مرزا کو خدا کے کاموں اور خدا کے بندوں سے کوئی دلچسپی نہیں تو ہمیں بھی اُس سے کوئی علاقہ و واسطہ نہیں۔ ہم واپس جاتے ہیں لیکن یاد رکھو۔ تمہارا یہ حاکم اگر خدا کی نیابت کے فرائض انجام نہیں دے سکتا تو اُس کو ہٹا کر دوسرا حاکم لایا جائے گا۔"

یہ کہہ کر آپ سمرقند سے تاشقند کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا وہ بدتمیز امیر ایسا بیمار ہوا کہ آناً فاناً اس کو موت نے اپنے نرغے میں لے لیا۔ اور اُس کی موت سے تقریباً ایک مہینہ بعد ۸۵۵ھ میں سلطان ابوسعید مرزا بن مرزا شاہ رُخ بن امیر تیمور ترکستان سے ظاہر ہوا اور مرزا عبداللہ پر حملہ کر کے اُسے ہلاک کر دیا۔

مرزا سلطان ابوسعید بڑا نیک خدا رسیدہ اور حضرت کا معتقد تھا۔ وہ اسلام کے معاملات

اور خدا کے احکامات کی باقاعدگی سے پابندی کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی خواجہ احرارؒ اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ مرزا بابر بن مرزا نصیر بن مرزا شاہ رُخ بن امیر تیمور ایک لاکھ سپاہ سے کرہ خراسان سے سمرقند کی طرف متوجہ ہوا۔ مرزا بابر بڑا طاقتور حکمران تھا اُس کا مقابلہ حاکم سمرقند سلطان ابوسعید مرزا کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لیے ابوسعید کے امیروں نے اُسے مشورہ دیا کہ آپ ترکستان چلے جائیں اور وہاں جاکر قلعہ نشین ہو جائیں۔ سلطان کو امراء کا مشورہ پسند نہ تھا مگر وہ کچھ اور کر بھی نہ سکتا تھا۔ چنانچہ سامان باندھ لیا گیا اور روانگی کی تمام تیاریاں مکمل کر لیں گئیں۔ جانے سے پہلے سلطان ابوسعید حسبِ عادت حضرت خواجہ احرارؒ کی خدمت میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔

حضرت نے پوچھا۔" ابوسعید! کدھر کی تیاری ہے۔"

سلطان نے مرزا بابر کی لشکر کشی اور اپنی بے بسی کی روداد سنائی اور روانگی کے پروگرام سے حضرت کو آگاہ کیا۔

حضرت نے فرمایا۔" ابوسعید! تمہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری مہم کی ذمہ داری مَیں نے اپنے سر لے لی ہے۔ اور تم گھبراؤ مت تمہاری ساری مشکلات سمرقند میں ہی حل ہو جائیں گی۔"

حضرت کے حکم پر سلطان ابوسعید نے ترکستان جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور تیاریاں موقوف کر دیں۔ امیروں نے بہت واویلا مچایا کہ حضرت ہمیں مروا دیں گے مگر مرزا سلطان ابوسعید نے امیروں کو اپنا حتمی فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔" چاہے کوئی میرا ساتھ دے یا چھوڑے مَیں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ مجھے حضرت خواجہ احرارؒ کی زبانِ مبارک پر یقین کامل ہے اور انشاء اللہ ان کا کہنا کبھی غلط نہیں ہوگا۔"

یہ کہہ کر سلطان سمرقند میں ہی قلعہ نشین ہو گیا اور حضرت کے حکم پر عمل پیرا ہونے کی تیاریاں کرنے لگا۔

دوسری طرف مرزا بابر جب سمرقند کے قلعہ کے اردگرد پہنچا تو اُس کا سالارِ خلیل سمرقند کی عیدگاہ کے دروازے پر ٹھہر گیا اور حملے کی تیاری کرنے لگا کہ اچانک سمرقند کے قلعہ سے مرزا سلطان کے چند آدمی نکلے اور انھوں نے خلیل کے لشکر پر حملہ کر کے اُس کو گرفتار کر لیا۔ مرزا بابر سمرقند کے پرانے قلعے میں اُترا ہوا تھا۔ اُس کے لشکری سلطانِ

معیشت کے لیے جس طرف جاتے اہل سمرقند ان کو پکڑ کر اُن کے ناک اور کان کاٹ دیتے۔
مرزا بابر اہل سمرقند کے اس طرزِ عمل سے سخت پریشان ہوا۔ ابھی یہ پریشانی موجود ہی تھی کہ ایسی وبا پھیلی کہ مرزا بابر کے گھوڑے لگاتار بیمار ہو کر مرنے لگے۔ اس ناگہانی مصیبت نے مرزا بابر کو اور زیادہ پریشان کیا۔ اُس کو جب کوئی اور صورت نظر نہ آئی تو اُس نے مولانا محمدؒ نعمائیؒ کو حضرت خواجہ احرارؒ کی خدمت میں روانہ کیا اور صلح کی درخواست کی۔

مولانا محمد نعمائی نے اثنائے گفتگو میں تفاخر کہا۔

"حضرت! ہمارا مرزا بہت غیور اور عالی ہمت بادشاہ ہے جس طرف جاتا ہے بغیر اسیر کے واپس نہیں آتا۔"

حضرت نے جواب دیا۔ "مولانا! آپ خاطر جمع رکھیں میں آپ کے مرزا کے دادا مرزا شاہ رُخ کے زمانے میں ہرات میں تھا۔ اُس نے میری بہت خدمت کی۔ یہ اُس خدمت کا ہی پاس و لحاظ ہے کہ مرزا بابر ابھی تک زندہ ہے۔ ورنہ اب تک اُس کا کام تمام ہو چکا ہوتا۔"

مولانا محمدؒ نعمائی نے اپنی غرورانہ بات کی معذرت کی اور پھر آخرکار مرزا بابر کی صلح کی درخواست منظور ہوئی اور وہ عفو خواہ ہو کر واپس چلا گیا۔"

سلطان ابوسعید مرزا عمر بھر حضرت کا تابع فرمان رہا۔ ۲۵ رجب ۸۷۳ھ کو اُس نے وفات پائی۔ اس کے پسماندگان میں گیارہ بیٹے تھے جو برسرِ حکومت آئے۔ جن میں مرزا بیگ کابل، مرزا سلطان احمد سمرقند، مرزا عمر شیخ ولایت اور جان و فرغانہ اور مرزا سلطان محمود حصار و قندز و بدخشان کے حکمران ہوئے۔

مرزا سلطان محمود اور مرزا سلطان احمد میں اکثر ٹھنی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ مرزا سلطان محمود نے سمرقند پر یلغار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مرزا سلطان احمد اپنے باپ کی طرح سمرقند کا حاکم اور شریف النفس انسان تھا اور حضرت خواجہ کا مُرید بھی تھا۔ وہ اپنے بھائی سے مقابلہ آرائی کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔

حضرت خواجہ احرار نے مرزا سلطان محمود کو خط لکھا اور سمرقند پر چڑھائی کرنے سے روکا مگر وہ باز نہ آیا۔ اُس کو اپنے بے شمار لاؤ لشکر اور ساز و سامان پر ناز تھا۔ چار ہزار ترکمان برکاب چغتائی لشکر سے بچنے کے لیے مرزا سلطان احمد اس جنگ سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ سیدھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سمرقند چھوڑ دینے کی اجازت چاہی

آپ نے اُس کو تسلی دی اور فرمایا۔

" سلطان احمد تم مت گھبراؤ تمہارے معاملے کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر تمہارا دشمن مغلوب نہ ہوا تو تم مجھ سے موافذہ کرنا۔"

یہ کہہ کر آپ نے بادشاہ کو اپنی خانقاہ میں پناہ گزیں کر لیا اور اُس کی تسلی کے لیے خانقاہ کے عقبی دروازے کے آگے ایک برق رفتار اونٹنی بٹھا دی اور مرزا سلطان احمد کو کہا۔

" اگر خدانخواستہ تمہارے بچنے کی کوئی صورت نہ رہی تو تم اس عقبی دروازے سے نکل کر اس تیز رفتار اونٹنی پر سوار ہو کر کہیں بھی نکل جانا۔"

یہ کہنے کے بعد آپ نے اپنے مریدوں مولانا سید حسین، مولانا قاسم، میر عبدالاولیٰ اور مولانا جعفر کو جو آپ کے اکابر اصحاب میں سے تھے کو حکم دیا کہ خانقاہ کے دروازے کے برج میں جا کر مراقبہ کریں۔ انھوں نے حکم کی تعمیل کی اور مراقبہ شروع کر دیا۔ ان حضرات نے مراقبے میں ایک بڑا لشکر دیکھا جس کا مقابلہ ایک اور بڑا لشکر کر رہا ہے جس کا ہر سپاہی حضرت خواجہ احرارؒ کا ہم شکل ہے۔

اُدھر مرزا سلطان محمود جب میدان میں اُترا تو اُس کا مقابلہ مرزا سلطان احمد کے مٹھی بھر سپاہیوں نے اس بے جگری سے کیا کہ سپاہی خود کہتے تھے کہ ہمیں یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہم سب کے ساتھ کوئی ایک مددگار بھی لڑ رہا ہے۔ مرزا سلطان محمود اپنے تیر کمانوں اور امیروں کی جماعت کے ساتھ ایک تالاب کے کنارے کھڑا تھا۔ ناگاہ تالاب کی بالائی زمین کا ایک حصہ پھٹ گیا اور ایک دھماکہ ہوا جس سے چار سو سوار زمین کے اندر دھنس کے مر گئے۔ ابھی یہ آفت ذرا رُکی ہی تھی کہ اچانک زور کی آندھی چلی جس نے گرد و غبار کا ایسا طوفان اُٹھایا کہ سارا لشکر پریشان ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان محمود کو شکست ہوئی اور مرزا سلطان احمد اور شہر کے دیگر لوگوں نے پانچ کوس تک اُس کے لشکر کا تعاقب کیا اور بہت سا سامان، گھوڑے اور مالِ غنیمت لے آئے۔ یوں خواجہ احرارؒ کے ہاتھوں تیمور کے خاندان کے متعدد بادشاہوں نے فیض و کمال حاصل کیا۔

حضرت خواجہؒ کا ایک خادم سمرقند جانے لگا تو آپ نے اُس کو فرمایا۔ "اے عزیز! سمرقند سے ہمارے لیے چند ڈبے شہد لیتے آنا۔" وہ خادم سمرقند سے واپسی پر کئی ڈبے شہد بھرے

سربمہر کرکے لایا۔ راستے میں ایک بزاز جو اُس کا دوست تھا اُس کی دکان پر وہ ٹھہر گیا۔ دکان پر اُس کی ملاقات ایک زنِ بازاری سے ہوگئی۔ اُس شخص نے حرام کاری کی نیّت سے اُس عورت سے بات چیت کی لیکن وہ اپنا مقصد نہ پا سکا اور واپس اپنے سفر پر روانہ ہوا۔ جب حضرت خواجہؒ کی خدمت میں پہنچا اور شہد کے ڈبے پیش کئے۔ آپ نے ڈبوں کو کھولے بغیر کہا۔

"اے کم بخت! مَیں نے تو تمہیں شہد لانے کو کہا تھا تُو شراب لے آیا ہے۔"

خادم نے عرض کی: "حضرت مَیں تو شہد لایا ہوں۔"

آپ نے ڈبے کھولنے کا حکم دیا تو ہر ڈبے میں شہد کی بجائے شراب تھی۔

حضرت خواجہ احرارؒ کے اوائل جوانی کا ایک واقعہ ہے جو کرامت کے زمرے میں آتا ہے۔ "آپ ایک دفعہ مولانا سعدالدین کاشغریؒ کے ساتھ ہرات میں سیر کر رہے تھے کہ آپ نے دیکھا پہلوانوں کا دنگل ہو رہا ہے آپ بھی کُشتی دیکھنے لگے۔ اُس دوران آپ جس پہلوان کی طرف دیکھتے تھے یا توجہ فرماتے تھے وہ جیت جاتا تھا اور جو آپ کی نظرِ التفات سے محروم رہتا وہ ہار جاتا تھا۔"

مولانا زادہ فرکیؒ، مولانا نظام الدینؒ کے مرید تھے جو اپنے مُرشد کے وصال کے بعد حضرت خواجہ احرارؒ کی خدمت میں آگئے۔ وہ بیان فرماتے ہیں۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے سردیوں کے دن تھے مَیں اور خواجہ احرارؒ کسی گاؤں میں جا رہے تھے۔ سردیوں کے دن چھوٹے ہوتے ہیں۔ عصر کی نماز تک ہم نے بمشکل آدھا سفر طے کیا۔ شام ہونے کو آگئی مگر ابھی ہم منزل سے بہت دُور تھے۔ میرے دل میں خیال ہوا کہ سردیوں کے اس موسم میں اگر رات راستے میں آگئی تو کیا ہوگا۔ ابھی یہ خیال میرے دل میں ہی تھا کہ خواجہ صاحب نے فرمایا۔

"مولانا! اپنی گھوڑی تیز دوڑاؤ ہو سکتا ہے خدا ہمیں منزل پر پہنچا دے۔"

حضرت کے کہنے سے مَیں نے اپنی گھوڑی کی رفتار اور تیز کر دی۔ مَیں گھوڑی بھی دوڑا رہا تھا اور بار بار میری نگاہ ڈوبتے سورج کی ٹکیہ پر بھی تھی۔ مَیں بار بار محسوس کر رہا تھا کہ سورج کی ٹکیہ ایک جگہ یوں جمی ہوئی تھی جیسے کسی نے اُس کے اندر کوئی میخ گاڑ رکھی ہو

اور سورج مسلسل افق پر ٹھہرا ہوا ہے۔

آخر ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے اور ابھی ہم گاؤں کے اندر پہنچے ہی ہوں گے کہ سورج مکمل طور پر غروب ہو گیا۔ اور اتنے میں عشاء کی اذانیں ہونے لگیں۔ میں بہت حیران تھا کہ سورج کی ٹکیہ کا مسلسل لٹکے رہنا، سورج غروب ہوتے ہی عشاء کی اذان ہو جانا چہ معنی دارد؟

میری حیرانی دیکھ کر حضرت خواجہؒ فرمانے لگے: "میاں حیرانی کی کیا بات ہے، تم پریشان تھے میں نے اللہ سے گزارش کی" اے اللہ ہمیں غروبِ آفتاب سے پہلے منزل پر پہنچا دے" خدا نے میری التجا قبول کر لی اور سورج کو تب غروب کیا جب ہم منزل پر پہنچ گئے۔ اوقات کے مطابق سورج کو غروب ہوئے اتنا وقت گزر چکا تھا اس لیے عشاء کی اذانیں ہونے لگیں۔ وہ تو حق تعالیٰ نے ہماری خواہش کے لیے سورج کو دیر سے غروب کیا۔

ایک مرتبہ ایک شخص کا ایک غلام گم ہو گیا۔ اُس نے اُس کو ہر کہیں تلاش کیا مگر کوشش بسیار کے باوجود غلام نہ مل سکا۔ وہ شخص حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مسئلہ بیان کیا۔ آپ نے اُس کو ایک گاؤں کا نام لے کر فرمایا" فلاں گاؤں سے اپنے غلام کو تلاش کرو۔" اُس شخص نے کہا حضرت وہاں سے تو میں کئی مرتبہ بے نیلِ مرام واپس آ چکا ہوں۔" آپ نے فرمایا" تب تم اپنی مرضی سے وہاں گئے تھے اب خدا کی مرضی اور حکم سے وہاں جاؤ۔"

وہ شخص حضرت کے بتائے ہوئے گاؤں میں گیا ابھی چند ہی میل چلا تھا کہ اُس نے دیکھا اُس کا غلام سر پر گھڑا اُٹھائے کھڑا ہے۔ اُس شخص نے غلام کو فوراً پکڑ لیا اور پوچھا۔

"اے غلام! تو اب تک کہاں تھا؟" غلام نے عرض کی" اے آقا! میں ایک روز آپ کے گھر سے نکل رہا تھا کہ ایک شخص مجھے بہکا کر خوارزم لے گیا اور وہاں مجھے فروخت کر دیا۔ میں خوارزم میں اپنے نئے مالک کے لیے دریا سے پانی بھر کر لا رہا تھا کہ اچانک آپ کو سامنے دیکھا اور اب حیران ہوں کہ میں خوارزم سے سمرقند کیسے پہنچ گیا۔"

وہ شخص اپنے غلام سمیت حضرت خواجہ احرارؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ساری بات سنائی۔ آپ نے اُس شخص کو مشورہ دیتے ہوئے فرمایا" اے شخص اب تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تُو اس غلام کو آزاد کر دے۔"

اُس شخص نے آپ کے حکم کو تسلیم کیا اور اپنے غلام کو آزاد کر دیا۔

حضرت خواجہ احرارؒ نے نوّے سال سے چند ماہ کم عمر پائی اور بروز شنبہ ۲۹ ربیع الاوّل ۸۹۵ھ میں واصلِ حق ہوئے۔ آپکا کا مزار پُروقار سمرقند میں آج بھی زیارت گاہِ عام و خاص ہے۔

حضرت ابواسحاق ابراہیم شیبانی رحمۃ اللہ علیہ

اللہ کے ایک بزرگ اپنے ارادت مندوں کے ساتھ سفر سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں انھوں نے کہا مجھے مسور کی دال کھانے کی خواہش ہو رہی ہے۔ چنانچہ ایک ارادت مند نے آپ کے لیے مسور کی دال کا بندوبست کر دیا جسے آپ نے شوق سے کھایا۔ سفر سے واپسی پر اس بزرگ کی طبیعت جب ذرا سیر کی جانب مائل ہوئی تو وہ یوں ہی چہل قدمی کے لیے شہر کے بازار میں نکل آیا۔ راستے میں اُس نے ایک جگہ بہت سے مٹکے پڑے ہوئے دیکھے۔ ولی اللہ نے لوگوں سے پوچھا۔ ان مٹکوں میں کیا ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید آپ کا تعلق محتسب کے عملے سے ہے۔ اس لیے ایک شخص نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا کہ ان مٹکوں میں شراب بھری ہے۔ یہ سُن کر بزرگ پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ ان بزرگ کے اندر سے آواز آئی: "اے بندے خدا! جب تجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ مٹکوں میں شراب بھری ہوئی ہے تو تم مسلمان ہونے کے باوجود پھر بھی بے حس و حرکت کھڑے ہو۔"

چنانچہ یہ غیبی آواز سنتے ہی آپ نے کسی کو بتائے بغیر سارے مٹکے توڑ ڈالے اور یوں مٹکوں سے شراب نکل کر سڑک پر بہنے لگی۔ وہاں پر موجود بہت سے لوگ یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ پھر اچانک ہجوم میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اُس نے آپ سے پوچھا

"حضرت آپ یہاں کیسے؟"

بزرگ نے جواب دیا" بھائی میں تو ایک عرصہ سے یہاں رہ رہا ہوں۔" ہجوم میں سے کسی نے اس شخص سے آپ کے بارے میں پوچھا" کیا تم ان سے واقف ہو کہ یہ کون ہیں؟"

اُس شخص نے جواب دیا" کیوں نہیں میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں یہ اللہ کے خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ انھوں نے اپنے پیر و مرشد کے ساتھ چالیس سال مکہ معظمہ میں گزار دیئے ہیں۔"

پوچھنے والے نے اپنا شک دور کرنے کے لیے پھر سوال کیا۔ "کہیں ان کا تعلق محتسب کے عملے سے تو نہیں ہے؟"

اُس نے جواب دیا" میں کہہ تو رہا ہوں کہ یہ ایک بڑے صوفی بزرگ ہیں ان کا تعلق کسی قسم کے دنیاوی عملے سے نہیں ہے۔"

اب تو وہ شخص غصّے سے بے قابو ہو گیا اور چیختے ہوئے کہنے لگا" لوگو! ہم نے تو اس بزرگ کو محتسب کا آدمی سمجھ کر خاموشی اختیار کی تھی لہذا اب یہ شخص جانے نہ پائے جس نے ہمارے شراب کے مٹکے توڑ ڈالے ہیں۔" اتنا سننا تھا کہ وہاں پر موجود لوگوں نے ان بزرگ کو پکڑ لیا۔ دکاندار نے آپ سے پوچھا" جب تُو محتسب کے عملے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تو تُو نے میرے مٹکے کیوں توڑے ہیں؟"

اس پر بزرگ نے جواب دیا" میں ایک مسلمان ہوں اور ایک مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے دوسرے بھائی کو بُری چیز سے بچائے چنانچہ میں نے یہ فرض ادا کر دیا۔" اب تو دکاندار اور بھی غصّے میں آگیا اور بزرگ سے کہنے لگا۔

" شاید تجھے یہ علم نہیں کہ محتسب کے علاوہ اور کسی کا یہ فرض نہیں ہے۔ اب تمہاری خیر اسی میں ہے یا تو میرا نقصان پورا کر دو یا پھر حاکم شہر کے پاس چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

چنانچہ بزرگ نے اس دکاندار کا نقصان پورا کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ تب لوگ انھیں پکڑ کر حاکم شہر کے پاس لے گئے اور سارا واقعہ تفصیلاً کہہ سُنایا۔ حاکم نے بزرگ سے پوچھا" کیا یہ دکاندار صحیح کہہ رہا ہے؟"

بزرگ نے کہا" یہ بالکل درست کہہ رہا ہے۔" اب تو حاکم بھی غصّے سے لال پیلا ہو گیا اور بزرگ سے کہنے لگا" اگر یہ دکاندار سچا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تُو مجرم ہے تُو نے اس شخص کو نقصان پہنچایا ہے اور بلاشبہ تُو سزا کا مستحق ہے۔"

بزرگ نے جواب دیا۔ "اے حاکمِ شہر! مَیں نے جو کچھ کیا ہے ایک مسلمان کی حیثیت سے کیا ہے۔ تُو بھلا مجھے کیا سزا دے گا؟"

یہ بات سُن کر حاکم مزید طیش میں آگیا۔ اُس نے کہا: "مَیں تمہیں کوڑے لگواؤں گا اور تجھے قید خانے میں ڈال دوں گا۔"

بزرگ نے کہا: "تُو مجھے جو چاہے سزا دے لیکن یاد رکھ مَیں اس کا سزاوار نہیں ہوں اگر تُو مجھے ناحق سزا دے گا تو قیامت کے روز تیری پکڑ ہوگی۔"

اب تو حاکم آپے سے باہر ہوگیا۔ اُس نے بزرگ پر سرسری سا مقدمہ چلا کر اُسے سزا سُنا دی کہ اس شخص کو سو کوڑے مارنے کے بعد جیل میں ڈال دیا جائے۔

حاکم کے حُکم پر ملازموں نے بزرگ کو سو چھڑیاں ماریں اور پھر اسے قید خانے میں ڈال دیا۔

اس واقعے کو کافی روز گزر گئے پھر ایک روز حاکمِ شہر نے ان بزرگ کو دربار میں طلب کیا۔ اُس وقت حاکمِ شہر کے پاس ایک صوفی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ قید خانے سے آتے ہوئے اس بزرگ کو دیکھ کر وہ صوفی اپنی جگہ سے فوراً کھڑے ہوگئے اور حاکمِ شہر سے کہا۔ "تُو نے اللہ کے اس بندے کو قید خانے میں ڈال کر اچھا نہیں کیا۔"

اس پر حاکمِ شہر بولا: "مَیں نے جو کچھ کیا درست کیا۔ انصاف کے تقاضے پورے کیے ہیں۔ مَیں اپنے کیے پر نادم نہیں۔"

صوفی نے کہا: "شراب حرام ہے اور اس بزرگ نے وہی کچھ کیا جو ایک سچا مسلمان کر سکتا تھا۔"

حاکمِ شہر نے کہا: "یہ کام اس بزرگ کا نہیں بلکہ محتسبِ اعلیٰ کا تھا کسی اور کا محتسب کے ہ میں دخل دینا ایک ناقابلِ معافی جُرم ہے۔"

حاکم کے پاس بیٹھے ہوئے صوفی نے سزا پانے والے بزرگ کو اپنے ساتھ لیا اور اپنی خانقاہ میں سے کئے ۔ وہاں جاکر پوچھا: "اے بندے خدا! مجھے یہ بتا کہ تمہارے ساتھ یہ سب کیونکر ہوا؟"

بزرگ نے کہا: "بظاہر تو کوئی وجہ سمجھ میں آ نہیں رہی، بجز اس کے کہ اس واقعے سے پہلے مَیں نے اپنی خواہش پر مسور کی دال کھالی تھی۔ شاید اللہ کو میری یہ بات ناگوار گزری ہو۔"

اس کے بعد انھوں نے پورا واقعہ سُنا دیا۔

بزرگ کی بات سُن کر صوفی بولے: "تب تو تمہیں واقعی بہت کم سزا ملی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ درویش کی سب سے بڑی آزمائش اور نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ نفس کی خواہش سے دُور رہے۔"

صوفی کی بات کا اس بزرگ پر بہت گہرا اثر ہوا اور پھر انھوں نے زندگی بھر اپنے نفس کو اپنے اختیار میں رکھا۔

حاکمِ شہر سے قید پانے والے یہ عظیم بزرگ حضرت ابو اسحاق ابراہیم شیبانیؒ تھے۔ چونکہ آپ کے والد کا نام شیبان تھا اس لیے آپ شیبانی کہلائے۔ آپ کے بچپن کے حالات کے بارے میں تاریخ کچھ زیادہ واضح نہیں ہے۔ حضرت ابو اسحاق ابراہیم شیبانی کو بچپن ہی سے سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ اس سیاحت کے دوران ان کی ملاقاتیں عبداللہ مغربی اور ابراہیم خواص سے ہوتی رہیں۔ آپ کی شخصیت اس قدر متاثر کُن تھی کہ ہر ملنے والا آپ کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا تھا۔ آپ کو کوئی جگہ رہائش کے لیے پسند نہیں تھی، جہاں چاہتے رُک جاتے۔ آپ طبعاً تنہائی پسند تھے۔ بھیڑ بھاڑ اور ہجوم سے آپ کو نفرت تھی۔ بڑے بڑے صوفیائے کرام آپ کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتے ہیں۔

سیر و سیاحت کے دوران ابی عبداللہ مغربی سے ملاقات ہوئی اور آپ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ یہاں سے فیضان شروع ہوا تو آپ میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی چلی گئی۔ آپ نے ابی عبداللہ مغربی کے ساتھ سیاحت شروع کی اور دورانِ سفر بہت سی ایسی کیفیات اور واردات ان پر واضح اور منکشف ہوئیں جن سے پہلے وہ ناآشنا تھے اور ایسے ایسے عجیب و غریب اشخاص سے ملاقاتیں ہوئیں کہ ان سے کبھی اور کہیں اور ملاقات ممکن نہ تھی۔

ابی عبداللہ مغربی نے آپ سے پوچھا: "اے ابنِ شیبان! چند دن پہلے سفر سے واپس آئے ہو، تکان کا کیا حال ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "پیر و مرشد! تکان کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ اس دوران میں جن کیفیات اور لذّات سے متمتع ہوا ہوں وہ میرے لیے ایک گراں مایہ سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ ارشاد فرمائیں، میری تکان کا خیال ہرگز نہ فرمائیں۔"

ابی عبداللہ مغربی نے فرمایا: "میں کوہِ طور جا رہا ہوں، جہاں موسیٰ کلیم اللہ کی اپنے رب سے باتیں ہوا کرتی تھیں۔ وہ برکتوں کا مقام ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر آپ اس سفر میں مجھے اپنے ساتھ لے جانا پسند فرمائیں گے تو

قابلِ اعتماد کوآپریٹو ادارہ

پاسبان

قائم شدہ ۱۹۶۹

صدر دفتر اسلام آباد
فون نمبر: ۸۲۴۵۰۴
۸۲۳۶۷۴

سنٹرل آفس لاہور
فون نمبر ۵۷۳۱۸

میں ضرور چلوں گا۔"

ابی عبداللہ نے اپنے منصوبے کا ذکر کیا: "میں وہاں تنہا نہیں کچھ لوگوں کے ساتھ جا رہا ہوں اور تم سے بطورِ خاص چلنے کی درخواست کر رہا ہوں۔"

انھوں نے پوچھا: "آپ کے ساتھ اور کتنے لوگ جا رہے ہیں؟"

ابی عبداللہ نے جواب دیا: "تقریباً ستر آدمی۔ یہ سب اس جگہ کی زیارت کرنا چاہتے ہیں۔ سوچا، اگر تم بھی اس سفر میں میرے ساتھ رہو تو کیا ہی اچھی بات ہو۔"

ابنِ شیبان نے عرض کیا: "حضرت! میں نے کہہ جو دیا کہ میں آپ کا تابعدار ہوں، آپ حکم دیں میں اس کی تعمیل کروں گا۔"

ابی عبداللہ نے اس جواب سے خوش ہو کر کہا: "مجھ کو بھی تم پر فخر ہے ابنِ شیبان! جاؤ سفر کی تیاری کرو بقیہ لوگ تیار ہیں۔"

ابنِ شیبان جس حال میں تھے کھڑے ہو گئے۔ بولے: "حضرت! مجھے کون سی تیاری کرنا ہے۔ میں بھی جس حال میں ہوں اسی میں چل پڑوں گا۔"

ابی عبداللہ مسکرائے اور بولے: "پھر کیا ہے۔ اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔"

ابنِ شیبان نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر کہا: "میں تیار ہوں چلیے۔"

یہ اپنے پیر مرشد کے ساتھ کوہِ طور کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ ستر آدمی اور تھے۔ سفر میں بڑی چہل پہل تھی۔ راستے میں ابی عبداللہ اور آپ میں مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ آپ نے اپنے پیر مرشد سے پوچھا: "حضرت! ایک سوال کئی دن سے کلبلا رہا ہے۔ سوچتا ہوں، وہ سوال آپ سے کروں یا نہ کروں۔"

ابی عبداللہ نے تسلی دی اور کہا: "اگر کوئی سوال تمہارے دل میں پیدا ہوا ہے تو اس کے اظہار میں بخل سے کام مت لو۔"

آپ نے اپنے مرشد سے پوچھا: "کیا آپ بتائیں گے کہ عارف کی پہچان کیا ہے؟"

ابی عبداللہ نے جواب دیا: "اس کا جواب ابھی دوں یا بعد میں؟"

آپ نے فرمایا: "ابھی اسی وقت، کیونکہ آپ کے جواب سے جو فائدہ میں اس وقت حاصل کر سکتا ہوں کسی اور وقت ہرگز نہیں۔"

ابی عبداللہ نے کہا: "لیکن میں اس کا جواب کسی اور طرح دینا چاہتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا: "مجھ کو تو اپنے سوال کا جواب درکار ہے۔ وہ جس طرح چاہیں دیں۔"

ابی عبداللہ خاموش ہو گئے۔ سفر جاری رہا۔

کئی دن بعد یہ لوگ کوہِ طور کے سامنے پہنچ گئے۔ ہر ایک کے چہرے پر بشاشت کے آثار نمایاں تھے۔

ابی عبداللہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "دوستو! اب تمہارے سامنے کوہِ طور ہے، ایک متبرک اور مقدس مقام۔ اپنے جذبوں کو قابو میں رکھو اور اس طرح آگے بڑھو کہ یہاں کے ذرّے ذرّے کی محبت سے تمہارے دل سرشار ہوں اور اس سرشاری میں بھی ہوشیاری بطورِ خاص ملحوظِ خاطر رہے۔"

آپ کے دل کی عجیب حالت تھی، بے اختیاری اور بے قراری کا یہ عالم تھا کہ انھیں کچھ پتا نہ تھا کہ وہ پاؤں کہاں رکھ رہے ہیں اور وہ کہاں پڑ رہا ہے۔

وہاں ایک طرف سے ایک نوجوان نمودار ہوا اور کچھ کہے سنے بغیر ان میں شامل ہو گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا: "تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟"

نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا مگر الگ بھی نہیں ہوا۔

آپ نے اس سے ایک بار پھر دریافت کیا: "تو بولتا کیوں نہیں؟ تو کون ہے اور ہم میں کیوں شامل ہو گیا؟"

نوجوان نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس طرح چپ تھا گویا گونگا ہو۔

ابی عبداللہ نے ظہر کی نماز پڑھی تو جماعت میں یہ نوجوان بھی شامل ہو گیا۔ اس میں ایک بات جو سب سے نمایاں اور واضح تھی یہ تھی کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں معلوم ہوتا تھا از خود رفتگی میں اسے خود اپنا بھی ہوش نہ تھا۔ نماز اتنے انہماک اور شوق سے پڑھی کہ اس کا اثر ہر کوئی اپنے دل پر محسوس کرتا رہا۔

نماز کے بعد ابی عبداللہ نے حاضرین سے کہا: "اب تم کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

حاضرین نے جواب دیا: "بیشک، ہم سب گوش بر آواز ہیں۔"

ابی عبداللہ کے چہرے سے ان کی اندرونی کیفیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ انھوں نے کہنا شروع کیا: "جانتے ہو عارف کا قلب کیا ہوتا ہے؟"

حاضرین میں سے کسی ایک نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ ابی عبداللہ نے خود ہی جواب دیا۔ "عارف کا دل اللہ کی بارگاہ ہوتا ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے دوسرا سوال کر دیا۔ "اور اس بارگاہ کے دروازوں کے بارے میں

تم کیا جانتے ہو؟"

لوگوں نے پھر کوئی جواب نہ دیا اور آخرکار خود آپ نے اپنے اس سوال کا جواب بھی دے دیا۔ "اس بارگاہ کے دروازے ہمارے حواس ہیں، یہاں ہمارے حواس سے مراد عارف کے حواس ہیں، جس نے مناسب نزدیکی کے ذریعے عارف کے حواس کا قرب حاصل کر لیا اس کے لیے اس بارگاہ کے دروازے کھل جائیں گے جس نے اپنے اخلاق پر مالکانہ تصرف حاصل کر لیا۔ اس نے اپنے خالق کی عبادت کی۔"

آپ نے اس اجنبی نوجوان کو اس حال میں دیکھا کہ وہ آپ کی تقریر میں مستغرق اور منہمک تھا اس کو کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔

ابی عبداللہ نے پھر ایک سوال کر دیا۔ "اور عادت کیا ہے؟ کچھ جانتے ہو؟"

ہر طرف سے ایک ہی آواز آئی: "نہیں۔ ہمیں نہیں معلوم۔"

ابی عبداللہ نے اپنے سوال کا خود ہی جواب بھی دیا۔ "عادت وہ ہے جس میں لذتِ نفوس پائی جائے اور عبادت وہ ہے جس کا خالص مقصود ملکِ قدوس ہو۔ چاہے وہ نماز ہو یا روزہ، چاہے سونا اور کھانا ہو۔ ایک عارف کے لیے یہ سب عبادتیں ہیں۔"

کچھ توقف کے بعد انھوں نے مزید فرمایا۔ "جس نے اپنی عادتوں کو اپنا مالک بنا لیا، اس کی عبادتیں رائیگاں گئیں لیکن جس نے عادتوں کو قابو میں کر لیا، وہی بامراد عارف ٹھہرا۔ دوستو! آئینے کو دیکھو اس میں ہر شخص اپنی ہی شکل دیکھ سکتا ہے۔ تم اپنے آپ کو آئینہ بنا لو کہ خود غائب ہو جاؤ اور پھر اس میں وہی کچھ نظر آئے جو حقیقت ہو، حقیقتِ مجردہ بن جاؤ۔ سنو، احتیاج کی کوئی حد نہیں، یہ ایک لامتناہی سلسلہ کا نام ہے، ایک پوری ہوگی دس مزید پیدا ہو جائیں گی، تم کو کتنا لباس درکار ہے، کچھ جانتے ہو؟ بہت زیادہ نہیں۔ صرف اتنا کہ جب تم اسے پہن کر عاقلوں کے سامنے جاؤ تو وہ تمہیں بے وقوف نہ سمجھیں اور بے وقوفوں میں جاؤ تو وہ ہنسی نہ اڑائیں۔ سواری کے لیے تمہاری ٹانگیں کافی ہیں۔ دوسرے جانوروں کو کم سے کم تکلیف دو، یا پھر کوئی ایسی سواری جو تمہارے معیار کے عین مطابق ہو۔ کھانا ایسا ہو کہ اس میں قسموں کی بہتات نہ ہو، اور ایسا ہو جو جسم میں جا کے زندہ تو رکھے لیکن فتنہ و فساد نہ پیدا کرے، شر سے بچائے۔ یاد رکھو جو تم کھاؤ گے اس کے خواص اور اثرات بھی ہوں گے۔ جب دو چیزیں ملتی ہیں تو کوئی تیسری چیز وجود میں آجاتی ہے اور جب تین چیزیں مل جاتی ہیں تو کوئی نئی چیز وجود میں آجاتی ہے۔ اس طرح تم جو کھاتے ہو اس کے اثرات کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

میں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو مرغن غذائیں کھاتا ہو اور بیماریوں سے محفوظ رہتا ہو۔ اچھی غذائیں وہ ہیں جو سادہ اور مفرد ہیں۔ جب مرغن کھانے اندر جاتے ہیں تو یہ طبیعتوں میں فساد پیدا کرتے ہیں، مزاجوں میں شر کی صورت نمودار ہوتے ہیں۔ پُرتکلف لباس رعونت اور تکبّر پیدا کر دیتے ہیں اور دیکھو، عبادت کرو تو یہ مت سوچو کہ تم دوسروں سے ممتاز اور برتر ہو۔ یہ ساری باتیں بربادی کی ہیں، دنیا میں خواہشات، خود پرستی، ہوس، طمع اور جاہ پرستی کے طوفان اُٹھ رہے ہیں۔ ان طوفانوں میں جو بڑے بڑے تناور درختوں کی طرح سینہ تان کر کھڑے رہنے کی کوشش کرے گا اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے لیکن جو عاجزی اور فروتنی اختیار کرے گا، وہ چھوٹے چھوٹے گھاس کے پودوں کی طرح محفوظ اور سلامت رہے گا۔

ابی عبداللہ کی باتوں نے حاضرین اور سامعین کو وجد میں مبتلا کر دیا تھا۔ آپ کی ان باتوں سے اجنبی نوجوان بھی خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ابی عبداللہ کے قریب بیٹھ گیا۔ پاس ہی ابنِ شیبان بھی تشریف فرما تھے۔ ابی عبداللہ نے بطورِ خاص اس نوجوان سے پوچھا: "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تم بھی سن رہے ہو؟"

نوجوان نے اشک آلود نظروں سے آپ کی طرف دیکھا، وہ رو رہا تھا۔

ابی عبداللہ نے مزید دریافت کیا: "میں ابنِ شیبان کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ عارف کیا ہوتا ہے اور اس کی پہچان کیا ہے۔ کیا تم کو اس سوال کا جواب میں یہاں بھیجا گیا ہے؟"

نوجوان نے کوئی جواب تو دیا نہیں، جہاں بیٹھا تھا وہیں لیٹ گیا اور لمبی سانس لی۔ ایسی سانس جس میں کرب کی گرمی تھی اور پھر آہیں بھرنے لگا، وہاں سبھی نے یہ حیرت انگیز بات محسوس کی کہ اس کی سانس گھاس کے جس جس حصّے پر پڑی وہ جھلس گیا۔

ابنِ شیبان نے ابی عبداللہ سے پوچھا: "حضرت! یہ کیا ہے؟"

ابی عبداللہ نے جواب دیا: "یہ نوجوان عارف ہے اور اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کو جو کچھ معلوم ہو چکا ہے اس سے یہ دم بخود خاموش ہو گیا اور اب یہ اپنی زبان کو فضول باتوں کے لیے نہیں کھولتا۔ میں نے جو کچھ کہا، اس کے معرفت زدہ دل نے اس کو پوری طرح محفوظ اور مرتکز کر لیا۔"

ابنِ شیبان اور دوسرے لوگ ابی عبداللہ کی باتوں میں کچھ اتنے محو اور مستغرق ہو چکے تھے کہ انھیں اپنے ماحول کی بھی کوئی خبر نہیں تھی۔ ابنِ شیبان کو اچانک اس نوجوان کا خیال آیا اور اب جو انھوں نے سبزے پر اس نوجوان کو دیکھا تو اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ وہ معلوم نہیں کہاں اور

کس طرح غائب ہو چکا تھا۔

ابنِ شیبان نے اپنے پیر مرشد سے پوچھا: "حضرت! یہ نوجوان کہاں چلا گیا؟"

انھوں نے جواب دیا: "نوجوان عارف تھا اور عارف کو اپنے وجود پر اتنا اختیار ہوتا ہے کہ وہ جب اور جہاں چاہے، لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو سکتا ہے۔"

حاضرین دنگ تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔

ابنِ عبداللہ کو کوہِ طور ایسا پسند آیا کہ آپ نے وہیں دائمی قیام اختیار کیا اور وہیں آپ کا مزار بھی ہے۔ ان کے بعد ابنِ شیبان تنہا رہ گئے۔ ایک دن جب وہ اداس اور غمگین کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں ان کو مشہور صوفی ابراہیم خواص مل گئے۔ ابراہیم خواص کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ آپ نے شیخ ابراہیم خواص کو سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا "ابنِ شیبان! کیا بات ہے، تم اکیلے کیوں پھر رہے ہو؟"

آپ نے جواب دیا: "حضرت! میں اکیلا تو نہیں ہوں، میرے ساتھ میرا خدا بھی تو ہے۔"

ابراہیم خواص کو ان کا یہ جواب بہت پسند آیا کہنے لگے: "بے شک تم صحیح کہہ رہے ہو۔ اگر پسند کرو تو میرے ساتھ رہو۔"

آپ نے جواب دیا: "میں تو اس اجازت کا متمنی تھا، میں آپ کی صحبت میں ضرور رہوں گا۔"

اس وقت ابراہیم خواص کے ساتھ جو نوجوان موجود تھا.... مسلمان نہیں معلوم ہوتا تھا۔ آپ نے اس نوجوان کے بارے میں پوچھا: "حضرت! کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ جس طرح میں آپ سے واقف ہو گیا ہوں، اس نوجوان کے بارے میں بھی جان جاؤں۔"

ابراہیم خواص نے جواب دیا: "میں اس کو اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ یہ مجوسی ہے، ایک آتش پرست نوجوان۔ کل مجھے صحرا میں مل گیا تھا۔ کہنے لگا۔ بزرگوار! مجھے بھی اپنے ساتھ رکھیں۔ میں نے اس سے کہا کہ ساتھ رکھنے میں کوئی تکلیف نہیں لیکن میں تو کل کا مسافر ہوں، کیا اس راہ میں تو میرا ساتھی بن سکے گا۔ اس نے وعدہ کیا اور کہا کہ ہاں، میں نے بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے آپ کا ساتھ اختیار کیا ہے۔ اس لیے امید ہے کہ آپ کی صحبت سے مجھے بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچ جائے گا۔ چنانچہ کل سے یہ میرے ساتھ ہے۔"

آپ نے پوچھا: "کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکوں گا؟"

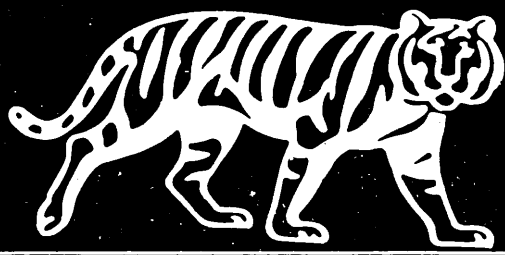
ابراہیم خواص نے جواب دیا۔ "اے ابنِ شیبان! میں نے توکل کا راستہ اختیار کیا ہے اور توکل کے اس سفر میں میں کسی حیلے کو بھی پسند نہیں کرتا۔ اب تم بتاؤ کہ کیا تم اس حال میں میرے

جب درد، نزلہ، زکام یا بخار
کی تکلیف شدید ہو تو
نکولس کی پیراسیٹامول
جلد آرام دیتی ہے۔

Nicholas

Paracetamol

Tablets



500 mg

شیر والی پیراسیٹامول
مؤثر اور
تیز اثر



ہمیشہ نکولس کی اصلی شیر والی پیراسیٹامول
لیجئے۔ نقلی گولی سے ہوشیار

پیراسیٹامول خالی پیٹ یا بہت بھوکے میں نہ لیں۔ بچوں سے دور رکھیں۔
طبیعت زیادہ خراب ہو تو ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

A-984

ASIATIC

ساتھ چل سکو گے؟"

انھوں نے جواب دیا: "جب ایک آتش پرست مجوسی نوجوان اتنی ہمت کرسکتا ہے تو میں کیوں نہیں آپ کا ساتھ دے سکتا۔"

ابنِ شیبان بھی ابراہیم خواص کے ساتھ رہنے لگے۔ یہ تینوں ایک ہفتہ تک ساتھ رہے اور ابنِ شیبان نے کسی کے منہ سے کھانے کا نام تک نہیں سنا۔ ان کو بھوک لگ رہی تھی اور کمزوری سے چلنا دوبھر ہو رہا تھا مگر کھانے کا کہیں پتا نہ تھا۔ ایک دن نقاہت کے عالم میں ابنِ شیبان نے پوچھا: "حضرت! کیا آپ کھانا نہیں کھاتے؟"

ابراہیم خواص نے جواب دیا: "کیوں؟ کھانا کھاتے کیوں نہیں؟"

آپ نے کہا: "ایک ہفتے سے تو آپ دونوں نے کچھ کھایا نہیں، میرا تو نقاہت سے حال ہی ابتر ہو چکا ہے۔"

ابراہیم خواص نے جواب دیا: "لیکن یہ بات تو میں پہلے ہی واضح کر چکا ہوں کہ میں راہِ توکل کا مسافر ہوں اور کسی حیلے بہانے کا قائل ہی نہیں۔"

ابنِ شیبان نے مجوسی نوجوان کی حالت پر غور کیا تو وہ بھی دگرگوں ہو رہی تھی۔ اس نے ابنِ شیبان کو اس قسم کی باتیں کرتے دیکھا تو اس میں بھی حوصلہ پیدا ہوا۔ کہنے لگا: "حضرت! اب مزید یارائے صبر نہیں رہا۔ اب تو بھوک نے اس قابل بھی نہیں رکھا کہ میں آپ کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھ سکوں۔ مجھے کھانا درکار ہے۔ کھانا منگائیے۔"

ابراہیم خواص نے جواب دیا: "نوجوان! کیا توکل کی بات نہیں یاد رہی تجھ کو؟"

نوجوان نے جواب دیا: "میں توکل کے خلاف کوئی بات کب کر رہا ہوں، آپ اپنے اللہ سے کہیے کہ وہ ہمیں کھانا کھلائے۔"

ابراہیم خواص نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور دل میں کہا: "اے اللہ! اپنے حبیبؐ کے صدقے میں اس آتش پرست کے سامنے ندامت سے بچا، یہ کھانا مانگ رہا ہے اور میں توکل کی بات کر رہا ہوں۔ میں کیا چاہتا ہوں، تو جانتا ہے اور کیا عرض کروں۔"

کچھ دیر بعد آپ نے آنکھ کھول کر سامنے دیکھا تو ایک شخص کھانے کا خوان لیے آتا دکھائی دیا۔ وہ آپ ہی کی طرف چلا آرہا تھا۔ قریب آکے کہنے لگا: "حضرت! یہ تین آدمیوں کا کھانا ہے۔ مجھے جو حکم دیا گیا تھا، اس کی تعمیل کردی۔"

ابراہیم خواص نے کہا: "دوستو! کھانا آگیا، کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو۔"

ان تینوں نے شکم سیر ہوکر کھانا کھایا اور اگلے سفر پر روانہ ہوگئے۔ آٹھ دن بعد وہی صورت حال پھر پیدا ہوگئی اور تینوں شدید بھوک میں مبتلا ہوگئے۔ ابراہیم خواص نے آتش پرست نوجوان سے کہا۔ "اب تیری باری ہے' مَیں نے تو ایک بار تجھ کو کھانا کھلوا دیا' اب تُو انتظام کر کھانے کا۔"

آتش پرست نوجوان کے چہرے سے اس کی پریشانی ہویدا تھی' اس نے اپنے ہاتھ کے عصا کو زمین پر ٹکا دیا اور آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا کوئی بھی نہیں سُن سکا لیکن کچھ دیر بعد انھیں جو کچھ نظر آیا' حیران کُن تھا۔ ایک شخص کھانے کا خوان لیے حاضر ہوا' جب اُس خوان پر سے خوان پوش ہٹایا گیا تو سب کی حیرتوں میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوگیا۔ اس میں گرم گرم روٹیاں تھیں۔ تلی ہوئی مچھلی تھی' تازہ کھجوریں تھیں اور ٹھنڈا پانی تھا۔

نوجوان نے دونوں سے کہا۔ "آیئے' ہم تینوں پہلے کھانا کھائیں؟"

ابراہیم خواص کو نوجوان آتش پرست کے اس کھانے میں شبہ تھا اس لیے ان کو تامل ہوا اور نوجوان سے کہا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے' پھر کھالوں گا۔"

آتش پرست نوجوان نے ابراہیم خواص سے کہا۔ "حضرت! آپ کھانا کھائیں تو سہی' کھانے کے بعد مَیں آپ کو ایک خوش خبری سناؤں گا۔" پھر فوراً ہی اصلاح کی۔ "ایک نہیں' دو خوش خبریاں۔ ایسی خوش خبریاں کہ آپ کی روح تازہ ہو جائے گی۔"

ابراہیم خواص نے طوعاً و کرہاً اس نوجوان کے ساتھ کھانا کھایا اور پوچھا۔ "ہاں اب ان دونوں خوش خبریوں کے بارے میں کچھ بتا۔"

نوجوان نے جواب دیا۔ "حضرت پہلی خوش خبری تو یہ ہے کہ اب مَیں مسلمان ہوجانا چاہتا ہوں' مجھے مسلمان کر لیجیے۔"

آپ نے اس آتش پرست کو اسی وقت مسلمان کر لیا اور اس سے پوچھا۔ "ہاں تو اب دوسری خوش خبری کی بابت کچھ بتا۔"

نوجوان نے جواب دیا۔ "دوسری خوش خبری یہ تھی کہ جب آپ نے مجھ سے کہا کہ اب تم کھانا کھلاؤ تو مَیں بہت فکرمند ہوگیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مَیں آپ دونوں کو کہاں سے اور کس طرح کھانا کھلاؤں گا۔ پھر بھی مَیں نے اپنے دل سے کہا کہ تُو کیا کر رہا ہے۔ اپنے ربّ سے کہہ کہ ہر چند مَیں آتش پرست ہوں لیکن میرے دل میں ایمان کی چنگاری موجود ہے۔ اے اللہ! اس بزرگ کے صدقے میں مجھ کو ندامت سے بچالے۔ چنانچہ اللہ نے مجھے مایوس اور شرمندہ نہیں کیا اور ہمارے لیے کھانے کا انتظام کر دیا گیا۔"

اس دوسری خوش خبری نے آپ کے تردّد کو دُور کر دیا اور اسی وقت سجدے میں گر کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

اس کے بعد تینوں مکّہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ مکّہ معظمہ میں نوجوان تو وہیں کا ہو رہا اور اس نے دونوں سے کہہ دیا کہ اب مَیں یہیں اپنی زندگی گزار دوں گا۔ آپ دونوں جہاں جانا چاہیں چلے جائیں۔"

اس واقعے نے ابنِ شیبان کے دل پر بڑا اثر کیا۔ یہ بھی یہیں سے الگ ہو گئے اور اپنی راہ الگ کر لی۔ ان کو اب یہ دُھن تھی کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں، دوسروں سے الگ تھلگ اور اپنے ربّ کے ذکر و فکر میں اتنے ڈوب جائیں کہ ماسوا اللہ کا ہوش ہی نہ رہے۔

***

آپ کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ ابی عبد اللہ کی صحبت اور رہنمائی بے حد ضروری ہے یہ ان کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے اور کافی تلاش اور جستجو کے بعد کسی نے بتایا کہ ابی عبد اللہ مکّہ معظمہ میں موجود ہیں۔ یہ ان کو تلاش کرتے ہوئے مکّہ معظمہ پہنچ گئے۔ دیکھا، خانۂ کعبہ کی چھت کے نیچے ابی عبد اللہ تشریف فرما ہیں۔ یہ ان کے پاس گئے اور ادب سے سلام عرض کیا۔

ابی عبد اللہ نے پوچھا: "اے ابنِ شیبان! کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان نظر آتے ہو۔"

انھوں نے جواب دیا: "مَیں بالکل پریشان نہیں ہوں، یہاں آ کے تو آدمی کا سب کچھ ہی بدل جاتا ہے۔"

ابی عبد اللہ نے ان کو مشورہ دیا: "تم یہاں تک آ تو گئے ہو، مگر یہاں اس طرح رہنا کہ یہاں کے اہلِ نظر آنے لگو۔"

انھوں نے جواب دیا: "میری کوشش تو یہی رہے گی، ورنہ جب تک تائید ایزدی ساتھ نہ ہو کوئی اس شخص کی بات نہیں کر سکتا۔"

آپ خانۂ کعبہ میں رہنے لگے۔ ایک دن وہ نوجوان یاد آیا جو مسلمان ہو گیا تھا۔ آپ نے اس کو تلاش کیا تو بمشکل ایک ایسی جگہ اس سے ملاقات ہوئی جہاں کے لیے یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

انھوں نے پوچھا: "اے نوجوان! تو یہاں ایک ایسی جگہ پر پڑا ہوا ہے کہ جہاں دوسرے نہیں آتے۔"

نوجوان نے جواب دیا: "اے ابنِ شیبان! میرے دل میں جو آگ بھڑک رہی ہے وہ مجھے کسی

اور طرف دیکھنے ہی نہیں دیتی۔ یہ تو بتاؤ، تم دوبارہ یہاں کیوں آ گئے اور کب تک کے لیے آئے ہو؟"

ابنِ شیبان نے جواب دیا: "اس بار مَیں یہاں اپنے پیر مرشد کے ساتھ آیا ہوں، جو آگ تیرے دل میں بھڑک رہی ہے وہی مَیں بھی بھڑکانا چاہتا ہوں، تُو خوش قسمت ہے اور مَیں ابھی اس سے دُور ہوں۔"

نوجوان نے آپ کے حق میں دُعا کی: "اللہ آپ کو کامیاب کرے۔"

ابنِ شیبان جب نوافل سے فارغ ہوئے تو سامنے طشت میں کھانے رکھے دیکھے، ابی عبداللہ بھی موجود تھے۔ انھوں نے آپ سے پوچھا: "ابنِ شیبان! کیا بھوک لگ رہی ہے؟"

انھوں نے جواب دیا: "بھوک لگ تو رہی ہے لیکن مَیں کھانا اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک میں کھانوں کی موجودہ اقسام سے واقف نہ ہو جاؤں۔"

ابی عبداللہ مسکرائے اور سمجھانے لگے: "دیکھ ابنِ شیبان! مَیں جانتا ہوں کہ تو ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اللہ ستار العیوب اور قاضی الحاجات ہے۔ مجھے اس کی رحمت پر ناز ہے۔"

دونوں میں اس قسم کی باتیں ہونے لگیں کہ کوئی تیسرا شخص اس کو سُن کر کوئی نتیجہ نہیں اخذ کر سکتا تھا۔

ابنِ شیبان نے کہا: "پیر مُرشد کھانے میں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن مَیں نے اس کا ایک اصول بنا لیا ہے۔"

ابی عبداللہ نے پوچھا: "وہ کیا؟"

انھوں نے جواب دیا: "مَیں نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ وہ کھانے ہرگز نہیں کھاؤں گا جو مجھے پسند ہیں۔ مَیں وہی کھانے کھاؤں گا جو مجھے پسند نہیں ہیں۔"

طشت میں رکھے ہوئے کھانوں کو دیکھا گیا تو اس میں کھانے ملے جلے تھے، چند وہ تھے جو ابنِ شیبان کو بالکل ناپسند تھے اور دو ایک ایسے تھے جو انھیں بے حد پسند تھے۔ آپ نے ناپسند کھانے کھا لیے۔ ابی عبداللہ نے دعا دی: "خدایا! میرے ابنِ شیبان پر اپنے کرم کی نظر رکھ۔"

بارہا ایسا ہوا کہ کھانے آپ کی پسند کے آئے۔ آپ نے وہ کھانے نہیں کھائے اور اپنے لیے فاقہ پسند کر لیا۔

خانۂ کعبہ کی جس چھت کے نیچے ان دونوں کا قیام تھا، وہاں دونوں نے سالہا سال گزار دیے۔ ابنِ شیبان نے اس چھت کے نیچے وہ عظیم الشان مجاہدے کیے جن سے آپ کی شخصیت اور کردار

کی بے مثال تربیت اور تشکیل ہوئی۔ آپ کی شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی۔ جو ابی عبداللہ سے ملتا، آپ سے ضرور ملتا۔

ایک دن ابی عبداللہ نے ان سے اچانک سوال کیا' اے ابنِ شیبان! آج ہمیں خانۂ کعبہ کی چھت کے نیچے رہتے ہوئے کتنا عرصہ بیت گیا؟"

ابنِ شیبان حساب لگانے لگے اور کچھ دیر بعد جواب دیا: "شاید چالیس سال۔"

ابی عبداللہ دیوار سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ چالیس سال کی آواز نے انھیں چونکا دیا۔ وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور ابنِ شیبان سے کہا۔ ابنِ شیبان! ذرا پھر سے حساب کرو اور مجھے بتاؤ کہ مَیں خانۂ کعبہ کی اس چھت کے نیچے کتنے عرصے سے رہ رہا ہوں؟"

ابنِ شیبان نے ایک بار پھر حساب کتاب سے سالوں کو نکالا تو وہ چالیس سال نکلے۔ وہ تڑپ کر کھڑے ہو گئے اور اعلان کیا: "ابنِ شیبان! میری مدتِ کار ختم ہو گئی۔ اب مَیں اس چھت کو چھوڑ دوں گا۔"

ابنِ شیبان کو یقین ہو گیا کہ اب ابی عبداللہ ان کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔

ابی عبداللہ نے وہاں سے نکلنے کی تیاری شروع کر دی۔ کئی آدمیوں کے نام لیے اور کہا۔ "اے ابنِ شیبان! تم ان کے پاس جاؤ اور میری طرف سے کہہ دو کہ ابی عبداللہ مغرب جا رہا ہے اس کے قیام کی مدت ختم ہو چکی ہے اس لیے آ کر مجھ سے مل لیں۔"

ابنِ شیبان ان کے پاس گئے اور ان کو آپ کا پیغام پہنچا دیا۔ اب تو ابی عبداللہ سے ملنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ اور ہر وقت وہاں ہجوم سا رہنے لگا۔

ان ملاقاتوں کے بعد انھوں نے ابنِ شیبان سے بھی اجازت چاہی اور کہا: "اچھا ابنِ شیبان! اب مَیں جاؤں۔"

ابنِ شیبان ساتھ چھوڑنے پر تیار نہ تھے' پوچھا: "پیرِ مرشد! یہاں سے آپ کہاں جائیں گے؟"

ابی عبداللہ نے جواب دیا: "مَیں کوہِ سینا جاؤں گا' وہاں کوہِ طور کو آخری بار دیکھنا ہے۔"

ابنِ شیبان نے افسردہ لہجے میں پوچھا: "یہ آخری بار کیوں؟"

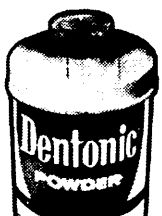
ابی عبداللہ نے جواب دیا: "زندگی کا کیا بھروسہ؟ اور یوں بھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مَیں نے اپنی زندگی کے سارے ضروری کام انجام دے لیے اور اللہ کی مرضی یہ ہے کہ اب مَیں کہیں اور جا بسوں اور تم جانو مشیّتِ ایزدی تو پوری ہو کر رہے گی۔"

ایک معیّنہ دن یہ دونوں کوہِ سینا کے لیے روانہ ہو گئے۔ دورانِ سفر ابی عبداللہ کا حال

گھریلو، غیر معیاری اور بازاری منجن۔ آپ کے دانت اور مسوڑوں کے جانی دشمن

تعجب ہے کہ ترقی کے اس دور میں بعض سیدھے سادے افراد محض چند پیسے بچانے کی خاطر گھریلو اور بازاری منجن سے اپنی اور معصوم بال بچوں کی صحت تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ انجام سے بے خبر افراد خصوصاً والدین کو معلوم ہونا چاہیئے کہ منجن کا بنیادی جز (BASE) کوئلہ وغیرہ ہونے کی وجہ سے ریگ مال (EMERY PAPER) کی طرح دانہ دار ہوتا ہے چاہے یہ کتنا ہی باریک کیوں نہ ہو۔ دانتوں کے ENAMEL خصوصاً آپ کے مسوڑوں کو یہ منجن مسلسل گھستا رہتا ہے جیسے لکڑی یا لوہے پر روزانہ ریگ مال استعمال کیا جائے تو ایک دن یہ اپنا وجود کھو دیں گے۔ اب آپ خود فیصلہ کیجیے کہ اس طرح آپ کے خصوصاً بچوں کے نرم و نازک مسوڑوں کا انجام کیا ہوگا؟ اس کا علاج ممکن ہی نہیں سوائے اس کے کہ آپ قدرتی دانتوں کی جگہ مصنوعی دانتوں کا عذاب مول لے کر قبل از وقت بوڑھے ہو جائیں۔ حقیقت ہے کہ یہ منجن آپ کے دانت اور مسوڑوں کے بدترین دشمن ہیں۔

اِن سب کے مقابلے میں ڈنٹونک اِتنا مہنگا بھی نہیں جبکہ ہمارا BASE (اِنتہائی باریک 20 MICRONES) دنیا کا بہترین CAL. CARB ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم BP اور USP کی معیاری دہنگی دوائیں استعمال کرتے ہیں جب ہی تو امریکہ، یورپ اور جاپان جیسے ترقی یافتہ ممالک کی اہم شخصیات نے بھی اعتراف کیا ہے کہ "ڈنٹونک کا مقابلہ تو ہمارے یہاں کے ٹوتھ پیسٹ بھی نہیں کرتے لہٰذا ہم پابندی سے ڈنٹونک استعمال کرتے ہیں" مفید و موثر ڈنٹونک کو اس قدر بین الاقوامی مقبولیت کیونکر نصیب ہوئی؟ اس لئے کہ خدا کے فضل و کرم سے ڈنٹونک کی اپنی ایک ٹیکنالوجی اور ہمارا وسیع تجربہ ہے جو کسی کے پاس نہیں۔ اس کا اندازہ آپ ہمارے صرف ایک آئیٹم BASE کے حسب ذیل "CHARACTERISTICS" سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔



FINE MILLED CAL. CARBONATE PREPARED TO BE APPLIED AS FILLER WITH MATERIALS OF GREAT WHITENESS AND WITHOUT HARMFUL COMPONENTS SHOWING EXCELLENT STIRRING WITH THE OTHER MATERIALS.

CHARACTERISTICS :–

(1) WHITENESS 86 - 88% According to MgO
(2) SPECIFIC GRAVITY 2.71 gr/cm3 (3) DENSITY 0.7778
(4) DRY STRENGTH 298 - 565 Kg/Cm2 (5) MOISTURE 0.05%

FINENESS OF THE MILL:– RESIDUE ON SIEVE DIN 80 0.00%
" " " " 100 0.01%
" " " " 130 0.19%

PARTICULARS ARE MOSTLY BELOW 20 MICRONES
LOSS OF IGNITION 43.61 & SiO_2+ UNSOLUBLE 0.20 & AL_2O_3 0.36
Fe $_2O_3$ 0.01.CaO 55.51 & MgO 0.00 & SO_3 0.00

ALA CHEMICALS
P.O. Box 2110, KARACHI-18

قابلِ دید تھا۔ وہ جہاں سے بھی گزرتے، نہایت انہماک اور توجہ سے دیکھتے ہوئے گزرتے۔ جس چیز پر نظر ڈالتے نہایت توجہ کی نظر ڈالتے۔ دورانِ سفر باتیں بھی عجیب لب و لہجے میں کرتے رہے۔ ایک گنجان آبادی کے قصبے سے گزرتے ہوئے ابی عبداللہ نے کہا: "ابنِ شیبان! یہ ایک مثالی بستی ہے، یہاں تم نے کوئی خاص بات محسوس کی؟"

ابنِ شیبان نے عرض کیا: "پیر مرشد! میں تو یہاں آپ کے ساتھ آپ کی رہنمائی میں آیا ہوں۔ اس لیے میں کیا محسوس کروں گا۔ بظاہر یہ نظر آرہا ہے کہ یہ آبادی کے اعتبار سے ایک بڑا قصبہ ہے۔"

ابی عبداللہ نے کہا: "نہیں صرف یہ بات کافی نہیں ہے۔ میں اس بستی کو کھنڈر بنتے دیکھ رہا ہوں، بستی کے یہ خوشحال لوگ اللہ کی نافرمانی میں مبتلا ہیں، کارکنانِ قضا و قدر عنقریب اس بستی کو اجاڑ دیں گے۔"

ابنِ شیبان نے عرض کیا: "اور پیر مرشد! بستی کے نیک لوگ، کیا وہ بھی؟"

ابی عبداللہ نے جواب دیا: "بستی کے نیک لوگ اگر یہاں سے کہیں اور چلے گئے تو خیر، ورنہ ان کا انجام بھی ان کے ساتھ ہی ہوگا۔"

ابنِ شیبان نے کہا: "حضرت! کچھ دیر پہلے آپ نے فرمایا تھا کہ یہ ایک مثالی بستی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟"

انھوں نے جواب دیا: "ہاں، میں نے یہی کہا تھا اور اس کا مطلب ہے ایک ایسی مثالی بستی جو ماضی کی منصوب اور معتوب قوموں کی صف میں جگہ پائے گی۔"

دونوں یہاں سے آگے چلے گئے۔ سامنے کوہ طور تھا۔ ابی عبداللہ کو یہ جگہ بہت پسند تھی۔ یہ اس پہاڑ پر چڑھ گئے اور رقتِ قلب کے ساتھ اس پر چہل قدمی کرتے رہے۔ ابنِ شیبان ان کی وارفتگی اور بے چینی دیکھتے رہے، ابی عبداللہ کہتے رہے: "مجھے یہاں سے ایک خوشبو سی محسوس ہو رہی ہے۔ یہاں کا ذرّہ ذرّہ کسی بات کی گواہی دے رہا ہے۔ اللہ اور اس کے کلیم کی مہک محسوس ہو رہی ہے میں اپنے وجود کو بھولتا جا رہا ہوں۔"

ابنِ شیبان، ابی عبداللہ کی حالت سے مطمئن نہیں تھے، پوچھا: "پیر مرشد! سچ سچ بتائیں آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔"

ابی عبداللہ نے جواب دیا: "بتاؤں سبب کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

ابنِ شیبان نے عرض کیا: "میں یہی جاننا چاہتا ہوں کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

ابی عبداللہ نے ایک جگہ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "وہ دیکھ، اس جگہ کو دیکھ۔ یہ میری آخری

آرام گاہ ہے، مجھے یہ جگہ خواب میں دکھا دی گئی تھی۔ مَیں اسی جگہ کی تلاش میں آیا تھا۔ سو مل گئی۔"

ابنِ شیبان کو بڑی حیرانی ہو رہی تھی۔ کہا: "آپ کی باتیں میری سمجھ میں تو آنہیں رہیں، آپ نے اس جگہ کو پہچانا کس طرح؟"

ابی عبداللہ نے جواب دیا: "اس جگہ میں کشش ہے۔ مَیں خود کو اس کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ اس زمین میں میرے وجود کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔" اس کے بعد آپ ابنِ شیبان کو مذکورہ حصۂ زمین پر لے گئے اور وہاں کی تھوڑی سی مٹی اٹھا کر سونگھی اور سونگھ کر ابنِ شیبان کے حوالے کر دی اور حکم دیا: "اس کو سونگھ اور مجھے بتا کہ اس میں میرے وجود کی خوشبو ہے یا نہیں؟"

ابنِ شیبان نے یہ مٹی سونگھی تو اس میں سے وہی خوشبو بکھر گئی جو ابی عبداللہ کے وجود سے ہمیشہ محسوس ہوئی تھی۔ ابنِ شیبان چالیس سال سے اس خوشبو کو محسوس کر رہے تھے۔ انھیں دُکھ ہو رہا تھا کہ اب وہ اپنے پیر مرشد سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں گے۔ شاید ابی عبداللہ ان کے اس دُکھ کو محسوس کر رہے تھے۔ کہنے لگے: "اے ابنِ شیبان! یہ وہ پُل صراط ہے جس سے ہمیں ایک نہ ایک دن تو گزرنا ہی پڑے گا۔ آج مَیں کل تم، پرسوں کوئی اور۔ پھر اس کا دُکھ کیوں؟"

ابی عبداللہ نے وہیں سکونت اختیار کر لی اور ابنِ شیبان کو واپس چلے جانے کی اجازت دے دی لیکن ابنِ شیبان اس پر آمادہ نہ ہوئے۔

کچھ عرصے وہاں رہ کر ابنِ شیبان کسی ضرورت سے کہیں اور چلے گئے اور جب واپس آئے تو لوگوں نے ابی عبداللہ کے بارے میں بتایا کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور اس جگہ آسودۂ خواب ہیں جہاں کی اپنی زندگی میں نشاندہی کر دی تھی۔

ابنِ شیبان خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کرنے لگے۔ اپنے پیر مرشد کے مزار پر کچھ عرصے رہ کر اجازت چاہی۔ واپسی میں اس بستی سے گزر ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اب وہاں وہ رونق نہیں تھی، وہاں ایک ایسی وبا پھیلی ہوئی تھی کہ انسان انسان سے نفور و گریزاں تھا۔ ان کا اتفاق اور اتحاد ختم ہو چکا تھا اور ہر شخص دوسرے کے بارے میں بدگمانی اور سوئے ظنی کا شکار تھا۔ یہ بدگمانی اور سوئے ظنی خونِ خرابے میں بدل چکی تھی اور وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔

ابنِ تیمیان اس بستی سے تیزی سے گزر گئے کیونکہ وہ لوگ جس لعنت میں گرفتار تھے اس سے اللہ کی پناہ مانگنا چاہیئے۔

**

آپ کے دونوں طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو آپ سے مختلف قسم کے سوالات کرتے تھے اور آپ ان کے جوابات دیتے تھے۔

ایک شخص نے کہا: حضرت! میرے پڑوس میں ایک صاحب قیام فرما ہیں۔ انھیں یہ دعویٰ ہے کہ اولیاء کوئی چیز نہیں اور وہ خود اتنے اونچے مقام پر فائز ہیں کہ اولیاء سنیں تو رشک کریں۔"

آپ نے جواب دیا: "اس کی باتوں میں بُوئے تکبّر پائی جاتی ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ وہ اپنا کچھ وقت اولیاء اللہ کی صحبت میں دیا کرے۔ ورنہ اس کے یہ جھوٹے دعوے اس کی ذلت و رسوائی کا سبب بن جائیں گے۔"

آپ سے سوال کیا گیا: "بُری باتوں سے کنارہ کشی کس طرح ممکن ہے؟"

جواب دیا۔ "اس کے لیے احکامِ شریعت کی پابندی بہت ضروری ہے۔"

آپ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا۔ "حضرت! مَیں ایک خوشحال آدمی ہوں، مَیں نے اپنی زندگی کا ابتدائی دور بڑی عُسرت اور تنگ دستی میں گزارا۔ پھر عقل اور شعور میں اضافہ ہوا اور تجربوں نے راہیں دکھائیں تو مَیں نے ترقی کرنا شروع کر دی اور اب مَیں کہہ سکتا ہوں کہ مَیں نے کسی کی مدد کے بغیر اتنا کچھ حاصل کر لیا ہے کہ دوسرا کوئی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا اور مَیں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہ جو کچھ ہے، میری اپنی کوششوں اور محنتوں کا ثمرہ ہے، اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں۔"

آپ نے پوچھا: "اور خدا کا بھی کوئی دخل نہیں۔"

وہ شخص چڑ گیا، بولا: "یہ خدا کا ذکر کہاں سے آ گیا بیچ میں؟"

آپ کو بڑا دُکھ ہوا، کہا: "خدا کا ذکر! اس کے بغیر تو بات ہی نہیں بنتی۔"

اس شخص نے کہا: "حضرت! جب مَیں پریشان تھا تو یہ خدا کہاں تھا۔ اس وقت اس کی مہربانیوں کو کیا ہو گیا تھا، جب مَیں نے محنت کی اور عقل اور تجربوں سے کام لیا تو یہاں تک پہنچ گیا۔ اس لیے مَیں اپنی محنت، عقل اور تجربوں کی بات کر رہا ہوں۔"

آپ کو اس کی باتوں سے وحشت ہو رہی تھی، پوچھا: "مگر تُو میرے پاس کیوں آیا ہے؟ مجھ سے کیا کام ہے تیرا؟"

اس نے جواب دیا: "آپ کے مریدوں میں ایک شخص ایسا بھی ہے جس پر میں نے بڑے احسان کیے ہیں اور اب مجھ کو افسوس اس بات کا ہے کہ اس نے میرے احسانوں کا یہ صلہ دیا ہے کہ کبھی میرا شکر گزار ہی نہیں ہوتا' اس نے کبھی میرے احسانوں کو تسلیم ہی نہیں کیا۔"

آپ نے فرمایا۔ "جب تو اپنے رب کا احسان نہیں مان رہا ہے پھر تو کسی اور کا کیا گلہ کر سکتا ہے۔"

اس نے جھنجلا کر کہا: "آپ گھما پھرا کے پھر خدا کا ذکر لے آئے۔ آخر آپ کو اس میں مزہ کیا آتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "اب تو یہاں سے جا سکتا ہے۔ ویسے تیری بابت میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو شخص اللہ سے نہیں ڈرتا اور احسان کرنے کے بعد احسان جتاتا ہے وہ نہایت کمینہ ہوتا ہے۔ اب تو جا سکتا ہے۔"

وہ شخص گھسیا کر چلا گیا' لیکن اس کے دل میں معمولی سا انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ کچھ عرصے بعد واپس آیا اور کہا: "حضرت! آپ کے معمولی سے فقروں نے میری دنیا ہی بدل دی۔ اب آپ مجھے نصیحت فرمائیں۔"

آپ نے جواب دیا: "جس چیز کو تو احسان سمجھتا رہا ہے وہ حقیقتاً تواضع تھی اور ہر حال میں خوش و خرم اور مطمئن رہنا توکل اور قناعت ہے' بس میں تجھ سے یہی چاہوں گا کہ تواضع جاری رکھ اور توکل اور قناعت کا دامن اپنے ہاتھ سے مت چھوڑ۔ اللہ نے چاہا تو اس سے تجھ کو بڑے فائدے پہنچیں گے۔"

اس نے پوچھا: "مگر میں تواضع' توکل اور قناعت کو کس طرح اختیار کروں' اس کا کوئی آسان طریقہ بتائیں۔"

آپ نے جواب دیا: "اللہ سے ڈرتا رہ' کیونکہ اللہ سے خائف رہنے والے کے دل میں دنیا کی محبت باقی نہیں رہتی۔ اس کے دل سے دنیا کی محبت اور شہوت اس طرح نکل جاتی ہے جس طرح آگ سے دھواں۔"

اس نے عرض کیا: "حضرت! مجھ میں ایک خرابی اور ہے۔"

آپ نے پوچھا: "کون سی خرابی؟"

اس نے جواب دیا: "اگر میں توکل اور قناعت اختیار کروں گا تو جذبۂ خود ستائی میں ہر جگہ اس کا ذکر کرتا پھروں گا' آپ ہی بتائیں اس کا علاج کیا ہے؟"

آپ نے فرمایا: "توکل خدا اور بندے کے درمیان ایک راز ہوتا ہے' اس راز کو راز ہی رہنا

چاہیے۔ جس دن تُو میرے اس قول پر کاربند ہو گیا تو تیرے زندہ رہنے اور مر جانے میں بھی ایک خاص شان اور ایک خاص ادا ہو گی۔"

اس شخص کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پوچھا: "حضرت! اب میں اللہ اللہ زیادہ کرتا ہوں اور اس کے لیے کسی خاص جگہ کی قید نہیں، جہاں بھی بیٹھ گیا اللہ اللہ کرنے لگا۔ اس سلسلے میں آپ کیا فرمائیں گے؟"

آپ نے جواب دیا: "اللہ اللہ کرنے کی بہترین جگہ مسجد ہوتی ہے، وہاں جا کے اللہ اللہ کیا کر۔ اللہ اس کو قبول کرے گا۔"

آپ کی باتوں میں بڑا اثر تھا۔ اس شخص کو اپنے اندر ایک زلزلہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھا: "کیا میں دنیا کو ترک کر دوں؟"

آپ نے جواب دیا: "نہیں، کیونکہ دنیا تو رسول اللہ نے بھی نہیں چھوڑی تھی۔ تو مسلمان بھائیوں سے ملتا رہ، ان کے کام آتا رہ، اس کا بڑا اجر ہے اور جنت تو پھر کہیں گئی ہی نہیں۔"

آپ نے کتنوں کی زندگی بدل کے رکھ دی۔ جب بھی کسی کے سامنے زبان کھولتے تو وہ آپ کی باتوں میں گم ہو کر رہ جاتا۔

ایک بار آپ سے کسی نے کہا: "حضرت! آپ بیمار رہنے لگے ہیں۔ آپ چاہیں تو اپنے لیے دعا کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ خدا آپ کی دعا ضرور قبول کرے گا۔"

آپ نے جواب دیا: "افسوس کہ میں دعا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں یہ جانتا ہوں کہ جو کچھ میرے ساتھ پیش آ رہا ہے، اس میں اس کی مشیت شامل ہے۔ میرے نزدیک وقت کی مخالفت سوئے ادبی ہے۔ کم از کم میں اس کے خلاف نہیں جا سکتا۔"

آپ سے کہا گیا: "حضرت! کوئی نصیحت فرمائیں جس پر بہ آسانی عمل کیا جا سکے۔"

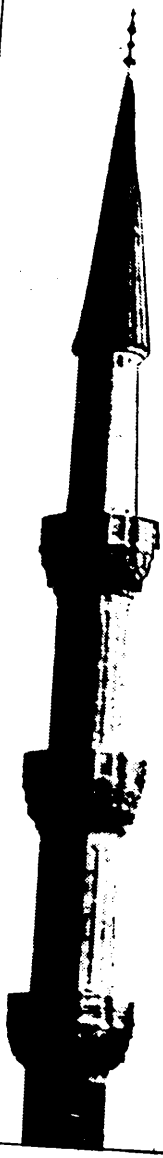
آپ نے جواب دیا: "ہر لمحے خدا کو یاد رکھ۔ اس کو یاد کیا کر، تیرے لیے یہی کافی ہے۔"

اس کے جواب میں عذر پیش کیا گیا: "یہ بہت مشکل ہے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کیا کیا جائے؟"

آپ نے جواب دیا: "اگر یہ مشکل ہے تو پھر موت کو یاد کیا کر۔"

سوال کرنے والا کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر گویا ہوا: "ہاں یہ نسبتاً آسان ہے مگر اس کا فائدہ؟"

آپ نے جواب دیا: "اس کا فائدہ یہ ہے کہ موت کا خوف تجھ کو برائیوں سے روکے گا اور پھر خدا کی یاد خود بخود دل میں اپنی جگہ بنا لے گی۔"



بے شک آنے والا وقت تمہارے لئے بہتر ہے اس وقت سے جو گزر چکا
اور بے شک تمہارا رب ایسی نعمتوں سے تم کو نوازے گا جو تم کو خوش کر دینگی۔

یہ الفاظ مبارکہ جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب
فرمائے، تمام سچے مسلمانوں کیلئے طمانیت کا پہلو رکھتے ہیں۔
آیئے ہم اللہ تعالےٰ کے حضور میں سر جھکا کر ان رحمتوں کا شکر
بجالائیں جو امتِ مسلمہ پر اب سے پہلے ہوتی رہیں اور عہد کریں کہ
آئندہ اور زیادہ عنایات کا مستحق بننے کی کوشش کرینگے۔
ایک فریضہ جو ہم پر عائد ہوتا ہے، نظام اسلام کی تعمیر ہے۔
جو بفضلہٖ تعالیٰ پاکستان میں شکل پذیر ہو رہا ہے۔
نیشنل بینک اس مبارک مہم میں حسبِ توفیق شریک رہے گا۔

نیشنل بینک آف پاکستان
قومی ترقی قومی بینک

United

PID-I-19/85

آپ نے ایک دن لوگوں کو بتایا کہ جب میں چھوٹا سا تھا تو میرے والد مجھ کو نصیحتیں فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن میں اپنے استاد کے پاس پڑھنے جا رہا تھا تو انھوں نے مجھ سے ایک عجیب سا سوال کر دیا۔ پوچھا۔ بیٹے! علم کیوں حاصل کرنا چاہیئے؟"

میں نے انھیں جواب دیا تھا۔ اس سے اچھے بُرے کی تمیز آجاتی ہے مگر والد مرحوم نے کہا۔ اس کا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ علم آداب ظاہری کے لیے بہت ضروری ہے اور تقویٰ، یہ آداب باطنی کے لیے بہت ضروری ہے، اس مختصر تعریف نے میری زندگی ہی بدل کر رکھ دی اور اب میں علم اور تقوے کی بابت کتنا ہی سوچوں اس سے بہتر وضاحت اور توجیہہ ناممکن ہے۔

اس کے بعد کسی دوسرے موقع پر والد مرحوم نے ایک اور نصیحت کی۔ انھوں نے کہا۔ بیٹے! اس چیز سے ہمیشہ دُور رہنا جو چیز تم کو خدا سے دور رکھے۔

جب میں نے ان سے کہا کہ باوا جان! اگر غلطی سے ایسا ممکن نہ رہے تو؟ اگر میں ایک بار کسی ایسی چیز کو اختیار کروں جس سے خدا دُور ہو جاتا ہے اور بعد میں اس کو ترک کر کے خدا سے لو لگا لوں تو؟

میرے والد نے منہ پھیر لیا تھا اور کراہیت سے جواب دیا تھا کہ بیٹے! یہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی شخص کسی دولت سے منہ پھیر لے اور وہ اس کے ہاتھ سے جاتی رہے لیکن دوبارہ اس کو حاصل کرنا چاہے تو ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے کہ وہ پھر مل گئی ہو۔"

آپ نے ایک سرد آہ بھری۔ "پوری زندگی کا نچوڑ یہی ہے کہ والد مرحوم نے بڑی سچی بات بتائی تھی مجھے۔"

آپ نے چھوٹی چھوٹی باتوں کو اس طرح بیان کیا کہ وہ بہت بڑی معلوم ہونے لگیں۔

حضرت ابو اسحاق ابراہیم شیبانی نے اپنی ساری عمر صوفیوں کی صحبت میں فیض حاصل کرتے ہوئے گزار دی۔ آپ نے اپنے مسلک اور جذبوں میں بھی شریعت کا خاص خیال رکھا اور اس کی سختی سے پابندی کرتے رہے۔ آپ کے ادراک و فہم کا یہ عالم تھا کہ مشیت کے اشاروں سے صحیح نتائج اخذ کیا کرتے تھے۔ آپ اللہ کے ایک صابر و شاکر اور متوکل بندے تھے۔ مختلف کتابوں کے مطابق آپ نے ۳۲۷ ہجری میں وفات پائی۔





نور الحسن شاہ بخاری رح

۲۷ جمادی الآخر ۱۳۰۶ ہجری کی شب تھی کہ حضرت سید نور الحسن شاہ رحمتہ اللہ علیہ اس عالمِ رنگ و بو میں تشریف لائے۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت غلام علی شاہ کو بوجوہ گھریلو حالات گھر سے جانا پڑا اور نارمل تک تحصیلِ علم کے بعد احمد نگر میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ آپ کا روحانی تعلق حضرت اللہ بخش تونسوی رحمتہ اللہ علیہ سے تھا جو اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ دوست اور دشمن سب ان کے اخلاقِ حمیدہ کا گہرا نقش دل پر لے کر اُٹھتے تھے۔ غرباء و مساکین کی طرف خصوصی توجہ فرمایا کرتے تھے۔ جب حضرت غلام علی شاہ سکول کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو اپنے آبائی وطن کیلیانوالہ میں آگئے اور زندگی کے دن عبادت و ریاضت میں گزارنے لگے اور اخلاقیاتِ مرشد پر گامزن رہنے کی سعی میں لگے رہتے۔

حضرت سید نور الحسن شاہ رحمتہ اللہ علیہ کی ولادتِ باسعادت احمد نگر میں ہی ہوئی تھی۔ وہیں آپ کو تحصیلِ علم کے لیے مدرسے میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ گھر کے ماحول کا اثر اہلِ خانہ پر بڑا گہرا ہوتا ہے۔ والدین کی زندگیاں بچوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ آپ کا رُخ ایامِ طفولیت سے ہی نیکی و طہارت کی طرف تھا۔ چھوٹی سی عمر میں ہی نماز اور روزے کی بڑی پابندی کرتے تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ بھی حضرت سید فضل شاہ رحمتہ

اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھیں۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ والدہ ماجدہ کے مُرشد تشریف لائے ہوئے تھے۔ سید نورالحسن شاہ قریب ہی ہمجولیوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ نہ جانے آپ کے جی میں کیا آیا کہ کھیلنا بند کر دیا اور بڑے آرام سے حضرت فضل شاہ کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔

"کیا بات ہے بیٹا نورالحسن؟" آپ نے بڑی محبّت اور شفقت سے دریافت کیا۔ آپ نے بڑے معصوم انداز میں کہا۔

"سائیں جی! میری طرف بھی دھیان کیجئے گا۔"

حضرت فضل شاہؒ صاحب نے سُنا تو عالمِ وجد میں آگئے۔ کافی دیر یہ کیفیت رہی اور پھر آپ نے نورالحسن کو سینے سے لگایا تو وہ عالم حیرت میں مستغرق ہو گئے پھر چند یوم تک یہی حالت طاری رہی۔ جیسے خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہے ہوں۔

کیلیا نوالہ میں آنے کے بعد آپ کی پڑھائی بڑی متاثر ہوئی تھی۔ ایکا ایکی حالات و واقعات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ سعی بلیغ اور محنتِ شدید کے باوجود حصولِ علم ممکن نہ رہا تو پڑھائی کو نامکمل چھوڑ کر اپنے بڑے بھائی سیّد حسین شاہ کے ساتھ کھیتی باڑی کا کام کرنے لگے۔ اب شب و روز اسی کام میں بسر ہونے لگے۔ وقت کے ہم آہنگ بچپن نے جوانی کا روپ دھار لیا۔ جیسے جیسے عمر میں اضافہ ہوتا گیا۔ عبادت و ریاضت و مجاہدہ میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ کھیتی باڑی سے بھی طبیعت بھر چکی تھی۔ لہٰذا آپ نے خوشنویسی کا کام بھی سیکھنا شروع کر دیا۔ اس میں مہارت پیدا نہ ہوئی تھی کہ اس کام سے بھی طبیعت اکتا گئی۔ ٹھیکیداری کیطرف اسی دوران میں میلان ہوا تو وہ شروع کر دی۔ اس میں بھی دل نہ لگا تو تھوڑی مدّت بعد اُسے بھی خیرباد کہا اور پھر بڑے بھائی کے ساتھ مل کر کاشتکاری کا کام شروع کر دیا۔ طبیعت میں عجیب طرح کا اضطراب تھا۔ اس کی کیا وجہ تھی کچھ علم نہ تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا۔

اللہ تبارک و تعالےٰ نے آپ کو لحنِ داؤدی عطا فرمایا تھا۔ آواز میں ایسی شیرینی اور کشش تھی کہ چلتے راہی رُک جاتے تھے۔ جب نعتِ رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم محبّت میں ڈوب کر پڑھتے تو عجب سماں بندھ جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے انوار و برکات کی بارش ہو رہی ہو۔ لوگ محو و بیخود ہو جایا کرتے تھے۔

جن دِنوں آپ چک نمبر ۱۴ علی پور میں تھے تو وہاں ایک شخص پیری مُریدی کرتا تھا اس سے آپ کی گاہے بگاہے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ بڑی محبّت و شفقت سے پیش آتا

تھا۔ اس نے آپ کو اپنی لڑکی کا رشتہ دینا چاہا اور دو مربع زمین بھی۔ آپ نے اپنے دل میں نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ عورت اور دولت کے لالچ اور محبت سے پاک ہے۔ اب وہاں رہنا ممکن نہ تھا۔ اس علاقے کو فوراً چھوڑ دیا اور واپس آ گئے۔

دل کا رجحان بزرگانِ دین کی طرف تھا۔ ایک خاص قسم کی کشش ان کے لیے دل میں پاتے تھے۔ ایک دن اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ شرق پور شریف گئے اور قطب الاقطاب حضرت میاں شیر محمد شرق پوری کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔

"کیا نام ہے؟"

"حضور! خادم کو نور الحسن کہتے ہیں۔"

حضرت شیر ربّانی رحمتہ اللہ علیہ نے سُنا تو فرمانے لگے۔

"نور بنا دوں۔"

ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی ولی اللہ نے یوں کہا ہو۔ بہت مرعوب ہوئے حالانکہ اس سے قبل آپ کی کبھی ایسی حالت نہ ہوئی تھی۔ خاموش رہے اور پھر واپس آ گئے۔

گھر پہنچ کر بڑے بھائی سید حسین شاہ نے سارا ماجرا والدہ محترمہ کے گوشوار کیا۔ ماں نے سُنا تو بولیں۔

"جب اللہ تعالیٰ کے ایک نیک و برگزیدہ بندے نے کہا تھا کہ نور بنا دوں تو خاموش کیوں رہے تھے۔"

"آپ جو میری مُرشد ہیں۔"

آپ نے عرض کیا تو ماں بولی

"آج سے مَیں تمہاری مُرشد نہیں ہوں۔"

جب سے آپ حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمتہ اللہ علیہ سے مل کر آئے تھے نصف شب کے بعد آنکھ کھل جاتی تھی اور پھر نیند کا کوسوں نام و نشان نہ ملتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے سینہ پھٹ جائے گا۔ جب یہ کیفیت ہوتی تو اُٹھ کر بارگاہِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں ہدیہ نعت پیش کرنے لگتے۔ ایک دن سائیں الہ داد کے ہمراہ کسی کام سے گئے اور ان کے کہنے پر پھر حضرت میاں صاحب شیر ربّانی رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ مسجد لوہاراں میں تشریف فرما تھے۔ جاتے ہوئے آپ راستے سے حضرت میاں صاحب کے لیے پھل بھی لے گئے تھے جو آپ کے طریقہ کے خلاف تھا لیکن آپ نے اُسے بخوشی

قبول فرما لیا اور حاضرین میں تقسیم فرما دیا۔

واپسی پر آپ نے سید نور الحسن کو محمد شفیع کی مسجد میں حاضری دینے کے لیے کہا جب آپ وہاں گئے تو حضرت میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ موجود تھے۔ حضرت میاں صاحب نے آپ کا ہاتھ مبارک ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ سورہ خلق کی تلاوت فرمائی اور ارشاد فرمایا۔ "کبھی کبھی آجایا کرو۔"

اس کے بعد آپ کو بیعت فرما لیا۔ بہت بڑی نعمت تھی جس سے آپ کی جھولی بھر گئی تھی۔ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ غوثِ ربانی، جنید زمانی اور شیرِ یزدانی رحمتہ اللہ علیہ از خود آپ کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل فرمالیں گے۔ اس نعمتِ غیر مترقبہ پر جس قدر ناز کرتے کم تھا۔

حضرت میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ بڑے حق گو، زاہد و عابد، صاحبِ کرامت، منکسر المزاج، متوکل، متواضع۔ سنتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سختی سے کاربند۔ ایثار و سخاوت کے پیکر، غیور اور عظیم مبلغ تھے جن کی حیاتِ مبارک کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک عمل بذاتِ خود تبلیغ تھا۔ جب سے حضرت سید نور الحسن شاہؒ آپ سے بیعت ہوئے تھے اکثر شرقپور شریف آنا جانا رہتا تھا۔ حضرت میاں صاحب نے آپ کی اصلاح و تربیت فرمانا شروع کی۔ اور آپ اپنے شیخ و مرشد کے فرمان کی روشنی میں عبادت و ریاضت کرنے لگے۔ ایک مرتبہ کوئلہ شریف جاتے ہوئے حضرت میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ آپ کے ہاں تشریف لائے تو خوشی کی انتہا نہ رہی جیسے دولت کونین حاصل ہو گئی ہو۔ سوچ رہے تھے کہ ربِ کریم کی رحمت میاں صاحب کی صورت میں گھر آگئی ہے۔ خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

وقت کے ہم آہنگ آپ کی ذات شیخ کی محبت میں گم ہوتی چلی گئی۔ ہجر و فرقت کوہِ گراں معلوم ہوتی تھی۔ ہر وقت مرشد کا خیال و تصور دامنگیر رہتا تھا۔ دل مضطرب و بے چین رہتا تھا۔ جب صبر کا یارا نہ رہا تو ایک دن گھر بار کو خیرباد کہا اور درِ مرشد پر پہنچ گئے اور ان کی خدمت میں رہنا شروع کر دیا۔ سلوک و معرفت کی منازل طے ہونے لگیں، حجابات اٹھنے لگے، رنگ شہودی غالب آنے لگا۔ دنیا پہلے ہی دل میں نہیں تھی اب وہ سب سے کمتر نظر آنے لگی تھی۔ جب راستہ طے ہو گیا منزل سامنے آگئی۔ تو مرشد نے اجازت دے کر رخصت فرما دیا تاکہ اللہ کے بندوں میں حاصل کردہ انعامات تقسیم کریں۔

میجک ڈپوکسی اسٹیل (امریکہ کا بنا ہوا)

گھنٹوں کا کام اب منٹوں میں ممکن ہے۔

دنیا کے مشہور و معروف "میجک برانڈ" مصنوعات بنانیوالے ادارے کے سائنس دانوں کی برسوں کی تحقیق و تجربات کے بعد ایک اور کامیاب پیشکش

میجک ڈپوکسی اسٹیل

جدید ترین فنی تحقیق کا حیرت انگیز کمال

- عظیم صنعتی اداروں، کارخانوں میں ہر قسم کی مرمت، پچکے اور ٹوٹے ہوئے پرزوں کو منٹوں میں جوڑا جاسکتا ہے۔
- ریفریجریٹر، ایئر کنڈیشنر، کاروں، ٹریکٹروں، اور موٹر سائیکلوں کی مرمت چند منٹ میں کی جاسکتی ہے۔
- ہر قسم کی پائپ لائنوں، ٹینکوں میں لیک کو منٹوں میں روکتا ہے۔
- گرمی اور پریشر برداشت کرتا ہے۔
- اس پر تیل، پانی، گیس اور دیگر کیمیکلز کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔
- ڈھلائی میں آجانے والی شوری کو منٹوں میں بھرا جاسکتا ہے۔
- چند منٹ میں خشک ہوکر لوہے کی طرح سخت ہوجاتا ہے۔
- اس میں سوراخ کئے جاسکتے ہیں، چوڑیاں کاٹی جاسکتی ہیں۔
- ریگ مال سے گھسنے پر لوہے کی طرح چمک دار ہوجاتا ہے۔



میجک ڈپوکسی اسٹیل

کے جوڑ ہزاروں پونڈ وزن برداشت کرتے ہیں 300 F° تک کی گرمی بھی برداشت کرلیتا ہے۔

- اس سے وہ کام کرسکتے ہیں جو پہلے ممکن نہ تھے۔ اسمیں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جس کی انجینیروں، کاریگروں موٹر مکینکوں، ریفریجریٹر ٹیکنیشنوں اور سب کو عرصے سے ضرورت تھی۔
- لوہا، تانبہ، پیتل، المونیم، پورسلین، سنگ مرمر، شیشہ، پتھر، چمڑا، لکڑی اور دیگر اشیاء کو چند منٹوں میں انتہائی مضبوطی کے ساتھ جوڑتا ہے۔

میجک ڈپوکسی اسٹیل۔ اس کا کوئی بدل نہیں۔

گھنٹوں کا کام منٹوں میں کیجئے۔

آپ حق گوئی میں کسی کی رو رعایت نہ فرماتے تھے اور برملا فرمادیا کرتے تھے تاکہ لوگ اپنی اصلاح کرسکیں۔ اگر کبھی کوئی محکمہ پولیس کا اہلکار حاضرِ خدمت ہوتا۔ تو اُسے فرماتے۔

"ظلم سے بچو اور پرچہ درج کرتے وقت بے گناہ آدمی کے اندراج سے پرہیز کرو۔"

اور صوم وصلوٰۃ کی تلقین فرماتے۔ الغرض جو کوئی بھی آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتا اُسے کوئی نہ کوئی پند و نصائح ضرور فرماتے اور سنت خیرالانام صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے لیے کہتے۔ جمعہ کی نماز خود پڑھاتے تھے۔ آپ کا خطبہ رشد و ہدایت، معرفتِ الٰہیہ، عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم، بزرگانِ دین کے حالات و واقعات و احکامات، قرآن و حدیث اور مسئلے مسائل پر محیط ہوتا تھا۔ غرضیکہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہوتا تھا جس کے بارے میں آپ نے اظہار نہ کیا ہو اور لوگوں کی رہنمائی نہ فرمائی ہو۔ آپ اپنے متعلقین کو اکثر فرمایا کرتے تھے۔

"ہمیشہ باوضو رہو۔ تھوڑا بولا کرو۔ اکثر ذکر میں مشغول رہو۔ اپنے مرشد و شیخ سے دلی و قلبی رابطہ رکھو۔ عام لوگوں سے الگ رہو۔ بہت کم کھاؤ کسی پر اعتراض نہ کرو اور دل سے خطرات نکال کر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔

آپ کو اپنے مریدین کا بڑا خیال رہتا تھا۔ ہمیشہ ان کے حال واحوال پر نگاہ رکھتے تھے۔ تاکہ قدم میں لغزش نہ آنے پائے اور صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں۔ آپ کا ایک مُرید جو کہ موضع جو کالیاں میں رہتا تھا نماز جمعہ کے لیے ایک دکان سے سائبان لایا کرتا تھا۔ وہاں ایک مجذوب بھی رہتا تھا۔ وہ مُرید اس کی بھی خدمت کر دیا کرتا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ اس مُرید کو خواب آیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہ مجذوب جس کی وہ خدمت کیا کرتا تھا بُلا رہا ہے اور اپنے حلقہ ارادت میں شامل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپ کو اپنے مرید کے اس خواب کے بارے میں کشف ہوا تو اگلے روز ہی اس گاؤں میں گئے اور مجذوب کے پاس جاکر کہا۔

"سائیں صاحب! جس شخص کو آپ اپنے حلقہ میں شامل کرنا چاہتے ہیں وہ ہمارا بچہ ہے۔"

اور تشریف لے گئے۔ چند دنوں کے بعد جب وہ مُرید سائبان لینے کے لیے اس گاؤں میں گیا اور حسبِ معمول اس مجذوب سے بھی ملا تو اس نے کہا۔

"تمہارے پیر و مُرشد ہم سے زیادہ طاقتور ہیں۔"

بزرگانِ دین کے خواب بھی بڑے بامعنی اور مبنی برحقیقت ہوتے ہیں۔ اللہ تبارک و

تعالےٰ اپنے برگزیدہ اور مقبول و مقرب بندوں پر مختلف اشیاء کی ماہیت آشکارا کرتا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت سید نورالحسن شاہ رحمتہ اللہ علیہ نے کیا دیکھا کہ ایک شخص ہے جس کا مُنہ کُتّے کی طرح ہے۔ ایک عورت لباس وزیورات سے مرصع اور شکل وصورت میں مگرمچھ کی طرح ہے۔ ایک بوتل میں خنزیر کا خون' ایک برتن میں پیشاب اور دوسرے میں خشک پاخانہ ہے۔ عالمِ خواب میں ہی آپ دریافت کرتے ہیں۔

"اے باری تعالیٰ! یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟"

تو کہنے والے نے کہا۔

"کتّے کے مُنہ سے گانے بجانے والے کا مُنہ مراد ہے۔ بنی سنوری عورت سے مراد شادی کا کھانا ہے۔ خنزیر کے خون سے مُراد شراب۔ پیشاب سے مراد بھنگ اور خشک پاخانہ سے مُراد افیون ہے۔"

مقبولانِ بارگاہِ خداوندی پر کشف وکرامت کے دروازے ازخود کھل جاتے ہیں۔ اس کے لیے انھیں کوئی ریاضت نہیں کرنی پڑتی اور نہ ہی خوارقِ عادات ان کے نزدیک بزرگی کی دلیل ہے۔ بعض اوقات کرامات صرف اس لیے رونما ہوتی ہیں کہ لوگ راہ سے بےراہ



نہ ہوں۔

ایک دن آپ کا ایک مُرید آپ کی زیارت و نیاز حاصل کرنے کی غرض سے گھر سے چلا۔ ابھی تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اُسے کوئی اور کام یاد آگیا اور واپس لوٹ گیا۔ دوسرے دن حاضر ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

"کل ہم نے یاد کیا تھا اور اطلاع بھی دی لیکن پرواہ نہ کی۔ اگر اتنا بھی ربط و مطابقت نہ ہو تو تعلّق کا کیا فائدہ ہوا۔"

جب حضرت سید نورالحسن شاہ رحمتہ اللہ علیہ حضرت میاں شیر محمّد شرقپوریؒ کی خدمت با برکت میں حاضر ہوئے تھے تو اس وقت آپ کی عمر پچیس سال تھی۔ اس وقت سے آپ کا معمول تھا کہ فرائض و سنن کے علاوہ نصف شب کو بیدار ہوتے۔ نمازِ تہجد ادا کرتے۔ تین ہزار مرتبہ درود خضری پڑھتے اور نمازِ فجر تک مراقبہ میں رہتے۔ کلمہ شہادت، سورہ قدر اور یہ شعر بھی پڑھا کرتے تھے۔

ے
سرم خاک رہ ہر چار سرور
ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ

حضرت نورالحسن شاہ رحمتہ اللہ علیہ ہر وقت سنتِ نبوی پر نظر رکھتے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ جود و سخا اور استغفار کی صفات سے متصف تھے۔ آپ اکثر و بیشتر کسی نہ کسی مرض و عارضہ میں مبتلا رہتے تھے۔ عرصہ بیس سال سے جوڑوں کے درد کی شکایت تھی لیکن لبوں پر سدا اللہ کے شکر کے الفاظ موجزن رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ آپ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے۔ وجع المفاصل کا مرض متواتر اٹھائی سال رہا۔ لیکن ان سب کے باوجود روزمرّہ کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ چہرہ مبارک سے قطعاً ظاہر نہ ہوتا تھا کہ آپ بیمار ہیں چنانچہ اس مردِ حق نے رشد و ہدایت کی بے شمار شمعیں روشن کرنے کے بعد ۳ ربیع الاوّل ۱۳۷۲ ہجری مطابق ۲۱ نومبر ۱۹۵۲ء کو جب کہ عمر ۶۳ سال اور گیارہ ماہ تھی داعی اجل کو لبیک کہا۔

آپ نے پسماندگان میں دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی۔ ایک بچّی کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ ۲۱ نومبر کو ہر سال آپ کا عرس مبارک ہوتا ہے۔ مریدین و معتقدین دُور و نزدیک سے حاضر ہوتے اور اپنی مرادوں سے جھولیاں بھرتے ہیں۔



حضرت ابراہیم بن شہریار

قطب الاولیاءؒ

حضرت ابراہیمؒ ایک روز وعظ فرما رہے تھے۔ مجلس میں بے شمار مخلوق وعظ سن رہی تھی۔ اسی محفل میں خراسان کا ایک عالم بھی موجود تھا جس کو اپنے علم و دانش پر بڑا زعم و گھمنڈ تھا۔ وعظ کے دوران اُس کے دل میں خیال آیا کہ میں خود بہت بڑا عالم۔ مفسرِ قرآن اور صاحب عرفان ہوں اور حضرت سے زیادہ یگانۂ اوصاف ہوں۔ مگر نہ معلوم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اُن کا دھیان میری ہی طرف بالکل نہیں اور وہ حضرت کی عقیدت میں دیوانے ہو رہے ہیں۔

حضرت قطب اولیاءؒ پر اس عالم کا یہ خیال منکشف ہو گیا۔ آپ نے وعظ میں ہی اہل مجلس سے فرمایا۔

"اے درویشو! وہ دیکھو قندیل کی چمنی اور تیل کا مباحثہ ہو رہا ہے۔ قندیل کی چمنی کہتی ہے کہ میں تجھ سے زیادہ افضل ہوں۔ میری ہی وجہ سے مخلوق کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ تیل یہ جواب دے رہا ہے چونکہ میں نے خدمتِ خلق میں بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ کاشت ہو کر زمین میں ایک مقررہ مدت گزار کر پیداواری مراحل طے کرنے کے بعد میں کاٹا گیا۔ کولہو میں ڈالا گیا۔ پیسا گیا۔ پھر اس قابل بنا کر دُنیا کے لیے روشنی کا سامان بہم پہنچا سکوں۔ اِن وجوہ کی بنا پر مجھے چمنی پر برتری حاصل ہے۔

حضرت یہ بات کہہ کے منبر سے نیچے اُتر آئے۔ خراسان کے عالم کو یہ بات سمجھ آگئی۔ حضرت کو عرفان و علم اور معرفت و آگہی میں اُس سے زیادہ برتری اور بالادستی حاصل ہے۔ اس لیے وہ فوراً حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر عضو خواہ ہوا اور آپ کے مریدوں میں شامل ہو گیا۔



حضرت قطب اولیاء ابراہیم بن شہریار گارزونیؒ مادرزاد ولی تھے۔ آپ کے والد خدا رسیدہ انسان تھے۔ انہوں نے اپنی دین پسندی اور حق پرستی کی بنا پر آپ کو ہوش سنبھالتے ہی قرآن پاک کی تعلیم کے لیے عازم مکتب کیا۔ آپ کے دادا جو مسلمان نہیں تھے آپ کو صنعتی تعلیم دینا چاہتے تھے مگر آپ کی علمی لگن اور شوق نے آپ کو صنعتی تعلیم کی طرف راغب نہ کیا۔ قدرت نے آپ کو ذہن و ذکاوت میں یگانۂ اوصاف بنایا تھا۔ آپ نے بہت جلد قرآن پاک حفظ کیا اور آپ نے تفسیر و حدیث پر عبور حاصل کر لیا۔ ہم مکتبوں اور دیگر ساتھیوں میں آپ سب سے زیادہ لائق اور فائق تھے۔

زمانہ طالب علمی میں ہی آپ کی خواہش تھی کہ آپ کسی شیخ طریقت سے طریقت و حقیقت کی تعلیم حاصل کریں اور آداب معرفت سیکھیں۔ آپ کی نظر میں اُس دور کے کئی اکابر اہل اللہ تھے اس لیے کسی ایک کا انتخاب کرنے کے لیے آپ نے استخارہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ استخارہ میں آپ نے دیکھا۔

"ایک شخص اونٹوں پر کتابیں لاد کر کہیں سے آرہا ہے آپ کے پاس پہنچ کر وہ آپ سے کہتا ہے کہ یہ سب کتابیں میں آپ کے لیے لایا ہوں۔ آپ جب کتابیں ملاحظہ فرماتے ہیں تو وہ سب کی سب حضرت شیخ عبداللہ خفیفؒ کی تالیف کردہ ہوتی ہیں۔

بیدار ہونے کے بعد آپ خواب میں استخارہ کو سمجھ جاتے ہیں کہ اللہ پاک نے یقیناً حضرت عبداللہ خفیفؒ سے بیعت کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ نے فوراً حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا خواب سُنایا اور بیعت کی درخواست کی۔ جو قبول کر لی گئی۔

بیعت ہونے کے بعد آپ بہت جلد صاحب کمال ہو گئے اور ہمیشہ نفس کشی کی طرف متوجہ رہے۔ ایک مرتبہ آپ حج پر روانہ ہوئے تو بصرہ میں قیام کے دوران آپ کو وہاں کے مشائخ نے کھانے میں گوشت پیش کیا۔ آپ نے گوشت کھانے سے معذرت کر لی۔ اُن لوگوں نے سمجھ لیا کہ شاید آپ گوشت نہیں کھاتے ہوں گے۔ مگر آپ کے نفس نے آپ کو مجبور کیا کہ

لوگوں کے سامنے گوشت نہیں کھایا گیا تو کیا ہوا۔ تنہائی میں گوشت کھا لینے میں کیا حرج ہے۔ نفس کے اس طرح باغی کرنے پر آپ نے عہد کر لیا کہ اب زندگی بھر گوشت نہیں کھاؤں گا۔ آپ اس عہد پر زندگی بھر قائم رہے۔

اسی طرح تر خرما اور شکر کھانے سے بھی آپ نے ایک مرتبہ ایسا ہاتھ کھینچا کہ ساری زندگی اُس کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ بلکہ ایک مرتبہ آپ بیمار بھی ہو گئے۔ حکیم نے دوائیں شکر میں ملا کر پینے کی ہدایت کی مگر آپ نے کڑوی دوا پی لی اور شکر کو مُنہ نہ لگایا۔

*

آپ فرمایا کرتے تھے جو آدمی بچپن اور جوانی میں حق تعالیٰ کا مطیع ہوتا ہے بڑھاپے میں بھی خدا کا مطیع رہتا ہے اس کا باطن معرفت کے نُور سے روشن ہو جاتا ہے۔ حکمت کے چشمے اس کے دل سے جاری ہو کر اُس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں اور جو آدمی بچپن اور جوانی میں گنہگار اور خدا کا نافرمان رہتا ہے اور بڑھاپے میں خدا کی اطاعت کرتا ہے۔ اس کو کمال شائستگی حاصل نہیں ہوتی۔ حکمت بھی اُسے بہت دیر سے بلکہ بہت کم حاصل ہوتی ہے۔ جیسے بقول شخصے

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری
وقتِ پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار

*

آپ نے طریقت کی وادی میں جب قدم رکھا تو سب سے پہلے مہمان نوازی کی عادت کو اختیار کیا آپ نے یہ معمول بنا لیا جو بھی مسافر آپ کو ملتا آپ اُس کی مہمانداری فرماتے ـــــ۔ آپ کی اس شاہ خرچی پر ایک روز آپ کے والد نے فرمایا۔

"بیٹا! تم فقیر آدمی ہو۔ تم میں اتنی استطاعت نہیں کہ ہر آنے جانے والے مسافر کی خدمت کر سکو۔ ایسا نہ ہو کہ تم اس کام میں پھنس کر اپنے کام سے رہ جاؤ۔"

اپنے والد صاحب کی بات سُن کر آپ خاموش ہو گئے۔ اِسی دوران رمضان المبارک کا مہینہ آ گیا۔ ایک روز مسافروں کی ایک جماعت آپ کے پاس آ گئی۔ اُس روز آپ کے پاس کھانے پینے کا کوئی سامان نہ تھا۔ شام کا وقت ہو گیا، لیکن افطاری کروانے کے لیے آپ کوئی انتظام نہ کر سکے۔ کوئی اور ہوتا تو ایسی صورتِ حال میں پریشان ہو جاتا مگر آپ ـــــ مطمئن رہے۔ مغرب کی اذان سے کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔ ایک شخص آپ کی خدمت

میں حاضر ہُوا اور کافی ساری روٹیاں ۔ سالن اور پھل لاکر آپ کی خدمت پیش کیں ۔ آپ کے والد صاحب بھی وہاں پاس ہی موجود تھے ، اتنے میں اذان ہوئی سب نے مل کر روزہ افطار کیا اور خدا کا شکریہ ادا کیا ۔ آپ کی یہ کرامت دیکھ کر آپ کے والد صاحب نے آپ کو مہمان داری سے روکنا چھوڑ دیا بلکہ آپ کے اس عمل کو سراہنا شروع کر دیا ۔

***

حضرت قطب الاولیاءؒ اکل حلال کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا کرتے تھے ۔ آپ بیت المقدس سے بیج کے لیے گیہوں لاتے ، جنہیں خود کاشت کیا کرتے تھے اور فصل آنے پر حسب ضرورت رکھ کر باقی خیرات فرما دیتے تھے ۔ اسی طرح کپڑے کے معاملے میں آپ بہت احتیاط سے کام لیتے تھے ۔ روئی کے بنولے کسی دین دار آدمی سے خرید کر خود کاشت کرتے ۔ ہر سال روئی کی فصل آنے پر اُس کا کپڑا بنواتے اور پھر اُسے پہنتے تھے ۔

***

حضرت کے دستِ مبارک پر چوبیس ہزار مجوسی اور یہودی مشرف بہ اسلام ہوئے ۔ آپ فرماتے تھے ۔

"مرد کامل وہی ہے جو لے لے اور دیدے ، وہ مرد آدھا مرد ہے جو لے لے مگر دوسرے کو کچھ نہ دے اور جو شخص نہ کچھ لے اور نہ کچھ دے وہ مردانگی صفت سے خارج ہے ۔"

***

آپ کے اندر شفقت اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ ایک مرتبہ ایک ہرن جنگل سے آپ کے پاس آگیا ۔ آپ نے اُسکو پیار کیا ایک خادم کے ساتھ واپس جنگل روانہ فرما دیا ۔

آپ اپنے مریدوں کو ہمیشہ یہ تعلیم دیتے تھے کہ نیکوں اور باعمل لوگوں کی صحبت اختیار کیا کرو ، کیونکہ ارشادِ نبویؐ ہے " اللہ ہمیشہ اُس اُمت کی حفاظت فرماتا ہے جو تین کاموں سے ہمیشہ اپنا دامن بچا کر رکھے ۔ اوّل یہ کہ نیک لوگ بُروں کی صحبت میں نہ جائیں دوم یہ کہ اچھے لوگ بُروں کو اپنا بڑا نہ بنائیں اور سوم یہ کہ طریقت والوں کے رشتہ دار اور سنت کے بیرو کار ظالموں سے ملاپ نہ رکھیں ۔ ایسے کام کرنے سے گریز کرنے والی اُمت کو خدا ہمیشہ اپنی حفاظت میں لیے رکھتا ہے ۔

*

ایک مرتبہ آپ وعظ فرما رہے تھے۔ وعظ کی مجلس میں دو دنیا پرست انسان داخل ہوئے آپ نے اُن کو دیکھتے ہی فرمایا۔

"جو شخص میری زیارت کا خواہش مند ہو۔ اُسے جستہ اللہ آنا چاہیئے۔ کسی دنیاوی طمع سے نہیں۔ دنیاوی طمع سے جو شخص ملاقات کے لیے آتا ہے اُس کو کوئی فائدہ حاصل نہیں۔ میں مخلوق خدا کو خدا کے لیے ملتا ہوں اسکی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک میں خدا نے جو احکام صادر فرمائے ہیں میں اُن تمام کا عامل ہوں۔

**

ایک روز ایک باپ اور بیٹا حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی۔

"حضرت! ہم آپ کے سامنے توبہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔"

آپ نے فرمایا "عزیزانِ من! میرے سامنے توبہ کرنے کے بعد جو شخص توبہ شکنی کرتا ہے وہ دنیا اور آخرت کے عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

اُن دونوں نے صدقِ دل سے حضرت کے سامنے توبہ کر لی۔ مگر کچھ ہی عرصہ بعد توبہ شکنی کے مرتکب ہو گئے۔ خدا کا کرنا کیا ہوا ایک کھانا پکاتے ہوئے آگ بیٹے کے کپڑوں کو لگ گئی۔ باپ بیٹے کو بچانے کے لیے آگے بڑھا مگر آگ نے اُس کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور یوں وہ دونوں آگ میں جل کر خاکستر ہو گئے۔

**

بادشاہِ وقت کا ایک مصاحب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "حضرت! میں بادشاہ کا مصاحب ہوں۔ مجھے محفلِ شاہی میں شراب و کباب اور شباب میں برابر کا شریک ہونا پڑتا ہے۔ میں دل سے ان عادات کو پسند نہیں کرتا، لیکن حکم شاہی سے سرتابی ممکن نہیں۔ آپ میری مدد فرمائیں۔"

آپ نے فرمایا "تم! میرے سامنے شراب و شباب سے توبہ کر لو پھر انشاء اللہ تمہیں بادشاہ کبھی گمراہ نہیں کر سکے گا۔"

مصاحب نے عرض کی "حضرت آیا تو میں توبہ کرنے ہی ہوں۔ مگر ڈرتا ہوں اگر توبہ شکنی کر بیٹھا تو دنیا و آخرت کے عذابوں کا شکار ہو جاؤں گا۔"

آپ نے فرمایا "تم! توبہ کر لو۔ اگر کبھی توبہ شکنی کا موقع آجائے تو مجھے یاد کر لینا۔"

مصاحب نے حضرت خواجہ کے روبرو سچی توبہ کرلی۔ مگر ایک روز بادشاہ کی محفلِ رقص و سرور اور شراب و قدوگیسو گرم تھی۔ مصاحب کو بھی دادِ عیش دینے پر آمادہ کیا گیا۔ باوجود ہزار کوشش کے جب عہد توڑنے پر آمادہ ہوا اچانک اُس کے منہ سے نکلا۔

"یا شیخ آپ کہاں ہیں"

یہ کہنے کی دیر تھی کہ ایک بلّی آئی اُس نے جھپٹا مار کر شراب کی بوتلیں گرادیں اور یوں محفل درہم برہم ہوگئی۔ مصاحب نے حضرت شیخ کی یہ کرامت دیکھی تو رونا شروع کر دیا۔ بادشاہ نے مصاحب سے رونے کا سبب پوچھا تو اُس نے ساری بات بلا کم وکاست سنادی۔ اس روز کے بعد بادشاہ نے اُس مصاحب کو محفلِ نشاط میں آنے کے لیے کبھی نہ کہا۔

*

آپ فرمایا کرتے تھے۔ صوفیت اور درویشی مشکل کام ہیں۔ اس راہ پر جو آدمی گامزن ہوگا۔ اُس کو لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے۔ خدا کی عبادت کرنے کے لیے خدا سے ڈرنا، اور مخلوقِ خدا کی بھلائی چاہنا عبادت کے لیے لازم ہیں۔

شیطان ناپاک ہے اور خون بھی ناپاک ہے۔ شیطان انسان کے خون کے ساتھ دوڑا دوڑا پھرتا ہے۔ ذکرِ حق پاک ہے اور روح بھی پاک ہے۔ اس لیے پاک چیز کا پاک چیزوں میں گزر ہوتا ہے۔

ہمیشہ علومِ شرعی حاصل کرو۔ کیونکہ اہلِ طریقت وحقیقت کو کسی حال میں علوم سے چھٹکارا نہیں۔ علم سیکھنے کے بعد ریاکاری اور دکھاوے سے پرہیز کرو اور جو جانتے ہو اُس کو چھپاؤ نہیں۔ ہمیشہ خدا کی رضاجوئی کی کوشش کرو۔ علم پر عمل نہ کیا جائے تو وہ بے روح کے قالب کی طرح ہوگا۔

آپ نے عمر بھر دین کی اور مخلوقِ خدا کی بے دریغ اور بے لوث خدمت کی اور یکشنبہ ۸ ذیقعد ۴۲۶ھ کو وصال فرمایا، آپ اہلِ طریقت وحقیقت کے پیشوا، علم وحقیقت و معرفت میں یگانہ روزگار، متابعت شریعت وسنت کے عاشق و دلدادہ تھے۔ ریاضت و تجرید اور فراست میں بے نظیر تھے۔ آداب واحوال اور مقاماتِ مشائخ میں اپنی مثال آپ تھے۔ بڑے بڑے جیّد مشائخ کی صحبت بابرکت سے آپ فیض یاب ہوتے تھے۔ آپ کا مزار دمشق میں واقع ہے اور وہاں آنے جانے والے آج بھی برملا کہتے ہیں آپکا مزار تریاق اکبر ہے اور آپ کے توسط سے جو مراد بھی مانگی جائے خدا تعالیٰ ضرور پوری فرما دیتا ہے اور دلی مقصود بر آجاتا ہے۔

حضرت سید علی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ
المعروف پیر بابا

پاچہ کلے کا نام سنتے ہی ذہن میں حضرت سیّد علی ترمذی المعروف پیر بابا رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی کا خیال گھوم جاتا ہے اور سر ادب سے جھک جاتا ہے۔ چار سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا کہ آپ اس سرزمین میں آسودۂ خواب ہیں لیکن بے شمار محبّین اور عقیدت مندوں کا عرس مبارک کے ایّام کے علاوہ سارا سال مزار مقدّس پر حاضری کے لیے تانتا بندھا رہتا ہے جس نے اس علاقے کو شہرتِ دوام بخش دی ہے۔ وہاں یوں احساس ہوتا ہے جیسے صاحبِ مزار اب بھی انعام واکرام تقسیم کرنے میں مصروف ہیں اور لوگوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے محبوب صلّی اللہ علیہ وسلّم کے راستے پر چلنے، شریعتِ مطہّرہ پر مضبوطی سے گامزن ہونے اور دینِ حنیف کی رسّی مضبوطی سے تھام لینے کی وعظ ونصیحت کر رہا ہو۔ اور زبانِ ترجمانِ حق بیان سے ارشاد فرما رہا ہو۔

"اے لوگو! عارضی اور فانی زندگی کے عوض دائمی اور اخروی زندگی تباہ وبرباد نہ کرو۔ کیا تم نے اللہ تعالیٰ کی عظیم الشّان اور آخری کتاب قرآن حکیم میں نہیں پڑھا کہ اس عالم رنگ وبو کا نام کھیل تماشا اور لہو ولعب ہے۔ یہ آزمائش گاہ ہے۔ حرص وہوا وخواہشات نفسانی کی اتباع انسان کو جہنّم کی طرف لے جاتی ہے۔ دُنیا مزرع آخرت ہے لہٰذا اس میں عمل کے وہ بیج بوؤ جو آخرت میں جنّت کے ہاتھوں میں اُگیں۔ کیا تم سدا زندہ رہو گے؟ یقیناً نہیں، پھر نیکیوں میں سبقت لے جانے سے گریز کا کیا مطلب ہے؟ ——

لوٹ کھسوٹ کس لیے کرتے ہو؟ تضاد و اختلاف اور نفرتوں کو کیوں جنم دیتے ہو؟ محبتوں کے رشتوں کو کیوں قطع کرتے ہو؟ علمِ دین و شریعت پر دنیاوی علوم کو کیوں فوقیت دیتے ہو؟ دین فروشی کس لیے کرتے ہو؟ ملک دشمنی سے کیا مفاد حاصل کرنا چاہتے ہو؟

حضرت پیر بابا رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ دینِ اسلام کی ترویج، لوگوں کی اصلاحِ احوال، بدعات کی بیخ کنی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین اور خدا ترسے بزرگ و برتر اور اس کے حبیبِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا و خوشنودی میں بسر ہوتا تھا۔ آپ کی مساعی جمیلہ سے دُور و نزدیک ایسے علم و معرفت کے چراغ روشن ہوئے جن کی روشنی آج بھی پھیلی ہوئی ہے۔

آپ فرمایا کرتے تھے۔

"میرے دوست اور مرید وہ ہیں جو مجھ سے رُوحانی فائدہ حاصل کرتے اور میرے احوال پر نظر رکھتے ہیں۔"

آپ سادات ترمذ میں سے تھے۔ آپ کی پیدائش ۹۰۸ ہجری میں بمقام قندس تھا۔ آپ کا نسبتی تعلق اکتیسویں واسطوں سے حضرت امام حسینؓ سے ملتا ہے۔ آپ کے والد بزرگوار سیّد قنبر علی باوجود اس کے کہ ہمایوں بادشاہ کی فوج میں کمانڈر تھے، درویشانہ زندگی بسر کرنے کے قائل تھے اور حتی الامکان وہ افسرانہ انداز و اطوار سے بہت دُور رہتے تھے۔ بابر بادشاہ نے اپنی لڑکی ان کے عقد میں دی ہوئی تھی اس لحاظ سے سلاطین زمانہ سے رشتہ داری بھی تھی۔ کبھی کبھار اپنے بیٹے علی کو ساتھ دربار میں لے جایا کرتا تھا تو ہمایوں علی کو خلعتِ شاہی سے نوازتا تھا۔ ۹۴۲ھ میں جب ہمایوں واپس کابل آیا تو پیر بابا کے والد کو بطور تبرک ساتھ لے گیا۔ تاکہ اسے ہر مقام پر آسانی نصیب ہو اور خیر و برکت رہے۔

حضرت علی ترمذیؒ کا زیادہ تر وقت درباری مصروفیات میں گزرتا تھا اس لیے آپ کی تعلیم و تربیت کا بیڑا آپ کے دادا سید احمدؒ نُور نے اٹھا رکھا تھا۔ لہٰذا پوتے کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ شرح ملّا جامی تک کتب پڑھیں اور ساتھ ساتھ زہد و ریاضت اور افکارِ طریقت کی راہوں سے آشنا کیا۔

علی ترمذی کی سادگی اور سوچ بچار کی بنا پر سب گھر والے آپ کو دیوانہ کہتے تھے۔ دادا کو اپنے پوتے کی یہی ادا پسند تھی۔ فرمایا کرتے تھے "یہی دیوانہ تو مجھے پسند ہے۔" اور جب آپ کے دادا جان کا وقتِ آخر آیا تو انھوں نے پوتے علی ترمذی کو بُلایا اور کہا۔

"قرآن پاک سے کچھ یاد ہے تو پڑھو۔"

آپ نے ایک سورہ کی تلاوت کی۔ حضرت سید احمد نورؒ نے تین مرتبہ تلاوت قرآن کرواتی اور پھر جو نصیحت و برکت آباؤ اجداد سے سلسلہ کبرویہ انھیں نصیب تھی وہ پوتے کے حوالے کردی اور شرفِ اجازت سے نوازا۔

حضرت سید احمد نورؒ کے وصال کے بعد آپ بے یار و مددگار ہوگئے۔ ظاہری و باطنی علوم کے حصول کی تشنگی ہنوز باقی تھی لہٰذا تحصیلِ علم کے لیے ہندوستان کا رُخ کیا۔ اب آپ پر فقیری کا رنگ غالب تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے چونکہ آپ سے لوگوں کی رشد و ہدایت کا کام لینا تھا اس لیے آپ کو اہلِ حریف سے الگ کر دیا گیا۔ ہوا یوں کہ جب آپ اہلِ خاندان کے ہمراہ پانی پت پہنچے تو حضرت شیخ شرف الدین پانی پتی المعروف بوعلی قلندرؒ کے دربار پر حاضری دی۔ وہاں پہنچے تو حالت غیر ہوگئی۔ چنانچہ اپنے خاندان والوں سے الگ ہوگئے اور مانک پور تشریف لے گئے اور حضرت شیخ سیلونہ کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے۔

حضرت شیخ سیلونہؒ اپنے وقت کے جلیل القدر علماء اور اولیاء اللہ میں سے تھے۔ دُنیا سے ناطہ توڑ کر اپنے رَب سے تعلق جوڑ لیا تھا۔ سوائے درس کے ان کا سارا وقت عبادت و ریاضت و مجاہدہ میں گزرتا تھا۔ ہر وقت عالمِ استغراق میں رہتے تھے۔ الگ بھی آرام فرما رہے ہوتے تو نیند کی حالت میں بھی آپ کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس طرح حرکت کرتی رہتی تھیں جیسے تسبیح پر اللہ کا ذکر کر رہے ہوں۔ عاشقِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم اور متوکل علی اللہ تھے۔ ایک دن ذکرِ جلی میں مشغول تھے کہ غلبہ ذوق و ذکرِ الٰہی سے بیخود ہو کر بام سے نیچے گر پڑے۔ لیکن ذکر میں ہنوز مشغول تھے۔ جب ہوش میں آتے تو پتہ چلا کہ نیچے گر پڑے تھے مگر آپ کو چوٹ نہیں لگی۔ اس پائے کی شخصیت سے آپ نے علم فقہ اور دُوسری کتب سے فراغت پائی۔ حضرت شیخ سیلونہ کو ان طلباء کے ساتھ بڑی محبت ہوتی تھی جو علم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ لہٰذا حضرت سید علی ترمذی پر خاص لُطف و عنایت کی نگاہ ڈالی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو سال کے عرصہ میں آپ نے ظاہری علم حاصل کر لیا اور پھر علم باطنی کی طرف متوجہ ہوتے۔

ایک دن استادِ مکرم کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ بڑے ادب سے عرض کی۔

"یا حضرت! شریعت کے بعد طریقت کی راہ پر بھی میری رہنمائی فرمائیں۔" استاد نے سُنا تو فرمایا۔

"علی ترمذی! میں تمھیں بیعت کرنے سے معذور ہوں۔ اس سلسلہ میں تم میرے شیخ حضرت سالار رومیؒ کے پاس چلے جاؤ وہ اس راستے کے مردِ کامل ہیں۔"

حضرت علی ترمذیؒ کی درخواست پر حضرت شیخ سیلونہؒ نے اپنے شیخ کے نام ایک خط دیا اور اجمیر شریف جانے کے لیے کہا۔

حضرت شیخ سالار رومیؒ کو بذریعہ کشف معلوم ہو گیا تھا ایک سید زادہ ان سے ملنے آ رہا ہے۔ آپ نے حاضرِ خدمت ہو کر استاد گرامی حضرت شیخ سیلونہ کا رقعہ دیا تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

"اے سید! اگرچہ اہلِ بیعت خدمت کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے لیکن سلسلہ بیعت کا اصول خدمت پر جاری ہے۔ نیز بیعت کے اثر و فوائد بغیر باطنی صفائی اور کامل مرشد کی صحبت کے حاصل نہیں ہو سکتے۔" اور آپ کو حلقہ ارادت میں شامل فرما لیا۔ اب آپ نے سلوک کی منازل طے کرنا شروع کیں۔ عبادت و ریاضت میں وقت بسر ہونے لگا۔ علم تصوف پڑھنا شروع کیا ایک سبق لیتے اور مرشد کے فرمان کے مطابق اس پر عمل و ریاضت کرتے۔ جب اس عمل کے اثرات نمودار ہوتے تو مرشد کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے کہ کیا کیا مشاہدات ہوتے ہیں۔ مرشد سنتا، مسرور ہوتا اور تصوف و روحانیت کا اگلا سبق دیتا۔ غرضیکہ جو علم بتایا جاتا اس پر عمل بھی ساتھ ساتھ کیا جاتا اور آپ کی ذات گنجینۂ معرفت میں ڈھلتی چلی گئی۔ کافی عرصہ کے بعد جب مرشد نے دیکھا کہ تربیت مکمل ہو گئی ہے تو سلسلہ چشتیہ، سہروردیہ، شطاریہ اور جلالیہ میں اجازت عطا فرمائی۔ سلسلہ کبرویہ میں آپ کو پہلے سے اجازت حاصل تھی۔ لہٰذا یہ فرما کر کہ کسی کو ہمستانی علاقے میں جا کر لوگوں کی اصلاح کرو رخصت کر دیا اور اس بات کو آپ کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ ہندوستان میں کسی کو ہمستانی علاقے میں جا کر یہ فریضہ ادا کرتے ہیں یا اپنے وطن مالوف جا کر۔

دریائے جہلم سے مغرب کی طرف چار میل کے فاصلے پر پنڈ دادن نامی گاؤں ہے۔ وہاں ایک ہندو رہتا تھا جس کا نام کیلاش تھا۔ ایک دن اُسے خواب آیا کہ ایک بزرگ گاؤں میں آیا ہے جس کی وجہ سے پورا گاؤں روشن ہو گیا ہے۔ صبح اٹھا تو اس نے اپنا خواب گاؤں والوں کو سنایا اور اس بزرگ کا حلیہ اور پیشانی پر تل تک بتا دیا۔ حضرت سید علی ترمذیؒ جب مسافت طے کرتے ہوئے پنڈ دادن پہنچے تو کیلاش نے آپ کو پہچان لیا اور تمام گاؤں والوں کو آپ کی آمد کی اطلاع دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے گاؤں والے آپ کے گرد جمع ہو گئے اور وہاں قیام فرمانے کے لیے عرض کی۔ آپ نے جب دیکھا کہ لوگ دین کی طرف راغب ہیں تو وہیں رُک گئے۔ اس سے زیادہ اور اچھی بات کیا ہو سکتی تھی۔ لوگ حصول علم دین کے لیے حاضرِ خدمت ہونے لگے۔ غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔ دین کی روشنی پھیلنے لگی۔ یہ ۹۵۰ھ کا واقعہ ہے۔ آپ نے جب دیکھا

کہ لوگوں کے ہجوم میں ان کے درود و وظائف اور عبادت و ریاضت میں خلل پڑ رہا ہے تو فیصلہ کیا کہ اجمیر واپس جا کر عرض کروں کہ مجھے اپنے تفویض شدہ فرائض سے سبکدوش کر دیا جائے تاکہ کسی گوشہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا رہوں۔ اس نیت سے آپ اجمیر روانہ ہوئے۔ جب گجرات کے قریب پہنچے تو والد محترم سے مُلاقات ہوگئی۔ جو شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد ہمایوں کے ساتھ بچے کھچے لشکر کے ساتھ کابل کی طرف روانگی کا پروگرام بنا رہے تھے۔ کافی عرصے کے بعد باپ اور بیٹے کی ملاقات ہوئی تھی۔ جذبات کا عجیب عالم تھا۔ باپ نے بڑی محبت و شفقت کا اظہار فرمانے کے بعد کہا۔

"بیٹا تم نے بہت اچھا کیا جو اپنے آباؤ اجداد کا راستہ اختیار کیا اور روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔"

اس کے بعد باپ نے آپ کو دو تھیلیاں دیں جن میں سے ایک میں سونا اور دُوسری میں چاندی تھی۔ آپ نے دیکھا تو عرض کی۔

"اے والد محترم! مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔"

"میں جانتا ہوں بیٹا تم انھیں درویشوں پر خرچ کر دینا۔ باپ نے کہا تو آپ نے وہ تھیلیاں قبول فرمالیں اور اجمیر شریف جاتے ہوئے راستے میں ہی تقسیم کر دیں۔

جب آپ وارد اجمیر ہوئے تو پتہ چلا کہ مرشدنا حضرت سالار رومیؒ دارِ فانی سے کوچ فرما گئے ہیں۔ درگاہ عالیہ میں پہنچے تو مُرشد کے صاحبزادے اور آپ کے پیر بھائی حضرت شیخ حسین مسندِ خلافت پر جلوہ افروز تھے۔ اس وقت وہ مراقبہ کی حالت میں تھے۔ آپ قریب جا کر بیٹھ گئے۔ جب تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے سر اٹھایا تو اپنے پیر بھائی کو سامنے موجود پایا۔ فرمانے لگے۔

"اے سیّد علی ترمذی! ابھی دورانِ مراقبہ حضرت قبلہ والد محترم سے مُلاقات ہوئی ہے۔ فرما رہے تھے کہ مَیں نے دو خرقے چھوڑے ہیں۔ ان میں سے ایک کے ٹکڑے کر کے معتقدین میں بانٹ دیں اور دُوسرا جو ابھی آتے اُسے دے دینا۔ لہٰذا وہ خرقہ آپ کو پہنا دیا گیا۔ آپ تو اس لیے حاضر ہوتے تھے کہ عائد شدہ فرائض سے کنارہ کشی کے لیے درخواست کریں تاکہ دُنیا سے الگ تھلگ ہو کر عبادت و ریاضت میں مصروف رہیں مگر معاملہ اس کے برعکس ہوگیا۔

آپ نے چند دن وہاں قیام کیا۔ زیادہ تر خلوت میں رہ کر وظائف و درود میں مصروف رہتے تھے۔ اور پھر اجازت لے کر مرشد کے فرمان کے مطابق لوگوں کی اصلاح کے لیے وہاں سے کشمیر کی طرف رُخ کیا۔ وہاں پہنچے تو یہ خطہ سرزمین بہت پسند آیا۔ تبلیغ حق شروع کر دی۔ لوگ حاضرِ خدمت ہوتے

لگے اور ہدایت پانے لگے۔ بہت سے لوگ آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوتے۔ کچھ عرصہ یہاں قیام فرمانے اور تبلیغ حق کرنے کے بعد براستہ پشاور عازم افغانستان ہوتے۔

جس طرح مشک کی خوشبو پھیل جاتی ہے اسی طرح اولیاء اللہ پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ جب حضرت علی ترمذیؒ پشاور پہنچے تو آپ کی مُلاقات حاجی سیف اللہ ـــــ سے ہوئی۔ آپ سے مل کر اُسے مسرّت ہوئی اور درخواست کی کہ اپنے فیوض و برکات سے ہمارے علاقے کے لوگوں کو مستفید فرمائیں۔ آپ نے اس کی دعوت قبول فرمالی اور سوچا کہ ان کے گاؤں دوابہ میں چند ے قیام کرنے کے بعد افغانستان چلا جاؤں گا۔ چنانچہ اس کے ساتھ تشریف لے گئے اور لوگوں کی اصلاحِ احوال فرمانے لگے۔

دوابہ کے قیام کے دوران آپ جب بھی ارادہ فرماتے کہ اب چلنا چاہیئے تو کوئی نہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جاتی کہ رُکنا پڑتا۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔ اس عرصے میں آپ کی عظمت و بزرگی کا بھی کافی شہرہ ہو گیا تھا۔ ایک دن آپ تشریف فرما تھے کہ قبیلہ گگیانی کے چند ایک لوگ حاضرِ خدمت ہوتے اور عرض کی۔

"حضور! آجکل یوسف زئیوں کے علاقے میں دو نام نہاد شریعتِ محمدیؐ کے مخالف پیر آتے ہوتے ہیں جو لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں"۔

آپ نے سُنا تو ان لوگوں کے ہمراہ سلام نامی گاؤں میں تشریف لے گئے۔ تاکہ بھولے بھالے لوگوں کو ان کے فریب سے بچائیں اور ان کی اصلاح کریں۔

پختون قوم بڑی اسلام دوست اور اس کے لیے سب کچھ نثار کرنے کے لیے آمادہ و تیار ہوتی ہے۔ علماء و بزرگانِ دین کا بڑا احترام کرتی ہے اور ان کی باتوں کو بڑی محبت و عقیدت سے سُنتی ہے۔ ان کے اس محبت آمیز جذبے اور خلوص کی بناء پر بعض نام نہاد بزرگ دھوکہ دیتے ہیں اور مفاد حاصل کرتے ہیں۔ جب حضرت علی ترمذی المعروف پیر بابا موضع سدم پہنچے تو لوگ آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ آپ نے انھیں پند و نصائح کیے۔ بدعات سے رُک جانے کی تلقین کی۔ شریعتِ محمدیہ پر عمل پیرا ہونے کے لیے کہا اور بتایا کہ ہر وہ شخص جس نے دستار و جبہ پہن رکھا ہو ضروری نہیں کہ اولیاء اللہ ہی سے ہو۔ اللہ والے وہ ہوتے ہیں جو خواہشات کی پیروی نہیں کرتے اور ہر معاملہ اللہ تبارک و تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی رضا و خوشنودی کے لیے کرتے ہیں۔ آپ کے قول و عمل سے لوگ بے حد متاثر ہوتے۔ آپ کے قرب سے انھیں خیر اور غیر ملی۔ حق اور باطل میں فرق کرنا آگیا اور ان جھوٹے پیروں کی قلعی کھل گئی جو ان کے علاقے میں گمراہی پھیلا رہے تھے

اور لوگوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈال رہے تھے۔ ایک دن آپ نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں جعلی پیروں سے گفتگو کی جائے تاکہ وہ مزید لوگوں کو گمراہ نہ کر سکیں۔ ان کو جب علم ہوا کہ آپ ان سے بحث و مناظرہ کرنے کے لیے تشریف لا رہے ہیں تو روپوش ہو گئے۔ ظاہر ہے باطل حق کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس سے علاقے کے لوگوں پر ان کی حقیقت منکشف ہو گئی اور وہ اُن کے جال میں پھنسنے سے بچ گئے اور جو پھنس چکے تھے وہ بھی حق کی طرف لوٹ آئے۔

یوسف زئیوں میں قیام کے دوران ہی حضرت پیر بابا ؒ کی شادی مریم بی بی سے ہو گئی تھی۔ شادی سے کچھ عرصہ بعد آپ اہلیہ محترمہ کو ساتھ لے کر بطرف ترمذ اپنے وطن مالوف کی طرف روانہ ہوئے تاکہ والدین سے مُلاقات کریں۔ وطن پہنچے تو پتہ چلا کہ آپ کے والد محترم سیّد قنبر علی رحلت فرما چکے ہیں۔ دلی صدمہ ہوا۔ والدہ ماجدہ سے ملے اور تمام حالات سے انھیں آگاہ کیا۔ ماں نے سُنا تو ارشاد فرمایا۔

"بیٹا! بہتر ہے تم یوسف زئی جا کر لوگوں کی اصلاح و رشد و ہدایت کا کام جاری رکھو۔"

چنانچہ چند سے قیام فرمانے کے بعد آپ واپس تشریف لے آئے۔ اب آپ کو کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں خلوت میں رہ کر اپنے رب کی عبادت کریں۔ یہ سوچ کر آپ نے اہل و عیال کو ساتھ لیا اور چل پڑے۔ کوئی متعین منزل نہ تھی۔ خود کو اپنے معبود حقیقی کے حوالے کر دیا تھا کہ جہاں اس کی مشیت ہو گی لے جائے گا۔ چنانچہ آپ چلتے چلتے گنداب کے راستے پاچہ کلے گاؤں میں پہنچے جو کہ بونیر کے گوشے میں واقع ہے۔ آپ نے یہیں سکونت اختیار فرمائی۔ یہ ۹۷۰ھ کا واقعہ ہے۔

اب آپ کو ایک ایسے گوشۂ تنہائی کی ضرورت تھی جہاں دُنیا والوں سے الگ تھلگ ہو کر اپنے رب تعالیٰ کی عبادت و ریاضت کرتے رہیں۔ پاچہ کلے سے تھوڑی دُور نربٹول گاؤں ہے جس کے عقب میں ایک پہاڑی غار ہے۔ ایک دن آپ وہاں گئے تو یہ غار بے حد پسند آیا۔ لہٰذا اس میں آپ عبادت میں مشغول ہو گئے۔ لیکن مرشد نے جو آپ کو فریضہ سونپا تھا اس سے بھی غافل نہیں تھے۔ تبلیغی خدمات کے علاوہ مختلف علاقوں میں درسگاہیں بھی قائم کیں تاکہ لوگ دینی علوم سے بہرہ ور ہوں۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ روز افزوں لوگ منکرات و لواہی سے مُنہ موڑنے لگے اور راسخ العقیدہ ہو گئے۔ لوگوں کو سیدھی راہ پر گامزن رکھنے کے لیے انھیں بیعت فرما لیا کرتے تھے کیونکہ بغیر علم دین انسان کے گمراہ ہونے کا بے حد امکان ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ بے علم زاہد کے لیے بے حد خطرات موجود ہیں۔ لوگوں کو بیعت کرنے سے یہ ہوتا تھا کہ جو عمل کرتے تھے مُرشد کے فرمان کے مطابق کرتے تھے اور یہی ان کی حفاظت تھی۔ اکثر فرمایا کرتے تھے۔

"اے لوگو! شریعتِ فقہ اسلامیہ پر ثابت قدم رہنا ہی نجات کے لیے کافی ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ آج تک جتنے بھی بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ ہوتے ہیں یا موجود ہیں یا آئندہ ہوں گے سب کے سب شریعت کے پابند ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہی وہ بنیاد ہے جن پر معرفت الٰہیہ کی عظیم عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اور اسی سمندر سے طریقت و حقیقت و معرفت کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔

آپ کے عادات و اخلاق رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اخلاق و شمائل کا بہترین نمونہ تھے۔ بچپن سے ہی اخلاقِ حمیدہ کے مالک تھے۔ آپ کا کوئی بھی عمل خلافِ شرع نہ ہوتا تھا۔ فرائض کی ادائیگی کے علاوہ روزمرّہ کے معمولات میں بہت پابندی فرماتے تھے۔ آپ کے تلامذہ و مریدین بے شمار تھے ہر کوئی آپ کے حُسنِ اخلاق، تبحّرِ علمی اور باعمل زندگی سے متاثر تھا۔ جو لوگ علم و معرفت کی پیاس بجھانے کے لیے حاضرِ خدمت ہوتے تھے انھیں زیادہ عزیز و مقرب جانتے تھے۔ دُنیا داروں کا بھی تانتا بندھا رہتا تھا جو اپنے اپنے مصائب و آلام اور دُکھوں کے مداوا کے لیے درِ اقدس پر حاضر ہوتے اور بامراد لوٹتے تھے۔ اس حال پر میرے مرشد حضرت فضل شاہ قطبِ عالم فرماتے ہیں کہ بزرگانِ دین کے پاس جو دین لینے کے لیے حاضر ہوتے ہیں انھیں دین بھی عطا کر دیا جاتا ہے۔ یہی صورت حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر بابا ؒ کی تھی۔ جو دین کے لیے حاضرِ خدمت ہوتا کچھ عرصہ بعد آپ کا معتقد ہو جاتا تھا۔

جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ کے پاس جو کچھ آتا اُسے دُوسروں پر خرچ کر دیتے تھے۔ دُنیاوی دولت سے کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے۔

"شیخ کامل کی رہنمائی کے بغیر زہد و ریاضت سے انسان گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے مبتدی کو چاہیئے کہ زہد و ریاضت صرف اس طریقہ سے کرے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت ہو۔"

ایک دن تشریف فرما تھے۔ علم و عرفان کے موتی بکھیر رہے تھے۔ مریدین و معتقدین باادب بیٹھے اس ولی اللہ کی باتیں غور سے سُن رہے تھے۔ آپ کہہ رہے تھے "طریقت اور معرفت کی راہ میں ہر ایک سالک اور صوفی کو تین مقامات حاصل ہوتے ہیں۔ پہلا مقام شہرت کا ہے کہ اللہ کے عام و خاص بلاد یہ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ دوسرا مقام کشف و کرامت کا ہے کہ اس سے خرقِ عادات کام ہونے لگتے ہیں۔ تیسرا مقام وہ ہے جس میں سالک کا تمام مدعا صرف اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اس مقام پر سالک کو نہ دینی ہوش رہتی ہے اور نہ دُنیا کی کوئی ضرورت ہوتی ہے۔"

حضرت سید علی ترمذیؒ کو لوگ از راہِ محبت وعقیدت پیر بابا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ پختون جس کی عزت واحترام کرتے ہیں دل وجان سے کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں مرشد کا مقام تو بہت بلند ہوتا ہے جس نے گمراہی سے بچا کر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر ڈالا ہوتا ہے۔ وہ مرشد کا نام لینا بھی ادب کے منافی سمجھتے تھے لہٰذا سب آپ کو پیرؒ بابا کے نام سے پکارتے اور یاد کرتے تھے۔

حضرت پیرؒ بابا کے بے شمار مریدین تھے۔ خلفاء میں سے حضرت اخوند درویزہؒ کو جو فضیلت و عظمت حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ ان کا اصلی نام عبدالرشید تھا اور ننگرہار افغانستان کے رہنے والے تھے۔ لیکن عُمر کا زیادہ حصہ پشاور، اطراف پشاور اور سوات وبنیر میں بسر کیا تھا۔ بچپن سے ہی ان پر خوفِ الٰہی طاری رہتا تھا۔ حصولِ علم کے بعد ہی حضرت پیرؒ بابا سے وابستہ ہو گئے تھے۔

حضرت پیرؒ بابا کی ساری زندگی اصلاحی تحریک تھی جس میں بے شمار لوگ شامل ہوئے اور اپنے احوال کی اصلاح کی۔ آپ نے اپنے مُرشد کے فرمان کی لاج رکھ لی تھی۔ ہر گام اور ہر لحظہ لوگوں کے اصلاح احوال کے لیے مختص تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قریہ قریہ، گاؤں گاؤں جا کر لوگوں میں

51 جڑی بوٹیوں کا
نیو زلفِ دراز ہیئر آئل
گرتے بالوں
سکری خشکی۔ گنجے پن۔
قبل از وقت بال سفید ہو جائیں تو قدرتی
سیاہ کرتا ہے
تین شیشی استعمال کرنے پر فائدہ نہ ہو تو
قیمت واپس۔
تیار کردہ: صابر سلور لاہور
تقسیم کنندہ: دواخانہ خاص۔ رجسٹرڈ
مین بازار بیرون قلعہ مبارک لاہور فون: ۶۰۴۲۲

تبلیغ کرتے۔ مدرسے قائم کیے اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ وقت گزرتا رہا۔ جب آپ ۹۹۱ھ میں پہنچے تو زندگی کا جام لبریز ہو گیا۔ خالقِ حقیقی کی طرف سے بلاوا آگیا۔ اِس دنیا سے عالمِ بالا کی طرف رخصتی کس طرح ہوئی کہیں مذکور نہیں۔ جب آپ کے وصال کی خبر ہوئی تو مریدین اور معتقدین کا تانتا بندھ گیا۔ ہر دل سوگوار تھا۔ اکیس سالوں سے جو چراغِ معرفت پاچہ کلے کے مقام پر روشن تھا وہ بظاہر بجھ گیا تھا لیکن اس کی روشنی ہنوز پھیلی ہوئی ہے اور لوگ اس روشنی میں حق کے راستوں پر رواں دواں ہیں۔

آپ کا مزار شریف مینگورہ (سوات) سے چالیس میل کے فاصلے پر علاقہ بونیر کے موضع پاچہ کلے میں ہے۔ آج کل یہ علاقہ پیرؒ بابا کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کا عُرس تین ماہ تک جاری رہتا ہے اور چیت، بیساکھ اور جیٹھ کے مہینوں میں یہ چھوٹا سا گاؤں شہر کا سا سماں پیش کرتا ہے۔ دُور و نزدیک سے لوگ حاضر ہوتے اور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ محبتوں کے نذرانے لاتے ہیں اور فیوض و برکات سے جھولیاں بھر کر لوٹتے ہیں اور یہ فیض کا سرچشمہ سدا جاری رہے گا۔ حضرت پیرؒ بابا کی مقبولیت و عظمت کا صرف اس بات سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آج سے تیس سال قبل مروان میں عدالتی کارروائی کے وقت حلفیہ بیان ان الفاظ سے شروع ہوتا تھا۔

جب میں پیرؒ بابا کی زیارت کے لیے جا رہا تھا یا زیارت سے واپس آ رہا تھا"

اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو بیٹے سیّد حبیب اور سیّد مصطفےٰ عطا فرماتے تھے۔ اوّل الذکر جوانی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ موخر الذکر سے آپ کا سلسلۂ نسب چلا۔ ان کے ہاں تین فرزند سیّد حسن، سیّد قاسم اور سیّد عبداللہ پیدا ہوئے۔ سیّد حسن وادی سوات میں فرغزار کے مقام پر ابدی نیند سو رہے ہیں اور سیّد عبداللہ کا مزار دریائے سوات کے کنارے شل بانڈی کے مقام پر ہے۔ آپ کی اولاد کا سلسلہ صوبہ سرحد سے افغانستان تک پھیلا ہوا ہے۔

آپ کے فرمودات ایسے مہکتے ہوئے پھولوں کا گلدستہ ہیں جن سے رُوح معطر و مسرور ہو جاتی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

- اپنے ایمان اور بہت سے لوگوں کے ایمان کو زوال سے بچاؤ۔
- عام مسلمانوں کو سیدھا سادا دین بتاؤ کیونکہ آج کل لوگ علم پر گھمنڈ کرتے ہوئے گمراہ ہو رہے ہیں۔ طریقت کی حقیقت سے آگاہ نہیں۔ اس لیے مختلف نظریات کے شکار ہو جاتے ہیں۔

حضرت جمال الدین ہانسویؒ

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے جب مخدوم صابر کلیریؒ کو دہلی کی خلافت و قطبیت عطا فرمائی تو ساتھ یہ ارشاد بھی فرمایا "عزیزِ من! دہلی جانے سے پہلے اس سند پر ہمارے جمال الدّین ہانسویؒ کی توثیق و تصدیق کروا لینا" مُرشد کا یہ حکم سُن کر حضرت کلیریؒ اجودھن (پاک پتن) سے ہانسویؒ کی جانب روانہ ہوئے۔ اِدھر حضرت کلیریؒ روانہ ہوئے اُدھر خواجہ ہانسوی کو نورِ فراست سے مہمان کی آمد کی اطلاع کر دی گئی۔ آپ اپنی خانقاہ کے دروازے پر استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔

جب خواجہ مخدوم کلیریؒ تشریف لائے تو آپ سواری سے اُترنے کی بجائے سواری سمیت خانقاہ میں داخل ہو گئے۔ حضرت خواجہ ہانسویؒ کو اپنے مہمانِ عزیز کی یہ ادا پسند تو نہ آئی تاہم انہوں نے مخدوم کلیریؒ کو پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنا مہمان کیا۔ ابھی چند گھنٹوں کا قیام ہی ہوا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ دونوں بزرگوں نے ایک ساتھ نماز ادا کی۔ بعد فراغتِ نماز حضرت مخدوم کلیریؒ نے اپنی سندِ قطبیت جناب خواجہ ہانسویؒ کے سامنے پیش کی اور توثیق کی درخواست کی تاکہ وہ دہلی کی جانب روانہ ہو سکیں۔

رات کا وقت تھا روشنی کا کچھ خاص انتظام نہ تھا۔ حضرت ہالنویؒ نے فرمایا۔ مخدوم کلیریؒ! اس وقت رات کا وقت ہے۔ روشنی کا کچھ انتظام نہیں۔ آپ صبح تک توقف کر لیں۔ کل انشاءاللہ روشنی میں سند دیکھ کر۔۔۔ اس کی توثیق و تصدیق کر دی دی جائے گی۔"

حضرت صابر کلیریؒ نے یہ بات سُنی تو فرمایا "اے خواجہ ہالنویؒ! روشنی کے نہ ہونے کی وجہ سے آپ صبح تک روک رہے ہیں یا کہ کوئی اور وجہ ہے۔"

خواجہ ہالنویؒ نے فرمایا "بھائی صاحب اور تو کوئی کام یا وجہ نہیں ہیں تو محض روشنی نہ ہونے کی وجہ سے روک رہا ہوں کہ صبح تصدیق کر دی جائے گی۔"

یہ کلمہ سُن کر حضرت کلیریؒ نے اپنے دستِ راست کی انگشتِ شہادت پر اسمِ اعظم پڑھ کر دم کیا۔ دم کرنے کی دیر تھی آپ کی انگلی چراغ کی مانند روشن ہو گئی۔ حضرت خواجہ ہالنویؒ نے آپ کا جلال ملاحظہ فرمایا تو فوراً اپنے دائیں ہاتھ۔۔۔ کی شہادت کی انگلی پر اسمِ اعظم دم کر کے روشن کر دکھایا۔ خواجہ کلیریؒ نے نہایت عجلت سے کام لیتے ہوئے اپنے دستِ راست پر دم کیا اور پورا ہاتھ روشن کر دکھایا۔

خواجہ ہالنویؒ نے خواجہ کلیریؒ کی یہ عجلت پسندی دیکھی تو اُن کی سند قطعیت پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دی اور فرمایا۔ "آپ دہلی اس سند کے بغیر تشریف لے جائیں۔ دہلی عزیب آپ کے اس دمِ آتش کو برداشت نہ کر سکے گی۔ آپ نے دہلی کو جانا ہے تو تنہا ہی جائیں۔"

حضرت خواجہ کلیریؒ جو مجسمہ شانِ جمال تھے سخت جلال میں آ گئے اور اُسی جلال میں واپس حضرت بابا فرید کی طرف لوٹے اور لوٹتے ہوئے حضرت ہالنوی سے کہا "خواجہ ہالنویؒ آپ نے میری سند جس طرح پھاڑی ہے میں نے آپ کا سلسلہ چاک کر دیا ہے۔" یہ کہہ کر آپ اجودھن (پاک پتن) لوٹ گئے اور سارا واقعہ حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں پیش کیا تو باباجیؒ نے مسکرا کر فرمایا۔

"اے میرے صابر! ذرا یہ تو بتاؤ تم نے جمال ہالنویؒ کا سلسلہ کس طرف سے چاک کیا ہے۔"

عرض کی "میں نے اوّل سے شجرہ چاک کیا ہے۔"

حضرت بابا نے فرمایا "چلو خیر ہوئی تم نے جمال کا شجرہ ابتدا سے چاک کیا انشاءاللہ

خدا اُن کا شجرہ درست فرما دے گا مگر پھر بھی تمہارے الفاظ کا اثر ضرور رہے گا۔"

حضرت کلیریؒ کے الفاظ کا یہ اثر ہوا کہ حضرت جمال کے بڑے صاحب زادے جو عالم فاضل اور عارف تھے آخری عمر میں مجنون ہو گئے اور چھوٹے صاحبزادے برہان الدین باوجود حضرت کی تعلیم و تلقین کے صلاحیت تسخیر پیدا نہ کر سکے اور اپنے والد خواجہ ہانسویؒ کے فیوضِ باطنی سے محروم رہے اور آپ کا شجرہ نسب دونوں صاحب زادوں کو میسّر نہ آسکا۔

***

حضرت جمال الدین ہانسویؒ، حضرت امام ابوحنیفہ امام اعظمؒ کی اولاد مجاز میں سے تھے تمام منازلِ علوم اور فقر و عرفان سے گزر کر قربِ الٰہی کی منزل میں قدم رکھا اور حضرت بابا فرید گنج شکرؒ سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ حضرت جمال الدین ہانسویؒ صورت و سیرت میں کمال رکھتے تھے اور یکتائے زمانہ تھے۔ اور حضرت بابا فرید سے بیعت ہونے کے بعد یہ حسنِ ظاہری اور باطنی اور زیادہ نکھر گیا۔ آپ کا اپنے مرشد سے روحانی علاقہ و واسطہ اس قدر مستحکم تھا کہ حضرت بابا فریدؒ دہلی سے جب واپس لوٹے تو اپنے محبوب مرید جمال الدین کی خاطر پورے بارہ برس تک ہانسی میں مقیم رہے اور بابا صاحب اکثر فرمایا کرتے۔

"جمال می خواہم کہ گرد سر تو بگردم"

اور یہ کمالِ محبت و شفقت حضرت جمال کی روحانی معراج تھی۔ حضرت باباؒ اور جناب حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے درمیان علوم و عرفان کی ایسی وابستگی اور یگانگت تھی کہ دونوں اس معاملہ میں یک جان دو قالب تھے اور اسی طرح محبت فی اللہ میں بھی باہم شیر و شکر تھے۔ یگانگتِ درویشی کے روابط اس درجہ ترقی پذیر تھے کہ دونوں کا ملین ایک دوسرے کے آستانے پر اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔

حضرت ملتانیؒ جب بھی اجودھن (پاک پتن) تشریف لاتے تو آپ حضرت باباؒ کے محبوب مرید جمال الدین ہانسویؒ پر خصوصی تلطف فرمایا کرتے تھے اور جس طرح حضرت بابا صاحبؒ، جمال الدین کو محبوب رکھتے تھے اسی طرح حضرت ملتانیؒ بھی اُن سے محبت کرتے تھے۔ یہ اسی محبت اور تلطف کا اثر تھا کہ ایک مرتبہ حضرت ملتانی نے حضرت باباؒ صاحب کو خط لکھ کر درخواست کی کہ خواجہ جمال ہانسویؒ کو اُن کے پاس ملتان میں بھیج دیا جائے۔

حضرت باباصاحبؒ نے جواب دیا۔

"جمال الدین جمال است، وکسے شخص جمالِ خویش بدیگرے نمی دہد۔"

اس جواب سے خواجہ ملتانیؒ کو سخت مایوسی ہوئی اور انہوں نے اپنے روحانی تصرف اور توجہ سے حضرت جمال ہانسویؒ کے دل میں ایک شورش واضطراب پیدا کر دیا۔ یوں اُن کی توجہ حضرت باباصاحبؒ سے ہٹ کر حضرت ملتانیؒ کی طرف ہو گئی۔ اسی اضطراب و شورش میں خواجہ ہانسویؒ نے حضرت باباؒ سے ملتان جانے کی اجازت طلب کی۔ باباصاحبؒ نے کوئی جواب دینے کی بجائے سکوت اختیار کیا۔ خواجہ ہانسویؒ نے بجائے اس کہ وہ بھی مرشد کی خاموشی کی رمز پالیتے اور اپنا ارادہ ملتان ترک کر دیتے وہ مُصر ہوئے اور بار بار ملتان جانے کا اصرار کرنے لگے۔ اس بار بار کے اصرار نے حضرت باباصاحبؒ کو غضب ناک کر دیا اور آپ نے جلال میں آکر فرمایا۔

"برو دور روئے خود سیاہ کُن۔"

بس یہ الفاظ حضرت باباؒ کی زبان سے نکلنے کی دیر تھی کہ قیامت آگئی۔ حضرت جمال الدینؒ کا جمالِ صورت اور کمالِ معرفت دونوں سلب ہو گئے۔ چہرہ سیاہ تر ہو گیا اور سینہ عرفان کے خزانے سے خالی ہو گیا اور حضرت باباصاحبؒ نے جمال الدینؒ کو اپنی خانقاہ سے نکال کر حکم دیا کہ کوئی بھی ہم سے جمال الدین کی سفارش نہ کرے۔ تمام حاضرین نے کہا۔ در و بام بھی حضرت باباصاحبؒ کے جلال سے لرزہ بر اندام تھے۔ کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔

حضرت جمال الدین ہانسویؒ روئے سیاہ اور حالِ تباہ کے ساتھ ملتان جانے کی بجائے ملتان کے قریب ایک صحرا میں چلے گئے اور حالتِ جنون اور خود رفتگی میں دست پیمائی کرنے لگے اور ایک سال تک اپنے وجود سے بے خبر دیوانہ وار اپنی عاقبت نااندیشی کا ماتم کرتے رہے۔

ایک سال کے بعد ملتان کے قریب، اسی صحرا سے حضرت باباصاحبؒ کا ایک مرید جو سوداگر تھا ایک قافلے کے ہمراہ واپس اجودھن جا رہا تھا کہ قافلے نے اسی صحرا کے قریب پڑاؤ ڈالا اور ملتان کے اس شعلہ نما صحرا میں جہاں گرم ہواؤں کے جھونکے آئندہ رند کے چہرے جھلسا دیتے ہیں اور جہاں دوپہر کے وقت دھوش وطہور میلوں تک نظر نہیں آتے وہاں ایک پراگندہ حال اور ژولیدہ بال انسان کو نالہ و فریاد میں مصروف دیکھا۔

اردگرد کے لوگوں سے اس فقیر کے بارے میں اُس نے پوچھا تو پتہ چلا یہ دیوانہ سال بھر سے کشمکشِ موت و حیات میں گرفتار ہے۔ یہ سیاہ چہرہ شخص جس کے سر پر خاک اور لب پر آہ ہوتی ہے کبھی جوشِ دیوانگی میں ملتان کی طرف میلوں خاک اُڑاتا ہوا جاتا ہے اور پھر اسی حالت میں واپس آجاتا ہے اور کبھی دیوانگی اور جذبات میں اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتا ہے اور جب کبھی سلوک و ہوش کی ترنگ میں آتا ہے تو اپنا سرِ نیاز سجدے میں جھکا دیتا ہے۔ اس کا نہ کوئی پُرسانِ حال ہے نہ کوئی ہم خیال ہے۔

سوداگر نے لوگوں سے اس فقیر کا احوال سُنا تو اُس سے ملنے کی خواہش کی۔ سب لوگوں نے اُس کو روکا۔ مگر وہ فقیر سے ملنے کا مصمم ارادہ کیے ہوئے تھا۔ سوداگر نے رات بھر عبادت میں گزاری اور دورانِ عبادت ہی اُسکو اشارہ ہوا کہ یہ فقیر جمال الدین ہانسویؒ ہیں۔ صبح ہوتے ہی سوداگر صحرا میں پہنچ گیا اور فقیر کو دیکھ کر پکار اُٹھا۔

"اے جمال! تو یہاں ہے تُو نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے"

فقیر نے بھی سوداگر کو دیکھ کر پہچان لیا یہ تو میرا پیر بھائی ہے۔ اور چیخ مار کر اُس کے گلے لگ گیا۔ پھر رو رو کر کہنے لگا اے میرے پیر بھائی جب بھی تو حضرت باباؒ کی درگاہ پر جائے تو اُن سے اتنا عرض کر دینا۔

حضرت گنج شکر قطبِ زماں و زمین
چشمِ رحمت بکشا و جانبِ درویش بہ بیں

سوداگر نے چشمِ نم کے ساتھ حضرت ہانسویؒ سے رخصت ہو کر اپنے قافلے کے ہمراہ صحرا سے کوچ کیا اور پاک پتن پہنچ کر حضرت بابا شکر گنجؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس وقت حضرت باباؒ وضو فرما رہے تھے۔ عادتِ کریمانہ کے مطابق اُنہوں نے سوداگر کی مزاج پُرسی کی اور سفر کے احوال دریافت فرمائے۔

سوداگر نے حضرت پیر و مرشد کی نگاہِ پُر شفقت کو اپنی طرف مائل دیکھا تو اپنے سفر کے حالات اور احوال کے ساتھ اُس فقیر صحرا کی حالتِ زار بیان کی۔ حضرت بابا صاحبؒ نے اپنے مرید جمال ہانسویؒ کی روداد سُنی تو اپنے دیگر مریدوں اور اُس سوداگر سے فرمایا۔

"تم نے جمال ہانسویؒ کے احوال سُنے۔ وہ کیسے نافرمانی کی سزا کاٹ رہا ہے"

سب درویشوں نے درخواست کی "حضرت سرکار قطب مدارؒ کے واسطے اور خواجہ غریب نوازؒ کے صدقے جمال ہانسویؒ کو معاف فرما کر اُن پر چشمِ التفات فرمائیے"

حضرت بابا صاحبؒ نے خدا کی طرف رجوع کیا۔ اُدھر سے بھی یہی حکم ملا کہ جمال ہانسوی کو معاف فرمایا جائے۔ حضرت فریدالملت نے ایک رباعی ایک کاغذ پر تحریر فرمائی اور ایک شخص کو حکم دیا کہ ملتان کے صحرا میں جاؤ اور جمال ہانسویؒ کو دے دو۔

رو گرد جہاں بگرد و پا آبلہ کُن
گر ہم چو منی یابی و ما و اگلہ کُن
یک صبح یا خلاص بیا بر درِ ما
گر کارِ تو بر نیار و آنگاہ گلہ کُن

حضرت جمال ہانسویؒ کو جب حضرت بابا کا یہ ـــــ نامہ ملا تو آپ نے اس کو اپنے سینے سے لگایا۔ چوما اور بار بار چوما۔ دل میں انبساطِ روحانی اور آنکھوں میں تجلیِ ایمانی پیدا ہوئی۔ پیدل اجودھن (پاک پتن شریف) روانہ ہوئے اور اپنے مرشد عالی مقام حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں پہنچ کر اُن کے قدموں پر گر کر اس قدر روئے کہ آنکھوں میں ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔

محب نے محبوبِ روحانی کے قدموں سے اُس وقت تک سر نہ اُٹھایا جب تک بابا صاحب نے اپنے دستِ شفقت سے حضرت ہانسویؒ کو خود نہ اُٹھایا۔ پھر تلطف ہوا۔ نگاہِ کرم اُٹھی تو رحمت کے بادل چھا گئے خزاں رسیدگی تمام ہوئی۔ بابا صاحبؒ نے حضرت ہانسویؒ کو ظرفِ رحمت سے سینے سے لگا لیا اور جو علوم و عرفان جمال کے سینے سے محو کر دیے گئے تھے سینہ بہ سینہ واپس کر دیے اور مزید خزائن معرفت بھی عطا کر دیے۔

حضرت جمال الدین ہانسویؒ نہایت رقیق القلب بزرگ تھے۔ آپ کا وصال ۳۰ ربیع الثانی ۶۵۹ھ کو ہوا۔ آپ کا مزار ہانسی بھارت میں واقع ہے۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے مریدوں نے آپ کے مزار پر گنبد تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ تعمیر کی تیاری شروع ہوئی تو اچانک آپ کی قبر شق ہو گئی اور سوراخ میں سے اتنی مدہوش کرنے والی خوشبو آئی کہ لوگوں کے دماغ معطر ہو گئے اور اس اشارہ غیبی پر گنبد کی تعمیر کا کام بند کر دیا گیا۔

خواجہ قمرالدین سیالوی

سلطنتِ برطانیہ کے تاج داروں کو یہ بات روزِ روشن کی طرح معلوم تھی کہ تحریکِ آزادی کا ایک اہم ترین مرکز سیال شریف بھی ہے۔ چنانچہ اس سلطنت کے اربابِ بست و کشا آزادی کے اس مرکز کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ایسا کرنے کے لیے فرنگی بابا نے شاطرانہ چال چلی اور حضرت خواجہ قمرالدین سیالویؒ کو رئیس العلماء (تقدس مآب) کا خطاب دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ اعزاز اُس زمانے میں بہت بڑا مذہبی اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ اِس خطاب کی عطا کا پروانہ جب حضرت خواجہ کے پاس پہنچا تو انہوں نے حضرت کعب بن مالکؓ کی سُنّت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اِس پروانے کو پُرزے پُرزے کر کے نذرِ آتش کر دیا اور فرمایا۔

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور پیر پٹھان حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ سے وابستگی میرے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے اس کے ہوتے ہوئے دنیا کا ہر اعزاز میری نظر میں بے وقعت اور بے معنی اور کم تر ہے۔"

حضرت شیخ الاسلام خواجہ قمرالدین سیالویؒ ضلع سرگودھا کے ایک مشہور قریہ طیبہ سیال شریف میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت باسعادت تذکرہ نگاروں کے مطابق جمادی الاوّل

۱۳۲۴ھ بمطابق ۱۹۰۶ء میں ہوئی۔ آپ کی جبینِ سعادت پر درخشاں مستقبل کی نشانیاں دیکھ کر آپ کا نام محمد قمر الدین تجویز کیا گیا۔ آپ کے والدِ گرامی خواجہ ضیاء الدین قدس سرہ جلیل القدر، فاضل، مجاہد اسلام اور پیکرِ حریت و شجاعت تھے۔ ان کے فقر و درویشی کی عظمتوں اور رفعتوں کے سامنے شاہی جاہ و جلال اور تخت و تاج کا کروفر لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔ خواجہ ضیاء الدین عمر بھر آزادیٔ وطن کے لیے انگریزوں سے برسرِ پیکار رہے۔ یہ اُن کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے کہ تازیست انہوں نے اپنی سرزمین کا لگان استعماری حکومت کو نہیں دیا۔ شاید خدا کو موصوف خواجہ ضیاءؒ کا خلوص و ایثار پسند آیا کہ اُنہیں خواجہ قمر الدین سیالویؒ ایسا فرزند عطا کیا گیا۔ جس کی ذہانت و فراستِ علمی۔ بزرگی اور شانِ فقر و استغنا کا ڈنکا چار دانگ عالم میں آج تک بج رہا ہے۔

حضرت خواجہ قمر الدین مادر زاد ولی تھے۔ بچپن سے ہی آپ میں ایسے آثار نمودار ہونے لگے جو آپ کی عظیم شخصیت کی غمازی کرتے تھے۔ ایک دفعہ جب ابھی آپ صرف تین برس کے تھے۔ آپ نے یہ معمول بنا لیا گھر میں جو کپڑا بھی ہوتا اس کو پگڑی بنا کر سر پر باندھ لیتے تھے۔ بعض اوقات تو اتنے کپڑے سر پر باندھ لیتے کہ آپ کے ننھے سے سر پر پگڑیوں کا انبار لگ جاتا تھا۔ آپ کے اس طرزِ عمل کی خبر کسی طرح آپ کے دادا جان حضرت ثانیؒ کو ہو گئی۔ اُن کی محبت کے جذبات میں جوش آ گیا۔ اُسی وقت پوتے کو بُلایا اور اپنے پاس محفوظ تبرکات کے صندوق سے آپ کو جتنی دستاریں آپ کے پیر خانہ سے عطا ہوئی تھیں۔ یا حضرت شمس العارفین کے جو عمامے بطورِ تبرک محفوظ تھے۔ سب کے سب نکال لیے اور اپنے دستِ مبارک سے اپنے اس نونہال کے سر پر باندھ دیے۔

حضرت خواجہ قمر سیالویؒ کی عمر بمشکل چار برس کی ہوئی ہو گی جب حضرت ثانی لاثانیؒ آپ کے دادا کا وصال ہو گیا۔ آپ کی تربیت کی ذمہ داری آپ کے والدِ محترم خواجہ ضیاء الدین نے سنبھالی۔ جنہیں طریق شہسواری سکھانے کا خداداد ملکہ حاصل تھا۔ آپ کی عمر جب چار سال چار ماہ اور دس دن ہوئی تو قصبہ لُوہلا کے ایک حافظ کریم بخشؒ کے پاس آپ کو قرآن کریم حفظ کرنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد جید اساتذہ نے آپ کو فارسی اور حرف و نحو کی ابتدائی کتابیں بڑے شوق سے پڑھائیں اور اس جوہر قابل نے اپنے اساتذہ کے فیض کو بڑے شوق و محبت سے قبول کیا۔

برصغیر پاک و ہند میں خیر آبادی خانوادہ علم و حکمت کے فقید المثال عالم، حضرت مولانا

معین الدین اجمیریؒ کی نگاہ انتخاب آپ پر پڑی۔ وہ اُس وقت مدرسہ عثمانیہ دارالخیر اجمیر میں صدر مدرس تھے۔ کچھ عرصے کے لیے خواجہ ضیاءالدینؒ نے اپنے فرزندِ ارشد کو حصولِ تعلیم کے لیے اجمیر شریف روانہ کیا۔ پھر حضرت کا شوقِ فراواں مولانا کو کشاں کشاں اجمیر سے یہاں تشریف لے آیا۔ اور حضرت خواجہ قمرالدین علامہ اجمیریؒ سے اکتسابِ علم کرنے لگے۔ مولانا اجمیری کے تلمذ رشید حضرت مولانا محمد حسینؒ بھی حضرت خواجہ سیالویؒ کی تدریس کے لیے دارالعلوم ضیاءشمس الاسلام میں عرصہ دراز تک تشریف فرما رہے۔ حضرت مولانا محمد دین صاحب بدھویؒ نے بھی جناب خواجہ کو منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھائیں۔ یوں آپ نے علومِ معقول و منقول کی تکمیل ان اساطین علم و دانش سے کی۔

حضرت خواجہ قمرالدینؒ کو آپ کے والد اور دادا نے نہ صرف علمِ کتابی کا ماہر بنایا بلکہ ایک مجاہد کی زندگی کے آداب بھی سکھائے۔ آپ شاہسواری۔ نشانہ بازی۔ شمشیر زنی میں بھی یکتا تھے۔ آپ کو مشقت پسند اور جفاکش بنانے کے لیے گھوڑا دوڑانے کی خوب مشق کروائی گئی۔

خواجہ سیالویؒ نے ۱۹۳۲ء بمطابق ۱۳۵۱ھ میں علوم سے فارغ التحصیل ہو کر سندِ فراغت حاصل کی۔ ۱۹۳۸ء میں آپ حج کی سعادت و زیارت سے مشرف یاب ہونے کے لیے حرمین شریفین تشریف لے گئے۔ مدینہ طیبہ میں اندلس کے قاضی شیخ ابوبکر النبانی نے ایک ملاقات میں آپ کو سندِ حدیث عطا فرمائی۔ اسی طرح مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ کے شیخ الحدیث علامہ عمر و محمدان المکیؒ نے بھی آپ کو سندِ حدیث عطا فرمائی۔

حضرت خواجہؒ طبقہ علماء میں متجرّ اور ممتاز حاصل شمار کیے جاتے تھے۔ اور زمرہ مشائخ میں جانِ محفل ہوا کرتے تھے۔ آپ اپنے والدِ ماجد کے صحیح جانشین، اوصافِ مشائخ کے جامع اور حد درجہ زیرک انسان تھے۔ آپ چرخ شریعت و طریقت کے نیّر تاباں تھے۔ آپ کے والدِ گرامی حضرت خواجہ ضیاءالدین سیالویؒ نے جب وصال فرمایا تو آپ نے آستانہ عالیہ سیال شریف کی مسند سجادگی کو رونق بخشی اور پیر سیال کی جانشینی کا حق ادا کیا۔

حضرت خواجہؒ نے ہزاروں گم کردہ راہوں کو اپنی روحانی توجہ کی بدولت راہِ راست سے ہمکنار کیا۔ حرماں نصیبوں کو سکون و طمانیت کی دولت عطا کی۔ اَن گنت نفوس آپ کے انفاسِ طیبہ کی وجہ سے اللہ پاک اور حبیبِ خدا احمدِ مجتبیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے انوار سے جگمگا اٹھے۔ آپ سیدھے سادے مسلمانوں کے ایمان اور

خوش عقیدگی کے تحفظ کی خاطر ہمیشہ فرق باطلہ کی تردید میں سینہ سپر رہے۔ مناظروں اور مباحثوں سے اُن کے شکوک و شبہات کے مسکت اور شافی جواب دیے گئے۔

حضرت خواجہ سیالویؒ عربی۔ فارسی۔ اُردو اور پنجابی زبانوں میں بھی گفتگو فرمالیا کرتے تھے۔ انشاء عربی پر آپ کو قدرت کاملہ حاصل تھی۔ عربی میں کمال درجے کا شغف رکھنے کے علاوہ آپ کو اِس زبان میں بلا تکلف مضمون لکھنے کی بھی مہارت تامہ حاصل تھی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس غضب کا حافظہ عطا فرما رکھا تھا کہ سالوں پڑھی ہوئی کتابوں کے مضامین آپ کے پیشِ نظر رہتے تھے۔ آپ کے استادِ محترم علامہ معین الدین اجمیری آپ کی ذہانت و ذکاوت کی بہت تعریف فرمایا کرتے تھے۔

***

حضرت خواجہ کو عیسائیت کے علوم پر بھی دسترس حاصل تھی۔ آپ نے اپنے زورِ علم اور زورِ بیان سے عیسائیوں کے ساتھ مباحثے اور مناظرے کیے جنہیں بڑے بڑے عیسائی زعماء و علماء کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑی۔

ایک دفعہ حضرت خواجہؒ کو اطلاع ملی کہ سلانوالی کے علاقہ میں پادری براؤن (BROWN) نے قیامت برپا کر رکھی ہے۔ اس نے ایک کیمپ قائم کر رکھا ہے۔ وہاں سے ہر روز آکر بازار اور سڑکوں پر اپنی اسٹیج لگاتا ہے۔ عوام کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اُس کے پاس جمع ہو جاتے ہیں اور وہ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اسلام پر بے سروپا اعتراضات کی بوچھاڑ کرتا رہتا ہے۔

سلاں والی، سیال شریف سے کوئی بارہ چودہ کوس کے فاصلے پر ہے۔ آپ اطلاع ملتے ہی گھوڑے پر سوار ہو کر سلاں والی روانہ ہو گئے اور اس پادری کے کیمپ میں پہنچ گئے اور اس کو مناظرے کا چیلنج دیا جو اُس نے قبول کر لیا۔

آپ نے پہلی تقریر میں ہی بائیبل کی تعریف کے موضوع پر مدلل تقریر کی۔ بائیبل سے حوالہ جات کا آپ نے انبار لگا دیا۔ پادری براؤن کو اپنے علم اور طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا، لیکن آپ کی مدلل اور پُرزور تقریر سے اس کے حواس یوں باختہ ہو گئے کہ اس نے بائیبل کو زمین پر پٹخ دیا اور یہ کہتا ہوا میدانِ مناظرہ سے بھاگ گیا۔ کہ واقعی ہماری کتابیں خراب ہو گئیں ہیں۔ اس طرح حضرت کی ایک ہی مجاہدانہ ضرب سے اس سامری کا سارا طلسم پاش پاش ہو گیا۔

SAC

FOOD ESSENCE



ایس اے سی
(فوڈ ایسنس)
کے چند قطرے

خوشبوؤں کے خزانے، مہک اُٹھے کھانے!
اپنے پسندیدہ فلیور کے چند قطرے شامل کیجئے اور آئسکریم
مشروبات اور روزمرہ کے کھانوں کو پہلے سے زیادہ خوشذائقہ
بنایئے • کیوڑہ • زعفران • بریانی • ونیلا
آئسکریم • اناس • بیلا • صندل
نارنگی • گلاب اور رس بھری
میں حسب منشا خوشبو
پسند فرمایئے

زعفرانی قوام
بھی آزمایئے
پان کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔

سول ڈسٹری بیوٹر:

جاوید اینڈ کمپنی بوتل بازار۔کراچی فون: ۲۱۵۹۶

REPCOM

اسی طرح تونسہ شریف میں آپ ایک مرتبہ عرس مبارک پر شرکت کے لیے حاضر ہوئے۔ انہی دنوں ایک عیسائی مبلغ وہاں آگیا۔ اور اس نے بر سر بازار اپنی تقریر شروع کر دی۔ لوگوں کی کثیر تعداد اُس کے پاس جمع ہو گئی اور وہ اسلام پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ قرآنِ پاک کی آیات اور احادیثِ مبارکہ کی ایک بڑی تعداد اُس کو ازبر تھی۔ جن کو وہ جا و بے جا استدلال کے طور پر بڑی چابکدستی سے استعمال کر رہا تھا۔ اس مجمع میں کئی عالم موجود تھے مگر کسی میں اُس کو روکنے کی جرأت نہ تھی۔ حضرت خواجہؒ کو جب پتہ چلا تو آپ دوڑتے ہوئے وہاں تشریف لے گئے اور چند ہی لمحوں میں اُسکا ناطقہ بند کر دیا اور وہ راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔

***

ایک مرتبہ آپ کو رائفل کا لائسنس بنوانا مقصود تھا جس کے لیے آپ نے درخواست دی۔ ضلع سرگودھا کا ڈپٹی کمشنر ایک انگریز تھا۔ اُس نے آپ کی درخواست کے جواب میں آپ سے استفسار کیا۔

"آپ نے جو خدمات انگریزی سرکار کے لیے انجام دیں وہ لکھ بھیجیں تاکہ اُن خدمات کی روشنی میں آپ کو لائسنس جاری کیا جائے۔"

حضرت خواجہ نے ڈی سی کو لکھ بھیجا۔

"شاید آپ خواجہ محمد ضیاء الدین صاحب سیالوی کے نام نامی اور ان کے کارناموں سے واقف ہوں گے میں اُنہیں کا فرزند ہوں۔ جس قسم کی خدمات انہوں نے سرکارِ انگلشیہ کے لیے انجام دی ہیں انہی خدمات کی آپ مجھ سے بھی توقع رکھیں۔"

جواب ارسال کر کے خواجہ صاحب مطمئن تو ہو گئے مگر رائفل کے لائسنس کا خیال آپ کو دل سے نکالنا پڑا کیونکہ ایسی صورتِ حال میں انگریز ڈی سی کس طرح لائسنس جاری کر سکتا تھا۔ اُسی رات خواب میں آپ کی ملاقات اپنے والد خواجہ ضیاء الدینؒ سے ہوئی۔ انہوں نے فرمایا۔

"قمر الدین! آپ مایوس مت ہوں" پھر ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس کمرے میں رائفلوں کا انبار لگا دیا گیا ہے ان میں سے جو آپ کو پسند ہو وہ چن لیں۔"

اس واقعہ سے صرف چند روز کے بعد بغیر کسی کاوش و سعی کے آپ کو رائفل کا لائسنس جاری کر دیا گیا۔

حضرت خواجہ سیالویؒ نے جہادِ کشمیر میں بھی بھرپور حصّہ لیا۔ فرنٹیئر کے سرحدی علاقوں سے بیش قیمت آتشیں اسلحہ خرید کر مجاہدین میں تقسیم فرمایا۔ جہادِ کشمیر کے لیے آپ نے ملک گیر مہم چلائی اور لوگوں کو اس جہاد میں شامل ہونے کی طرف راغب کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ جوق در جوق جہادِ کشمیر میں شامل ہوئے۔

حضرت سیالویؒ نے مہاجرین کی آبادکاری میں بھی حکومت کا بہت ہاتھ بٹایا اور اپنی ذاتی مدد سے بے شمار مہاجروں کے گھر آباد فرمائے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر آپ نے اپنی تمام پونجی "دفاعی فنڈ" میں جمع کروادی اپنے مریدوں اور متعلقین کو بھی زیادہ سے زیادہ ملکی مدد میں شمولیت کرنے کی ہدایت فرمائی آپ کے ایثار و قربانی کا اُس وقت یہ عالم تھا کہ آپ نے اپنے اہلِ خانہ کے زیورات بھی ملک پر قربان کر دیے۔ اور اپنے احباب کو قنوتِ نازلہ پڑھنے کی تلقین فرمائی۔



حضرت خواجہ سیالویؒ کو ذکاوت اور لطافتِ طبع سے بھی قدرت نے مالا مال کر رکھا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت علامہ معین الدین اجمیریؒ جو حضرت خواجہ کے استادِ محترم بھی تھے۔ آپ کے پاس بیٹھے تھے۔ باتوں کے دوران انہوں نے اپنی عینک اُتار کر رکھی اور بھول گئے جب اُنہیں عینک کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے عینک تلاش کرتے ہوئے فرمایا۔

"میری عینک کہاں ہے؟"

حضرت خواجہ سیالویؒ نے برجستہ فرمایا۔

"استادِ محترم! فِی مَا بَیْنِیْ وَبَیْنَکَ (یعنی میرے اور آپ کے درمیان رکھی ہوئی ہے)"

اس جواب سے علامہ اجمیری بہت محظوظ ہوئے اور ایک مدّت تک یہ لطیفہ اپنے احباب کو سناتے رہے۔

حضرت صاحب زادہ فیض الحسن شاہ آلو مہارویؒ فرماتے ہیں۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کا ذکر ہے۔ ایک سرمایہ دار اور جاگیر دار شخص "جمعیت علمائے پاکستان" کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کا خواہش مند تھا۔ اِس تمنا کی تکمیل کے لیے وہ حضرت سیالویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اُس کی خواہش سُنی تو فرمایا۔

"یہ نشست تو ہم نے ایک عالمِ دین کو دے دی ہے تاکہ وہ انتخاب لڑ کر کامیاب ہو جائے

اور دین کی خدمت کرے۔" یہ سُن کر مذکورہ جاگیردار بہت مایوس ہوا اور بے نیل ومرام واپس چلا گیا۔ اس بات کے کچھ ہی روز بعد وہ تین لاکھ روپے کی خطیر رقم کا چیک لے کر حضرت خواجہ سیالویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی۔

"حضرت یہ رقم اس ناچیز کی طرف سے قبول کر لیجئے تاکہ لنگر کے خرچے میں کام آئے"

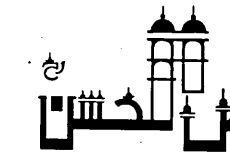
حضرت سمجھ گئے کہ اس دنیا دار کا اصل مقصد کیا ہے۔ آپ کو اس سرمایہ دار کی اس حرکت پر اتنا طیش آیا کہ غضب ناک ہو کر فرمایا۔

"اے دولت مند انسان! یہ اپنی دولت لے جا اور یہ بوٹی کسی دنیا کے کُتّے کے آگے ڈال دینا۔"

۱۹۷۰ء ہی کا ذکر ہے کہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ میں مولانا عبدالحمید بھاشانی" نے گھیراؤ۔ جلاؤ مٹاؤ تحریک کا آغاز کیا تو حضرت خواجہ صاحب نے "دارالسلام" (ٹوبہ ٹیک سنگھ) میں اس قدر عظیم سُنی کانفرنس منعقد کی کہ بھاشانی کی غیر اسلامی اور تشدد پر مبنی ناپاک کوششیں گرد ہو کر رہ گئیں۔

پاکستان میں نظامِ مصطفےٰ کے قیام کے لیے آپ نے انتھک جدوجہد فرمائی۔ آپ نے شدید بیماری کے باوجود اسلامی نظریاتی کونسل کے لیے دن رات قابلِ قدر کام کیا۔ حضرت کی ان خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن نے انکشاف کیا کہ حضرت نے نظریاتی کونسل کے لیے ہمیشہ تنخواہ کے بغیر کام کیا۔ حتیٰ کہ سفر خرچ کے لیے بھی آپ نے کوئی پیسہ نہیں لیا۔

۱۲ر جولائی ۱۹۸۱ء کو حضرت خواجہ سرگودھا سے چند میل دور پُل گیارہ پر ٹرالنگ کے ایک حادثے میں بُری طرح زخمی ہو گئے۔ آپ کو فی الفور سرگودھا کے ہسپتال میں داخل کیا گیا مگر وہاں آپ کی حالت بہتر نہ ہو سکی۔ پھر آپ کو کمبائنڈ ملٹری ہسپتال لاہور لایا گیا۔ جہاں آپ ۲۰ر جولائی ۱۹۸۱ء بمطابق ۱ر رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ اپنے خالق و مالک حقیقی سے جا ملے۔ آپ کو سیال شریف میں آپ کے نامور والدِ گرامی حضرت خواجہ ضیاء الملک والدینؒ کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔ آپ کا مزار آج بھی زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔



صاحبزادہ فیض الحسن

زبردست

ژالہ باری اور شدید بارش نے شکر گڑھ میں کھڑی فصلیں تباہ کر دیں۔ لوگ اناج کے دانے دانے کو ترسنے لگے۔ مولیشی چارے کے لیے بے چارہ ہو گئے۔ کسمپرسی کا یہ عالم لائقِ دید تھا کہ لوگ حسرت و یاس بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھتے اور خدا سے فضل و کرم کی بار بار دعائیں مانگتے تھے۔ پھر خدا تعالیٰ نے اہلِ شکر گڑھ کی التجائیں اور دعائیں قبول فرمالیں۔ رحمت کا ایک فرشتہ نما انسان شکر گڑھ میں آیا۔ یہ خدا کا ایک ولی تھا، ایک کامل انسان تھا۔ یہ وہ انسان تھا جس کا علم متلاشیانِ حق کے لیے مشعلِ عرفان تھا۔ جس کا عمل مخلصینِ حق کے لیے نمونۂ عمل تھا۔ اور جس کا صدق اہلِ صفا کے لیے منبعِ اخلاص تھا۔

اہلِ شکر گڑھ اس خدا کے ولی کے پاس آئے اور عرض گزار ہوئے: "ہماری فصل بالکل تباہ ہو چکی ہے، مشکلات نے ہمارے گھروں میں ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔ آپ ہمارے لیے دعا فرمائیں تاکہ فضلِ خداوندی ہمارے مصائب و آلام ختم کر دے۔"

اس صاحبِ علم و عرفان اور مردِ باطل شکن نے اہلِ شکر گڑھ سے کہا: "تم سب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ، میں بھی خدا تعالیٰ کے حضور دست بستہ التجا کرتا ہوں۔" سب نے دعا کی۔ لوگ بھی رو رہے تھے اور خدا کے ولی کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔ نہ جانے کتنی ہی دیر

راعی اور رعایا قادرِ مطلق کے سامنے گڑگڑاتے رہے۔ خدا نے اُس نیک اور کامل انسان کے صدقے شکرگڑھ کے باسیوں پر کرم فرمایا اور پھر جو معجزہ رونما ہوا وہ جیتی جاگتی نظروں نے دیکھا۔ جس کی شہادت دینے والے اب بھی زندہ موجود ہیں کہ خدا کی قدرت سے چند ہی ہفتوں کے بعد تباہ شدہ فصلیں ازسرِنو شاداب اور سرسبز ہوگئیں اور ایسی بھرپور فصل اس سے پہلے کبھی تیار نہ ہوئی تھی۔ اناج اتنی وافر مقدار میں حاصل ہوا کہ انسان تو کیا حیوانوں کے لیے بھی کوئی کمی نہ رہی۔

یہ مردِ فقیر جس کا سطورِ بالا میں ذکر کیا گیا ہے، شہبازِ ولایت حضرت صاحب زادہ فیض الحسن شاہؒ تھے۔ جن کا شمار بلاشبہ ایسی عقبریٰ اور نادرۂ روزگار شخصیتوں میں ہوتا ہے جو اپنی نگاہِ کرامت اثر کے فیضان اور فکرِ آفرین تعلیمات کے اثر سے گمراہی اور ضلالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں شمع ہدایت روشن کیے رکھتی ہیں۔

جناب صاحب زادہ سید فیض الحسن ۱۹۱۱ء میں اس عالم فانی میں مولود ہوئے۔ آپ کی ولادت شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے شہر سیالکوٹ کے ایک مضافاتی قصبہ آلومہار شریف میں ہوئی۔ مشرق کا یہ تابندہ آفتاب اس شان سے نمودار ہوا کہ اس کے سر پر اُمتِ مسلمہ کی راہنمائی کرنے والے روشن اور ابدی اصولوں سے چمکتا دمکتا تاج تھا۔

حضرت صاحب زادہؒ کے والدِ گرامی کا نامِ نامی حضرت سید محمد حسین شاہ تھا جو خود بھی فاضل، عالم اور نابغۂ روزگار اور یگانۂ عصر بزرگ اور آلومہار کے سجادہ نشین تھے۔ جناب سید محمد حسین حکومتِ برطانیہ کے عہد میں فرسٹ کلاس آنریری مجسٹریٹ تھے لیکن آزادیِ وطن کی تحریک اور انگریز کی عمومی اسلام دشمنی کے خلاف احتجاج کے طور پر آپ اس عہدے سے مستعفی ہوگئے۔

حضرت صاحب زادہ فیض الحسنؒ نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ آپ کا گھرانہ علم و فضل اور فیضان و عرفان کا گہوارہ تھا۔ لہٰذا دینی علوم سے واقفیت اور قرآنِ حکیم کی تعلیم آپ نے گھر سے ہی حاصل کر لی۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے فارغ ہوئے تو آپ نے مزید دینی اور دنیاوی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی۔ جن علماء نے آپ کے اندر علم کی فروزاں قندیل روشن کی ان میں مولانا لُطف اللہ اور مولانا عبدالحمید سنبھلی قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات کے علم و فضل سے ہی آپ کو دینی تعلیم میں کماحقہ آگہی حاصل ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آپ مرلے کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے۔ آپ کالج کے طبعاً شریف،

شخصیتاً پُرکشش اور مزاجاً انتہائی خوش اخلاق طالب علم تھے۔ آپ اپنے انہی اوصاف کی بدولت کالج میں ہر دل عزیز تھے۔ فنِ خطابت میں آپ کو مہارتِ خاص حاصل تھی۔ آپ نصابی اور غیر نصابی اور دیگر سرگرمیوں کی وجہ سے کالج کا مایہ ناز سرمایہ شمار ہوتے تھے۔

۱۹۳۲ء میں آپ کے محترم پدر گاہی نے وصال فرمایا۔ آپ کی عمر اُس وقت صرف ۲۲ سال تھی مگر آپ کی مذہبی، علمی اور ریاضی سطح اتنی بُلند تھی کہ آپ کو درگاہِ عالیہ آلو مہار شریف کا سجادہ نشین بنایا گیا۔ آپ نے سجادگی کی ذمہ داری کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر اُٹھایا تو یہ ثابت کر دیا کہ آپ نہ صرف ہونہار ہیں بلکہ فہم و فراست کے بھی مردِ میدان ہیں۔ آپ کے والد ماجد جو آپ کے مرشدِ طریقت بھی تھے۔ انھوں نے روحانیت اور ولایت کی منازل آپ کو نہایت شاندار تربیت کے ساتھ سر کرائیں۔

جناب صاحب زادہؒ ایک عظیم خانوادہ تصوّف کے چشم و چراغ ہونے کی حیثیت سے صوفیانہ نکات اور عملی تصوّف کے رموز اس خوش اسلوبی کے ساتھ بیان فرماتے تھے کہ سامع پر کیف و مستی کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے آپ سامعین کو معرفت کے جام پلاتے ہوئے وارداتِ تصوّف کی بیکراں وادیوں میں لیے پھرتے ہیں۔

یہ روحانی سفر کے آغاز کے دن تھے جب بعض سوالات بڑی شدّت سے اُبھر کر جناب صاحب زادہؒ کے سامنے آئے۔ جن کی تشفی و تسلّی نہ ہونے کی وجہ سے آپ پر اضطراب کی کیفیت طاری ہوگئی۔ آپ ان اضطراب پیدا کرنے والے سوالوں کا جواب چاہتے تھے۔ صوفیائے کرام کا نظریۂ کائنات و ذات، راہِ طلب و سلوک کی کیفیت، نصابِ طریقت اور فنا و بقا وغیرہ کے متعلق سوالات آپ کو پریشان کیے رکھتے تھے۔ اس مشکل سے نجات حاصل کرنے کے لیے آپ نے بے پناہ مطالعہ کیا اور ان سوالات کے جوابات آخر کار آپ کو حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی تعلیمات سے حاصل ہوئے۔ آپ نے حضرت امامِ ربّانی مجدّد الف ثانیؒ کے مکتوبات کا بے انتہا اور ایک لمبے عرصے تک مطالعہ کیا اور اپنے علم میں تسکین و تقویت حاصل کی۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت صاحب زادہؒ کو امامِ ربّانی مجدّد الف ثانی، شیخ احمد فاروقی، کی ذاتِ گرامی سے بے پناہ عقیدت و احترام تھا۔ اُن کی ذات پاک سے آپ کا عشق و تعلق اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مذہبی تقریب میں شجرۂ خواجگانِ نقشبند

پڑھا جا رہا تھا۔ پڑھنے والے سے نا دانستگی میں حضرت امام ربانیؒ کا نام پڑھا نہ گیا۔ آپ کے چہرے پر ایک جلال آگیا۔ آپ نے کسی قدر سختی اور ناراضگی سے فرمایا۔

"دوبارہ پڑھو۔"

اُس شخص نے دوبارہ پڑھا۔ آپ امام ربانیؒ کا ذکر سُن کر آب دیدہ ہو گئے۔ آپ روتے جا رہے تھے اور فرماتے جا رہے تھے۔

"یہی مصرعہ بار بار پڑھو۔"

حتیٰ کہ آپ نے ایک ہی مصرعہ جس میں حضرت مجددؒ کا ذکر تھا کوئی دس بار سُنا۔ آپ پر اس دوران عجیب سی کیفیت طاری رہی اور آپ کافی دیر تک سسکیوں کے ساتھ روتے رہے۔

حیاتِ انسانی میں جن صفات سے انسان ممتاز و منفرد بنتا ہے وہ حضرت صاحب زادہؒ کی ذات میں بے پناہ موجود تھیں۔ آپ انتہائی نفیس و پاکیزہ خیالات کے حامل انسان تھے۔ آپ کو فنِ گفتار کا جو ملکہ خالقِ کائنات نے فرما رکھا تھا وہ زندگی میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ آپ کی ذاتِ اقدس ایک ایسی متاعِ گراں مایہ تھی جو قوموں کا سرمایہ ہوا کرتی ہے۔

حضرت فرمایا کرتے تھے "ماں کی گود ہی وہ درس گاہ ہے جہاں سے بچہ جملہ علوم کی اساس و بنیاد حاصل کرتا ہے۔ جب ماں کی جھولی مومنانہ ہے اس میں سنتِ فاطمہ کے تقاضے موجود ہیں تو اولاد یقیناً حسینؓ صفت ہو گی اور اگر ماں چور ہو گی تو بیٹا ڈاکو ہو گا۔ ماں جاہل ہو گی تو بیٹا احمق ہو گا۔ اگر ماں بہادر ہو گی تو بیٹا غازی ہو گا، اگر ماں سیاست دان ہو گی تو بیٹا حکمران ہو گا۔ اور اگر ماں عبادت گزار ہو گی تو بیٹا ولی ہو گا۔ ماں کنیز فاطمہ ہو گی تو کوئی وجہ نہیں کہ بیٹا خادمِ حسین نہ ہو۔"

مرزا غلام احمد قادیانی جو دشمنِ رسالتؐ و نبوت تھا اُس کے بیٹے مرزا بشیر الدین نے ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کو اپنے اخبار الفضل میں مجلسِ احرار کے قائدین کو قادیان میں دعوتِ مباہلہ دی۔ اُس زمانے میں قادیان دشمنانِ اسلام کا گڑھ تھا اور وہاں جانا خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا لیکن صاحب زادہ صاحبؒ جو عزم و ہمت کے پیکر تھے انھوں نے تمام خطرات کو بالائے طاق رکھا اور اپنے ساتھیوں سمیت قادیان روانہ ہو گئے۔

آپ کے ہمرائیوں میں مولانا مظہر علی اظہر، مولانا محمد حیات، ماسٹر سراج دین انصاری اور حاجی عبدالرحمان تھے۔ قادیان میں موجود مسلمانوں نے آپ کا جو والہانہ استقبال کیا وہ ایک تاریخی مثال ہے۔ ہزاروں لوگ آپ کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔ قادیان میں صاحب زادہ صاحبؒ نے نمازِ جمعہ پڑھائی اور مولانا مظہر علی اظہر نے خطبہ پڑھا۔

مرزا بشیرالدین جو اُس وقت انگریز حکومت اور ہندوؤں، سکھوں کا چہیتا تھا اُس کا خیال تھا مسلمان اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے کہ وہ قادیان آجائیں مگر جب صاحب زادہ صاحبؒ قادیان پہنچے تو اُس کے اوسان خطا ہوگئے اور وہ مباہلہ سے فرار اختیار کر گیا۔ اُس کو شاید یہ پتہ نہیں تھا کہ

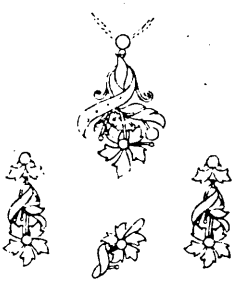
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی!

حضرت صاحب زادہؒ عمر بھر تحریک ختم نبوت سے منسلک رہے اور اس لیے آپ نے جس قدر جدّوجہد کی کہ حکومتِ پاکستان کو اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ منکرِ حضورؐ

دیدہ زیب و جدید ڈیزائن
کے زیورات کے لیے
تشریف لائیے

محفوظ جیولرز

MAHFOOZ
JEWELLERS



۴۱ کمرشل بلڈنگ - فون: ۲۱۳۱۸۸
۱۹۵- پینوراما سینٹر - فون ۳۰۲۱۲۱ — ۳۰۱۸۸۷
شاہراہِ قائدِ اعظم لاہور۔

دراصل کافر ہی ہے اور اس کو غیر مسلم قرار دینا ہی ایمان کی تکمیل ہے۔

ملک میں انتخابات ہو رہے تھے۔ آپ کے ایک مُرید بھی ایک بہت بڑے زمین دار کے مقابلے میں انتخاب لڑ رہے تھے۔ انتخاب لڑنا اس دَور میں عام آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ کیونکہ اب انتخابات میں سیرت و کردار اور قابلیت کی بجائے اثر و رسوخ، دولت و حشمت اور طاقت و ناموری دیکھی جاتی ہے۔ حضرت کا مرید نوجوان تھا زیرِ تعلیم تھا اور عوام الناس میں مقبولیت سے محروم تھا جب کہ مدِ مقابل بڑا مشہور و معروف تھا اُس کی جیت کے امکانات بھی روشن تھے۔ حضرت کا مرید آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔ "حضرت! مَیں آپ کا ایک ادنیٰ سا مُرید ہوں بس اس کے علاوہ مجھ میں کوئی خوبی نہیں۔ مَیں اپنے سے بڑے کام کا بیڑا اُٹھا چکا ہوں۔ میری کامیابی صرف آپ کی دُعاؤں اور توجہ کی بدولت ہو سکتی ہے۔"

حضرت نے اپنی باطنی قوت اور ظاہری ذرائع سے معلوم کیا تو آپ کے مُرید کے حریف کا پلڑا بہت بھاری تھا اور اُس کی پوزیشن بڑی مضبوط تھی اور جیتنے کے روشن اور قوی امکانات موجود تھے۔ آپ نے خدا سے دُعا کی اور پھر بڑے پُر اُمید انداز میں اپنے مُرید کو فرما دیا۔

"میاں! تم مطمئن رہو انشاء اللہ جیت تمہاری ہو گی۔"

مُرید مطمئن ہو گیا مگر الیکشن کے روز وہ سخت پریشان ہو گیا جب اکثر پولنگ اسٹیشنوں پر وہ ہار رہا تھا اور حریف جیت رہا تھا۔ حضرت صاحب زادہ اُس وقت گھر پر بیٹھے دُعا فرما رہے تھے کہ مُرید پریشان ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔

"حضرت! ابھی تک تو مخالف کا پلّہ بھاری ہے۔"

حضرت نے جلال میں آ کر فرمایا۔ "جاؤ تم مجموعی نتائج کا انتظار کرو۔"

پھر سب نے دیکھا کہ حضرت کا مُرید بھاری اکثریت سے جیت گیا اور خوشی سے بھاگتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اپنی کامیابی کی نوید سنائی اور عرض کی۔

"حضرت! اگر آپ جیسے کامل انسان کی نگاہِ کرم نہ ہوتی تو میرا جیتنا بہت مشکل تھا۔"

آپ نے اُس کو کامیابی کی مبارک باد دی اور نصیحت فرمائی۔ "دیکھو! تمہیں خدا نے بااختیار بنایا ہے اور جن لوگوں کے ووٹوں سے تم نے کامیابی حاصل کی ہے اُن کو بھولنا

مت، خدا نے تمہیں ایک امانت سونپی ہے اُس کا خیال رکھنا۔ ظلم و تکبّر بالکل نہ کرنا بلکہ ناانصافی کے خلاف جدّوجہد کو اپنا مقصودِ حیات بنانا اور غریبوں کا خاص خیال رکھنا۔

آپ نے اپنا مقصدِ حیات صرف اور صرف دینِ اسلام کی بھلائی اور اُس کے عروج کے لیے وقف کر دیا تھا۔ آپ کے حالاتِ زندگی پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ آپ محض وعظ کی حد تک تبلیغ نہیں کرتے تھے بلکہ جہاں ضرورت پڑی وہاں آپ نے جہاد میں بھی حصّہ لیا۔ حکمرانِ وقت کی مخالفت کی، مصائب کو دعوت دی، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر کے آپ نے اسیرانِ کربلا کی سُنّت کو پورا کیا۔ ہر حال میں صبر کا دامن تھامے رکھا، کبھی خدا سے شکوہ نہ کیا۔ ہمیشہ اس کی بندگی کا اقرار کیا۔ آپ قرآن و سنت کے ایسے پیروکار تھے جنہیں صرف خدا کے احکامات پر ہی کاربند رہنے کی چاہ تھی۔ آپ خدا کی ایسی برگزیدہ ہستی تھے جنہیں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی سے لگاؤ نہیں تھا۔ آپ صرف خدا پر توکّل رکھتے تھے۔ اپنی ہر ضرورت صرف خدا سے بیان کرتے تھے۔ آپ جیسا صوفی انسان صدیوں بعد پیدا ہوتا ہے۔

عمر بھر اسلام کی ابدی اقدار کی ترویج و تنقید اور مسلک اہلِ سنت کی برتری اور بالادستی کے مقدّس جذبات و احساسات آپ کے دل و دماغ میں موجزن رہے۔ اس ملک میں نظامِ مصطفیٰؐ کی روح پرور بہار دیکھنے کی حسرت بیقراری کی حد تک آپ کے اندر موجود تھی اور حضرتِ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر کے شدت سے آپ منتظر رہے۔

پھر غالباً یہ ۲۳ فروری ۱۹۸۴ء کا دن تھا اور دن کے گیارہ بجے کا وقت جب آپ کو گھبراہٹ کا احساس ہوا۔ آپ کے خدا کے پاس جانے کی ساعتیں قریب آ رہی تھیں۔ اہلِ خاندان ارد گرد کھڑے تلاوتِ قرآنِ پاک کر رہے تھے۔ آپ نے اہلِ خاندان کو بتایا "ایک روشنی کمرے میں آ رہی ہے اس لیے پردے ہٹا دو" پھر پردے ہٹا دیئے گئے پھر آپ نقشبندیہ سلسلہ طریقت کے معمولات دہرانے لگے۔ معاً آپ کے چہرے کی دلکشی اور دل آویزی میں اضافہ ہونے لگا۔

اور پھر خوابِ غفلت میں مدہوش انسانوں کو جگانے والی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔



قطبِ زماں حضرت مولانا شاہ جماعت علی خاں آفریدی رحمۃ اللہ علیہ

نومبر ۱۹۲۴ء کو محلہ رکاب گنج آگرہ کی مسجد میں اعلان ہوا کہ حضرت امیرِ ملّت قبلۂ عالم پیر جماعت علی شاہؒ موتی کٹرہ میں تشریف لائے ہیں۔ اُن سے ملاقات کے خواہش مند اور فیوض و برکات کے طالب انھیں مذکورہ مقام پر مل سکتے ہیں اور گوہرِ روحانیت سے اپنا دامن بھر سکتے ہیں۔ اعلان کا سننا تھا کہ لوگوں کا ایک بحرِ بیکراں موتی کٹرا کی طرف رواں ہو گیا۔ ہر شخص حضرت پیر جماعت علی شاہؒ سے فیض یاب ہونے کا متمنی تھا۔ اسی جمِ غفیر میں ایک نوجوان جو الیف اسے کے طالب علم تھے اور معرفت کے سمندر کے غواص بھی اس طالب علم نے پیر صاحب کے کروفر کو دیکھا تو بہت مرعوب ہوئے مگر طریقت و حقیقت کے متجسّس اس نوجوان نے حضرت کی عظمت و شان کا مزید اور گہرا مطالعہ و مشاہدہ کرنا چاہا۔ یوں تقریباً ایک ہفتہ تک صبح و شام حضرت کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد ایک شام مغرب کی نماز سے تھوڑی دیر قبل مذکورہ بالا نوجوان نے حضرت سے بیعت ہونے کی درخواست کی۔ حضرت قبلۂ عالمؒ اُس وقت وضو فرما رہے تھے۔ انھوں نے بغور اُس نوجوان کی طرف دیکھا اور فرمایا: "میاں! اچھی طرح پرکھ لو کہیں بعد میں تمہارے دل میں خیال نہ رہے کہ آزمائش میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔"

نوجوان نے اپنا حالِ دل جب حضرت کی زبان سے سُنا کو اُس کی حالت مُضطرب ہو

گئی۔ اسی اضطراب میں اُس کے منہ سے بمشکل دو جملے نکلے: "حضرت! بس آپ مجھے اپنا خادم بنالیں، آپ سے دُور رہنے کی اب مجھ میں ہمّت نہیں۔"

قبلۂ عالم جو عرفان و ولایت کے تاجدار تھے انھوں نے مردم شناسی سے اُس نوجوان کی اندرونی کیفیت بھانپ لی اور اس کا بازو تھام لیا اور اپنے ہمراہ مسجد کے اندر لے گئے جہاں عقیدت مندوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ اُس نوجوان کو حضرت کے ہمراہ دیکھ لوگوں کی نگاہیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں، کئی انگشت بدنداں بھی ہوئیں۔ حضرت نے نوجوان کو مصلے پر اپنے ہمراہ بٹھایا۔ اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی۔ نماز ادا ہوئی اور اُس کے بعد حضرت نے لوگوں کو بیعت کرنا شروع کیا۔ موصوف نوجوان کو بھی بیعت کر لیا گیا۔ پھر نقشبندیہ سلسلہ کے قواعد کے مطابق ذکر کی محفل شروع ہوئی۔ روشنیاں گل کر دی گئیں۔ اسی دوران حضرت نے اُس نوجوان کو اپنے قریب اور اتنا قریب کر لیا کہ دوری کا تصوّر مٹ گیا۔ اپنا لعابِ دہن حضرت نے نوجوان کے منہ میں دیا اور اپنی دستارِ فضیلت اُس کے سر پر رکھدی اور پیٹھ پر مُکّا رسید کر کے فرمایا: "تم میرے حقیقی جانشین ہو۔"

بس یہ کہنا تھا کہ نوجوان کا تن، من، نورِ روحانیت و معرفت سے جگمگا اُٹھا۔ پھر مراقبہ ختم ہوا تو حضرت نے بھری محفل جس میں بڑے بڑے اکابر علماؤ فضلا اور اہل اللہ بیٹھے تھے اُس نوجوان پر بھرپور تلطف فرمایا۔ چائے آئی تو آدھا کپ پی کر باقی نوجوان کو دے دی۔ کھانا آیا تو حضرت ایک لقمہ اپنے منہ میں ڈالتے، ایک اس نوجوان کے منہ میں دیتے جس کو آپ نے اپنا جانشین بنایا تھا۔

اُسی روز سے چرخِ طریقت پر یہ نوجوان اختر ولایت بن کر چمکا۔ روحانیت کا یہ سمندر محمّد یونس خان آفریدیؒ تھے۔ آپ نے ہمیشہ گمنام اور گوشہ نشین رہنا چاہا۔ آپ اُن افراد میں سے ہیں جو شہرت پر عاشق نہیں ہوتے بلکہ شہرت اُن پر عاشق ہوتی ہے۔

محمّد یونس خان آفریدیؒ ۱۴ر دسمبر ۱۹۰۲ء بروز اتوار آگرہ فیروز آباد کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ گرامی حاجی محمّد اسماعیل خان آفریدی ایک نیک نہاد، ولیٔ کامل اور ابدالِ وقت تھے۔ یونس آفریدیؒ کے آباؤ اجداد کابل کے پٹھان قبیلے آفریدی سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ قیصر خان احمد شاہ ابدالی کی افواج کے سالار تھے۔ پانی پت کی دوسری لڑائی میں موصوف قیصر خان نے اپنی عسکریت کے وہ جوہر دکھائے کہ احمد شاہ ابدالی کو فتح نصیب ہوئی۔ اسی فتح کے انعام کے طور پر قیصر خان کو اعتماد پور کے

نزدیک موضع پنواڑی میں جاگیر عطا کی گئی۔ یوں کابل کا یہ آفریدی خاندان موضع پنواڑی میں کاشتکاری کرنے لگا۔ یونس خان آفریدیؒ کا خاندان مذہبی اور علمی تھا۔ آپ کے والد حاجی اسماعیلؒ نے کاشتکاری کی طرف توجّہ دینے کی بجائے سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ آپ ایک سرکاری ادارے میں ملازم تھے۔ اُس زمانے میں آپ آگرہ میں تعینات تھے کہ جب آپ کے گھر قطب زماں حضرت آفریدی نے جنم لیا۔ آفریدی صاحب کل تین بھائی تھے۔ یعقوب آفریدی سب سے بڑے تھے۔ حضرت آفریدی منجلے اور ڈاکٹر شکیل اشرف آفریدی سب سے چھوٹے تھے۔ حضرت آفریدی ابھی صرف آٹھ سال کے تھے کہ سایۂ مادر آپ کے سر سے اُٹھ گیا۔ آپ نے اپنے کامل و عالم والد سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۲ء میں آپ نے باقاعدہ تعلیم کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے آپ نے قرآن پاک حفظ کیا اور ساتھ ہی اسلامیات میں محیّر العقول دسترس حاصل کی۔ اس اسلامی تعلیم اور قرآنی علوم کے حصول و عبور پر آپ کو وقتاً فوقتاً بیش بہا انعامات ملتے رہے۔

آپ ۱۹۱۵ء میں سکول میں داخل ہوئے۔ درسی تعلیم میں آپ کا معیار ہمیشہ بلند رہا۔ آپ نے مڈل و میٹرک میں وظائف اور میڈل حاصل کیے۔ ایف اے، بی اے علی گڑھ سے پاس کیا۔ پھر روحانیت و تصوّف کی جستجو کے لیے آپ نے علومِ فارسی سیکھنا شروع کیا۔ ایم اے فارسی کے ساتھ ساتھ آپ نے ایل ایل بی بھی کیا۔ آپ نے آگرہ سے ایم اے فارسی اور ایل ایل بی کے بعد علی گڑھ سے ایم اے جغرافیہ اور لندن سے ایف آر جی ایس کیا۔

آپ علمِ روحانیت کے بھی زبردست مشتاق تھے۔ روحانیت کا درس آپ نے سب سے پہلے اپنے والدِ گرامی سے حاصل کیا۔ پھر جب آپ نے اپنے بڑے بھائی یعقوب خانؒ کو زینۂ معرفت پر قدم رکھے دیکھا تو اُن سے بھی علومِ معرفت سیکھے۔ آپ اپنے بھائی سے بہت متاثر تھے۔ روحانیت کے سفر پر روانہ ہوئے تو ابتدائی منازل حضرت نے گھر پر ہی سر کرلیں، مگر تشنگی، شوق اور جستجو ابھی باقی تھی۔ ابھی آپ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے کہ ہیکر گارڈن آگرہ میں آپ کی ملاقات شہبازِ ولایت حضرت مولانا محمّد کریمؒ سے ہوئی۔ مولانا ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ آپ قرآن مجید اور فقہ و حدیث کے فاضل عالم تھے۔ آپ نے حضرت آفریدی پر خصوصی تلطف فرمایا۔ اور خیابان ولایت پر آپ کی انگلی تھام کر آپ کو چلنا سکھایا۔ مولانا کی عظمت و تصوّف کے واقعات حضرت آفریدی ہر ایک کو سنایا کرتے تھے۔

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت آفریدیؒ نے ۱۹۲۴ء میں قبلۂ عالم پیر جماعت علی شاہؒ کی بیعت کر لی تھی۔ حضرت قبلہ عالم نے آفریدی صاحبؒ کو اپنا حقیقی جانشین کہہ کر اُن کی روحانیت و معرفت کو نیا رُخ اور انداز عطا فرما دیا تھا۔ اب حضرت آفریدیؒ باقاعدہ ریاضت اور عبادت کے خوگر ہو گئے۔ اگرچہ صوم وصلوٰۃ اور تہجد گزاری کے تو آپ طفولیت سے ہی پابند تھے مگر اس طرزِ عمل کو جِلا حضرت قبلۂ عالم نے عطا فرمائی۔

سفر ہوتا یا حضر حضرت قبلہ عالم آفریدی صاحب کو ہمیشہ یاد کرتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ آگرہ میں حضرت کا قیام تھا کہ آفریدی صاحب کسی مجبوری کے تحت حضرت کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے۔ روانگی والے دن آفریدی صاحب حضرت کی خدمت میں قدم بوسی کے لیے گئے تو اس وقت قبلہ عالم کار میں سوار ہو چکے تھے۔ رش اتنا تھا کہ حضرت تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ آفریدی صاحبؒ دل آزردہ ہوا کہ وہ اپنے مُرشد کی ملاقات سے محروم رہ جائیں گے ابھی یہ خیال آپ کے دل میں تھا کہ کسی نے بلند آواز سے پکارا۔

"میاں یونس آفریدیؒ ہیں تو وہ فوراً قبلہ عالم کی سواری کے پاس آجائیں حضرت اُن کو یاد فرما رہے ہیں۔"

یہ سُننا تھا کہ آفریدی صاحب بھاگتے ہوئے۔ ہجوم کو چیرتے ہوئے حضرت کے پاس گئے۔ حضرت قبلہ عالم اُس وقت گلاب و موتیا اور چنبیلی کے پھولوں کے ہاروں سے لدے ہوئے تھے۔ انھوں نے آفریدی صاحب کو دیکھا تو تمام ہار اپنے گلے سے اتار کر آفریدی صاحب کے گلے میں ڈال دیئے اور فرمایا۔

"یونس خان! یہ ملاقات نہ کرنے کی سزا ہے۔ مَیں اتنے دن یہاں رہا مگر آپ نہیں آئے۔ آئندہ ایسی کوتاہی نہیں ہونی چاہیئے۔"

آفریدی صاحبؒ نے سر نیاز خم کیا اور عرض کی۔ "حضرت! مَیں عفو خواہ ہوں آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔"

حضرت قبلہ عالمؒ جب تک اس عالمِ فانی میں موجود رہے اُن کے تلطف کا ابرِ کرم حضرت آفریدی پر ہمیشہ برستا رہا۔ ایک مرتبہ آفریدی صاحب نے "قل ہو اللہ" کا عمل کرنے کی اجازت حضرت سے چاہی۔ حضرت نے سکوت فرما دیا۔ آفریدی صاحب نے بھی بات دہرانا ادب کے منافی جانا اور خاموش ہو گئے۔ اس واقعہ کے بیس سال بعد حضرت قبلہ عالم لاہور میں ایک روز مُریدوں کے حلقے میں تشریف فرما تھے۔ حضرت آفریدی بھی اس

محفل میں موجود تھے۔ تب حضرت قبلہ عالمؒ کی بینائی رخصت ہو چکی تھی۔ آپ نے اُس روز پکار کر فرمایا۔ "یہاں یونس آفریدی ہیں۔" آفریدی صاحب نے فوراً عرض کی۔ "حضرت! خادم حاضر ہے۔"

قبلہ عالمؒ نے فرمایا۔ "یونس خان آپ کو یاد ہے ایک روز آپ نے مجھ سے "قل ھو اللہ" کے عمل کی اجازت چاہی تھی" عرض کی۔ "حضرت بالکل یاد ہے۔"

قبلہ عالم نے فرمایا" تو آج میں اس عمل کی اجازت دیتا ہوں اور آپ کے طفیل تمام شرکاء مجلس کو بھی اس عمل کی اجازت ہے۔"

حضرت کی محبت آفریدی صاحب پر اس قدر تھی کہ آپ کے کہنے پر لاہور میں پیر خانہ قائم کیا گیا جہاں باقاعدہ ذکر و اذکار کی مجالس ہوا کرتی تھیں۔ حضرت کی شفقت دمِ آخر تک آفریدی صاحب کے لیے جاری رہی۔ وصال کے وقت حضرت قبلہ عالم نے تین مرتبہ آفریدی صاحب کو پکارا مگر آفریدی صاحب کیونکہ وہاں موجود نہ تھے اس لیے پیر و مرید کی آخری ملاقات نہ ہو سکی۔

آفریدی صاحب کو اس ملاقات کے نہ ہونے کا شدّت سے قلق و افسوس تھا۔ آپ فرماتے تھے' نامعلوم حضرت اُس آخری ملاقات میں کیا عطا فرمانا چاہتے تھے جس سے میں محروم رہ گیا۔

قبلۂ عالم کے وصال کے بعد حضرت آفریدیؒ کو ایک روز خواب میں حضرت غوث اعظم پیرانِ پیرؒ کی زیارت ہوئی۔ حضرت غوث پاکؒ نے فرمایا" یونس خان تمہاری روحانیت کا حصّہ نقشبندیہ سلسلہ میں تمام ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب قادریہ سلسلہ میں داخل ہو جاؤ۔" آپ نے یہ خواب دیکھنے کے بعد قادریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ پیر طاہر علاؤالدین گیلانی سے سکھر کے ایک مقام پر ملاقات کر کے بیعت کی۔

آفریدی صاحبؒ کی عمر کے ساتھ ساتھ آپکی روحانی و عرفانی شان بھی بڑھتی گئی۔ آپ نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ ایکسائز اینڈ لینڈ کسٹم کے محکمہ میں ملازمت کرنا اور اپنا دامن رزقِ حرام سے آلودہ نہ ہونے دینا کسی مردِ قلندر کا ہی کام ہے۔ ملازمت کے دوران آفریدی صاحب مختلف مقامات پر تعینات رہے۔ آپ کا معمول تھا کہ جب بھی کہیں تبدیل ہو کر جاتے وہاں کے شہر یا دیہات سے پہلے کسی اہل اللہ کی تلاش

کرتے تھے۔ آپ کو اولیاء اللہ سے اتنی محبت تھی کہ آپ نے اپنی سرکاری ملازمت کے دوران تقریباً ایک سو پچیس اقطابِ زمان سے ملاقاتیں کیں۔ بعض اوقات تو آپ کسی بزرگ کے پاس جاتے تو وہ آگے سے آپ کا خیر مقدم کرنے کے لیے موجود ہوتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے" ان بزرگوں اور درویشوں کی تلاش کے لیے بعض اوقات مجھے پُرخطر پہاڑی علاقوں میں میلوں راستہ ہاتھوں کے بل چل کر طے کرنا پڑتا لیکن جونہی کسی صاحبِ ارشاد اور کشف و کرامات سے میری ملاقات ہو جاتی میں اپنی تمام تکالیف بھول جاتا تھا۔"

۱۹۶۳ء میں آپ بھارت بلڈنگ لاہور میں واقع واپڈا کے دفاتر میں بطور اکاؤنٹ آفیسر کام کرتے تھے۔ ایک روز راولپنڈی سے ایک بزرگ صوفی بادشاہ جن کا اصل نام شاہ عبدالقادر تھا اور وہ راول ڈیم کے رہنے والے تھے اپنے مریدوں کے ہمراہ آپ کے پاس آفس میں آئے اور فرمایا" کیا آپ ہی یونس خان آفریدی ہیں؟" عرض کی جناب میں ہی خادم ہوں۔ کہیے میں کیا خدمت کروں جناب کی۔"

صوفی بادشاہ نے فرمایا" صاحب! آپ کیا خدمت کریں گے خدمت کرنے کے لیے تو ہم حاضر ہوئے ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ ہم آپ کو چہار سلاسل میں بیعت کر کے آپ کو لاہور کا خلیفہ مقرر کریں۔ کیا آپ اس کے لیے تیار ہیں۔"

آفریدی صاحب نے فرمایا" آپ درست فرماتے ہیں مگر میں اس بیعت اور خلافت کو اس وقت تک اختیار نہیں کر سکتا جب تک مجھے خود خدا سے کوئی حکم نہ ملے گا میں معذرت خواہ ہوں۔"

صوفی بادشاہ نے فرمایا" آپ کا کہنا بجا ہے ہم انتظار کر لیتے ہیں انشاء اللہ خدا آپ کو ضرور بیعت کا حکم دے دے گا کیونکہ ہمیں بھی اُسی نے بھیجا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ خدا کا بھیجنا غلط نہیں ہو سکتا۔"

اگلے روز صوفی صاحب موصوف دوبارہ تشریف لائے تو آفریدی صاحب نے اُن کو بڑھ کر گلے لگایا اور فرمایا" حضرت! آپ بالکل سچے تھے۔ خدا نے واقعی آپ کو مجھے خلافت سے سرفراز کرنے کے لیے بھیجا ہے کیونکہ مجھے بھی آج رات خواب میں اسی بات کا حکم ملا ہے۔"

حضرت آفریدیؒ صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب آپ ہجرت کر کے ہندوستان سے پاکستان آئے تو راستے میں ہندوؤں اور سکھوں نے اپنی عادات اور حصول کے مطابق

آپ کی ٹرین کو بھی نرغے میں لے لیا۔ آپ نے فوراً کارروائی فرمائی اور پوری گاڑی کا حصار کر لیا۔ خدا نے ایسی کرم نوازی کی کہ ٹرین سے ہندو اور سکھ خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے۔ آپ اور آپ کے ہمراہ آنے والے جملہ مسلمان بحفاظت پاکستان پہنچ گئے۔

آپ مسلسل چالیس سال تک پانی دم کر کے لوگوں کو دیتے رہے۔ مہلک سے مہلک اور پیچیدہ سے پیچیدہ بیماری کا علاج آپ کلام الٰہی سے دم کردہ پانی سے کر دیتے تھے۔ آپ نے بصارت کا نسیان، امراضِ نسواں و مرداں، دمہ، بلڈ کینسر، دل و دماغ کے امراض کے بے شمار مریضوں کو شفایابی کا جامِ شیریں عطا فرمایا۔

پنجاب ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین (مرحوم) جس زمانے میں ایڈووکیٹ جنرل ہوا کرتے تھے اُن کو گھٹیا کی بیماری لاحق تھی وہ ایک ہفتہ تک آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر پانی دم کرواتے رہے اور اُن کو خدا تعالیٰ نے شفا عطا فرمائی۔ اسی طرح سابق وزیرِ خوراک و زراعت ملک خدا بخش بُچہ کی اہلیہ محترمہ جو کہ بلڈ پریشر کی دائمی مریضہ تھیں اُن کو آپ کے دم کردہ پانی سے خدا نے شفا عطا فرمائی۔

حضرت آفریدی صاحب کرامت اور عظیم انسان تھے۔ آپ نے اسلام کی بے پناہ خدمت کی۔ آگرہ اور اُس کے نواحی علاقوں میں جا کر سالوں اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ بے شمار ہندوؤں کو دینِ مبین سے ہمکنار کیا۔ وہ مسلمان جو نام کے مسلمان تھے اُن کے اندر اسلام کی حقیقی روح پیدا کی۔ اپنے علاقے میں ہندوؤں کی دکانوں سے سود اسلف خریدنے سے روکا۔ کیونکہ ہندوؤں کو پاکی، پلیدی کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کی دکانیں کھلوائیں۔ خود عمر بھر سفر میں بھی رہے اور حضر میں بھی لیکن کبھی بے نمازی کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی نہ کھاتے تھے۔ ایک عرصہ تک اپنے گھر میں جمعہ کے روز ایک تبلیغی اجتماع منعقد کرواتے رہے۔ مرزائیوں کے سخت خلاف تھے۔ اُن کو خدا کے باغی، دین کے قاتل اور رسول صلعم کا دشمن قرار دیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کو انتہائی محبت تھی۔ آپ اسوہ رسولؐ کی پیروی کو مسلمان کی تکمیل قرار دیتے تھے۔ آپ کو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تین مرتبہ زیارت ہوئی تھی جس کا تذکرہ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے۔

اللہ پاک اپنے نیک بندوں کی مشکل وقت میں، کسی نازک مرحلے میں جب اُن پر

شیطان حملہ آور ہونے والا ہو، یا کسی اور خاص انعام کے لیے وقتاً فوقتاً رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ یہ رہنمائی اوامرِ الٰہی کی شکل میں ہوتی ہے۔ حضرت آفریدیؒ فرماتے ہیں" میں وہ خوش نصیب ہوں جس کو خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت کے صدقے انھیں اوامرِ الٰہی سے نوازا ہے۔ یہ اوامر ہمیشہ میری رہنمائی کرتے رہے۔"

روحانیت کے موضوع پر آپ نے پیامِ عمل، ذکرِ الٰہی، مجمع البحرین حصہ اوّل و دوم جیسی جامع اور بے مثال کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ جغرافیہ کی کتابیں اور گائیڈیں بھی لکھیں جو میٹرک اور ایف اے میں پڑھائی جاتی رہیں۔

اپنے وصال سے چند روز قبل آپ نے ایک خواب دیکھا جس میں آپ کو یہ نوید سنائی گئی۔" آپ اب سدرۃ المنتہا تک پہنچ گئے ہیں بس اب آگے آپ نہیں جا سکتے۔ آپ اس خواب کا مطلب سمجھ گئے۔ اپنے بچّوں اور احباب کو بتا دیا کہ اب ہم اسی ہفتے میں خدا کے ہاں چلے جائیں گے۔ اپنے آخری سفر کے بارے ہدایات دیتے ہوئے غسلِ آخر، کفن دفن اور دیگر ضروری معاملات سے گھر والوں کو آگاہ کر دیا۔

یکم اپریل ۱۹۸۸ء بروز جمعۃ المبارک بوقتِ عصر آپ کو پیامِ اجل آگیا۔ صبح کے وقت آپ کی طبیعت خراب ہوئی۔ گھر والوں نے ہسپتال لے جانا چاہا۔ آپ نے روک دیا۔ صدقے کا بکرا لایا گیا۔ آپ نے اس کو چھونے سے انکار کر دیا۔ باتیں کرنے سے گریز کیا آپ کی زبان پر ذکرِ الٰہی تھا اور نظریں گھڑی پر تھیں جیسے کسی کے منتظر ہوں۔ آپ اُس وقت تنہائی چاہتے تھے لیکن گھر والے آپ کے اردگرد جمع تھے۔ وہ لوگ بھی اپنی محبّت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ آخر آفریدی صاحب کی خواہش پوری ہوئی۔ عصر کی نماز سے کچھ دیر پہلے آپ کے ہاں کچھ مہمان آگئے یا شاید خدا نے خود بھیجے۔ گھر والے اُن کی خاطر مدارت میں لگ گئے اور آفریدی صاحب کو تنہائی کا موقع مل گیا۔ بس یہ وہ گھڑی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے جلیل القدر ولی قطب زمان رازیٔ دوراں کو اپنے پاس بُلا لیا گیا۔

حضرت آفریدیؒ نے ۸۶ سال کی عمر میں وصال فرمایا۔ آپ کی زندگی، آپ کی تعلیم و تربیت اور صحت قابلِ رشک تھی۔ آپ نے ایک مثالی زندگی گزاری جس کی تقلید کرنا باعثِ نجاتِ آخرت ہے۔ آپ کو میانی صاحب کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ عقیدت مند آج بھی آپ کے مزار پر حاضری دیکر فیوض و برکات سے جھولیاں بھرتے ہیں

اولیائے کرام (جلد چہارم) کی تیاری اور بزرگانِ دین کے انتخاب
کے سلسلے میں مندرجہ ذیل دینی کتب سے استفادہ کیا گیا۔

تذکرۃ اولیائے نقشبند	تذکرۃ اولیائے چشت	حیاتِ شہباز قلندر
تذکرۃ اولیائے ضلع سرگودھا	تذکرۃ اولیائے ضلع جھنگ	تذکرہ مشائخ پاک و ہند
ملفوظاتِ سچل سرمست	تذکرہ حضرت سلیمان تونسوی	حیات امام رازی
کیمیائے سعادت	غزالی نامہ	ملفوظات حضرت احمد رضا خان بریلوی
سوانح بندہ نواز گیسو دراز	شعر عجم	ادب نامۂ ایران
حکمتِ رومی	حکایات مولانا روم	معارفِ شمس تبریز
انوار اصفیاء	عرفان جلد اول و دوم	رسائل جنید
مناقبِ سلطانی	سفینۂ اولیاء	طبقات الاولیاء
سیرت العارفین	اولیائے علوم	تاریخ مشائخ چشت
صوفیائے دکن	انوارِ صفیا	درسِ ولی
تحزینۃ الاصفیاء	زہرۃ خواجگان چشت	دُرِّ اسرار
متاعِ فقیر	قراۃ الخیال	لطائفِ اشرفی

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ بعض جرائد مذہبی کتابچوں اور
عصرِ حاضر کے علمائے دین کی تحریروں اور تقاریر سے بھی
رہنمائی حاصل کی گئی۔